

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلسلہ  
داغ و گداز

ماہنامہ  
پس

اکتوبر 2016



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com



## انشائیہ

07 جون ایلیا

شعور و انانی سے مزین ایک  
وانش وری کی گہری باتیں

## نگار و ناموں کی داستان

16 الیاس سیٹاپوری

ماہی کا آئینہ اختیار اور بے اختیار  
انسان کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

## باجھ

71 علی اختر

ذہن کی بغاوت پر ایک  
زہریلی مسگر منقش و تحریک

## نہ خدای ملا

107 ڈاکٹر ساجد امجد

لوکھڑائی زندگی کو سہارا دینے والے  
ایک کمزور انسان کا سنگین روپ

## اللہ معافی

153 محمد الیاس

اپنے مفاد اور مطلب کا دائرہ مکمل کر کے  
اللہ سے معافی طلب کرنے کا انداز

## آپ کے خط

08 مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت و ستارین کی تلخ  
شیریں باتیں گلے گلے اور پر خلوص مشورے

## انگوٹھی کا راز

61 تنویر ریاض

ماورائی واقعات کے حوالے سے  
تاریخ کے طالع علم کا انداز نظر

## شیش محال

76 اسماء قادری

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطرینک  
بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

## سرکاری دہاری

122 ملک صفدر حیات

مالکان کے علم پرناچنے والے ایک  
سرکاری دہاری کا عبرت ناک انجام

## کارِ رفتہ

157 عبدالستار چوہان

تکست و ریخت کے ان کسور و لمحوں کا  
احوال جو اس کی زندگی کا حاصل تھے

جلد 46 • شماره 10 اکتوبر 2016 • نو سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 • فیکس: (021) 35802551 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com



## لکے دم

175 منظر امام

دم گھٹنے والے ماحول میں  
زندگی کی نافرمانی کا قصہ

## گمان

221 شہر عباس

ترقی یافتہ ماحول میں خوشی اور غم  
کا امتزاج..... مغربی معاشرے کا المیہ

## محبوب الہی

237 ضیاء السنم بلگرامی

حضرت نظام الدین اولیا  
کی زندگی کے شیب و سراز

## گورن

255 ابراہیم جلالی

اپنے پیروں پر کھڑی مارنے والے  
ایک باپ کے خون دل کا عبرت اثر واقعہ

## کثر نہیں

000 ارارہ

دنیا بھر سے اوسرا دھڑ سے لطیفے، چٹکے،  
اقتباسات، مسکرائشیں اور قلمی سب کچھ آپ کے لیے

## مخفلی شعر و سخن

172 قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک نئے رنگ  
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

## مارگو مکی

182 محی الدین نواب

ایکسپرٹ روپ بھی چھاؤں بھی دھوپِ محبت کی  
عنایتوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل با سلسلہ

## ملکین شلوم

231 ڈاکٹر شیر شاہ سید

بدلتے وقت کی زہریلی  
رنگینیوں کا سنگین احوال

## کرامات

251 سلیم انور

اچانک بازی پلٹ جانے  
پر ایک شاطر کی کایا پلٹ

## بھرم

260 عمر عبداللہ

کنگریٹ کی اونچی دیواروں کا بھرم اور  
کسی کی حیا و شرم کی عبرت ناک داستان



## شعور، دانائی اور دانش

میں اپنے گمان کی رو سے انسانوں کو بے حد عزیز رکھتا ہوں۔ مجھے مظلوم اور محروم انسانوں سے بے نہایت محبت اور یہ محبت میرے نزدیک سب سے بڑی عبادت بلکہ میرے نفس کی سب سے بڑی فضیلت ہے اور میرا گمان ہے کہ میرے قابل احترام پڑھنے والوں کی اکثریت بھی انسانوں سے بے نہایت محبت کرتی ہے اور وہ ان کو نسل، زبان، مسلک اور علاقوں میں نہیں بانٹتی۔ مگر عام معاملہ یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ ہر شخص اپنے آپ میں مگن ہے۔ رہے خونی رشتے تو وہ بہت معجزہ سمجھے جاتے ہیں مگر جب ان کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو گئی جتنی مثالوں کے سوا نتیجہ بہت دل شکن ثابت ہوتا ہے۔

انسان اپنے آپ کو جانداروں بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ ”جانوروں“ کا سب سے عمدہ نمونہ سمجھتا اور سمجھتا آیا ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھتا اور کیوں سمجھتا آیا ہے؟ یوں سمجھتا آیا ہے کہ اس نے پتھروں کو گھس کر ہر چھیاں بنا لی اور دوسرے جانداروں یا جانوروں کی جان کو آیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور جانوروں کے غم میں ضرر سے اپنے آپ کو ہرگز نہیں بچا سکتا تھا۔ اگر انسانوں کے درمیان رائے شماری ہو اور اس مسئلے پر کہ وہ چنگیز خان کو اپنا حکمران بنانا پسند کرتے ہیں یا کسی چیتے کو تو فلسفی ہوں، شاعر ہوں یا روحانی پیشوا، سب کے سب چنگیز خان کے حق میں رائے دیں گے۔ اس لیے کہ چنگیز خان آخر انسان تو تھا۔ وہ کم سے کم اپنی بیوی یا بیویوں، اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور کچھ دوسرے قریبی لوگوں سے تو اس رکھتا تھا۔ یعنی اس سے کچھ انسان بلکہ کئی سو یا کئی ہزار انسان تو محفوظ تھے۔ مگر چیتے سے تو کوئی بھی انسان محفوظ نہیں ہے۔

اب ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا ایک چیتے سے دوسرے چیتے محفوظ ہیں یا نہیں؟ ”شیان! تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے یہ سوال تم سے اس لیے کیا ہے کہ اگر میں اپنے سوال کا خود کوئی جواب دوں تو اسے ایک قسم کی دعویٰ داری سمجھا جائے گا۔“

”میرے صاحب! میری رائے یا میرا خیال یہ ہے کہ چیتا اپنے آپ کو دوسرے چیتے سے محفوظ سمجھتا ہے۔ کوئی بھی چیتا اس خدشے میں مبتلا نہیں ہوگا کہ مجھے کوئی بھی چیتا پھاڑ کھائے گا۔ یعنی کسی ایک چیتے سے چیتے کی نوع کو ہرگز کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”تو گو یا میری اور تمہاری رائے چیتوں کے بارے میں ایک ہے۔ اب چیتے کی بات چھوڑ کر چنگیز خان کی طرف آؤ۔ کوئی شبہ نہیں کہ چنگیز خان سے اس کے قریبی لوگوں کو خطرہ نہیں تھا مگر اس کے قریبی لوگوں اور اس کے حامیوں کے سوا جولا کھوں اور کروڑوں انسان تھے، کیا وہ چنگیز خان کی خوں خواری اور خوں آشامی سے محفوظ تھے؟“

”ہرگز محفوظ نہیں تھے۔ چنگیز خان نوع انسانی کی ایک مختصر تعداد کو چھوڑ کر باقی تمام نوع انسانی کے حق میں ایک خوں خوار چیتا تھا۔“

”شیان! وقت تمہیں اس آئے، تم پھلو اور پھولو۔ تم نے وہ کچ بولا جس کو زندگی کی تاریخ کا دردناک ترین جاندار، جانور یعنی انسان ہرگز نہیں جھٹلا سکتا۔ بھلا کون یہودی، مسیحی اور مسلمان تو ریت اور قرآن کا یہ قصہ جھٹلا سکتا ہے کہ مخلوق کی سب سے شریف نسل، آدم کی نسل کے پہلے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹا..... دوسرے بیٹے کا، یعنی اپنے بھائی کا قاتل تھا۔“

”کیا کسی دردناک نسل کے دو بیٹوں میں سے کسی ایک نے دوسرے کو قتل کیا؟ اب ایک اور بات کو دھیان میں لایا جائے اور وہ بات یہ ہے کہ کیا دردناکوں کے کسی ایک گروہ نے دردناکوں کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف اپنی حفاظت یا اس پر برتری پانے کے لیے کبھی کوئی ہتھیار ایجاد کیا؟ دردناکوں کی بات چھوڑو، عام بات کرو۔ سانپ اور نیو لے جنم جنم سے ایک دوسرے کے ہمیری ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟ سو بتاؤ کہ کیا کسی سانپ یا کسی نیو لے نے ایک دوسرے کے خلاف کوئی غلیل یا کمان ایجاد کی؟“

تو یہ ہے انسان اور نوع انسانی، جانداروں یا جانوروں کی وہ نوع جس کو جانداروں یا جانوروں کی ہر نوع پر برتری حاصل ہے۔ مگر اس نوع نے، جو شعور، دانائی اور دانش سے بہرہ مند ہے، جس کے علم نے سیاروں پر اپنی فتح مندی اور بلندی کے پرچم لہرائے ہیں، یہ نوع خود اپنے حق میں غلاب جیم بن گئی ہے۔ اس نے دنیا کو خود اپنے لیے ایک جہنم بنا رکھا ہے۔ کیا شعور، دانائی اور دانش سے اس صورت حال کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ شعور، دانائی اور دانش نے انسانیت اور انسان دوستی کو سخت مایوس کیا ہے۔ مگر ہم شعور، دانائی اور دانش کی نہاد سے ایک بہت باردار اور محنت کار امید رکھتے ہیں اس لیے کہ شعور، دانائی اور دانش اپنی نہاد اور اقدار میں خیر سے عبارت ہیں۔





عزیزانِ من!  
السلام علیکم!

اکتوبر 2016ء کا دُقریب سسپنس آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ تادم تحریر رچ اور عیدالضحیٰ کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام عازمینِ حج کو خیریت اور دل سے حج ادا کرنے کی سعادت عطا فرمائے اور تمام حجاج کرام کا حج قبول فرمائے۔ آمین۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانانِ عالم کو عیدِ قرباں کی ڈھیروں مبارک باد بھی قبول ہو لیکن گزشتہ دنوں عید کی تیاریوں کے دوران برسات نے مویشی منڈیوں میں جو افراتفری پیدا کر دی ہے، اس سے تیاریاں پھونکنے کا خدشہ ہو چلا ہے۔ بات وہی آتی ہے کہ ریاستی ادارے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ملکی سیاست بالخصوص کراچی میں حالات کی تازہ کروٹ نے سوچ کے کئی دروازے کھول دیے ہیں۔ خوش گمانیوں کے ایک خاص عہد کے آغاز کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ طویل عرصے بعد شاید دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ اور بھتا خوردی کا باب بند ہونے کی کم از کم امید تو کی جاسکتی ہے مگر یہ کیا..... ابھی امید اور ناامیدی..... خوف اور دہشت کی چادر سرکنے بھی نہ پائی تھی کہ پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں مہسوم بچوں کے اغوا اور انتقامی کارروائیوں کی خبریں بھی عام ہونے لگیں..... یہاں تک وہاں سے پھوٹ گئی..... یہ حقیقت ہے یا فسانہ اس سے بحث نہیں لیکن کیا اس طرح مستقبل کے معیار بھی لحاظ سے اپنی بنیاد مضبوط کر سکیں گے؟ والدین بچوں کو ہار نکالتے ہوئے خوفزدہ ہیں۔ یہ کیسا تحفظ محوام کو فراہم کیا جا رہا ہے۔ ہم ابھی اس کیفیت سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ خیر بختون خواہ ایک بار پھر دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا۔ مردان میں اس بم دھماکے نے پھر سے درد مند شہریوں کو اندیشوں، دوسلوں، بے عزتی اور بے بسی، تیز فضا اور اشتعال کی ملی جلی کیفیات کا شکار کر دیا ہے اور جناب اس کے بعد پھر سے ریلیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔ اب دیکھتے ہیں ان ریلیوں کا کیا رزلٹ نکلتا ہے اور کیا اس طرح کی پچھلی سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ نکل چکا ہے، بس ایک ٹھیل ہے جو کھلا جا رہا ہے اور ہم بھی اس ٹھیل ہی ٹھیل میں چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب، جہاں بہت پیارے سندیے ہمارے منتظر ہیں۔

زرین آفریدی، حیدرآباد سے محفل کی زینت بن رہی ہیں "بارشوں کا موسم بھی بہت عجیب ہوتا ہے اور اس موسم میں سسپنس ڈائجسٹ کا دل جانا اچھا لگتا ہے۔ ماہ ستمبر 2016ء کا سسپنس ڈائجسٹ بروقت مل گیا، سرورق کی حسینہ کی مسکراہٹ دیکھ کر ہم بھی مسکرا دیے۔ موسم کی مناسبت سے لان کا سوٹ اور آنکھوں میں کا جل بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کہانیوں کی فہرست میں یہ نئی میزبان زیادہ پیاری ہے مزید یہ کہ اپنے پسندیدہ رائٹرز کولٹ میں دیکھ کر دل جموم اٹھا۔ انتہائی میں اپنے عظیم ایلینا صاحبہ ایتلائے دکھ و درد تھے، کیا ہو سکتا ہے..... افسوس صد افسوس۔ ادارہ ہماری سوچ کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ بقول ادارہ محفل مناس میں شٹا ٹکھنے ہم بھی چلے گئے۔ محمد رضی صاحبہ صدارت پر تھے مبارک باد۔ محمد صفدر بھائی ہمیشہ سویرا انداز میں تہرہ کرتے ہیں۔ مرزا گل کا انداز چٹ پٹا ہے۔ عبادت کاظمی یہ مجاہدہ تو سنا ہوگا، یہ منہ اور مسور کی دال۔ طاہرہ نگر ابھی پیارے تہرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ محمد خواجہ بھائی، اب ہمارے نئے خادم اعلیٰ تو اچھے کام کر رہے ہیں، اب تو خوش رہیں۔ ہمارے دو تہرہ نگار تو رائٹرسٹ میں آچکے ہیں۔ محمد خواجہ صاحب اور زویا اعجاز صاحبہ الیاس صاحبہ کی کہانی اپنے جوبن پر ہے۔ تنگ و ناموس کی داستان ایک بے مثال روداد ثابت ہو رہی ہے۔ باروی، نواب صاحب کے چادوا اثر قلم نے ہمارے ذہنوں پر بھی جادو کی چٹری پھیر دی۔ حالی کے کارنامے، ان نون کی بد معاشیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ باروی میں بھی ماروی کا جنم ہو گیا۔ ان نون کا نام آہنوس سامنے آ گیا۔ ہمیں بھی اپنا دماغ تیز کرنے کے لیے بادام کھانے پڑیں گے۔ اسما قادری صاحبہ کی شیش محل اپنے جوبن پر جاری و ساری ہے۔ آخر کار جولیت اپنی اصل شناخت نواب زادی بن کر نواب سلیم اللہ کے روبرو کھڑی ہو گئی، بہت خوب۔ آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔ منجوں کے نقیب طاہر جاوید محل کی پھر یاد آئی، عمدہ کاوش ہے۔ دکھ تکلیف اور بیماری اللہ سامنے کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ ندیم نے اپنے بچوں کی ماں ثانیہ کو چھلیسیا بیماری کی وجہ سے طلاق دے دی پھر خود بھی کبھی کبھی نہیں رہا۔ لاجس کولا، ڈاکٹر شیر شاہ سیدی یہ منفرد نام کی اسٹوری کافی دلچسپ رہی۔ یہ صحیح نکتہ سامنے لائے کہ امریکا ہمیشہ دوسری اقوام کو محکوم بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ الور حنیاء، پابلو اور ان کا لاجس کولا، ویلڈن شاہ جی۔ زویا اعجاز کی خسارہ بھی خوب رہی۔ نادان انسان جوانی کے زور میں ہوش کھو بیٹھتا ہے اور اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ مبارک علی نے جو بویا وہی کاٹا۔ آخری گلاس کی صورت تحریر ریاض صاحب نے بہترین اسٹوری دی۔ کیتی نے برائن سے اپنی بربادی کا اچھا بدلہ لیا پیسے کا لالچ بہت برا ہے۔ کوہ گراں میں بیگ صاحب نے اس بار بڑی سقاوت دکھائی۔ مراد علی کو بے مراد سے بامراد بنا دیا۔ گڈ۔ ریخ تقدیر، جناب سلیم فاروقی صاحب نے کمال کر دیا آخری صفحات پر۔ اسد کی زندگی میں یہ شارت کثرت خود بخود نکلتا ہی چلا گیا



کہاں وہ کرائے کے مکان سے دھکے دے کر نکالا گیا بندہ کہاں کروڑوں کے نکلے کا مالک بن گیا۔ اسے کہتے ہیں تقدیر، آفتاب غنی واقعی غنی تھا۔ نورین نے اپنے لالچ کی سزا پائی۔ بہت سے نوجوانوں کی یہی خواہش ہوگی کہ کاش ہم بھی آفتاب غنی جیسے بندے سے ٹکرا جائیں۔ مراسلے کم تھے لیکن معیاری تھے۔ محفل شعرو سخن بھی حسب معمول بہت خوب رہی۔“ (اتنی عمدہ تبصرہ نگاری کا شکریہ)

طاہرہ گلزار، پشاور سے تبصرہ کر رہی ہیں ”آج مجھے سہنس 18 اگست کو ملا تو خوشی کے ساتھ حیرانی بھی ہوئی کہ اس بار 3 دن پہلے سہنس ملا۔ سرورق ہر بار کی طرح انٹرنیشنل بیرون کی طرح حسینہ لے کر حاضر لیکن اچھی لگی۔ براؤن بادامی آنکھیں، مناسب چہرہ، خوب صورت بال۔ واہ واہ، میرے تمام معصوم بھائی تو کام سے گئے، ہائے ہائے۔ کہانیوں کی فہرست میں مغل اعظم، عبدالرب بھٹی کے ساتھ ساتھ جب ڈاکٹر شیر شاہ سید کا نام پڑھا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ بہت عرصے سے شیر شاہ سید صاحب کی تحریر کو کس کر رہی تھی۔ ادارے والوں کا بہت شکریہ جو ہماری خواہشوں کا اتنا احترام کرتے ہیں۔ کوشش کریں کہ آگے مغل اعظم اور عبدالرب بھٹی صاحب سے قسط وار لکھوائیں۔ انشائیہ میں اس بار جون ایلیا اجلا لے کر انسانیت کے ٹھیکیداروں پر خوب خوب طنز کرتے رہے یہ پیرا گراف پڑھ کے دکھ کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ہم مظلوم زیادہ ہیں یا ظالم اور بے حس قوم ہیں۔ آخر یہ حالت ہماری قوم کی کب بدلے گی اور کیا بدلے گی بھی کبھی.....؟ ادارے میں مدیر اعلیٰ کو بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ انکل جب دہشت گردوں کے ساتھ اپنے غدار ملے ہیں تو انسانیت تو ایسے ہی تڑپے گی۔ پہلے نمبر پر جھگڑی کے محمد مرثیٰ حاضر مبارکباں۔ مجھے سالگرہ کی مبارک باد دینے کا شکریہ۔ رضوان تنولی کو تو میں تبصرہ لکھنے کے لیے ہر بار محسوس لکھتی ہوں لیکن وہ مچھلی ہی کیا جو ہاتھ آئے۔ مرزا گل ڈیڑا اکاشف زبیر کی جگہ کوئی نہیں لے سکا۔ علی رحمان جی و صبرج و صبرج، اتنی چھوٹی عمر میں حسینہ سے اتنا عشق، زیادہ لٹونہ ہو یا کرف شکریہ، سالگرہ کا یاد رکھنا۔ کہانیوں میں پہلے شیش محل پڑھی۔ کیا منظر نگاری..... اس وقت کی عداوتوں اور حالات پر..... بے مثال تحریر۔ فاروق اس بار اکبر کی وجہ سے پھنسا، جو زمین خوش قسمت تھی جو اس کو جوزف جیسا ہر درد اور محبت کرنے والا شوہر ملا۔ جوزف واقعی گریٹ انسان تھے، رین آفاک بکسٹنچ کے بھی نہ پہنچ سکا۔ جولیت حیدر آباد کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔ بعد کے حالات نے پھر فاروق کو کلکتہ جانے پر مجبور کیا۔ ماروی میں مراد ایک بار پھر انٹرویو کیا اور انٹرویو والے کب اپنا حسد اور کینہ چھپا سکتے ہیں۔ کالی قحقی اور روحانی علوم کی کیا منظر نگاری ایک بار پھر طاقت کا استعمال۔ اب پتا نہیں کہ کب کیا ہو..... سہنس کے شروع صفحات کی شان الیاس بیٹا پوری کے قلم سے نکلے ہوئے موتی کی لڑی میں پردے ہوئے الفاظ جب صفحہ قرطاس پہ بکھیرتے ہیں تو قاری جب تک اسے مکمل نہیں لے لے اس کا دل نہیں بھرتا۔ اسلامی صفحات پر تسنیم بکرا کی اسلامی تحریریں ہر سینے دل و دماغ اور روح کی پاکیزگی کا موجب بنتی ہیں۔ اللہ تسنیم بکرا کی کو اس کا اجر عظیم عطا کرے، آمین..... میرے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی مختصر تحریر آب حیات جو ایک رائٹر کے حالات زندگی پر لکھی گئی تھی، بہت ہی لا جواب۔ منظر امام کی دو غیر ملکی کہانیاں مختصر لیکن سبق آموز اور حقیقت کے قریب تحریریں تھیں۔ پہلے کی طرح ڈاکٹر شیر شاہ سید پھر ایک انوکھی اور لا جواب تحریر لاچس کو لا لائے۔ بہت ہی خوب صورت تحریر مجھے تو بہت پسند آئی، ویلڈن۔ بڑے عرصے بعد انٹرنیٹ کی لا جواب تحریر پھاٹلے پڑھی ویلڈن انٹرنیٹ..... سلیم انور کی مغربی تحریر کو تاہ اندیش جس میں کتنی مور نے صرف جینک دیکھ کے چور کی خود ساختہ چوری پکڑ لی واہ..... میرے فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل اس بار بہت ہی حساس موضوع پر تحریر، پھر یاد آئی لے کر آئے۔ یہ شوہر حضرات یہی کو ذلیل کرنے اور اس کو طلاق دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ایم جیسے بے حس شوہروں کے لیے نالکہ جیسے عورتیں ٹھیک ہیں۔ یہ چاہیے جیسی بیوی کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اچھا بلکہ بہت اچھا کہ ثانیہ زندہ نہیں تھی..... باقی کا سہنس بھی بہت معیاری ہو گا لیکن کیا کروں کہ کالج میں ان چند محبتوں کی مصروفیات میں اپنا محبوب سہنس جلد پڑھنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ باقی تو میں سہنس کا ایک لفظ بھی پڑھے بغیر نہیں چھوڑتی۔“ (بہت شکریہ آپ کی محبت کا)

اشفاق شاہین، لاہور سے شریک محفل ہیں ”سرورق بہت عمدہ رہا۔ جون ایلیا کے انشائیہ اجلا سے گزر کر اپنی محفل میں پہنچے جہاں محمد مرتضیٰ سب سے پہلے اور ادنیٰ مسند پر بیٹھے نظر آئے، بہترین خط کے ساتھ، بہت مبارکباد۔ رضوانہ قریشی، آپ کے قوی زبان کے حوالے سے جذبات قابل قدر ہیں۔ تاریخی کہانی حسب معمول شاندار اور معلوماتی رہی۔ شیش محل بہترین جاری ہے، کئی مشکلات کے بعد فاروق بھٹی پہنچے تو کیا ہے لیکن مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئیں، جولیت نے ایک مشن پکڑ لیا ہے ڈائری پڑھنے کے بعد۔ وہ تو نواب زادی نکلی، دیکھیں فاروق اور جولیت کب ملتے ہیں؟ ماروی اپنی رفتار سے بھی تیز ہو گئی ہے۔ رخ تقدیر، آخری صفحات پر سلیم فاروق کی بہترین تحریر رہی۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اسد اس جرم سے بچ نکلا۔ کچھ قصور بہر حال اس کا بھی تھا۔ کوہ گراں، مرزا امجد بیگ، بہترین تحریر لے کر آئے۔ خلاف معمول اس مرتبہ کیس کو انہوں نے اپنی دانش سے عدالت سے باہر ہی نمٹا دیا۔ مختصر کہانیاں بھی لا جواب رہیں، خصوصاً پھر یاد آئی آف طاہر مغل۔ شعروں کا انتخاب بھی خوب رہا، خصوصاً ثانیہ کاظمی، ناہید اختر اور رعنار ضوی کا انتخاب کمال کا تھا۔“

بینش صدیقی، حیدر آباد سے چلی آ رہی ہیں ”میں آپ کی اس بیاری بزم کی غنی ساتھی ہوں اور سہنس دا بجسٹ کی بھی غنی قاری (خوش آمدید) جی ہاں اگست 2016ء کا شمارہ میرا پہلا شمارہ ہے۔ 2 اگست کو مجھے ایک ضروری کام سے زرین آفریدی کے گھر جانا پڑا تو محترمہ یہ ڈائجسٹ پڑھ رہی تھیں اور میرے آنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ میں نے سوچا اس سہنس ڈائجسٹ میں ایسا کیا ہے جو زرین





صاحب کو میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ میں نے اچانک وہ ڈائجسٹ ان کے ہاتھ سے اچک لیا اور اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ گھر جا کر پڑھا، اس ڈائجسٹ کی کیا تعریف کروں، بس یہ ثبوت کافی ہے کہ میں اس محفل میں حاضر ہوں۔ (بہت شکر ہے۔ اب یہ غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے) پاکستان کا نمبر ون اسٹوریز کا مجموعہ ہے سسپنس ڈائجسٹ۔ یہ الیکٹرونک میڈیا کا دور ہے لیکن رسالے پڑھنے کا اپنا مزہ ہے، پھر اس دوستوں کی محفل کی کیا بات ہے بہت ہی منفرد، ساتھ ساتھ ہماری اردو بھی ٹھیک ہوتی ہے۔ دیکھیں اب کون کون مجھے ویکم اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ابھی مجھے اسٹوریز پر تبصرہ کرتا نہیں آتا لیکن سیکھ جاؤں گی پھر ایک دن صدارت پر قبضہ ہوگا، انشاء اللہ۔ فی الحال تو صرف سلسلہ وار کہانیاں پڑھی ہیں اور لاسٹ کہانی۔ سلسلہ وار کہانیاں تو گزشتہ اقساط پڑھ کر مجھے آگئیں، دونوں داستان بہت دلچسپ ہیں۔ ماروی اور شیش محل اب ان کی وجہ سے تو لازمی خریدنا پڑے گا۔ رخ نقد پر پڑھ کر تو بہت مزہ آیا۔ اللہ پاک جب کسی پر مہربان ہوتا ہے تو چھپر پھاڑ کر نوازتا ہے جیسے کہ اسد کو دیا۔ سر سلیم فاروقی صاحب نے بہت سی ٹیپتوں سے پردہ اٹھایا۔ محفل شعرو سخن بھی بہت خوب صورت ہے۔ تمام اشعار معیاری اور منفرد ہوتے ہیں۔ زریاں سلطان، محمد صفدر محادیہ، رمضان پاشا، مرزا گل، جاوید اختر رانا، محمد قدرت اللہ کے اشعار بہت پسند آئے۔“

رانا بشیر احمد اپاز، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”خلاف معمول اور خلاف امید تبصرہ کا شمار اس دفعہ سب ریکارڈ توڑتے ہوئے 13 اگست کی ایک سہانی سی خوب صورت شام کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل گرل کی سرگئیں آکھیں یقیناً ہماری راہ بے تابی سے دیکھ رہی تھیں مگر سرورق پہ دامیں طرف موجود پانچ عدد آکھیں کسی سیکوریٹی کمرے کی طرح ہمیں واضح کر رہی تھیں تو اس لیے صرف حسینہ کے شانگہ پر پل ڈریس کو سراہتے ہوئے اپنی محفل یاراں کو رونق بخشی جہاں پر محمد مرتضیٰ بھائی جھنگ سے وکٹری اسٹینڈ پر راجا اندر بنے بیٹھے تھے۔ بہت مبارکال جناب، عمدہ تبصرہ رہا آپ کا۔ محمد صفدر محادیہ بھی خوب صورت تبصرے کے ساتھ جان محفل بنے رہے۔ مرزا گل بھی اپنے کھٹے بیٹھے انداز کے ساتھ نظر آئیں۔ غلام یاسین ٹائٹل گرل سے نظریں کیوں چرائیں؟ کیا آپ ان کی کمپنی لے کر بھاگ گئے تھے؟ بہر حال ویکم بیگ۔ باقی تبصرہ نگار بھی خوب رہے لیکن طاہرہ بھگوار سب پہ بازی لے گئیں۔ بہت اچھا اور دلکش تبصرہ رہا۔ الیاس سیتا پوری تنگ و ناموس کی داستان لے کر آئے۔ زبردست انداز ہیاں، چاندرا کر داز نگاری۔ انتہائی خوب صورتی کے ساتھ ہمیں تاریخ سے آگاہ کیا۔ محفل اعظم صاحب کی پھر یاد آئی کہ اگر اسٹوری آف دی ملٹھ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ندیم نے ٹائٹل گرل کی بے لوث محبت کو بے دردی سے ٹھکرایا تو انجام نامکمل کی صورت میں نکلا۔ سسر مرگ پہ کام بھی وہی بچا آیا۔ جسے گوشت کا لوتھڑا سمجھ کر چھوڑ دیا تھا لیکن رابان نے اپنا فرض ادا کر دیا اور بیٹی نے بھی وقا کی مثال قائم کر دی۔ شیش محل میں فاروق اینڈ کمپنی کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں اور جب بڑی مشکل سے بمبئی پہنچا تو جو لیٹ حیدر آباد چلی گئی۔ اسپیکر وکرم کی وجہ سے رامو اور جانی ڈرائنگ روم کی سیر کرنے پر مجبور ہو گئے مگر آخر میں رامو نے چالاکی سے کام لے کر اپنی گلو خلاصی کرائی۔ ربن دادا شائیک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ جو لیٹ اپنی ماں کا بدلہ لینے کے لیے سرگرم ہو گئی ہے۔ ہلا اب فاروق کی ہٹ لسٹ پر آگئی ہے۔ بیگ صاحب اس دفعہ کافی مختلف انداز میں عدالت سے باہر ہی کیس حل کرتے نظر آئے۔ وصی شاہ اور سٹلی کو ڈیل کرنے کے ساتھ بیگ صاحب نے مراد کا بھلا کر دیا اور عزت کی نوکری کے ساتھ نیک شریک حیات بھی مل گئی۔ زمانے کی قسم انسان خسارے میں ہے۔ لڑو یا اعجاز کی بہترین کاوش۔ مبارک علی نے دوسری شادی تو کر لی مگر پہلی اور بچی کے حقوق ادا کرنے میں کسر ناکام رہا اور انسان سے درندہ بن گیا اور زندگی کی انتہا کر دی۔ دوسری طرف سکینہ نے وقاداری اور محبت کی مثال قائم کر دی۔ بیٹی کا قتل صحاف کر کے بھی وسم اور الیاس کو سگی ماں کی طرح پالا۔ مبارک آخر میں اسی کوٹھری میں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔ لاجس کو لا ڈاکٹر شیر شاہ سید کا ایک اور شاہکار۔ ڈاکٹر صاحب کافی عرصے بعد آئے لیکن دھوم چا دی۔ زبردست کہانی رہی۔ منظر امام صاحب غیر ملکی کہانیاں سناتے نظر آئے۔ بہت ہی سبق آموز کہانی رہی۔ منظر امام سے گزارش ہے کہ استاد ترائے عالم کو منظر عام پہ واپس لائیں۔ محبوب الہی، حضرت نظام الدین اولیاء کی ایمان افروز داستان پڑھ کر دل منور ہو گیا۔ مگر دوسرے حصے کی آمد کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ ضیائیم بگرامی کا انداز بہت زبردست ہے۔ ماروی بہت قاسٹ ہو گئی ہے۔ عالی دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے اور ان نون تنک نیلماں نے اسے پہنچا دیا ہے۔ مراد بھی ان ایکشن ہے۔ نصی ماروی بھی عجوبہ ثابت ہو رہی ہے۔ آب حیات ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی بہترین کہانی رہی۔ پروفیسر صدیقی آخر کار اپنے اصول پہ قائم رہتے ہوئے کامیاب رہا اور اپنے آخری ناول کی وجہ سے امر ہو گیا۔ آخری صفحات کی کہانی کوئی خاص رنگ نہ چھوڑ سکی۔ باقی مغربی کہانیاں بھی مناسب تھیں۔ محفل شعرو سخن میں سیدہ ثانیہ کاظمی، مسز صفدر محادیہ، مرزا گل، اور مدحت کا انتخاب پر ہٹ رہا۔“ (تبصرہ کافی دلچسپ رہا)

مرزا گل، درابن سے شریک محفل ہیں ”سب سے پہلے تو آپ کے لیے اور آپ کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو ہوں جو ہر ماہ ہمارے لیے اتنی بے ساختہ خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ جس کا کوئی مول نہیں..... (بہت نوازش ہے آپ کی) اس بار تبصرہ کا شمار 17 کوٹلا۔ ٹائٹل واقعی بہت سدر تھا۔ ٹائٹل کی حسینہ سمیت پانچ عدد دلکش عیناں..... فوراً ہمیں ویکم کرنے پہنچ گئیں۔ مگر ایک سحر انگیز جاوہری آنکھ تو ان سب سے تیز نکلی اور فوراً ہم پر جا دوسا کر دیا۔ خوب صورت فہرست میں طاہر جاوید مغل کا نام دیکھ کر طبیعت بارخ و بہار ہو گئی۔ جون ایلیا کو پڑھ کر محفل میں پہنچے۔ جہاں اپنے تبصرے سمیت سب کے تبصرے پڑھ کر بھی جی نہ جا سکا کہ لڑو تبصرے کریں۔ بے اختیار جی میں آیا کہ مریم کے خان اینڈ کاشف





ذہیر صاحب کو ڈسٹس کر لیں جو بھولے نہیں بلکہ اور بھی شدت سے یاد آتے ہیں۔ ان کے بغیر فہرست ادھوری ادھوری ہی رہتی ہے۔ کاشف ذہیر صاحب کی لازوال تحریریں نہ بھولنے والی جن کے الفاظ کاغذ پر بیٹھے نہیں بلکہ اڑتے پھرتے تھے تخیلوں کی طرح۔ انوکھا انداز، خوب صورت لب و لہجہ، اچھوتا خیال، تصوف اور ذہانت..... اف میرے احساسات مجھے لکھنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ مریم کے خان کہاں گم ہیں آپ..... مریم جی کبھی پلٹ کر ہی دیکھ لیجیے۔ کاشف ذہیر صاحب کے بعد ہم کب سے آپ کے شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ ہر بار نظریں ناکام آ جاتی ہیں آپ کا نام پڑھے بغیر۔ آپ کی کہانیاں میری جان ہے۔ رب ذوالجلال آپ کی تمام مشکلات دور کر دے۔ آمین۔ تاریخی داستانیں پڑھتے ہوئے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمارے ہر ذور اور کلمہ، کیا ہمارے ملک کی موجودہ صورت حال کی حقیقی عکاسی سیاسی صورت حال کا پردہ بھی کھلی چاک کر سکیں گے؟ کیا ہمارے موجودہ حالات کی تاریخ بھی کوئی محفوظ کر رہا ہوگا؟ کیا ہماری داستانیں بھی صدیوں بعد مضر عام پر آئیں گی؟ پھر یاد آئی۔ طاہر انکھ کی کہانی میں بات چچی تاثیر اور گہرائی کی ہوتی ہے۔ ایک ذہیر دست تحریر تھی۔ اپنے تو پھر بھی اپنے ہوتے ہیں۔ جیسے سٹس ہمارا اپنا ہے۔ طاہر انکھ کو سلام۔ شیش محل سے سیراب ہوئے۔ نہیں سیراب تو اس وقت ہوں گے جب ناول مکمل ہوگا۔ اس کا دوری کے قلم میں اس دفعہ کافی ایکشن تھا۔ اچھا ہے ماروی کب قربانی دے رہی ہے۔ ذویا اعجاز کی ایک جگہ بھی کھا پڑی جس نے آخر میں رلا دیا۔ حضرت میں ڈیڑی کا بروقت فیصلہ اچھا لگا۔ مضر امام کی کہانی میں ایک چھاپہ پیغام تھا۔ شکر ہے کسی کا تو اچھا انجام ہوا۔ بھٹی صاحب کی تحریر ہمیں بھی کہانی کی صورت میں آپ حیات پلا گئی۔ ویلڈن جناب۔ آخری گلاس ایک ذہانت سے بھرپور تحریر تھی۔ حرہ دے گئی۔ شیر شاہ سید بہت عرصے بعد آئے ہیں اور چھانگے ہیں۔ اب گم نہ ہو جائے گا۔ کوتاہ اندیش میں جیمز کی شکست اچھی لگی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی..... جیسے بھی ہو بندہ پہاڑ تلے آ گیا۔ امجد بیگ کی کوہ گراں ایک ذہیر دست اسٹوری تھی۔ غیا نسیم بلگرامی صاحب محبوب الہی پر بہت عمدگی سے تحریر کر رہے ہیں۔ آگے کیا لکھتے ہیں انتظار رہے گا۔ آخری کہانی سورج کی شعاعوں کی طرح روشنی بکھیرتی رہی۔ ترت پڑی..... بہترین کردار نگاری ہر کردار اپنی جگہ مکمل اور مضبوط۔ شبوبھی بڑی چالاک تھی۔ ذہیری خود اپنے دام میں پھنسا۔ اچھا ہوا۔ نورین بے چاری پر تھوڑا سا دکھ ہوا۔ اسد پر تو گویا خوش نصیبی کے در مکمل گئے۔ ادارے والوں سے ہلکا سا شکوہ ہے۔ (جی جی آپ کا شکوہ جانتے ہیں۔ نیکی اشعار صاف اور کاغذ کے ایک جانب لکھیے اور اچھے، معیاری اشعار ارسال کیجیے تو ضرور جگہ ملے گی) طاہرہ آغی کی بہنوں والی بات پر سخت خفا ہوئی۔ تیسرا اقبال کچھ طاہرہ آغی کی طرف سے ہماری معافی قبول کیجیے۔ دوپہر کے 4 بجے جب لڑکھ رہے تھے تو اندازہ نہ تھا کہ اتنی شدید آمدنی طوفان آئے گا لہذا کب لیا اور اب بارش کے بعد کا مظر لکھ رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے بارش دیکھی تھی مگر ایسی طوفانی دو گھنٹے والی بارش۔ کئی غریبوں کے مکانوں کی چھتیں گر گئیں، چالور موٹی ہلاک ہوئے۔ فصلیں تباہ ہوئیں۔ درخت اونچے پڑے تھے۔ ہم نے پچھلے تبصروں میں لکھا تھا کہ درابن کا موسم اکثر دوپہر کے وقت سہانا ہو جاتا ہے مگر اس مرتبہ سہانا نہیں بلکہ ظالم تھا۔ جس سے کئی دیہات لپیٹ میں آئے جہاں دیہاتوں میں ہر وقت لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے، وہاں بارش نے بجلی کا نظام درہم برہم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تمام طوفانوں، سیلابوں اور زلزلوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اس دفعہ سارا شمارہ ایک ہی دن میں چاٹ لیا تھا، اتنے مزے کا جو تھا چٹ پٹا..... اس دفعہ سارا شمارہ ہی بیسٹ رہا۔ اے سی والی کترین سمیت..... حیرانی ہے کہ پہلے بھی اتنی تیز رفتاری نہیں رہی تھی پڑھنے میں دن کو کئی پڑھتے تھے اور رات کو بھی حالانکہ اس دفعہ دن اکیلا تھا پڑھنے کو بے چارہ..... البتہ رات کو تبصرہ لکھ لیا۔ اگلے پلیئر ڈائجسٹ کے صفحات کچھ بڑھا لیجیے۔ اتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ۔ فی الحال صفحات بڑھانا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ہی سہولت ہوئی، آپ کی تجویز پر غور کیا جائے گا)

✽ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے محفل میں شریک ہیں ”سروق کو نہایت ہی خوب صورت ماڈل سے رونق بخشی مئی ساتھ ہی بہت سی انسانی آنکھیں بھی سروق کا حصہ رہیں۔ جون ایلیا محترم کے اہلکار کچھ بچے، بچا فرمایا کہ الٹا تیار داروں کو ہی سب کچھ بھگتنا پڑے گا اگر انسانیت کو اس دکھ سے باہر نہ نکالا گیا تو کل ہم بھی اسی بربادی کا حصہ ہوں گے۔ آپ کے ادارے پر پہنچے یقیناً 6 اور 7 ہماری تاریخ کے انتہائی قابل فخر دن ہیں لیکن یہ گئے دنوں کی بات ہے۔ ادھر عوام بھوک اور قاتلوں سے مر رہی ہے اور ادھر حکومت وفاق سے اجازت مانگ رہی ہے کہ 30 لاکھ ٹن گندم وافر ہے اسے بیرون ممالک بھیجا جائے اور عوام کو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس آٹا خریدنے کے پیسے نہیں کہ آٹا مہنگا ہے۔ اپنی محفل میں آئے تو محمد مرتضیٰ کو صدارت کی کرسی پر براجمان دیکھا۔ بہت اچھا تبصرہ مبارک ہو جی۔ دیکھ لو، ہم تبصرے میں بھی آپ کے پڑوسی بنے۔ رضوانہ بہن اصل میں مجھے دل ہی حساس کا ملا ہے۔ میں اپنے دشمن کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا، دوست اور باقی عوام کی تو بات ہی اور ہے۔ تنگ و ناموس کی داستان، کہانیوں میں ابتدا کی۔ بہت ہی عمدہ تاریخی واقعہ جہاں پر اپنے ہی کشتیاں ڈوبنے کے چکر میں ہیں۔ شیش محل پر پہنچے۔ یہ قسط بھی بہت عمدہ رہی۔ قاروق کا واپس آنا دادا کا اسے کلکتہ کا پروانہ تھما دینا لگتا ہے۔ قاروق کی قسمت میں ابھی بھی نہیں لکھا جو لیٹ بھی اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ اگلی قسط کافی انٹرسٹنگ ہوگی۔ ماروی کی تلاش میں ماروی تک پہنچے ازل سے ابد تک خیر و شر نے اکٹھے چلنا ہے۔ عالی، مراد، ہم زاد، ماروی خیر کے حامل تو ان تو ان اور اس کے ساتھی شر کے بہر حال جیت ہر دور میں خیر کی ہوتی ہے، کافی بہترین قسط تھی۔ بیگ صاحب کی کوہ گراں اس دفعہ یہ کیس بہت ہی الگ باقی کیسوں سے کہ بیگ صاحب نے ایک لڑکے کو سیدھا راستہ دکھایا اور وہ کامیاب بھی رہا۔ رخ تقدیر سلیم قاروقی کے قلم سے اسد نے بھی سوچا بھی نہ ہوگا جو کچھ تقدیر نے اس کو دیا۔ نورین کی موت کا دکھ ہوا پڑھیری کی گردن میں ٹھیک پھندا تھا ہوا۔ شبوبھی لائری لگ گئی۔ محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی، باقی تمام کہانیاں اور کتر نہیں بھی اچھی تھیں۔“





اور ایس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے تشریف لائے ہیں۔ "مجموعہ سسٹمز" کو ناگوار نہیں ہے مگر میں تھا اور سرورق ڈاکر صاحب کے مطابق اپنا آپ منوار ہا تھا اور حسین سرورق سادگی کا حسین احراج لیے ہوئی تھی۔ انشاء میں جون ایلیا کی حکمت کی کمرانی تھی مگر افسوس آج کے دور میں انسان حد سے زیادہ بے حس ہو گیا ہے۔ علم و حکمت کی باتیں سر سے گزر جاتی ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی افسوس ناک واقعہ پذیر ہو جاتا ہے تو وقتی اثر کے بعد پھر وہی اڑی بے حس جو انسان کے خیر میں شامل ہے۔ انشاء کے بعد اپنی محفل میں آئے، ادارے سے مستفید ہوئے پھر اپنی محفل کے مخلوط کا احاطہ کیے محمد مرثی کا خط نظر آیا سو مبارکباد۔ جہاں سارے نئے پرانے سسٹمز کے تبرہ لگا نظر آرہے ہیں، سب ہی دوستوں کو پُر خلوص سلام۔ سب سے پہلے تاریخ کے جھروکوں میں داخل ہوئے اور الیاس بیٹا پوری کی تنگ و ناموس کا مطالعہ کیا۔ زبان و بیان کی ادائیگی الیاس بیٹا پوری کا خاصہ تھا۔ ان کی لکھی ہوئی ہر تحریر ایسی ہے جو لکھنے والے کو مہبوت کر دیتی ہے۔ اس لیے کے بعد اس کا قاری کی شیش محل پڑی جو یقیناً ایسی تحریر ہے کہ بس پڑھتے جاؤ، پڑھتے جاؤ۔ طاہر جاوید مغل کی پھر یاد آئی، ایک متاثر کن تحریر تھی۔ مختصر تحریر انسانی خمیر کو چھوڑ دینے والی کہانی تھی۔ رشتوں میں جو آج کے دور میں دوریاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں، وہ ایک لمحہ لکھ رہے ہیں۔ افسوس رشتوں سے بے حس کا برتاؤ کرنے والے شاید بھول جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی ایسی برتاؤ ہو سکتا ہے جو انہوں نے رشتوں کے حوالے سے حق تلفی کی۔ جیسا کہ عدیم نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کیا مگر یہ شاید اس کی کوئی اپنی زندگی میں کی گئی تھی کہ آخر عمر میں جب ہر رشتے منہ پھیر لیتے ہیں تو اس کے بچوں نے اس میں دوبارہ جینے کی امنگ پیدا کر دی۔ آخری گلاس بھی پڑا کر کہانی تھی۔ بیچ بیچ میں اقوال زیریں پر مشتمل کتروں نے بھی آگہی کے درواکے محفل شعر و سخن میں بھی اچھے اور معیاری اشعار نے لطف دو بالا کیا۔ پھاڑ تلے اور لاجس کو لا بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ذویا اعجاز کی خسارہ بھی پسندیدگی کا خضر لیے ہوئے تھی۔ حفریت بھی اپنے اعزاز کی اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد برصغیر کے ایک بہت مشہور ولی اور اپنے سلسلے کے پیشوا حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زندگی کے حالات، واقعات نے قلب کو روشنی سے معمور کیا۔ بلاشبہ محبوب الہی بہت پائے کے بزرگ تھے اکثر سلاطین نے بھی ان سے بہت فیض پایا۔ آپ حیات اور آخری کہانی ربخ نقد پر بھی بہت پسند آئیں۔ تمام دوستوں کو بہت بہت سلام اور عید الاضحیٰ کی بہت بہت مبارکباد۔" (آپ کو بھی خیر مبارک)

رمضان پاشا، مجلس اقبال، کراچی سے شریک محفل تھے۔ آپا..... اس بار اس حقیر فقیر کا نام بلیک لسٹ میں سرفہرست نظر آ رہا ہے، بڑی خوشی ہوئی دیکھ کر اور پڑھ کر۔ پرانا قاری ہونے کے باوجود ابھی میں محفل کتب ہی ہوں۔ (بس..... ہو گیا نا چنانہ لبریز..... اب یہ بتائیے کہ کبھی بھی بلیک لسٹ میں نام آ جانے سے کوئی شان تو نہیں گھٹ جاتی نا.....) ستمبر 2016ء کے سسٹمز کا سرورق پسند نہیں آیا، البتہ بس دورق کے اشتہار کی حسینہ خوب تھی۔ انشاء میں جون صاحب ابتلا میں جلتا تھے۔ آپ کے خط میں اول نمبر پر آنے والے مرثی صاحب کو مبارکباد۔ موصوف کا تبرہ طویل اور پھر پور تھا۔ اشعار کی محفل میں صادق معاویہ، مایین فاطمہ، وسیم اکرم، مرزا طاہر الدین بیگ کے اشعار قابل تحسین تھے۔ اس دفعہ غیر ملکی کہانیوں میں آخری گلاس پہلے نمبر پر ہے۔ طبع زاد کہانیوں میں آپ حیات نے کافی متاثر کیا اور رخ نقد پر تو اس ماہ کی بہترین کہانی تھی، کافی حیرت یاد رہے گی۔ منظر امام صاحب کی غیر ملکی کہانیاں بھی خوب تھیں۔ خسارہ بہت ہی اثر انگیز کہانی تھی، مبارک کا انجام بہت ہی دردناک تھا اور وہ اسی کا شوق تھا۔ حفریت، اس کہانی پر میں کوئی تبرہ نہیں کروں گا۔ لاجس کو لایہ سرے سے کوئی کہانی ہی نہیں تھی، یہ تو ایک معلوماتی فیچر یا کوئی آرٹیکل قسم کا مضمون تھا، بہر حال تھا دلچسپ۔ پھر یاد آئی، مغل صاحب نے آخر میں رلا ہی دیا۔ اس ماہ شیش محل اور ماروی میں جس اور سسٹمز کوٹ کوٹ کر بھر دیا، آ کے کیا ہوگا؟ کوٹا اندیش کہانی جتنی مختصر ہے اتنی ہی خوب صورت بھی ہے۔ پھاڑ تلے بھی بہت پُر لطف کہانی تھی۔"

محمد شہباز ناز، سرگودھا سے تبرہ کر رہے ہیں۔ "میں بہت خوش ہوں اپنا اور اپنے دوست کا نام رسالے میں دیکھ کر (ایسی خوشی ہم بانٹتے رہتے ہیں) ناٹل گرل بہت خوب صورت تھی جامنی کپڑوں کے اوپر پیلا دوپٹا گلے میں ڈالے، کانوں میں سونے کی بالیاں، وہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی خاص کر اس کی آنکھیں بہت اچھی لگیں ہاں کے بعد جون ایلیا کا انشاء پڑھا تو حقیقت سامنے آ گئی۔ واقعی آج انسان دنیا کی رنگینیوں میں اس قدر مصروف ہو گیا ہے کہ اس کو ساتھ والے ہمسائے کی خبر ہی نہیں۔ جس طرح ہمارے نئی، اپنے پڑوسی کی خبر گیری کرتے اسی طرح ہمیں بھی اپنے نئی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے اللہ ہمیں توفیق دے (آمین) الیاس بیٹا پوری کی کہانی تنگ و ناموس کی داستان پہلے کی طرح اس بار بھی قابل تشریف تھی۔ میں تو ان کا فہم ہو گیا ہوں۔ ذویا اعجاز کی کہانی خسارہ عبرت ناک کہانی تھی۔ مبارک بہت مغرور تھا اگر وہ نیلہ کو اپنی بیٹی سمجھتا۔ اس کا علاج کروانا تو اس کی بیوی سکینہ یوں اس کو بددعا نہ دیتی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ "جیسا کرو گے ویسا بھر دے۔" شرمیاس کی حفریت عمدہ کہانی تھی۔ مرزا احمد بیگ کی کوہ گراں کہانی، اس بار ایک انوکھا کیس لائے۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی پھر یاد آئی، ایک چونکا دینے والی کہانی تھی۔ محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ پڑھا تو دل میں سکون آ گیا۔ اللہ پاک ان نیک بندوں کی دعا سے ہم سب کی مشکلیں آسان کرے۔ تمام دوستوں کے تبرے بہت اچھے تھے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔" (بہت شکریہ جناب)

منز صدیقی، مجلس اقبال کراچی سے تبرہ کر رہی ہیں۔ "سسٹمز میں میرا خط چھپا بے حد خوشی ہوئی۔ یہ میرا پسندیدہ پڑچ ہے۔ اسیر خیال کا شرف زہیر کی بہترین کہانی ہے۔ ایسی تحریریں پڑھنے کو اب کہاں ملیں گی۔ قدرت اللہ بخشنے نے سچ کہا ہے اگر آپ ان کی تحریریں



## ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

### ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

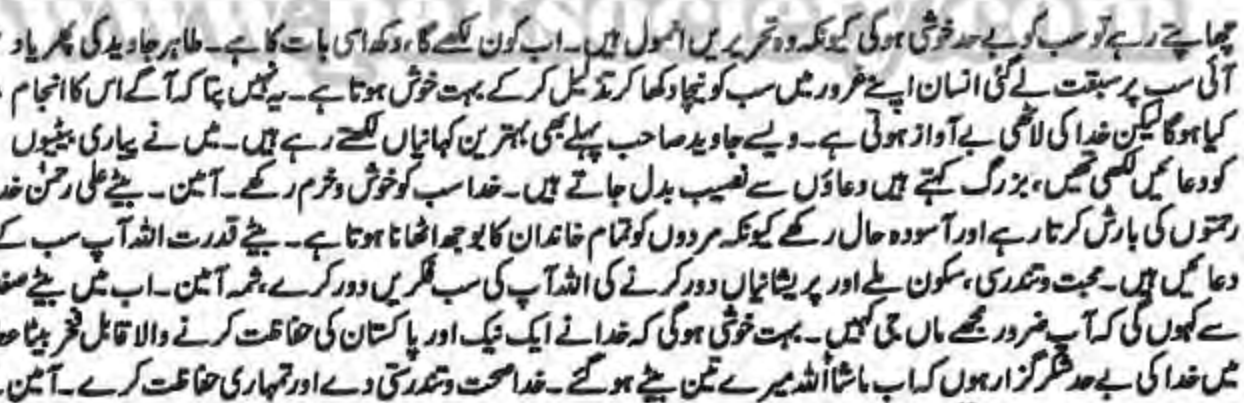
محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے [abbasnadeem283@gmail.com](mailto:abbasnadeem283@gmail.com)





سید عبادت کاظمی، ذریعہ اسامیل خان سے شریک محفل ہیں۔ ”سپنس“ سے ہمیں متعارف کروانے والے دوست نہ جانے زندگی کے میلوں میں کہاں کم ہو گئے ہیں لیکن ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے پڑھنے کے لیے اتنا اچھا پلیٹ فارم میسر کیا۔ 20 اگست کو سپنس ہمارے ہاتھوں کی زینت بن چکا تھا جس سے ہمارے من میں لذو پھوٹ رہے تھے۔ ٹائٹل گرل کی مسکراہٹ دل میں اتر گئی اور مسکراتے چہروں پر تو ہم ویسے بھی فدا ہیں۔ دجسی دجسی مسکراہٹ دل کے تار جھیر مٹی..... جون ایلیا کی باتیں سبق آموز ہوتی ہیں کوئی اگر سمجھے تو..... اپنی کھٹی کھٹی محفل میں بنا شریت بانی کے انٹروی دی کیونکہ گرمی کے اثرات کم تھے۔ مجھ مرتضیٰ بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ لیڈ کر رہے تھے۔ جناب کا تبصرہ سرا ہے جانے کے لائق تھا۔ بھائی یہ زندگی دکھوں اور خوشیوں کا احراج ہے سو ہم بھی بھی خوشی بھی غم کے موڈ میں نظر آتے ہیں۔ اپنے علاقے کی مرا حائل روئیں باقی نظر آئیں اورے ہمارا حصہ کہاں ہے۔ تاریخ پر مٹی کہانیاں سحر طاری کر دیتی ہیں۔ ننگ و ناموس کی داستان الف سے لے کر ی تک زبردست کہانیوں میں سے ایک تھی۔ گوشت کے کردار کی کچھ خاص سمجھ نہیں آتی۔ شیش محل کی تعریف کرتا تو میرے بس کی بات نہیں پھر بھی کوشش کرتے ہیں۔ پارو اور اکبر کی محبت کیا رنگ لائے گی۔ موجودہ قسط میں چاند بانو کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ نکلی ہی محسوس ہوئی۔ جولیت باپ کی کھوج میں نکل پڑی۔ مرحوم نواب صاحب کی ماروی لگتا ہے اختتام کی جانب رواں ہے۔ مرزا امجد بیگ اس وقت ڈیفرنٹ کیس لے کر آئے۔ مراد کو سدھار دیا گیا لیکن کچھ خاص حرفہ نہیں آیا۔ کہانی میں اتنا سپنس نہیں تھا۔ آب حیات آہ..... کیا خوب لکھا بجٹی صاحب نے الیاس احمد واقعی زندگی بھر کی حیات پا گیا آب حیات لکھ کر۔ کہانی کے اینڈ نے اداس کر دیا۔ اپنی جاتی پہچانی تجرہ نگار دیا اعجاز کی کہانی خسارہ ان کے چمکتے قلم کا منہ بولنا ثبوت تھی۔ مبارک گناہ کر کے خسارے میں رہا۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ رخ تقدیر اس قدر زندگی کے فرسودہ حالات میں الجھار ہا اور آخر کار منزل پالی۔ مجموعی طور پر ابھی کہانی تھی۔“

عبدالنجار رومی انصاری، چوتھک سٹی، لاہور سے محفل کی زینت بن رہے ہیں ”خوب صورت و شیراز کا خوب صورت انداز اور زرد آنچل سے رکھا، کھنی زلفوں کو آزاد، چوری چوری سے دیکھتی کئی آنکھیں شاہکار..... مگر وہ ہے حسن مجسم ان سب سے بے نیاز۔ اور بے نیازی ہر جگہ بھی کام نہیں کرتی جیسے کہ جون ایلیا جی فرما رہے ہیں کہ کچھ اپنی بھی پروا کیجیے اور ہلاکتوں میں پڑنے سے بچ جائیے اور بیماریاں صرف جسمانی ہی نہیں اور بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں اور اس وقت سب سے بڑی بیماری ہمارے ملک کو درپیش ہے جس میں کرپشن، لوٹ مار اور دہشت گردی سرفہرست ہے جو کسی ناسور کی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے اس بیماری کا ٹھیک سے علاج ہو جائے تو ہمارا ملک مکمل صحت مند ہو جائے گا۔ محمد رفیق کا امید افزا بھرپور تجربہ لائق تحسین ہے۔ مبارک ہو بھئی۔ آہ..... مفرد معاویہ بھائی پاکستان بنانے کا مقصد جانے کہاں گم ہو کے رہ گیا ہے۔ شکر یہ رضوانہ آپ کی آپ کا تجربہ بہت ہی اچھا لگا۔ مرزا گل کی معاونت بھی کمال کی رہی۔ آپ نے شیش محل کی طرف چھلانگ لگائی تو جو لیٹ فاروق کے آنے سے پہلے ہی بمبئی چھوڑ گئی۔ دیکھ لو وہ بھی نواب زادی نکلی اور نواب اسد اللہ سے اپنی ماما کا انتقام لینے پہنچ گئی۔ فاروق اور ربین دادا بھی مل گئے۔ لگتا ہے عدالت جانے کے بعد ربین اور پولیس افسر وکرم کا جوڑ پڑے گا جو جھٹلے کر آنکھیں پھیر گیا تھا۔ داستان رزم و بزم سے تنگ و ناموس تک پہنچ گئی اور آپ نے ٹھیک کہا مسلمانوں کی بربادی بھی انہوں کی وجہ سے ہوئی تھی اور خوش فہمی کا مارا خلیفہ بھی ہلاکو کے ہاتھوں تاراج ہونے کو ہے۔ باقی ورد داغ اور علیہ کا حق تو خوب دیکھی کا حامل ہے۔ محمد قمر صائم، غلام یاسین لوناری تو کافی عرصے بعد نظر آ رہے ہیں۔ لوبی لگتا ہے میرا خط تو اس دفعہ کہیں راستے میں ہی رہ گیا۔ طاہرہ گھڑا پہلے ہی کہہ رہی تھیں اب دیکھیں گے شادی کے بعد بھی تجربہ کتنے ہیں کہ نہیں۔ بھئی میں نے تو لکھا تھا پتا نہیں لیٹ ہو گیا پھر..... بھلا سہنس سے بھی نانا ٹوٹ سکتا

18 اور 19 اگست 2016ء کی درمیانی شب جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لہتی خیال کے شوہر اور معروف مصنف محترم مختار آزاد رضائے الہی سے وفات پا گئے۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم متعدد سرکاری و نیم سرکاری ادارے، این جی اوز اور افراد کو اپنے ہنر سے فیض یاب کرتے رہے۔ مختار آزاد اچھے کہانی کار اور مترجم تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے، ادارہ ان کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ آمین۔





بے بسی بھی نہیں۔ انشاء اللہ ساتھ ساتھ رہیں گے..... واہ زبردست بیگ صاحب نے اس دفعہ کوہ گراں کو بھی کیا اور مراد سے گرایا بھی تبھی تو کامیابی نے قدم بھی چوم لیے نا..... محبت کی دیوی ثانیہ نے بیمار ہوتے ہوئے بھی ایسی اولاد پیدا کی کہ اسے طلاق ہونے کے بعد حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی اس کی تربیت کا حق ادا کر دیا اور ڈاکٹر آیان احمد کی صورت میں اپنے باپ ندیم کو گروہ دینے پر محبت کا حق ادا کر دیا۔ پھر یاد آئی، ایک بہترین کہانی رہی۔ امریکا میں نہ تاریخ نہ زبان نہ کچھ صرف دوسری اقوام کو محکوم بنانے کی خواہش ہے یا بلو اور الوریجنا بھی ایسے ہی سماج پر کڑھتے رہے اور شادی بھی نہ کر سکے اور لاجس کو لای ان کی یاد بن کر رہ گیا۔ صفریت میں کم شدہ عورتوں کی وجہ سے بیڈن کی شخصیت پر اسرار ہو گئی اور کہانی میں بھی ڈراؤنا تاثر پیدا کیا گیا البتہ کوئی دہشت انگیز سن سانسے نہیں آیا۔ میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں اور موت سے خائف نہیں ہوں۔ مرحوم الیاس صدیقی نے آب حیات لکھ کر خود کو امر کر دیا۔ بابا نظام ہم نے جہیں ہندوستان کی ولایت اور خلافت دی، بابا فرید گنج شکر کی محبت میں رہنے والے حضرت نظام الدین اولیاء نے عظیم مرتبہ قائم کیا اور ہندوستان کے خواص و عام ان کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ حضرت نظام الدین کی ایمان افروز اور دلچسپ تحریر بہت اچھی لگی۔“

مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے شریک محفل ہیں ”آپ کے خط..... طاہرہ نگرار کا بڑا جامع تبصرہ اور مرتضیٰ مسند صدارت پر، اچھا لکھا۔ تاریخ کے جھروکوں سے شہزادہ ابوبکر، ورداغ، علیہ اور استاد شمس الدین تنگ و ناموس کی داستان میں خوب رنگ بجا کر گئے۔ طاہر جاوید مغل پھر یاد آئی اور خوب آئی، اس کا قدوری کا شیش محل برق رفتاری کی طرح بڑھ رہا ہے اور خوب دلچسپ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ اب انجام دیکھیں، شیش محل کا کیا ہوتا ہے۔ یہ جگمگا تا رہتا ہے یا ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ سلیم فاروقی صاحب رخ تقدیر بڑا زبردست افسانہ لے کر آئے۔ پلاٹ زبردست انداز بیان اور بھی شاندار اور کردار جواب نہیں۔ خاص طور پر آفتاب، نورین، زبیری اور اسد، کیا خوب کہانی میں رنگ بھر گئے کہ لطف آ گیا۔ زویا اعجاز کی کہانی اپنے اندر کرب اور درد لیے ہوئے سسپنس کے اوراق پر اس طرح بکھری کہ دل کو بہت بھائی۔ خسارہ کس کا تھا، مبارک علی کا یا سکینہ کا؟ وکیل صاحب کا ایک اور زبردست کارنامہ۔ کس طرح انہوں نے ایک کارنامہ انجام دیا اور مراد جیسے کوئٹہ راہ دکھادی۔ قدوس صاحب کا بھی جواب نہیں اور جواب ان کا بھی نہیں، جن کے شعر زبردست ہوتے ہیں۔“

مہتاب احمد کی حیدر آباد سے پہلی کوشش ”میں تو ہم پرانے قاری نہیں لیکن کئی ماہ سے سسپنس کا مطالعہ کر رہے ہیں اور دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ ہم بھی خطوط کی محفل میں حاضری دیں۔ پرہت نہیں ہو پار ہی تھی لیکن پھر سوچا کہ کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ سو علم لے کے بیٹھ گئے خط لکھنے۔ اب دیکھیں کہ ہمارا خط شامل محفل ہوتا ہے کہ نہیں کیونکہ پتا نہیں ہمارا انداز تحریر ٹھیک ہو یا نہیں۔ بہر حال ہم بہت کر کے لکھ رہے ہیں۔ ماہ تبصرہ کا شمار ملا۔ ناچل کچھ خاص پسند آیا۔ اس کے بعد انشائیہ پڑھا۔ کیا خوب لکھا ہے جون ایلیا صاحب نے۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں پہنچے۔ تمام لوگوں کے خطوط اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر صاحب کی کہانی پڑھنے بیٹھے۔ بہت ہی عمدہ کہانی لکھی طاہر صاحب نے۔ واقعی جو انسان رشتوں کی ناقدری اور حق تلفی کرتا ہے اس کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ندیم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تاہم اس کے بیٹے نے اپنا فرض ادا کر دیا اور باپ کی زندگی کی امید بن گیا۔ بہت زبردست کہانی تھی۔ اس کے بعد تاریکی کہانی میں انٹری دی۔ کیا منظر نگاری ہے۔ کیا انداز بیان ہے۔ الیاس بیٹا پوری کا لکھنے کا انداز سب سے جدا تھا۔ تاریکی کہانی میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ورداغ بے چارہ علیہ کے چکر میں در بدر کی شو کریں کھا رہا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کی صف میں موجود غدار مسلمانوں کو ختم کر دینے کے لیے ہر حربہ آزمایا ہے ہیں۔ کہانی اپنے اندر ایک گہرائی لیے ہوئے ہے۔ پڑھ کے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ہم بھی اسی کہانی کے کوئی کردار ہیں۔ پھر ہم نے ماروی کی طرف دوڑ لگائی۔ ماروی کا ٹیپو بہت تیز ہے لگتا ہے کہانی بھاگی جا رہی ہے۔ اسی لیے کہانی کا مزہ توڑ اساکر کر رہا گیا ہے۔ کردار جاندار ہیں مگر کہانی میں تیزی اتنی ہے کہ کہیں ٹھہراؤ نہیں آپا رہا اسی لیے سب کردار آپس میں گٹھ جوڑے محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ بہر حال کہانی اچھی ہے۔ شیش محل اب کافی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ کہانی میں نیا موڑ آ گیا ہے۔ فاروق صحت یاب ہو چکا ہے مگر تاحال اس کی جولیٹ تک رسائی ممکن نہیں ہو پار ہی جبکہ ادھر جولیٹ ولد دار آقا سے انتقام کو پس پشت ڈال کر اپنی ماں کا انتقام لینے حیدر آباد کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہے اور نواب سلیم اللہ کی حویلی پہنچ گئی ہے۔ بہت زبردست صورت حال پیدا ہو گئی ہے مگر ہمیں لگتا ہے کہ جولیٹ پر ابھی بہت سے راز افشا ہونے ہیں۔ شاید اس کے باپ کی کچھ مجبوریاں رہی ہوں، بہر حال اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے اس کا قدوری صاحب کہانی کو کون سا موڑ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر شہر شاہ سیدی کہانیاں نہایت منفرد اور سبق آموز ہوتی ہیں جن کو نہایت انہماک سے پڑھتے ہیں۔ کیا خوب منظر کشی کرتے ہیں۔ لاجس کو لایا اچھی تحریر تھی۔ آخری گلاس خوریر ریاض کی بس گزارے لائق لگی۔ کوہ گراں بھی کچھ زیادہ رنگ نہ جما سکی۔ رخ تقدیر سلیم فاروقی کی بہت تیز رفتار کہانی تھی۔ تاہم واقعات میں حقیقت کا رنگ کچھ کم تھا۔ کچھ خاص مزہ نہ دے سکی۔ محضرت کے ساتھ۔ اسد کو کچھ کرنا ہی نہ پڑا اور وہ صاف فٹ لکھا۔ حیرت ہے۔ زویا اعجاز کی خسارہ اچھی کاوش تھی۔ نام نیا ہے مگر کہانی میں دم تھا۔ عبدالرب بھٹی کی آب حیات نہایت ہی عمدہ کہانی تھی۔ معصوف اپنی تحریر کے ذریعے ہمیشہ کی زندگی پائی گیا۔ کیا خوب پلاٹ تھا۔ اثر نعمانی کا نام تو کسی تعارف کا محتاج ہی نہیں۔ ان کی کہانیوں پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پہاڑ تلے زبردست کہانی تھی۔ نیا تنسیم کی محبوب الہی کے واقعات پر تحریر نے ایمان کو نئی تازگی بخشی۔ چھوٹی کہانیاں تقریباً کافی اچھی رہیں۔“

محمد و محاو بیہ بیگ یار خان سے تشریف لائے ہیں ”سسپنس سے دوستی تو بہت پرانی ہے آپ احباب محفل سے ملنے کی جرات





پہلی دفعہ کر رہا ہوں (شکر ہے آپ کو شرکت کا خیال تو آیا۔ خوش آمدید) سہنس پر کسی بھی حوالے سے تبصرہ کرنے سے ڈرتا ہوں، کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ بزم دوستاں تو لا جواب ہے اور جھنگ کے محمد مرتضیٰ (بے وقاف) کری صدارت پر نازاں و فرحان بیٹھے نظر آئے۔ مرتضیٰ بھائی مبارک ہو مگر دیکھ لیتا اگلی دفعہ اس بے وقاف کری صدارت پر کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ محمد صفدر معاویہ، مرزا گل، طاہرہ گلزار، صادق معاویہ، قدرت اللہ نیازی کے تبصرے پڑھ کر لطف آ جاتا ہے۔ سہنس کی ہر کہانی اپنا الگ مزہ رکھتی ہے۔ اس دفعہ شیش محل، پھر یاد آئی، کوہ گراں، ماروی اور خسارہ ٹاپ کلاس کی کہانیاں تھیں۔ میرا خط چھپ گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ (اب کہیے گا کہ آپ کی خوشی کا حال کیسا ہے)

خواجہ نعیم جاوید، بھلول خلیع سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں "ساتھ کہ آپ کی ردی کی نوکری کا ہاضمہ بڑا بہترین ہے اور آپ کی قیمتی خطوط بہ بڑی چلتی ہے۔ اب آزما بھی لیا ہے۔ (اب ایسا بھی کیا غضب ہو گیا ہے مجھے)۔ ہم نے کہا تھا کہ وقت پر جو خطوط ملتے ہیں انہیں ضرور جگہ دیتی ہے۔ اس میں ناراض ہونے والی کوئی بات نہیں) ستمبر 16ء کا شمارہ 25 اگست کو بحیرہ بک ڈپو بھلول سے مل گیا تھا۔ ٹائٹل بڑا جاندار اور دلچسپ رہا۔ ڈاکٹر انکھ کو مبارک باد..... جون ایلیا صاحب کا انشائیہ ہر بار دل کو زخمی کر جاتا ہے۔ بہت تلخ باتیں کرتے ہیں لیکن سو فیصد سچ۔ خطوط کی محفل میں محمد مرتضیٰ جھنگ سٹی سے پہلے نمبر کی سیٹ پر نظر آئے۔ آپ کے پرانے تبصرہ نگاروں میں صفدر معاویہ، سید عبادت کاظمی، طاہرہ گلزار صاحبہ، محمد خواجہ کے تبصرے اچھے لگے۔ قدرت اللہ نیازی کی تجویز اچھی لگی۔ کاشف زبیر میرے بھی پسندیدہ راسخ ہیں۔ پلیزان کی تحریریں ضرور لگائیں (جی ضرور) سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ جو لیٹ آخر کار حیدر آباد اپنے والد کے سامنے آ گئی۔ اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ کاش سہنس پندرہ دنوں کا ہوتا۔ پورا ایک ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پھر یاد آئی، طاہرہ جاوید محفل کی بہترین کہانی جو لوگ رشتوں کو روندتے ہیں، آخر میں ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن اس کہانی میں طاہرہ صاحب نے باپ سے بیٹے کا ملاپ کروا دیا۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی کوہ گراں اچھی کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ قدوس نے برے لڑکے کو اچھا بنا دیا اور اس میں امجد بیگ کا ہاتھ سب سے زیادہ شامل رہا۔ ماروی ہمارے دوسرے گزرجاتی ہے۔ خسارہ، زویدا اعجاز کی بہترین کہانی۔ اس دفعہ اگر سب سے بیٹ کہانی شمار کی جائے تو خسارہ پہلے نمبر پر آئے گی۔ شرمیاس اس دفعہ عفریت کے ساتھ سامنے آئے۔ منظر امام غیر ملکی کہانیاں لے کر آئے۔ سلیم فاروقی صاحب ریشہ نقدیر کے ساتھ تشریف لائے اور لا جواب کر دیا۔ (اب تو آپ خوش ہیں نا)

صادق معاویہ سعیدی، خان پور سے محفل میں شریک ہیں "انشائیہ میں جون ایلیا ہمارے معاشرے میں پیدا شدہ بیماریوں پر دل گرفتہ لہو کے آنسو بہاتے نظر آئے۔ جون ایلیا سے زیادہ طاقتور الفاظ ہمارے حاشیہ خیال میں نہیں اور نہ ہی ان کی فکر سا کو پانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ہم پر مسلط شدہ آج کی بیماریوں اور تکیوں پر برسوں پہلے ماتم جون ایلیا کا خاصہ ہے اور آپ کا ادارہ یہ تو گویا..... زبان میری ہے، بات ان کی..... کا مصداق ہوتا ہے۔ کاش ہمارے ارباب بست و کشاد 24 گھنٹوں میں سے صرف چند منٹ ہمارے لیے پورے خلوص اور صرف پاکستانی بن کر صرف پاکستان کے لیے سوچیں تو حالات کے سدھار کی چکا چوند عالم کی آنکھیں چند ہی ڈالے۔ انشائیہ اور ادارہ میں دل جلانے کے بعد اپنی محفل میں پہنچے تو جھنگ سے محمد مرتضیٰ طمطراق سے کری صدارت پر جلوہ نما تھے۔ دل کی گہرائیوں سے خلوص بھری مبارکباد۔ حضرت سلطان باہو سمیت جھنگ سے ہماری محبت کے کئی رشتے ہیں ان میں ایک آپ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مرتضیٰ بھائی آتے رہے گا، ہمارے مہربانوں کی طرح کہ اقتدار ختم اور صاحب پاکستان سے قائب اور آغا سلمان پاشا، عذر ہاشمی، مونا رضوان، قیصر اقبال گچہ کی طرح، صدارت ختم اور بندہ محفل سے غائب۔ آپ تو ایسا نہیں کریں گے؟ صفدر معاویہ بھائی چار سال ہونے کو آئے ہیں ہم بھی آپ کی طرح انی جان سے جدا ہوئے بیٹھے ہیں اور آپ کی طرح مزہ صدیقی سے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ امی جان کہنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے اب تو لفظ امی جان لکھتے پڑھتے بولتے اور سنتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اللہ پاک سب کی ماؤں کو سدا سلامت رکھے اور جو جنت کو سدھار گئیں ان کی قبروں کو جنت کا باغ بنائے۔ آمین۔ مرزا گل بیٹا ہماری حاضری آپ کو ناگوار گزرتی ہے کیا اور عبادت کاظمی آپ بکلی والوں سے خوش ہیں۔ مرزا طاہر الدین، قمر صائم، شہباز ناز کے مختصر تبصرے شاعرانہ تھے۔ طاہرہ گلزار، محمد خواجہ اپنے الگ انداز کے مالک ہیں۔ شکر یہ اشفاق شاہین، قدرت اللہ نیازی، مرتضیٰ ہے آپ کی۔ اسرار سانی ڈسٹرکٹ جنرل انکھ کا نام بلیک لسٹ دیکھ کر دکھ ہوا (کیوں مجھے)۔ ہم سب ایک ہیں اس میں دکھ والی کوئی بات) سب سے پہلے شیش محل پڑھی کیونکہ پورا مہینہ اسی کا تو انتظار کرتے ہیں، اسما قادری جی آپ نے تو..... دو! اندر، دم باہر..... والا کام کر دیا۔ فاروق بیٹھی میں اور جولی حیدر آباد۔ چلو جی قلم آپ کے ہاتھ میں ہے اور منظر امام کی غیر ملکی کہانیاں کیا خوب تھیں۔ اپنے پیارے دیس میں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور محفل اعظم کی پھر یاد آئی تو مدح سرا کی کی محتاج ہی نہیں۔ جناب محفل اعظم آخری صفحات پر جلوہ نما کی فرمائیے، ہم سرا پا انتظار ہیں۔ باقی شمارہ مطالعے کا منتظر ہے۔ آخر میں عبدالباقی انصاری، تحریم شاہ اور حافظ شعیب معاویہ سے حاضری کی درخواست ہے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ناہید یوسف، اسلام آباد۔ انجم اسحاق، بہاولپور۔ ظہیر الدین، کراچی۔ آسیہ کمال، راولپنڈی۔ صبا عمر، اوکاڑہ۔ شاہین نجم، میرپور خاص۔ عامر خان، جھنگ سٹی۔ عظیم احمد لاڑکانہ۔ معصومی عزیز، خیرپور۔ نسیم احمد، ملتان۔ وزیر محمد خان، مل جلزارہ۔



# ننگو ناموس کسی داستان الیا سیتاپوری

انسانی قدم ہوں یا گزرا وقت... کسی نہ کسی حوالے سے اپنے نشان تو چھوڑ جاتے ہیں... یہ اور بات کہ ان سے وابستہ یادوں میں شدت ہے یا بس معمولی احساسات... قوموں کے حوالے سے تاریخ جہاں کی بھی ہو اپنی ایک مضبوط حیثیت دنیا سے تسلیم کراتی ہے... جیسے تاتاری اپنی سفاک فطرت کے باعث ایک الگ شناخت اور فتوحات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ منگولوں نے جب عروس البلاد بغداد کی فتح کا ارادہ کیا تو چن چن کر اپنے لیے ہر کاروں کا انتخاب کیا۔ یہ جنگ کئی محاذوں پر لڑی گئی۔ ہلاکو خان کی خوفناک تباہی نے بغداد میں انتشار پھیلانے کی انتہا کر دی۔ بغداد کے بااثر طبقے نے معمولی اور مبہم فائدے کے لیے اپنے ہی اشیانے کو آگ لگا دی۔ معتبر لوگ اپنی حرص و طمع کے ہاتھوں غیر معتبر ہو گئے... عجیب و غریب جبلت کے ہاتھوں متغیر حالات اور اس قوم کے عروج و زوال کی سبق آموز داستان۔



Downloaded From  
Paksociety.com





Downloaded From paksociety.com



دفاعی جنگ کے قائل ہی نہیں۔ کیا آپ لوگ اپنے آپ میں جارحانہ جنگ کی صلاحیتیں پاتے ہیں؟ یا یہ کہ کیا آپ بغداد سے نکل کر قراقرم اور چین پر حملہ آور ہو سکتے ہیں؟“

ان کے پاس دردراغ کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ شہزادے نے آہستہ سے کہا۔ ”اے کاش! ہم میں اتنی صلاحیت ہوتی۔“

دردراغ نے کہا۔ ”آپ لوگ میری باتیں نہایت غور سے سنیے۔ منگولوں کے جاسوس کہیں بھی مل جائیں گے مگر منگولوں میں ان کے دشمنوں کے جاسوس نہیں ملیں گے کیونکہ ان کے ماحول میں اس کی گنجائش ہی نہیں۔ وہ اپنے راز چھپانے میں ماہر ہوتے ہیں اور ان میں خدایوں کا وجود نہیں ملتا۔ کیا آپ اس معیار پر پورے اتر سکتے ہیں؟“

شہزادے نے بے بسی سے سر آہ بھری۔ ”اے کاش! ہم میں غدار نہ ہوتے۔“

دردراغ بولتا رہا۔ ”ان کا ہر قدم غیر متوقع اور اچانک ہوتا ہے اور وہ اپنے دشمن کو بھاگنے کا موقع نہیں دیتے۔ کیا آپ میں اتنی مستعدی، چستی اور تیزی ہے؟“

شہزادے نے ایک بار پھر سر آہ بھری۔ ”اے کاش۔ اے کاش..... خدا یا ہم پر رحم کر۔“

دردراغ کہتا رہا۔ ”ان کے کھانوں میں تکلف نہیں پایا جاتا۔ جس چیز کا بھی گوشت مل جائے، کھا لیتے ہیں۔ ان کے گھوڑے زمین پر سم مار مار کر گھاس کو اندر سے نکال لیتے ہیں۔ کیا آپ اور آپ کے گھوڑے ایسا کر سکتے ہیں؟“

شہزادے نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ”معاذ اللہ، معاذ اللہ..... ہم ان کی طرح حرام تو نہیں کھا سکتے۔ منگولوں کے گھوڑے بھی انہی کی طرح بے رحم اور بے تکلف ہوتے ہیں، اے کاش.....“

دردراغ نے کہا۔ ”وہ انہوں کے وفادار ہوتے ہیں اور مردم شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور ان کی شاطرانہ چالوں کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔“

شہزادہ ایک بار پھر بولا۔ ”اے کاش! ان باتوں کا علم ہمیں چند سال پہلے ہو جاتا۔“

دردراغ نے گویا آخری بات بتائی۔ ”اور جب وہ حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ اپنے دشمن کو دھوکا دینے کے لیے پسپائی اختیار کرتے ہیں۔ یہ ان کا میدان جنگ میں بہت بڑا دھوکا ہوتا ہے کیونکہ جب وہ سوچی سمجھی تدبیر کے تحت بھاگ رہے ہوتے ہیں تو فوج مندی کے نشے میں سرشار حقائق فوج اپنی احتیاط اور حواس سے بے بہرہ اور غافل اس وقت کچی فصل کی

دردراغ کھنٹوں اس شخص کا انتظار کرتا رہا جو علیہ کی درخواست لایا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس وقت وہ اس بد قسمت انسان جیسا تھا جو یارس پتھر کی تلاش میں صبح سے شام تک پتھروں کو گھس گھس کر سمندر میں پھینکتا رہا اور شام کو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس کے ہاتھ کا لوہا سونا بن چکا ہے اور یارس بھی دوسرے پتھروں کے ساتھ سمندر میں پھینکا جا چکا ہے۔ جب علیہ کی درخواست لانے والا نہیں آیا تو وہ سارے درخواست گزاروں کی شبیہیں تصور میں لاکر دیکھتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک بوڑھا چہرہ تھا..... جھریوں دار، خاموش طبع۔ شاید اس نے درخواست دیتے وقت کچھ کہا بھی نہیں تھا۔

شہزادہ ابو بکر شام سے ذرا پہلے اس کے پاس آیا۔ فکر مند، اداس، غمگین اور ملول۔ اس وقت بھی دردراغ کے ہاتھ میں علیہ والی درخواست دہی ہوئی تھی۔ اس نے شہزادے کو دیکھتے ہی وہ درخواست قیص کی جیب میں رکھ لی۔ شہزادے نے کہا۔ ”دردراغ! اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے ہلاکو خان بغداد کی طرف چل چکا ہے۔ میں اور میری سپاہ تم منگولوں کے طریقہ جنگ کی بنیادی باتیں سمجھنا چاہتے ہیں۔“

دردراغ بادل ناخواستہ اٹھا اور شہزادے کے ساتھ چھاؤنی چلا گیا۔ وہاں سلیمان شاہ امیر علم، ملک عز الدین ابن رخ الدین کرد اور مجاہد الدین ایک سردوات دار بھی موجود تھے۔ سلیمان شاہ ترکان تھا۔ ترکان قبائل اپنی بہادری، مستعدی اور جنگ جوئی میں کوئی جواب نہ رکھتے تھے۔ یہ امیر المومنین کا دایاں بازو تھے یعنی مینہ۔ یہ لوگ ماضی میں کئی بار حملہ آور منگولوں کو شکست بھی دے چکے تھے۔ ملک عز الدین کرد بغداد کا نامی گرامی پہلوان تھا اور مینہ کا علمبردار بھی یہی تھا۔

مجاہد الدین ایک خلیفہ مستعصم باللہ کے باپ مستنصر باللہ کے زمانے سے سردوات دار (چیف سیکریٹری) چلا آ رہا تھا اور سلطان مجاہد الدین ایک کہلاتا تھا۔ ان تجربہ کار آدمیوں کے درمیان دردراغ کی نمایاں حیثیت یہ تھی کہ وہ منگول تھا۔ شہزادے نے سلطان ایک کے علاوہ دونوں کا تعارف کرایا اور کہا۔ ”دردراغ! ہم تم سے منگولوں کے طریقہ جنگ کی بنیادی باتیں جاننا چاہتے ہیں تاکہ جب ہم ان سے برسر پیکار ہوں تو انہیں اپنے ذہن میں رکھیں۔“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! ان کی پہلی بنیادی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جارحانہ جنگ لڑتے ہیں۔ وہ



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف      ایڈفرس لنکس  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ      ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ      ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

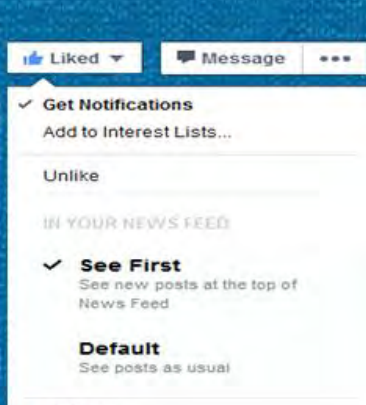
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**





جواب بھی شاید انسان کی قسمت میں نہیں لکھا گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ وہ معلوم نہیں کتنی دیر تک سوتا رہا پھر کسی نے اسے جگا دیا۔ وہ فوراً ہی جگانے والے کو پہچان نہیں سکا، ہاں کسی کی آواز خواب و خیال کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ”بد نصیب درداغ! اٹھ اور اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کر۔“

درداغ نے ہوش میں آتے ہی اس بد ہیئت اور بد قوارہ کو پہچان لیا۔ یہ موٹا منگول تھا۔ سانپ جیسی گول گول آنکھیں درداغ کے چہرے پر جھکی ہوئی تھیں۔ درداغ سنبھل کر بیٹھ گیا، پوچھا۔ ”تو اس وقت یہاں کہاں؟“

موٹے منگول نے جواب دیا۔ ”خلافتِ اسلامیہ کے لائق وزیر ابن علقمی کو یہ خبر ملی تھی کہ فوج کے مفسدین کی ایک جماعت امیر المومنین کے محل کو گھیر کر کوئی نازیبا قدم اٹھانے والی ہے چنانچہ امیر المومنین کے حکم کے بموجب اس کا تدارک کر دیا گیا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟“

موٹے منگول نے کہا۔ ”کیا میں تجھ سے پوچھ سکتا ہوں کہ تو اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں یہاں شہزادے کے ساتھ آیا تھا شہزادہ حملہ آوروں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔“

موٹا منگول ہنسنے لگا۔ ”حملہ آوروں کے خلاف جنگ کی تیاریاں؟ کن حملہ آوروں کے خلاف اور کس کے حکم سے؟ کیا امیر المومنین سے اس کی اجازت لی گئی تھی؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں یہاں کی انتظامی موشگافیوں سے واقف نہیں ہوں مگر جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بغداد میں ایماندار، وقادار اور جاں نثار ذلیل و خوار ہیں اور عیار، مکار، فریب کار اور غدار قابلِ اعتبار اور وقادار ہیں۔“

موٹا منگول درداغ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”درداغ! بغداد کے مقدر کا مجھے علم ہو چکا ہے۔ اس کا مقدر ابن علقمی لکھ رہا ہے۔ وقت کا دھارا کدھر بہہ رہا ہے؟ دیکھ، سمجھ اور پہچان۔ مخالف سمت کی تیراکی کا جو حشر ہو سکتا ہے، خود سوچ لے۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“

موٹے منگول نے جواب دیا۔ ”سوال یہ نہیں ہے کہ میں تجھ سے کیا چاہتا ہوں۔ سوال تو یہ ہے کہ ہلا کو خان تجھ

طرح کٹ جاتی ہے جب کھست خوردہ منگولوں کے سینے، میسرہ اور قلب انہیں اپنے زرخے میں لے چکے ہوتے ہیں۔“

سلطان ایک نے بے ساختہ..... ”سبحان اللہ، سبحان اللہ، کیا تجزیہ ہے۔ واہ خوب!“ کہہ کر درداغ کو رشک و محبت بھری نظروں سے دیکھا لیکن شہزادہ۔ ”اے کاش ہم بھی اسی طرح لڑ سکتے“ کہہ کر چپ ہو رہا۔

درداغ نے گویا آخری بنیادی بات بتائی۔ ”منگول متمدن یا شہری نہیں ہوتے۔ وہ موسموں اور حالات کی سختیاں یہ آسانی جھیل جاتے ہیں جبکہ اہل بغداد آرام طلب اور تن آسان ہو چکے ہیں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”اے کاش، ہمیں اتنی مہلت مل جائے کہ ہم اپنے دشمنوں کی طرح زندگیاں گزار سکیں۔“

جو کچھ درداغ نے بتایا تھا، اس میں بس یہی تدبیر قابلِ عمل تھی کہ جب منگول سپاہ کھست کھا کے بھاگنے لگے تو ان کا تعاقب نہ کیا جائے۔

شہزادے نے رات کا کھانا مل کے کھایا۔ ان سب کو یہ خوشی تھی کہ درداغ جیسا ایک لائق ان کی صفوں میں آچکا تھا لیکن خود درداغ بالکل مایوس اور ادا اس تھا۔ اس کو مسلمانوں کی جیت یا دفاع کا ذرا بھی یقین نہیں تھا۔ کسی چالاک، ذہین، وحشی اور اجڈ پر کوئی سادہ لوح مذہذب، کم عقل اور مہذب، کس طرح غالب آسکتا ہے؟

درداغ کو اپنے مستقبل کی فکر پڑ گئی تھی۔ وہ ان سب کو وہیں چھوڑ کر پاس کے ایک چھدرے باغ میں چلا گیا، ڈیڑھ دو سو مجوروں کا باغ۔ آسمان پر تاروں کی روشنی بارھویں کے چاند کی چاندنی میں ماند پڑ چکی تھی۔ وہ ایک درخت کی جڑ میں تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجبور کا یہ درخت کمان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ اس کی شاخوں اور پتوں سے چمن چمن کر زردی مائل چاندنی طستِ اسلامیہ پر لوحِ کناں محسوس ہو رہی تھی۔ باغ کے باہر پگھلنے لگی پر چند گھڑسوار اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے گزر گئے۔ گھوڑوں کے سموں کی اڑائی ہوئی گرد و حویں کی طرح فضا میں پھیل گئی۔

وہ بحالتِ بے بسی سوچ رہا تھا کہ انسان کیا ہے؟ انسان کا انسان دشمن کیوں ہے؟ انسان بے بس ہے یا مختار؟ تقدیر کیا ہوتی ہے اور سب کے آخر میں علیہ کی محبت کی کسک نے حسن اور عشق کی طرف مائل کر دیا۔ عشق کیا ہے؟ محبت کیا ہوتی ہے؟ اس نے سوچا، انسان کی اس سے بڑی مجبوری، بے بسی اور بد نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ سوالوں کے لشکر سامنے سے گزرے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کسی ایک سوال کا



سے کیا چاہتا ہے۔ ابن علیؓ تجھ سے کیا چاہتا ہے۔ زمانہ تجھ سے کیا چاہتا ہے اور یہ کہ اگر تقدیر کوئی چیز ہے تو وہ تجھ سے کیا چاہتی ہے۔“

درداغ نے حقارت سے موٹے منگول کا ہاتھ اپنے کانڈھے پر سے ہٹا دیا، بولا۔ ”میں تو بس یہ سمجھ سکا ہوں کہ خدا مجھ سے کیا چاہتا ہے اور خدا جو چاہتا ہے، میں وہی کر رہا ہوں۔“

موٹے منگول نے نفرت سے منہ بنایا۔ ”میں اس وقت تک بغداد ہی میں ملوں گا جب تک کہ اس کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دی جائے۔ جب پریشانی اور بچھتاوے کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جائے تو، تو میرے پاس چلے آنا۔ شاید میں اس وقت بھی تیرے لیے کچھ کر سکوں۔“

درداغ کوئی جواب دیے بغیر شہزادے کے پاس چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ موٹا منگول معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ شہزادہ بدحواس اور پریشان درداغ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ جب ان دونوں کا آمتا سامنا ہوا تو شہزادے نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے درداغ کو سمجھایا کہ فی الحال وہ محتاط اور چوکنا رہے کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ ہر سے کون وار کر جائے اور شہزادے ہی کی زبانی یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ابن علیؓ اپنے چند ہوا خواہوں کے ساتھ آیا تھا اور کچھ جائزہ لے کر چلا گیا۔

درداغ نے کہا۔ ”شہزادے! وہ اپنے چند ہوا خواہوں کے ساتھ کچھ جائزہ لینے نہیں آیا تھا بلکہ وہ فوج کے ایک مفید اور باغی دستے کی سرکوبی کے لیے آیا تھا کیونکہ یہ دستہ ابن علیؓ کے بقول امیر المومنین کے محل کو گھیر کر کوئی نازیبا قدم اٹھانے والا تھا۔“

شہزادے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”یعنی؟ کیا مطلب؟“

درداغ نے موٹے منگول سے ہونے والی گفتگو کو بے کم و کاست سنا دیا۔ شہزادہ سب کچھ سن کر آگ بگولا ہو گیا، بولا۔ ”واللہ، اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ ہم کب تک صبر و تحمل سے کام لیں گے۔ کیوں نہ ہم لوگ امیر المومنین کی مرضی کے خلاف ایک انتہائی قدم اٹھا دیں؟“

درداغ سوالیہ نظروں سے شہزادے کو دیکھنے لگا۔ شہزادہ، درداغ کو لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ کر مشورہ طلب کیا۔ سلطان ایک نے مشورہ دیا۔ ”شہزادے! جذباتی نہ بنیے، ذرا تحمل اختیار کیجیے۔“

ملک عزالدین کرنے کو کہنے لگا۔ ”کیوں نہ ہم وہی کچھ کر

گزر رہی جس کی ہم سے توقع کی جا رہی ہے۔“

سلیمان شاہ ترکمان نے کہا۔ ”میں تو شہزادے کے حکم کا غلام ہوں۔ ابن علیؓ کو کہیں سے اغوا کر کے مکرے نکلنے کر سکتا ہوں۔“

شہزادہ، سلیمان شاہ ترکمان کے جواب سے خوش ہوا، بولا۔ ”میری بھی یہی رائے ہے، اب ہمیں اس سانپ کو پھیل دینا چاہیے۔“

درداغ ابھی تک خاموش تھا، سلطان ایک نے کہا۔ ”درداغ! تو کیوں خاموش ہے؟ تو بھی تو کچھ کہہ، تیری رائے بھی حد درجہ وسیع ہوتی ہے۔“

درداغ نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”آپ لوگ جو چاہیں کریں لیکن اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے۔ بہت کچھ ہو چکا بقیہ جو کچھ ہونا ہے عنقریب ہو جائے گا۔ ابن علیؓ کو جو کچھ کرنا تھا کر چکا، اب اس کے مارے جانے یا امیر المومنین کو ہٹا دینے سے قصائے مبرم نہیں مل سکتی۔“

ماریوسی نے دلوں کو پشمرہ کر رکھا تھا مگر یہ چند جیالے اور سر پھرے ہمت ہارنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ پوری رات آسیب کی طرح آنے سے سامنے سر جھکائے بیٹھے مشورے کرتے رہے۔ چند موسمی شخصیں جلتی پھلتی رہیں۔ صبح فجر کی اذان نے انہیں خدا کی طرف رجوع کر دیا لیکن موذن کو کیا پتا کہ بستی میں چند ایسے نوجوان اور بزرگ بھی موجود ہیں جن کے خواب و خورش ہمیشہ کے لیے حرام ہو چکے ہیں۔

فجر کی نماز سے پہلے ہی ان میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ سلیمان شاہ ترکمان، عزالدین کرد اور سلطان ایک میں سے کوئی ایک شخص امیر المومنین سے مل کر انہیں اصل خطرے سے آگاہ کرے گا اور ابن علیؓ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

فجر کی نماز کے بعد ہر کوئی اپنے اپنے گھر چلا گیا۔ درداغ کو امیر المومنین کے دربار میں حاضری دینا تھی۔ اس کا خیال تھا کہ امیر المومنین اس سے پوچھیں گے کہ درداغ! رات کو تم لوگ چھاؤنی میں کیا کر رہے تھے؟ مگر اس سے کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ امیر المومنین سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے درداغ سے صرف یہ پوچھا۔ ”درداغ! یہ شہزادہ ابو بکر تجھ سے کیا کام لیتا ہے؟“

درداغ نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ خلیفہ کو ہنسی آگئی، اس نے کہا۔ ”لوگوں کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے، ابن علیؓ کچھ کہتا ہے اور شہزادہ ابو بکر کچھ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کی بات پر اعتبار کروں۔ پہلے میں ان حالات میں



خاصہ پریشان ہو جایا کرتا تھا مگر اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ سنوں گا سب کی مگر اعتبار کسی پر بھی نہیں کروں گا۔“  
درداغ نے کہا۔ ”مگر امیر المومنین! سننے میں آیا ہے کہ ہلاکو خان اپنے غول بیابانی کے ساتھ پیش قدمی کر چکا ہے۔“  
خلیفہ نے مسخر آمیز لب و لہجہ اختیار کیا، بولا۔ ”کیا تیرا یہ مطلب ہے کہ ہلاکو خان کی ہتھکڑیاں نام ہے جو کسی ایک جگہ متحدہ پڑا رہے گا۔ وہ آدمی ہے اور اس کے ساتھ منگول سپاہ بھی ہے۔ وہ چلے گا پھرے گا تو اس کے ساتھ اس کی سپاہ بھی حرکت میں آجائے گی۔ اس کی پیش قدمی میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

درداغ لاجواب ہو گیا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اپنا سر پیٹ لے لیکن وہ خلیفہ کے سامنے تھا۔ ادب و احترام نے اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تک نہیں پیدا ہونے دیے۔ اس نے رک رک کر نہایت ادب و احتیاط سے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! میں منگول ہوں اس لیے میں جانتا ہوں کہ ہلاکو اور اس کی سپاہ کا آئندہ شکار کون ہوگا؟“  
خلیفہ نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو چکا ہے پھر ہم اس پر شک کر کے خواہ مخواہ گناہ و صغیرہ کے کیوں مرتکب ہوں؟ اگر وہ بغداد کی طرف آ رہا ہے تو میں اس کا استقبال کروں گا۔ اس کو خوش آمدید کہوں گا۔ جب ہم خود کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تو کوئی اور ہم پر کیوں حملہ کرے گا؟“

درداغ نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! میں منگول ہوں اس لیے میں ہلاکو خان کو خوب سمجھتا ہوں۔“  
خلیفہ نے جواب دیا۔ ”یہ کیا بات ہوئی کہ تو منگول ہے اور ہلاکو کو خوب سمجھتا ہے۔ ہم امیر المومنین اور مسلمان ہیں لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم ابن علقمی اور شہزادہ ابو بکر کو خوب سمجھتے ہیں۔“

درداغ خاموش ہو گیا۔ خلیفہ نے کہا۔ ”اب تو جاسکتا ہے اور اس وقت تک دربار میں نہیں آئے گا جب تک تجھے طلب نہ کیا جائے۔“

درداغ دربار سے چلا آیا، امیر المومنین کی گفتگو نے اسے اور زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے سوچا ان حالات میں بغداد میں رہنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔

وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اس کو اچانک وہی بوڑھا نظر آ گیا جو علیہ کی درخواست دے گیا تھا۔ وہ درداغ کو

دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ درداغ اس کے پیچھے دوڑا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”بڑے میاں! تمہاری درخواست منظور ہو چکی ہے، تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“  
وہ بڑے میاں کے تعاقب میں گلی میں داخل ہو گیا مگر وہ کہیں غائب ہو چکے تھے۔ اس نے انہیں بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ درداغ سوچ رہا تھا، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

☆☆☆

بغداد میں یہ خبر عام تھی کہ ہلاکو خان بغداد کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ عراق کی سرحدوں پر منگول سپاہ جمع ہو رہی تھی۔ سلیمان شاہ ترکان اور سلطان ایک نے یہ فیصلہ کیا کہ منگولوں کے اس اجتماع کو توڑ دیا جائے۔ شہزادہ ابو بکر بھی یہی چاہتا تھا لیکن امیر المومنین ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ابن علقمی کے زیر اثر اس خطرے کو مول نہیں لینا چاہتے تھے لیکن سلیمان شاہ ترکان اپنی بات پر اڑ گیا۔ اس نے شہزادہ ابو بکر سے کہا۔ ”منگولوں کا اگلا قدم عراق کے اندر ہوگا لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں عراق میں داخل ہونے والے پاؤں توڑ دوں گا۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر میں اس کی پوری ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ امیر المومنین سے بات کر لی جائے۔“

سلطان ایک کو اس کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں امیر المومنین کے پاس نہیں جاؤں گا کیونکہ میں ایک بار شرمندگی اٹھا چکا ہوں۔“

سلیمان شاہ ترکان نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ وہ امیر المومنین سے فیصلہ کن بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں امیر المومنین سے بات کرنے کو تیار ہوں مگر میں اپنے ساتھ درداغ کو بھی لے جانا چاہتا ہوں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”لیکن درداغ کو امیر المومنین نے اس بات کا پابند کر دیا ہے کہ وہ جب تک اسے طلب نہ کریں، وہ ان کے پاس نہیں جائے گا۔“

سلیمان شاہ ترکان نے کہا۔ ”شہزادے! آپ امیر المومنین سے ملاقات کا وقت تو لیں اور انہیں یہ بتادیں کہ میں یہ ملاقات درداغ کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔“

شہزادہ کئی دن تک اس ملاقات کے اہتمام میں لگا رہا لیکن خلیفہ نے وقت نہیں دیا۔ سلیمان شاہ ترکان نے ادھر سے مایوس ہو کر موصل کا رخ کیا۔ موصل کا حکمران بدرالدین لولواس کا گہرا دوست تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ منگولوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا جائے لیکن یہ ملاقات بھی خلیفہ



کی اجازت اور منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی دوران ابن علقمی بیمار پڑ گیا۔ خلیفہ نے سلیمان شاہ اور درداغ کو ملاقات کی اجازت دے دی اور یہ حکم بھی دیا کہ اس ملاقات میں عزالدین کرد، سلطان ایک اور شہزادہ ابوبکر بھی موجود رہیں چنانچہ رات کے سناٹے میں شہزادہ ابوبکر، سلطان ایک، سلیمان شاہ، عزالدین کرد اور درداغ خلیفہ کے محل میں پہنچ گئے۔ خلیفہ نے اس ملاقات کا اہتمام محل کے پائیں باغ میں کیا تھا۔ اس میں دنیا بھر کے درخت لگائے گئے تھے۔ ان رنگارنگ درختوں میں کھجور کے درخت اجنبی اجنبی سے لگتے تھے۔ خلیفہ نے یہاں کے سبزہ زار پر کرسیاں بچھا دی تھیں۔ مہمانوں کی ضیافت کے لیے ایک تخت پر خشک و تر میوے اور مشروبات رکھ دیے گئے تھے۔ خلیفہ کے خاص خدمت گار سفید کپڑوں میں ملبوس بڑے بڑے رومال کا ندھوں پر ڈالے جگہ جگہ استادہ تھے۔

جب ان پانچوں مہمانوں کو یہاں پہنچایا گیا تو شہزادے کے علاوہ چاروں پر عرب خلافت طاری ہو چکا تھا۔ یہاں خلیفہ ایک زرتار منقش کرسی پر یوں بیٹھا تھا کہ اگر اس کو کرسی کی پشت سے دیکھا جاتا تو خلیفہ نظر ہی نہ آتا۔ سارے مہمان خلیفہ کے روبرو مودب کھڑے ہو گئے۔ خلیفہ نے شہزادے کو اپنے پاس بلایا اور اس کو آہستہ آہستہ سمجھانے لگا۔ ”ولی عہد خلافت! میں تیری خواہش اور درخواست کے لحاظ سے ان سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ ان کو سمجھا دو کہ یہ یہاں نزاعی مسائل پر ہرگز بات نہ کریں کیونکہ ابن علقمی کی عدم موجودگی کا یہ مطلب ہے ہرگز نہیں کہ اس کو ان باتوں کا علم ہی نہ ہوگا۔“

شہزادے نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین نزاعی مسائل کا کیا مطلب لیتے ہیں؟ ہمیں نہیں معلوم لیکن اس عاجز کی ناقص عقل کے مطابق یہاں جو بات ہوگی، وہ کسی نہ کسی طرح نزاعی ضرور ہوگی۔“

خلیفہ نے برہمی کا اظہار کیا۔ ”میں نے ہمیشہ ابن علقمی کے مقابلے میں چہری طرفداری کی ہے لیکن کیا اب یہ ممکن نہیں ہے کہ تم ابن علقمی سے مفاہمت کر لو؟“

شہزادے نے عرض کیا۔ ”کیا خیر اور شر میں مفاہمت ہو سکتی ہے..... نیکی اور بدی میں سمجھوتا ممکن ہے؟ کیا زہر اور تریاق یکبارہ سکتے ہیں؟ کیا معصومیت اور معصیت کا ملاپ ممکن ہے؟“

خلیفہ عاجز آ گیا۔ ”تو حد درجہ منطقی ہے اور ہمیشہ اپنے دلائل اور براہین سے لاجواب کر دیتا ہے لیکن پھر بھی تو

انہیں سمجھا دے کہ وہ یہاں ایسی باتیں نہ کریں جو بعد میں قتل و قتل کا سبب بن جائیں۔“

شہزادے نے خلیفہ سے باتیں کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو محتاط اور مفید باتیں کرنے کا مشورہ دیا اور خود بھی اس گفتگو میں شریک اور معاون و مددگار رہا۔

گفت و شنید سے پہلے خلیفہ کے ایما پر کھانے پینے کا سلسلہ جاری رہا، بعد میں بات چیت شروع ہو گئی۔

سلیمان شاہ ترکمان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”امیر المومنین! اپنی گفتگو شروع کرنے سے پہلے میں اپنے بارے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ امیر المومنین کی نظر میں کیا ہوں؟ غدار یا وفادار؟ جاں نثار یا شکار؟ بہادر یا بزدل؟ بات دیر یا بے تدبیر؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”تیرا کردار ہمیشہ بے داغ رہا ہے اور کوئی بھی شخص تجھ پر شک و شبہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔“ سلیمان شاہ کا انداز گفتگو ہر ایک کو بہت پسند آ رہا تھا۔ ان کے چہروں پر تازگی اور مسکراہٹ نمایاں ہو چکی تھی۔

سلیمان شاہ نے عرض کیا۔ ”درداغ تو ہم میں نیا ہے لیکن میرے بقیہ ساتھی بھی میرے ہی جیسے ہیں، شک و شبہ سے بالا، وفادار، جاں نثار، بہادر، سچ اور قابل اعتبار۔ رہ گیا درداغ تو یہ بھی ہمارے ہی جیسا ہے اور ہم اس پر اتنا ہی اور ویسا ہی اعتبار کر سکتے ہیں جتنا اور جیسا اپنے ان ساتھیوں پر کر سکتے ہیں۔“

خلیفہ، سلیمان شاہ کے ساحرانہ طرزِ خطاب کا شکار ہو چکا تھا، بولا۔ ”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! اسلام اور مسلمان سخت خطرے میں ہیں، اگر اس وقت کو ہم نے ضائع کر دیا تو وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے کہ وقت ہمیں ضائع کر دے۔ امیر المومنین! آپ دوستوں اور دشمنوں کو ایک ہی صف میں نہ کھڑا کیجیے۔ انہیں پہچانے اور جو جس کی جگہ ہے، اس کو وہیں پہنچا دیجیے۔ زمانہ کسی کا دوست یا کسی کا دشمن نہیں، تغافل اور تامل سے کام نہ لیجیے کیونکہ.....“

خلیفہ نے کہا۔ ”مگر تو چاہتا کیا ہے، یہ تو بتا؟“ سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”منگول ہماری سرحدوں پر کھڑے دستک دے رہے ہیں اور وہ جاننے کی فکر میں ہیں کہ ہم کس حد تک غافل ہوئے ہیں۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ تم لوگوں پر عائد ہوتی ہے کیونکہ سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داریاں تمہارے سپرد کی گئی



ہیں۔ اگر ہمارے دروں پر کوئی دستک دے رہا ہے تو تم انہیں بتادو کہ تم سوئے ہوئے نہیں، بیدار ہو۔“

سلیمان شاہ بے اختیار بول اٹھا۔ ”خدا امیر المومنین سے راضی رہے، میں یہی اجازت حاصل کرنے آیا تھا۔“

خلیفہ گھبرایا ہوا تھا، بولا۔ ”مگر اس کا خیال رہے کہ ہلاکو خان اور اس کے شیطانی لشکر کو نہ چھیڑا جائے۔“

سلطان ایک نے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی مگر سلیمان شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو خاموش کر دیا، بولا۔ ”پہلے میں باتیں کر لوں، اس کے بعد آپ لوگ بھی جو چاہیں گے کہہ سکتے ہیں۔“

خلیفہ نے مزید کہا۔ ”ہم امن پسند ہیں اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنا چاہتے ہیں۔“

سلیمان شاہ نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! بیشک ہم امن پسند ہیں اور کسی بھی شر پسند کو ہم یہ اجازت نہیں دیں گے کہ ہمارے امن و سکون کو برباد کر دے۔ چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی اجازت اور منظوری کے بعد اپنے دشمنوں پر یہ واضح کر دیں کہ ہم ترنوالہ نہیں ہیں اور ہمارے دار الضرب میں سکتے ہی نہیں گوارا دیں بھی ڈھلتی ہیں۔“

خلیفہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ ”تو گویا تو نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھارے شیر کو باہر لے آئے اور سوئے ہوئے قتل کو بیدار کر دے۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! ہماری سرحدوں پر جمع ہونے والے دشمن ضرور یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کچھارے شیروں کو باہر لے آئیں اور سوئے ہوئے غازیوں کو بیدار کر دیں۔“

سلطان عز الدین اور سلطان ایک کے منہ سے بے ساختہ، سبحان اللہ، جزاک اللہ نکل گیا۔

خلیفہ ناراض ہو گیا، برہمی سے کہا۔ ”لیکن میں اس تعلیٰ کو پسند نہیں کرتا۔ تم لوگوں نے شاید فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے تباہ و برباد کر دو۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! یہ فیصلہ میں نے یا میرے ساتھیوں نے ہرگز نہیں کیا۔ یہ تو ابن علقمی کا فیصلہ ہے کہ ہلاکو خان کی مدد سے خلافت عباسیہ کو برباد کر کے خلافت علویہ کی بنیاد رکھی جائے۔“

خلیفہ نے شہزادے کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں نے تجھ کو منع نہیں کر دیا تھا کہ یہاں ابن علقمی کے حوالے سے کوئی بات نہ کی جائے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! ہم اس

کا ذکر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ خدایوں کا سرخیل اور خداری کی علامت ہے۔ ابن علقمی محض ایک شخص، ایک نام ہی نہیں، خداری اور خدایوں کا ایک عہد ہے، جب تک یہ یہاں موجود ہے ہم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

خلیفہ نے سلیمان شاہ کو بات کرنے سے روک دیا، بولا۔ ”سلیمان شاہ! میں نے تیری باتیں سن لیں، اب تو چپ ہو جا۔“ اس کے بعد وہ سلطان ایک سے مخاطب ہوا۔

”ہاں تو کیا کہنا چاہتا ہے؟“

سلطان ایک نے کہا۔ ”امیر المومنین! سننے میں آیا ہے کہ ہلاکو خان بغداد کے لیے چل چکا ہے، ہمیں اس کو روکنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”یہ مسئلہ ہمارا ہے، ابن علقمی سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لیے کچھ کرے۔ آئندہ اس سلسلے میں ساری باتیں ابن علقمی سے کی جائیں۔“

عز الدین نے زیر لب کہا۔ ”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“

سلیمان شاہ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”افسوس کہ میں نے اپنی ساری صلاحیتیں اور جملہ طاقتیں لسانی ضائع کر دی۔ چلو، واپس چلیں، شاید خدا کو یہی منظور ہے کہ ہم اپنی غفلت و بے حسی کی سزا بھگتیں۔“

شہزادے نے بڑے کرب سے کہا۔ ”امیر المومنین! انہیں مایوس نہ کیجیے۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”شہزادے! واپس چلیے ہم خلیفہ سے نہیں، قصر خلافت کی دیواروں سے مخاطب تھے۔“

خلیفہ نے برہم ہو کر کہا۔ ”واللہ اگر مجھے تمہاری وفاداری کا پاس نہ ہوتا تو میں تمہیں ذلیل و خوار کر کے قتل کر دیتا۔“

شہزادے نے سلیمان شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”خدا کے لیے جذباتی نہ بنیے اور ضبط و تحمل سے کام لیجیے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”شہزادے! میں ضبط و تحمل سے کام لے رہا ہوں ورنہ تو سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت یہاں کا منظر کیا ہوتا۔“

سلیمان شاہ کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ بولا۔ ”شاید موت ہمارا مقدر بن چکی ہے، اگر امیر المومنین معاف فرما دیں گے تو ہلاکو خان ہمیں قتل کر دے گا۔“

خلیفہ کو سلیمان شاہ پر رحم آ گیا، پوچھا۔ ”آخر تو چاہتا کیا ہے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! میں اور میرے ساتھی ذلت کی موت نہیں مرنا چاہتے، ہمیں جہاد کی



پلٹ کر نہیں آیا۔ اب میں اس کو کہاں تلاش کروں؟“  
خلیفہ نے کہا۔ ”جہاں کہیں بھی ملے، اس کو تلاش کر کے حاصل کر لے ورنہ زندگی بھر روتا رہے گا۔“  
یہ لوگ پُر امید اور خوش خوش قصر خلافت سے نکلے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ سلیمان شاہ نے تیاریاں شروع کر دیں۔ عزالدین کرد اور سلطان ایک بھی مستعد اور تیار بیٹھے تھے۔

☆☆☆

اب دردراغ کا زیادہ وقت سلیمان شاہ کے ساتھ گزرنے لگا۔ وہ موصل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سلیمان شاہ نے سپاہیوں کا ایک دستہ لیا اور دردراغ کے ساتھ موصل روانہ ہو گیا۔ راستے میں دوران گفتگو سلیمان شاہ نے کہا۔ ”دردراغ! بدرالدین میرا جگری دوست ہے، اے کاش وہ میرا ہم خیال بھی ہو جائے۔“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میں کئی ملاقاتیں بدرالدین سے کر چکا ہوں۔ وہ منگولوں کا دہیل ہے، ہلاکو خان سے ڈرتا ہے، وہ آپ کا ساتھ نہیں دے گا۔“  
سلیمان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”نہ دے میرا ساتھ۔ دوست پہچانا تو جائے گا۔“

بدرالدین نے سلیمان شاہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے اپنے دوست سلیمان شاہ کے لیے اپنی آنکھیں بچھا دیں اور قیام کے لیے ایک شاندار محل پیش کیا۔ اس محل میں آسائش زندگی کا سارا سامان موجود تھا، وہ مشروب جنہیں علمائے عراق نے حلال قرار دیا تھا اور وہ کنیزیں جو قفقاز اور ہنگری سے لائی گئی تھیں لیکن سلیمان شاہ کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے کہا۔ ”بدرالدین! تو میرا دوست ہے اور آج میں اپنے دوست کی دوستی آزمانے آیا ہوں۔“

بدرالدین نے پوچھا۔ ”امیر المومنین خیریت سے تو ہیں؟ کیا انہیں کوئی مزید پلا کفہ درکار ہے؟“

جب بدرالدین یہ کہہ رہا تھا تو اس کی نظریں دردراغ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور دردراغ شرم سے گڑا جا رہا تھا، اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم نے ہلاکو خان کو مجتہدین فراہم کی تھیں؟“

بدرالدین نے جواب دیا۔ ”ہاں مگر کیوں؟“ اس نے دردراغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس کے سامنے کی تو بات ہے۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”تم نے ہلاکو خان کو مجتہدین

اجازت دی جائے۔“  
خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنی کامیابی کا یقین ہے؟“  
سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”میں اپنی کامیابی کا یقین ہے اور بغرض محال اگر ہم ناکام رہے تو ہم شہیدوں میں جگہ پائیں گے اور اس وقت آپ ہمیں خلافت کا باغی کہہ کر ہلاکو خان سے صلح کر لیں گے۔“  
خلیفہ نے کچھ دیر خاموش رہ کر سلیمان شاہ کی پیشکش پر غور کیا اور پوچھا۔ ”اگر میں جہاد کی اجازت دے دوں تو تم اپنا کام کس طرح شروع کرو گے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”ہم اپنے ملک کی سرحدوں پر موجود منگولوں کو لٹکاریں گے اور اگر اللہ نے چاہا تو انہیں قتل یا منتشر کر دیں گے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ موصل کے فرماں روا بدرالدین سے تیری گہری دوستی ہے، کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ منگولوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے پہلے تو ایک بار بدرالدین سے ملاقات کر لے اور اس کو بھی منگولوں کے خلاف اپنے اتحاد میں شامل کر لے۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”امیر المومنین کے مشورے کی میں قدر کرتا ہوں۔ ویسے مجھے یقین نہیں ہے کہ بدرالدین ہمارا ساتھ دے کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بدرالدین کو ہلاکو خان نے اس علاقے میں اپنے مفادات کا نگران اور مشاہد مقرر کیا ہے۔“

خلیفہ ایک بار پھر لرز گیا، بولا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں پھر یہی کہوں گا کہ جو کچھ بھی کرو، سوچ سمجھ کر کرو۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”ویسے میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ دردراغ کو لے کر موصل جاؤں اور بدرالدین کو منگولوں کے خلاف حملاً آرائی میں شامل کر لوں۔ خدا کرے میری باتیں اس کی سمجھ میں آجائیں۔“

خلیفہ کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا، بولا۔ ”سلیمان شاہ! میں نے تم لوگوں کو جہاد کی اجازت ذاتی طور پر دی ہے اس کا خلافت اور احکامات خلافت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب کچھ صیغہ راز میں رہے گا۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”آپ مطمئن رہیں، سب کچھ صیغہ راز میں رہے گا۔“

جب وہ سب چلنے لگے تو خلیفہ نے دردراغ سے پوچھا۔ ”وہ تیری علیہ کیا کیا؟ میں نے تو تیرا کام کر دیا تھا۔“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! انسان کی بد نصیبی اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ درخواست گزار آج تک



بدرالدین نے جواب دیا۔ ”سلیمان شاہ میرے دوست! میں مراغہ اور بغداد کے بیچ میں رہتا ہوں، دو پاٹوں کے درمیان..... چکیوں کے دو پاٹوں کے درمیان، میں نہ تو امیر المومنین کو ناراض کر سکتا ہوں اور نہ ہی ہلا کو خان کو۔ ہلا کو خان میرا دوست ہے اور میں اس کی دشمنی سے ڈرتا ہوں۔“

سلیمان شاہ کا دل ڈوبنے لگا۔ ”بدرالدین! یہ تم کہہ رہے ہو؟ یعنی تم؟“

بدرالدین نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ میں کہہ رہا ہوں۔ کیا میں کوئی غلط بات کہہ گیا ہوں؟“

سلیمان شاہ نے پشیمردی سے کہا۔ ”جب ہلا کو خان تیرا دوست بن چکا ہے تو اب میں کیا بات کروں؟“

بدرالدین نے دیکھا کہ سلیمان شاہ اچانک تم سے تو پر آچکا ہے۔ پوچھا۔ ”مگر سلیمان شاہ بات کیا ہے؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

سلیمان شاہ نے سر جھکا لیا۔ مایوسی سے جواب دیا۔ ”اب میں کیا کہوں گا، اب کہنے کے لیے رہ گیا ہے؟“

بدرالدین نے کہا۔ ”پھر بھی۔ تم کسی مقصد ہی سے تو آئے ہو گے میرے پاس؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”بدرالدین! میں دیکھتا ہوں صحرائے گوبی کی وحشی قوم نے متمدن اقوام کو خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے، بدرالدین! میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تاریخیں لکھی جائیں تو اس میں میرا ذکر ان کم ناموں میں نہ کیا جائے جو مزاحمت کے بغیر ہی اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں اس سیلاب کے سامنے پشیمان کھڑا کر دینا چاہتا ہوں۔“

بدرالدین نے پوچھا۔ ”اگر اس سیلاب کے سامنے تم پشیمان کھڑا کرنا چاہتے ہو تو میرے پاس کیوں آئے ہو؟ جاؤ کھڑا کرو پشیمان، باندھو بند اور پھر اس ریلے میں خود بھی نابود ہو جاؤ۔“

سلیمان شاہ کو بدرالدین سے اس قسم کی گفتگو کی توقع نہیں تھی، کہا۔ ”میں چاہتا تھا اس کا رخیر میں تیرا نام بھی شامل کر لوں۔“

بدرالدین نے جواب دیا۔ ”سلیمان شاہ! میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں لیکن سیاست و سیادت سے خوب واقف ہوں اس لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ تم اپنی خام خیالی سے باز آ جاؤ۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”شکریہ، اب میں واپس چلا

بدرالدین نے سلیمان شاہ کو سمجھانا چاہا۔ ”کیا تم نے بغداد میں یہ نہیں دیکھا کہ وہاں مسلمانوں کے دو فریقے آپس ہی میں دست بہ گریبان ہیں اور شہر کے نصاریٰ ہلا کو خان کے خیر خواہ ہیں، امیر المومنین میں تاب مزاحمت نہیں۔ فوج کا دو تہائی حصہ نکالا جا چکا ہے پھر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم ہلا کو خان کا کس طرح مقابلہ کرو گے؟ وحشی مگر منطج و فرماں بردار، منگول عذاب الہی ہیں، تم اس عذاب الہی سے کس طرح جنگ کرو گے؟“

سلیمان شاہ نے نہایت نرمی سے کہا۔ ”اچھا دوست! میں آج کی رات یہیں رہوں گا مگر کل واپس چلا جاؤں گا۔“

بدرالدین نے جواب دیا۔ ”تم میرے دوست ہو سلیمان شاہ! جب تک تمہارا دل چاہے میرے پاس رہو مگر میری ایک درخواست ضرور ذہن نشین رہے۔“

سلیمان شاہ سوالیہ نظروں سے بدرالدین کو دیکھنے لگا۔ بدرالدین نے کہا۔ ”آئندہ ہلا کو خان کا ذکر نہیں ہوگا کیونکہ میں اس کا حلیف بن چکا ہوں۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”جب میں یہاں موجود ہی نہ ہوں گا تو ہلا کو خان کی تجھ سے بات کون کرے گا؟“

بدرالدین دوسری باتیں کرنے لگا، اس نے دردناخ سے پوچھا۔ ”سادہ لوح منگول! میں خیران ہوں کہ تو نے اس نامساعد اور غیر یقینی ماحول میں کیا دیکھا جو اپنے مرکز سے کٹ کر بغداد کا ہو رہا۔ میرا خیال ہے تیرا انجام اہالیان بغداد سے مختلف اور زیادہ ہسیا تک ہوگا۔“

سلیمان شاہ نے بدرالدین کو تند و تیز نظروں سے دیکھ کر جھڑک دیا۔ ”بدرالدین! تم دردناخ کو دل برداشتہ نہ کرو۔ بس یہی چند لوگ تو میرا سہارا ہیں اور تم ان سہاروں کو بھی مجھ سے برگشتہ کر رہے ہو؟“

بدرالدین جانے لگا، بولا۔ ”اچھا پھر میں چلا۔ اب تم آرام کرو۔ حالات کی نئی اور نا کامیوں کے احساس نے تم کو چڑچڑا کر دیا ہے۔ خدا تم پر رحم کرے، اب کل ملاقات ہوگی۔“

سلیمان شاہ کو ساری رات نیند نہیں آئی، بدرالدین کے لذیذ کھانوں، اعلیٰ مشروبوں اور حسین و جمیل کنیزوں نے ذرا بھی متاثر یا مائل نہیں کیا۔ فجر کی نماز پڑھ کے اس نے بدرالدین سے اجازت لی اور بغداد واپس ہوا۔

بدرالدین نے الوداع کہتے ہوئے پیشکش کی۔ ”اگر کبھی بھی ہلا کو سے دوستی کرنے کا خیال آئے تو مجھے نہ بھول



ضرورت ہے، وہاں جوش سے کام لے رہے ہیں۔ بہر حال امیر المومنین کو مشورہ دیجیے کہ وہ اپنے نادان دوستوں اور کوتاہ اندیش ہمدردوں سے ہوشیار رہیں۔“

ابن علقمی نے درداغ کو قریب بلایا اور کہا۔ ”تو نے اسلام قبول کر لیا تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اب تو بغداد کی سیاست میں ہرگز نہ پڑ۔ میں تجھ کو جتنا سرگرم دیکھ رہا ہوں، وہ نہ تو تیرے لیے اچھا ہے نہ بغداد کے لیے۔ تجھ کو بغداد چھوڑ کر کہیں اور چلا جانا چاہیے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں مسلمان ہو کر مسلمانوں کا بھائی بن گیا ہوں اس لیے ابھی میں بغداد ہی میں رہوں گا۔ جب میں یہ دیکھوں گا کہ اب بغداد میں میری ضرورت نہیں رہی، کہیں اور چلا جاؤں گا۔“

سلیمان شاہ نے درداغ سے کہا۔ ”تو کس سے بات کرنے لگا؟ غداروں سے! ان کے سائے سے بھی بچ کر رہنا چاہیے۔“

ابن علقمی دانت پیس کے رہ گیا۔ جاثلیق سے شکایت کہا۔ ”افسوس کہ شہزادہ ابو بکر نے ان لوگوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے، ورنہ میں انہیں ایسی سزا دیتا کہ.....“

جاثلیق نے ابن علقمی کو تسلی دی۔ ”وزیر محترم! آپ غم نہ کریں، وہ دن دور نہیں جب آپ ہی عظیم اور کامیاب قرار پائیں گے۔“

سلیمان شاہ درداغ کے ساتھ شہزادے کے پاس پہنچا۔ وہیں عزالدین کرد اور سلطان ایک کو بھی بلوایا گیا اور انہیں اپنی مہم کی ناکامی کی افسوسناک اطلاع دے دی گئی۔ اس اطلاع نے ان سب کو بہت افسردہ کر دیا مگر سلیمان شاہ اب بھی مایوس نہیں تھا، اس نے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا۔ ”بہر حال، میں اب بھی اپنے اس فیصلے پر قائم ہوں کہ عراق کی سرحدوں پر موجود منگول سپاہ کی سرکوبی کی جائے گی اور انہیں بغداد میں نہیں داخل ہونے دیا جائے گا۔“

سلیمان شاہ نے اپنے دوستوں سے ابن علقمی اور جاثلیق سے ملاقات اور باہمی تلخ کلامیوں کا ذکر بھی کر دیا۔ اس اطلاع نے سبھی کو اور زیادہ فکر مند کر دیا کیونکہ اس بارے میں ہر کوئی یہی رائے قائم کر رہا تھا کہ ابن علقمی، ہلاکو سے جو رابطہ قائم کیے ہوئے ہے شاید اس میں جاثلیق کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے۔

سب سے آخر میں یہ بات زیر بحث آئی کہ ان باتوں کو امیر المومنین کے گوش گزار کیا جائے یا نہیں؟ ہر ایک نے اس تجویز کی مخالفت کی کیونکہ ان میں خطرات ہی خطرات

جانا۔ میں تمہاری پیشکش کا انتظار کروں گا۔“

واپسی میں سلیمان شاہ سے بولا نہیں جا رہا تھا، اس نے درداغ سے کہا۔ ”حالات، وقت اور قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں لیکن میں بھی ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ میں منگولوں سے مقابلہ کروں گا، خواہ مجھے تنہا مقابلہ کرنا پڑے۔“

درداغ نے مشورہ دیا۔ ”اگر بغداد میں مقابلہ دشوار ہو جائے، تو مصر چلے چلیے کیونکہ وہاں تازہ دم فوج تول جائے گی۔“

سلیمان شاہ نے درداغ کو حیرت سے دیکھا۔ ”تو تیری ہمت بھی جواب دے گئی۔ تو بھی بغداد چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تو مصر جاسکتا ہے لیکن میں نہیں جاسکتا۔ میں تقدیر الہی سے نہیں بھاگ سکتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں تقدیر الہی سے تقدیر الہی کی طرف بھاگوں گا۔“

جب یہ دونوں بغداد کے مغربی دروازے سے داخل ہوئے تو انہیں نستوری عیسائیوں کی آبادی میں ابن علقمی نظر آیا۔ وہ جاثلیق نامی ایک نستوری سے ایک درخت کے سائے تلے مصروف گفتگو تھا۔ سلیمان شاہ جاثلیق سے اچھی طرح واقف تھا اور اس شخص کی بابت وہ یہ بھی سن چکا تھا کہ وہ کئی بار ہلاکو خان کی بیوی و قوز سے شرفِ ملاقات حاصل کر چکا ہے۔

ابن علقمی نے بھی ان دونوں کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ سلیمان شاہ منہ بناتا ہوا چلا گیا۔ درداغ دور ہی کھڑا ہو گیا۔

ابن علقمی نے جاثلیق سے کہا۔ ”جاثلیق! یہ ہے خلافت عباسیہ کا وقادار بہادر سلیمان شاہ ترکمان۔ اس کو پہچان لو، شاید کہیں اور ملاقات ہو جائے۔“ پھر سلیمان شاہ سے کہا۔ ”اور یہ نستوری فریقے کے معزز مسیحی جاثلیق۔ میں ان کے ذریعے ہلاکو خان سے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ دوستی دشمنی سے بہتر ہے۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”آپ کی دوستی تو بہت پہلے سے قائم ہو چکی ہے، اب یہ کس دوستی کی بات ہو رہی ہے؟“

جاثلیق نے سلیمان شاہ کو ذرا غور سے دیکھا۔ ابن علقمی نے کہا۔ ”دوست جاثلیق! یہ دل کے بہت اچھے ہیں مگر ان کی زبان ذرا تلخ اور ترش ہے، اس کا کچھ خیال نہ کرنا۔“

جاثلیق نے جواب دیا۔ ”میں حیران ہوں کہ بغداد کے ذمے دار لوگ بد ہوش کیوں ہیں۔ جہاں ہوش کی



تھے۔ بدرالدین کی اطلاع امیر المومنین کو اختلاج قلب میں مبتلا کر سکتی تھی۔

شہزادے نے کہا۔ ”سلیمان شاہ! میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ جائیے اور منگولوں سے نہر د آڑ ماہو جائیے۔“

سلیمان شاہ اور مجاہد الدین ایک خاموشی سے اپنی افواج میں چلے گئے اور اسے منگولوں سے مقابلے کے لیے تیار کرنے لگے، لیکن درداغ کو شہزادے نے اپنے ساتھ رکھا جبکہ درداغ عراق کی سرحدوں پر چلا جانا چاہتا تھا کیونکہ اب اس کی زندگی میں کوئی دشمنی نہیں رہ گئی تھی۔ شہزادہ اس کو لے کر اپنے محل میں چلا گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور مستقبل کے منصوبے بنانے لگے۔ درداغ نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اس کو عراق کی سرحدوں پر جانے کی اجازت دے دی جائے لیکن شہزادے نے ٹال مٹول سے کام لیا، بولا۔

”دردِ داغ! ہم شرمندہ ہیں کہ تو نے اسلام قبول کرنے کے بعد شاید ایک دن بھی سکون کا نہیں گزرا۔ ہم دونوں زندگی کے جس موڑ پر ملے ہیں، وہاں اضطراب اور انتشار کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ تجھ کو ہمدرد بھی ملا تو استادِ شمس الدین جیسا تاجر، تو نے محبت بھی کی تو ایک ایسی لڑکی سے جو تجھے قیمتا مل سکتی تھی مگر تیرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ تو علیہ کو حاصل کر لیتا۔ پھر تو میرے پلے پڑ گیا اور میں نے تجھے ایسا مصروف کر دیا کہ تجھ کو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔“

دردِ داغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! اب کئی گزری باتوں کا ذکر نہ کیجیے، اسی لیے میں سرحدوں پر چلا جانا چاہتا ہوں۔ میں خود کو اتنا مشغول اور مصروف رکھنا چاہتا ہوں کہ میں اپنا سب کچھ بھلا دوں۔ براہِ کرم آپ آئندہ استادِ مس الدین اور علیہ کا ذکر نہ کیجیے گا۔“

شہزادہ دردراغ کو دیکھتا رہا، پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ تو علیہ کو صرف اس لیے حاصل نہیں کر سکا کہ تیرے پاس آٹھ ہزار دینار نہ تھے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میں نے کہہ جو دیا کہ آپ علیہ کا ذکر نہ کیجیے۔“

وہ دونوں جس جگہ بیٹھے تھے، اس حصے کو جالی نما دیواروں نے محل کے اندرونی حصے سے الگ کر رکھا تھا۔ درواغ نے جالیوں کے دوسری طرف رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس مہ پاروں کو ادھر ادھر متحرک دیکھا۔ ان کے قبہتہوں اور مترجم نہی کی آوازیں کانوں میں رس اور دلوں میں کیف اتار رہی تھیں اور وہ جس ماحول میں بیٹھا تھا، اس

میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ بغداد اور اہل بغداد کسی قیامت صغریٰ سے ہلکنا رونے والے ہیں۔  
شہزادے نے کہا۔ ”اگر تو مجھ سے یہ رقم مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ان دنوں میں بیمارستان میں داخل تھا۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ”شہزادے! تمام مسلمانوں کی طرح میں بھی قسمت کا قائل ہو چکا ہوں۔ شاید علیہ میری قسمت ہی میں نہیں تھی۔“

شہزادے نے کہا۔ ”درداغ! اگر تو پسند کرے تو میں کسی حسین کنیز کا بند بچست کر دوں۔ تو اس کو لے کر مصر چلا جا اور اپنی زندگی سکھ چین سے گزار دے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تو مسلمان ہونے کے بعد سکون کی سانس تک نہ لے سکے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ کی پیشکش کا شکریہ شہزادے! اگر میں سرحدوں کی جنگ سے واپس آ گیا تو آپ کی پیشکش پر غور کروں گا بشرطیکہ یہ پیشکش اس وقت تک قائم اور برقرار رہی۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”مجھ کو امیر المومنین نے علیہ  
اور آٹھ ہزار دیناروں کی بابت بتایا تھا، وہ کیا چکر تھا؟“

درواغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! علیہ شاید بغداد ہی میں کہیں موجود ہے کیونکہ اس نے کسی بوڑھے آدمی کے ذریعے امیر المومنین کو یہ درخواست بھیجی تھی کہ جس شخص نے علیہ کو استاد شمس الدین سے خریدا تھا، علیہ سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ مجھ سے آٹھ ہزار دینار حاصل کر کے علیہ کو میرے حوالے کر دے گا۔ امیر المومنین نے اذراہ بندہ پروری اس درخواست پر یہ حکم صادر فرمایا کہ درخواست گزار کو آٹھ ہزار دینار خزانہ عامرہ سے ادا کر دیے جائیں اور علیہ درواغ کے حوالے کر دی جائے۔“

شہزادے نے بے چینی سے پوچھا۔ ”پھر اس پر عملدرآمد کیوں نہیں ہوا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں درخواست گزار  
بوڑھے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آیا۔ ایک دن اتفاق سے  
وہ مجھے بازار میں مل گیا تھا مگر مجھ کو دیکھتے ہی معلوم نہیں وہ  
کیوں فرار ہو گیا۔ میں نے اس کو بہت تلاش کیا مگر نہیں  
پاسکا۔ وائے قسمت، ہائے محرومی۔“

شہزادے نے اس کو تسلی دی۔ ”خدا کی رحمت سے  
 مایوس نہ ہو درواغ! اور نہ میری پیشکش موجود ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ابھی تو میں اس درخواست گزار کا انتظار کروں گا یا پھر اگر وہ کہیں اتفاقاً کسی موٹر بازار



یا گلی میں مل گیا تو میں اس کو زبردستی پکڑ لوں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ تو نے میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا؟“

شہزادے نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے پہلے اس کا یہی ارادہ رہا ہو کہ وہ آٹھ ہزار دینار لے کر علیہ کو تیرے حوالے کر دے گا لیکن بعد میں علیہ کے کیف اور شباب نے خود اس بوڑھے کو مسخر کر لیا ہو اور اس کا ارادہ بدل گیا ہو۔“

درداغ نے بے چینی سے شہزادے کو دیکھا اور پہلو بدل کے بیٹھ گیا۔ ”خدا کرے ایسا نہ ہو۔“

شہزادے نے اس رات درداغ کو اپنی محفل خاص میں بیٹھنے کا شرف بخشا۔ جب رات بھگنے لگی اور ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا تو شہزادے کے محل کا ایک گوشہ بیدار ہو گیا۔ فواکھات اور مشروب سامنے رکھ دیے گئے۔ دنیا کی منتخب حسین لڑکیاں اور عورتیں مسکرا مسکرا کر دلوں کو برمانے اور گرم کرنے لگیں۔ درداغ کو شہزادے کی زندگی کے اس رخ کا پتا ہی نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ شہزادہ منگولوں کے سلسلے میں جو کچھ کر گزرتا چاہتا ہے، اس میں خلوص اور اسلام کی محبت کو کتنا دخل ہے اور اپنی اس زندگی کی بقا اور تحفظ کا احساس کس حد تک شامل ہے؟

شہزادے نے کھجور کی شراب سے درداغ کی تواضع کی، بولا۔ ”یہ فیض ہے میرے دوست! اس کو پی اور ان مہوشوں میں اپنے غموں کو بھول جا۔“

ایک حسین دہلی پتلی لڑکی خشک میوؤں کی قاب لے کر درداغ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ کی قاب درداغ کی طرف بڑھا دی گئی تھی اور نظریں اس کے اپنے پاؤں کے انگوٹھے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”معزز مہمان! نوش فرما کر شکر گزار فرمائیں۔“

درداغ نے تکلف سے کام لیا، بولا۔ ”میں جو کچھ لیتا چاہوں گا خود لے لوں گا۔ آپ تکلف نہ فرمائیں۔“

شہزادے نے دور ہی سے حکم دیا۔ ”درداغ! جو کچھ مل رہا ہے اس سے انکار نہ کر کیونکہ ایسا کرنا کفرانِ نعمت میں شمار کیا جائے گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! مجھ کو اجازت دیجیے، میں جانا چاہتا ہوں۔“

شہزادے نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آیا۔“

جب وہ چلا گیا تو دہلی پتلی لڑکی نے درداغ کا ہاتھ پکڑ لیا، پوچھا۔ ”منگول مہمان! یہ تکلف کیوں؟ کیا تم لوگ شرمیلے ہوتے ہو؟“

درداغ کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا، وہ اپنا ہاتھ چھڑا

نہیں رکھا۔ لڑکی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور خشک میوہ اپنے ہاتھوں سے درداغ کو کھلانے لگی، بولی۔ ”جوانی میں بڑھاپے یا بچپن کے انداز زیب نہیں دیتے۔ میں تجھ کو گانا سنانا چاہتی ہوں، میں تجھ کو خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”مگر مجھ پر یہ مہربانی کیوں؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو شہزادے کا مہمان ہے، اس لیے اور کیوں؟“

درداغ لڑکی کے حسین ہاتھوں کا دیا ہوا خشک میوہ کھانے لگا۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اس لڑکی کے حسن اور سراپا کا جائزہ لیتا رہا لیکن جیسے ہی لڑکی نے اس کی طرف دیکھا، درداغ مسکرانے لگا اور نظریں چرا گیا۔

لڑکی نے پوچھا۔ ”کوئی گانا سناؤں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”تو مجبور کرے گی تو تیرا گانا بھی سن لوں گا لیکن یہ شہزادے صاحب کہاں تشریف لے گئے؟“

لڑکی نے کہا۔ ”وہ شاید ابھی نہیں آئیں گے۔“

لیکن لڑکی کا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ شہزادہ دوبارہ آ گیا۔

درداغ نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ”شہزادے صاحب! میرا دل غمزدہ ہے۔ میں آپ کی خاطر یہاں بیٹھ تو گیا ہوں مگر افسوس کہ میں یہ جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اپنے پندار کے خلاف کر رہا ہوں۔“

شہزادہ مسکرایا۔ ”فکر نہ کر درداغ! میرا دل کہہ رہا ہے کہ علیہ تجھے ضرور ملے گی مگر یہ کیا کہ نقد کو ادھار پر قربان کر دیا جائے۔“

دہلی پتلی لڑکی درداغ کے پاس ہی بیٹھ گئی اور گانے لگی۔ اس کا گیت رجا بیہ تھا۔

لڑکی نے درداغ کے افسردہ اور مردہ دل میں امنگیں پیدا کر دیں، جینے کا حوصلہ دے دیا۔ اس کو اس لڑکی میں بلا کی دل کشی محسوس ہوئی۔ لڑکی گانے کے بعد گلے کے نیچے کھلے ہوئے دو بٹن لگانے لگی اور اس کے بعد اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا تیرا نام صفیہ ہے؟“

لڑکی نے شوقی سے پوچھا۔ ”ہاں مگر کیوں، کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔ کیا تو شاعرہ بھی ہے؟“

لڑکی نے اس بار پھر شوقی سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں



شاعرہ بھی ہوں مگر تمہیں اس پر حیرت کیوں ہے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”میں حیران ہوں کہ بغداد  
کی لڑکیاں تک شاعری کر لیتی ہیں۔“

لیکن اسی وقت شہزادے نے صفیہ کو آواز دی اور  
اپنے پاس بلا لیا۔ درداغ کا مزہ کرکرا ہو چکا تھا، اسے  
شہزادے کی حرکت بہت ناگوار گزری۔ صفیہ شہزادے کا  
دل پہلانے لگی۔ وہ شہزادے کے پاس بھی اپنے شعر سنا  
رہی تھی۔ درداغ کچھ دیر تو صفیہ کی جدائی برداشت کرتا رہا۔  
بار بار یہی جی چاہتا کہ وہ یا تو صفیہ کو آواز دے کر بلا لے یا  
خود بھی وہیں پہنچ جائے لیکن یہ شہزادے کی محفل تھی، یہاں  
وہ اتنی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر  
صفیہ ایک بار پھر اس سے نہ ملی تو وہ کیا کرے گا۔

شہزادے نے کچھ دیر تک صفیہ کا اپنا کلام اس کی  
اپنی سر ملی آواز میں سنا۔ اس کے بعد درداغ کو اپنے پاس  
بلا لیا۔ درداغ تو چاہتا ہی یہی تھا، وہ شہزادے سے تین چار  
ہاتھ دور جا بیٹھا۔ یہاں سے صفیہ نسبتاً زیادہ قریب تھی۔ اس  
کے شالوں پر بکھری ہوئی زلفیں سیاہ گھٹاؤں کی مستی اور  
کیف پیدا کر رہی تھیں۔ ان بالوں کے اندر سے حد درجہ  
سرخ و سفید گردن کہکشاں کی طرح روشن تھی۔ درداغ سب  
کچھ بھول کر صفیہ کے حسن زار میں کھو گیا۔

شہزادے نے اسے کئی آوازیں دیں لیکن وہ نہیں سن  
سکا۔ آخر ایک کنیز نے درداغ کو جھنجھوڑ کر متنبہ کیا کہ کیا وہ  
سو گیا، اس کو شہزادہ آوازیں دے رہا ہے۔ درداغ چونک کر  
ندامت کے ساتھ شہزادے کی طرف رجوع ہو گیا۔

شہزادے نے کہا۔ ”ذرا اور قریب آ جا۔“  
درداغ شہزادے سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔  
شہزادے نے ہاتھ کے اشارے سے بزم کی فخرک اور  
رقصاں فضا کو منجمد سا کر دیا۔ شہزادے نے درداغ سے  
پوچھا۔ ”کیا علیہ، صفیہ سے زیادہ حسین تھی؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میں ان  
دونوں میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ دونوں ہی  
اپنی جگہ لا جواب ہیں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح  
علیہ کو تیرے حوالے کر دوں، بس اس کا ملنا شرط ہے۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”ویسے مجھ کو صفیہ بھی بہت اچھی  
لگتی ہے، بخدا اس نے میرے خفتہ ارماتوں میں آگ سی لگا  
دی ہے۔“

ایک کنیز نے درداغ کے کان میں آہستہ سے کہا۔

”سادہ لوح منگول! یہ شہزادے کی محفل ہے اس لیے زیادہ بے  
تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تو نے وہ مثل نہیں سنی کہ  
گھوڑے کے پیچھے سے ہوشیار رہو اور حاکم کے سامنے سے۔“  
شہزادے نے ازراہ مذاق پوچھا۔ ”یہ کیا باتیں ہو  
رہی ہیں؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”میں اس سادہ لوح نو جوان کو  
یہ بتا رہی تھی کہ شاہی محفلوں کے آداب کیا ہوتے ہیں۔“  
شہزادے نے کہا۔ ”میرے چچا کی محفل میں ان کے  
ایک دوست نے ذرا بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ چچا نے اپنے  
دوست کو خوار کر کے اسی وقت اپنی محفل سے نکلوا دیا تھا کیونکہ  
چچا کو اپنی غیرت اور عزت کا ہمیشہ بڑا خیال رہتا تھا۔“

درداغ سمجھ گیا کہ اس طرح شہزادہ کیا کچھ کہہ گیا  
ہے، وہ محتاط ہو گیا اور صفیہ پر سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔  
درداغ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور اکیلا محسوس کر رہا تھا، اس کا  
دل اچاٹ ہو چکا تھا۔

رات کے پچھلے پہر جب محفل برخاست ہوئی تو  
حساس درداغ گویا کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ شہزادے نے  
بقیہ رات گزارنے کے لیے ایک خواب گاہ پیش کر دی اور  
خود محفل میں کہیں گم ہو گیا۔ درداغ صبح تک نہیں سو سکا۔ صبح  
اسے ناشامل گیا لیکن شہزادے کا کہیں پتا نہ تھا۔ شہزادہ  
دوپہر سے ذرا پہلے درداغ کے پاس آیا اور اس کے ساتھ محل  
سے باہر نکلا۔ جب یہ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار  
سیمان شاہ ترکان، عزالدین اور سلطان ایک کے پاس  
جانے والے تھے، محل کے دروازے پر وہ بوڑھا ایک بار  
پھر نظر آیا جو علیہ کا درخواست گزار تھا۔ اس کے منہ سے بے  
ساختہ نکل گیا۔ ”شہزادے! یہی وہ بوڑھا ہے جو علیہ کی  
درخواست لے کر آیا تھا۔“

شہزادے نے کہا۔ ”پھر پکڑو اسے۔“  
درداغ نے آواز دی۔ ”بڑے میاں! ذرا رکنا تو۔“  
اپنی درخواست تو لے لو مجھ سے۔“

بڑے میاں نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور  
بھاگ کر محل کی آڑ میں کہیں گم ہو گئے۔ ان دونوں نے ان کا  
تعاقب بھی کیا مگر وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔  
شہزادے نے کہا۔ ”اب تمہیں زیادہ فکر کرنے کی کوئی  
ضرورت نہیں۔ میں نے اس بوڑھے کو پہچان لیا ہے۔“

لیکن درداغ یہ چاہتا تھا کہ اس بوڑھے کو اسی وقت  
تلاش کیا جائے۔ اس نے کہا۔ ”شہزادے! اگر یہ بوڑھا  
اسی وقت مل جائے تو میری ایک پریشانی کم ہو سکتی ہے۔“



بہت زیادہ ہے۔ ہم اپنے طاقتور دشمن کو جوش ایمانی سے ضرور شکست دے سکتے ہیں۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”ہمارے لیے پہلی بار ایسا نہیں ہو رہا ہے کہ ہم قلیل تعداد کو لے کر طاقتور اور عظیم دشمن سے ٹکر لینے جا رہے ہیں۔ ماضی میں بھی یہی ہوتا رہا ہے، آج بھی ایسا ہو رہا ہے اور مستقبل میں بھی یہی ہوگا۔ ہمیں اپنے رب پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

سلطان ایک نے کہا۔ ”جب ہم قلیل تھے تو صحرائے عرب سے اٹھ کر اقصائے عالم پر چھا گئے۔ اللہ نے چاہا تو ایک بار پھر ایسا ہی ہوگا۔“

ان مختصر تقریروں نے سپاہ میں غضب کا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ گھوڑوں کی ہنہٹاہٹ اور اونٹوں کی بلبلاہٹ سے پورا میدان گونج رہا تھا۔

شہزادہ اور اس کے ساتھی بہت خوش تھے۔ شام سے ذرا دیر بعد شہزادہ دردراغ کو لے کر چھاؤنی کے اس مکان میں چلا گیا جہاں وہ اکثر ٹھہرا کرتا تھا۔ رات کو ایک بار پھر یہ مسئلہ زیرِ غور آیا کہ دردراغ کو اس جہاد میں حصہ لینا چاہیے کہ نہیں۔ دردراغ نے کہا۔ ”میں خود کو اس مہم میں شامل کر کے بہت خوشی محسوس کروں گا۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”لیکن میں تمہیں اس وقت شریک مہم کروں گا جب میں یہ دیکھوں گا کہ تمہاری ہمیں اشد ضرورت ہے۔“

دردراغ نے کہا۔ ”شہزادے! میں اپنا غم غلط کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو بھی جہاد میں شامل ہو جانے دیجیے، اگر میں.....“ اس کی آواز میں اعتماد تھا، ارادوں کی مضبوطی تھی۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”دردراغ! کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تم جنگ کے میدان کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہو؟“

دردراغ نے عرض کیا۔ ”افسوس کہ میں آداب شاہی سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ اب اگر میں آپ کے سوال کا صحیح جواب دوں گا تو اس سے میں کہیں بے جا صاف گوئی کی غلطی نہ کر بیٹھوں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ یہ تو کیسی بے بسی، بے بسی باتیں کر رہا ہے؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”جب میں آپ کے محل میں آپ کی رقاہ سے محظوظ ہو رہا تھا تو مجھے آپ کی ایک کنیز نے آداب شاہی کے نام پر ڈرا سہارا بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے یہ.....“

شہزادے نے بات کاٹ دی۔ ”تم صحرا کے خانہ بدوش

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے، اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ سلیمان شاہ اور اس کے دونوں ساتھی جلد از جلد سرحدوں پر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔“

دردراغ خاموش ہو گیا۔ سلیمان شاہ، عزالدین کرد اور سلطان ایک شہزادے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ فوج تیار بھی کوچ کے لیے۔ دردراغ نے بے دلی سے سوچا کہ اسے ان سب کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ بغداد میں اسے جو کچھ مل رہا تھا، ملنے سے پہلے ہی کھویا جا رہا تھا۔ اس نے یہاں ایک فوج تیار کھڑی دیکھی، تیس پینتیس ہزار گھڑسواروں اور پیادوں پر مشتمل سپاہ، زرہوں اور خودوں میں غرق گھڑسوار اوپچی بنے ہوئے تھے۔ شہزادے نے اس سپاہ کا تقریباً دو گھنٹے تک معائنہ کیا اور فوج کے سرداروں کی اہمیت بڑھائی۔ دردراغ سوچ رہا تھا کہ دیکھوان میں سے کتنوں کو واپسی نصیب ہوتی ہے۔

شہزادے نے پوچھا۔ ”دردراغ! تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ کیا تو بھی اپنی قوم سے جنگ کرنا پسند کرے گا؟“ دردراغ نے جواب دیا۔ ”میری خواہش تو یہی ہے کہ سرحدوں پر جا کر میں بھی جہاد میں شریک ہو جاؤں، ویسے آپ لوگوں کے فیصلے میرے سر آئیں گے۔ آپ لوگ جو کہیں گے اس پر عمل کرنا میرا ایمان ہوگا۔“

سلیمان شاہ نے عرض کیا۔ ”شہزادے! دردراغ کی موجودگی اور ہماری فوج میں شمولیت بہت ضروری ہوگی۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے مگر دردراغ ابھی میرے ساتھ رہے گا۔“

عزالدین کرد نے پوچھا۔ ”ہم کل صبح منگولوں کے مقابلے پر روانہ ہو جائیں گے، کیا امیر المومنین نے اس کی اجازت مرحمت فرمادی ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”وہ میری ذمہ داری ہے، آپ جاسکتے ہیں۔“

اونٹوں اور گاڑیوں پر خیمہ و خرگاہ اور سامان رسد لا دیا جا رہا تھا۔ شہزادے نے ان کاموں میں بھی دلچسپی لی اور کئی جگہ سامان لدوانے میں اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر سپاہ کا دل خوش کر دیا۔

شام سے ذرا پہلے سب نے عصر کی نماز ادا کی اور عصر اور مغرب کے درمیان شہزادے نے فوج کے سامنے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا۔ ”مگو ہمارے وسائل محدود اور سپاہ کم ہے مگر سپاہ میں جوش ایمانی



تازگی ذرا سی ویر میں غائب ہو گئی، بولا۔ ”کچھ نہیں۔ پھر جانے دیجیے۔“

شہزادے نے اصرار کیا۔ ”مگر بات کیا ہے؟“  
درداغ نے کہا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ پھر جانے دیجیے۔“  
شہزادے نے کہا۔ ”میں کیوں جانے دوں؟ اور صفیہ کے ذکر سے تیرا مطلب کیا ہے؟“

درداغ گویا جان پر کھیل گیا، بولا۔ ”محترم شہزادے! صفیہ مجھ کو پسند آگئی ہے۔ میں نے آپ کی پرسش پر سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے۔ آپ صاحب اختیار ہیں، چاہیں تو اس گستاخی کی مجھ کو سزا بھی دے سکتے ہیں مگر میں ہر قسم کے خوف اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دل کی بات صاف صاف کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں شہزادے! میں اس کی سزا بھگتے کو تیار ہوں۔“

شہزادہ کچھ سوچ رہا تھا، پوچھا۔ ”اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ میں نے تیری درخواست منظور کر لی اور صفیہ تیرے حوالے کر دی جائے گی تو کیا تو اس وقت بھی عراقی سرحدوں پر جہاد کی خاطر جانے کو تیار ہو جائے گا؟“  
یہ بڑا سخت اور تازک سوال تھا، وہ فوراً ہی اس کا جواب نہیں دے سکا۔

شہزادے نے دباؤ ڈالا۔ ”تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں پھر بھی پہلے جہاد کروں گا اس کے بعد کوئی دوسرا کام۔“

شہزادے نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو جہاد پر جانے کی تیاری کر۔ صفیہ تجھے بخش دی جائے گی مگر ابھی نہیں، جہاد سے سرخرو واپسی کے بعد۔“

درداغ نے مزید کہا۔ ”اور محترم شہزادے! اس بوڑھے کی بابت ضرور معلومات حاصل کیجیے گا جس سے علیہ کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔“

شہزادہ مسکرایا۔ ”اگر تو علیہ سے محبت کرتا ہے تو اپنے دل میں صفیہ کے لیے کہاں سے گنجائش نکال لی؟ بند انسان بہت حریص اور املاک اندوز واقع ہوا ہے۔ یہ اپنی ملکیت میں اضافے کا حریص ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی کی طرح۔“

درداغ، سلیمان شاہ اور سلطان ابیک کے حوالے کر دیا گیا۔ اسے ایک گھوڑا، ایک دمشقی کوار، نیزہ، کمان اور تیروں سے بھری ہوئی ترکش عطا ہوئی۔ یہ 655 ہجری کی بات ہے کہ شہزادہ انہیں دو فرسخ (بارہ میل) تک چھوڑنے گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھاتا رہا اور

انسان ہو، شہری اور شاہی آداب کیا جائے۔ اگر تمہیں اس کا ہلکا سا درس دے دیا گیا تو تمہیں برا نہیں ماننا چاہیے۔ میں نے تمہیں عزت دی، مقام دیا اور اپنی قربت اور دوستی کا شرف بخشا۔ تم ان نوازشوں کو تو بھول گئے اور اپنی نام نہاد اہانت کا شکوہ کرنے لگے۔ انسان کو ایسا ناشکر نہیں ہونا چاہیے۔“

درداغ ایک بار پھر شرمندہ کیا جا چکا تھا۔ شہزادہ خاموش ہو گیا۔ وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا، اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے سے ندامت اور افسوس ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر اچانک سر اٹھایا اور کہنے لگا۔ ”جب مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ تو مسلمان ہو جانے کے بعد علیہ کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے تو مجھ کو بڑی فکر ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ میں اس کا تجھ سے ذکر کیے بغیر..... خیر چھوڑوان باتوں کو، میں اب بھی تجھ سے یہی کہوں گا کہ عشق و شوق میں کچھ بھی نہیں رکھا۔ اگر تو کہے تو میں علیہ کے بجائے کسی اور لڑکی کا انتظام کر دوں، بات ایک ہی ہے علیہ نہ سہی کوئی اور سہی۔ جس کو تو نے اب تک اپنا عشق سمجھ رکھا ہے وہ نوجوانی کا مطالبہ ہے، شباب کا تقاضا ہے۔“

درداغ کے جی میں آئی کہ کہہ دے کہ اگر علیہ نہیں مل رہی تو فی الحال صفیہ ہی عطا کر دی جائے لیکن وہ یہ بات اپنی زبان سے اس لیے نہیں کہہ سکا کہ کہیں اس طرح وہ شہزادے کی اہانت کا مرتکب نہ ہو جائے۔

شہزادے نے پوچھا۔ ”تو سوچنے کیا لگا؟“  
درداغ نے انک انک کر کہا۔ ”شہزادے! میں جو کچھ سوچتا ہوں، آداب شاہی کا احساس اور حفظ مراتب کا خوف کہنے نہیں دیتے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”یہاں آداب شاہی یا حفظ مراتب کا کیا کام۔ میں انہیں محل کی حدود تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوں۔“

درداغ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا سچ؟“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”تو میرا دوست ہے..... میرا اہل درد، میرا غمگسار، میں تیری بات کا برا نہیں مانوں گا۔“  
درداغ نے بڑی ہمت کی کہ دل کی بات کہہ دے مگر نہیں کہہ سکا۔ منہ کھلا اور بند ہو گیا۔

شہزادے نے کہا۔ ”ہاں ہاں کہو، ڈرو مت۔“  
درداغ نے پوچھا۔ ”شہزادے! کیا صفیہ آپ کی کنیز ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”صرف کنیز ہی نہیں، محبوب ترین کنیز..... مگر کیوں؟“  
درداغ کا دل ڈوبنے لگا۔ چہرے کی بشاشت اور



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





ان پر دیکھیں چڑھا دی گئیں اور کھانے کینے لگے۔ چلوں سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل فضا میں بلند ہونے لگے۔ سلیمان شاہ، سلطان ایک اور عزالدین کرد پہاڑیوں کا معائنہ کرنے چلے گئے۔ ان تینوں کا درداغ مشیر تھا۔ سلیمان شاہ نے درداغ کو زرہ بکتر پہنا دی تھی کیونکہ منگولوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ دھوکے سے حملہ آور ہو سکتے تھے۔ ان چاروں نے پہاڑیوں پر آدمیوں کو دیکھا۔ ان کی تیز نظروں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ منگول تھے جو مسلمانوں کی آمد اور مصروفیات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

سلطان ایک نے پوچھا۔ ”اگر یہ منگول ہم سے لڑنا بھی چاہیں تو وہ کس طرح لڑیں گے۔ ہمیں اپنا لشکر پیچھے ہٹ کر کافی دور اتارنا تھا تا کہ منگولوں کو ہمارے مقابلے پر آنے کے لیے ایک میدان مل جاتا۔ اب وہ ہمارے سامنے کس طرح آئیں گے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”میری خواہش ہے کہ وہ اپنے تھوڑے تھوڑے آدمیوں کی مدد سے ہم پر حملہ کریں اور ہم ان کا صفایا کرتے رہیں۔ اس طرح ہماری فوج کا حوصلہ بلند ہوگا اور منگولوں کا رعب ان کے دلوں سے نکل جائے گا۔“

درداغ کی تیز نظروں نے ایک پہاڑی پر چند آدمیوں کو کھڑے دیکھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو انگلی کے اشارے سے اس طرف متوجہ کیا پھر انہوں نے کئی بھاری بھاری پتھروں کو لڑھک کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ تینوں ان کی زد سے ہٹ گئے اور کچھ دیر بعد یہ پتھر پہاڑی چٹانوں سے ٹکراتے اور مزید پتھروں کے اضافے کے ساتھ میدان میں دور تک لڑھکتے چلے گئے۔

سلیمان کا اندازہ درست نکلا۔ دوسرے دن میں منگولوں کا ایک دستہ پہاڑیوں کے اندر سے نمودار ہوا اور دلیری سے مسلمانوں کی فوج میں داخل ہو گیا۔ اس دستے میں دو مسلمان بھی تھے۔ یہ دونوں اپنی پوشش اور عماموں سے پہچانے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے عربی میں کہا۔ ”تمہارا سردار کہاں ہے؟ منگول ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

ان سب کو سلیمان شاہ، عزالدین کرد اور سلطان ایک کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ انہیں درداغ بھی موجود تھا اور اپنے خدوخال اور چہرے مہرے اور لباس سے منگول پہچانا جاتا تھا۔ آنے والے منگولوں نے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

انہیں ہدایت کی۔ ”خبردار اپنی آبادیوں، باغوں، کھیتوں اور لوگوں کو نقصان نہ پہنچانا۔ دشمن سے خوفزدہ نہ ہونا اور انہیں شکست دے دینے کے بعد دور تک دھکیل دینا۔ وہاں نئی فوج بھرتی کرنا اور اپنی تعداد بڑھانا۔ دشمن سے چھیٹا ہوا سامان وہاں کی آبادیوں میں گشت کرانا تا کہ ان کے دلوں میں تمہاری عزت، وقعت اور رعب و دبدبہ قائم ہو اور منگولوں کی دہشت نکل جائے۔۔۔۔۔ اور دیکھو، آپس میں صلاح اور مشورے کرتے رہنا۔ اگر کہیں کسی بات پر اختلاف ہو بھی جائے تو اس کا علم سپاہ کو نہ ہونے پائے اور کوشش اور فراخ دلی سے اس اختلاف کو جلد از جلد دور کر دینا کیونکہ سرداروں کے اختلاف سے سپاہ کے موقع پرست اور دیانت دار مخلص و دھوکوں میں بٹ جاتے ہیں اور یہ دونوں اختلاف کے شکار سرداروں سے کھل مل کر اختلاف اور نفرت و خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دیتے ہیں اور انجام کار دونوں ہی اپنے دشمن کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔“

آذربائیجان کے جنوب مشرق میں موجود تاتاریوں کو مسلمانوں کے لشکر کی آمد کی خبر پہلے ہی سے ہو چکی تھی، وہ بھی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا خان، ہلا کو خان، جواب اہل خان (چھوٹا خان) کہلاتا تھا، خراسان میں بیضا بخدا پر لشکر کشی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ مسلمان اس کی طرف پیش قدمی کر کے جارحانہ انداز میں حملہ کر سکتے ہیں۔

سلیمان شاہ کی سرکردگی میں منگولوں کی سرحدی فوج پر حملہ کر دیا گیا۔ منگولوں نے ابھی تک شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی انہوں نے کبھی یہ سوچا تھا کہ ان پر بھی کبھی حملہ کیا جاسکتا ہے۔ پہاڑی کے نیچے ایک سرسبز و شاداب میدان میں سلیمان شاہ نے اپنے خیمے نصب کرا دیے۔ آگے پہاڑیوں کا سلسلہ تھا اور ان پہاڑیوں میں کھس کر منگولوں سے جنگ نہیں لڑی جاسکتی تھی۔ منگول سپاہ انہی پہاڑیوں میں موجود تھی۔ سلیمان شاہ کو معلوم تھا کہ منگولوں کو جیسے ہی مسلمانوں کی آمد کا علم ہوگا، وہ جوش غضب میں پہاڑیوں سے باہر آجائیں گے اور معرکہ برپا ہو جائے گا۔

اس سطح سبزہ زار پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھے بھی تھے۔ ان گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ آنا فانا دیکھتے دیکھتے خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا۔ مویشیوں کا شور پورے میدان میں گونجنے لگا۔ خیموں کے پیچھے آخر میں گاڑیاں، اونٹ اور باربرداری کے گدھوں کو کھڑا کر دیا گیا۔ اس جگہ بڑے بڑے پتھروں کے چو لبر بنا کر



سلیمان شاہ کے وسیع و عریض خیمے میں منگولوں کا وفد آلتی پالتی مار کے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ایک مسلمان نے بات چیت کا آغاز کیا، کہا۔ ”ہمارے منگول بھائی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم تینوں میں سردار کون ہے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”ہم تینوں ہی سردار ہیں، انہیں بات کیا کرنی ہے؟“

ایک منگول نے ترجمان کے ذریعے جواب دیا۔ ”ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تمہی سردار ہو اور بالفرض اگر تم تینوں سردار ہو تو پھر ہمیں تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے کیونکہ ہمارے لیے ایک ایسے لشکر کو شکست دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہے جس میں مساوی حیثیت اور اختیار والے تین سردار موجود ہوں۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”یہ تمہارا خیال خام ثابت ہوگا۔“

منگولوں نے پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر میں یہی سوال تم سے کروں کہ تم لوگ قراقرم سے یہاں کیوں آئے ہو تو؟“

منگولوں نے حیرت سے سلیمان شاہ کو دیکھا اور ترجمان کے ذریعے جواب دیا۔ ”تو گویا تم نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم سے جنگ کرو۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، صرف جنگ کرنے ہی نہیں بلکہ تم سے اپنا علاقہ خالی کرانے آئے ہیں۔“

بات بہت جلدی ختم ہو گئی۔ منگولوں کی طرف سے پوچھا گیا۔ ”کیا تمہیں اپنے انجام کا علم ہے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر تمہیں اپنے انجام کا علم ہوگا، تو ہمیں بھی علم ہوگا۔“

منگول سردار نے کہا۔ ”ایل خان (ہلاکو خان) خراسان میں موجود ہے۔ کیا تم لوگ اس کے عتاب اور غضب سے بالکل واقف نہیں؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر یہ بات ہے تو تم لوگ بھی خراسان چلے جاؤ اور یہ علاقہ ہمارے حوالے کر دو۔ ہم ہلاکو خان کے عتاب اور غضب سے نکر کر اس کی شدت کا اندازہ لگا لیں گے۔“

منگول سردار احانک در داغ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تو کون ہے؟ اور ان لوگوں کے ساتھ کیوں ہے؟“

در داغ نے جواب دیا۔ ”میں بھی تمہاری طرح ہی ایک منگول ہوں اور بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہو چکا ہوں۔“

ستمبر 2016ء کے شمارے کی  
مضمون نگار کیا بیاں، پرنسپل داستانیں

اولین صفحات پر کاشف زبیر کی یادگار تحریر۔ فتنہ

طاہر جاوید مغل کے قلم سے سگتے، لہو کو گرماتے..... انگاری

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے آوارہ گرد کی شہ زوریاں اور آواز گریں

تنویر ریاض، سلیم انور، جمال دستی،  
منظر امام اور عکس فاطمہ کی دل ربا، چلبلی اور دلچسپ  
کہانیاں، کھٹی میٹھی محفل، تبصرے، حکایتیں، لطیفے، اور بہت کچھ  
اپنے ہا کر سے آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرالیں

ماہنامہ سوسیٹس



سردار کی رہنمائی

شبیم شفیق

اور مختار آزاد کے سنگ



دونوں کو اس طرف دیکھ کر ہمیں اپنی ناکامیوں کا سبب معلوم ہو گیا۔

ایک نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”اس طرح کہ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس دور کے مسلمان نہایت عاقبت نامدیش اور سودوزیاں کے احساس سے عاری ہو گئے ہیں۔“

منگول چلے گئے۔ سلیمان شاہ نے متوقع حملے کے خیال سے اپنی فوج کو آراستہ کیا اور دایاں بازو عزالدین کرد اور بایاں سلطان ایک کے سپرد کر دیا۔ خود قلب میں رہا۔ اس نے ایک بار پھر سپاہ میں جوش پیدا کرنے کے لیے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا۔ ”بہر حال میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں یا تو ان منگولوں کے غرور اور ناقابلِ تسخیر ہونے کے ظلم کو توڑ دوں گا یا پھر خود عدم کی گہرائیوں میں چلا جاؤں گا۔“

منگولوں نے انہیں زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ خلافِ توقع وہ داہنی طرف کی پہاڑیوں سے میدان میں آ گئے۔ سلیمان شاہ کو اپنی فوج کا رخ بدلنا پڑا اور جب دونوں فریق ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے تو ایک عظیم الشان اور ہولناک تصادم ہوا۔ منگولوں نے بڑی بے جگری اور عجلت میں حملہ کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ اس قصبے کو طول نہیں دینا چاہتے اور فوراً ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔

سلیمان شاہ نے منگولوں کے پاک کی نودموں کے پرچم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان بے دینوں سے شکست کھانے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہمارا اپنے رب پر سے اعتقاد اور اعتماد اٹھ چکا ہے۔ مردہ پاک کی دموں کا پرچم اللہ تعالیٰ کے پرچم کو کس طرح سرنگوں کر سکتا ہے۔ مسلمانو! آگے بڑھو اور انہیں روندتے ہوئے اپنے علاقے واپس لے لو اور خدا کے نام اور پرچم کو عزت اور رفعت بخش دو۔“

منگولوں کا خیال غلط ثابت ہوا۔ مسلمان زمین سے بیہوش ہو کر جم چکے تھے۔ ان کے جوش میں دیوانگی پیدا ہو چکی تھی۔ ایک جیلا دستہ منگولوں کے پرچم کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور منگول اس کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ معرکہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ دونوں ہی تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے لیکن دوپہر تک سلیمان شاہ غالب آچکا تھا۔ منگولوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سلطان ایک ان کے تعاقب کی خاطر فوج سے الگ ہو گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ہزار سپاہ تھی۔ ابھی تک درداغ عزالدین کرد کے ساتھ لڑ رہا تھا لیکن جیسے ہی اس کی آنکھوں نے سلطان ایک کو اپنے دستے کے ساتھ

منگول سردار نے مسکراتے ہوئے اپنا منہ اپنے ساتھیوں کی طرف کیا اور کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ شاید تو وہی ہے، ہمارے اہل خانہ کا ایک مہرہ، درداغ جو اپنی بد قسمتی سے ہمارے دشمنوں سے جا ملا۔ تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ نہ اپنے لیے نہ مسلمانوں کے لیے اور نہ ہی ہم منگولوں کے لیے کیونکہ ہم مشتبه ہو گئے۔“

درداغ نے دونوں مسلمانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ان دونوں کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟“

منگول سردار نے ایک بار پھر سلیمان شاہ کو مخاطب کیا۔ ”تو ہم جاؤں اور تمہیں زبردستی دھکیل کر واپس کر دیں یا تم شرافت سے واپس چلے جاؤ گے؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”تم جو چاہو کر لیکن اگر مجھ سے پوچھو گے تو میں یہی کہوں گا کہ تم لوگ قراقرم واپس چلے جاؤ اور ہمارے علاقے ہمیں واپس کرو۔“

منگول سردار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”او کوڑ چشمو! واپس چلے جاؤ ورنہ جو کچھ ہوگا اس کا نہ تو تمہیں کوئی علم ہے نہ ہمیں، وہاں جاودانی نیلا آسمان اس سے ضرور واقف ہے اور پھر تمہیں اس نیلے آسمان تلے کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ یا تو تمہیں دھکیل کر صحرائے گوبی کے اس پار بھیج دیں یا پھر خود تباہ و برباد ہو جائیں۔“

منگول سردار ایک دم اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور کہا۔ ”چلو واپس چلیں، میں اپنی بے عزتی نہیں برداشت کر سکتا۔“ پھر درداغ سے کہا۔ ”شاید تو ہمت دلا کر انہیں چڑھا لیا ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے منگول سردار بلکہ یہ لوگ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لائے ہیں۔“

منگول سردار باہر نکلا اور اسلامی لشکر کو غور سے دیکھتا رہا پھر درداغ کو ایک طرف لے گیا، پوچھا۔ ”درداغ ابج بتا کیا یہ لوگ واقعی ہم سے جنگ کرنے آئے ہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”منگول سردار! یہ لوگ واقعی جنگ کرنا چاہتے ہیں، آپ لوگوں کی بہتری اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے کہیں اور چلے جائیں، ورنہ یہ لوگ زبردستی اپنا علاقہ خالی کرالیں گے۔“

منگول سردار نے دانت پیس کر کہا۔ ”آج تک ایسا کوئی پیدا نہیں ہوا، اگر پیدا ہوا ہے تو ہم اسے دوبارہ ناپید کر دیں گے۔“

سلیمان شاہ نے دونوں مسلمانوں سے کہا۔ ”آپ



ہی کے لیے ناقابل یقین تھی۔ ابن علقمی نے بادشاہ کو سمجھایا۔  
”امیر المومنین! یہ جو کچھ ہو رہا ہے بہت برا ہو رہا ہے۔“  
خلیفہ نے کہا۔ ”ابن علقمی! تم چپ ہو جاؤ، میں  
سلیمان شاہ اور اس کے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے نواز  
دوں گا۔“

شہزادہ اپنے باپ کی نظروں میں سرخرو ہو چکا تھا۔  
خلیفہ نے اس کو حکم دیا۔ ”سلیمان شاہ، عز الدین کرد اور  
سلطان ایک کو تحسین و آفریں کا ایک شاندار پیغام بھیج دیا  
جائے اور انہیں ہدایت کی جائے کہ وہ عراق کی سرحدوں پر  
موجود منگولوں کو مار بھگا لیں۔“

ابن علقمی نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! ان دنوں ہلاکو  
خان خراسان میں ہے، اس کو کافی دنوں بعد اپنے منگولوں کی  
شکست کا حال معلوم ہوگا پھر وہ جوش غضب سے بغداد کا  
رخ کرے گا حالانکہ وہ بار بار یہ یقین دلا چکا ہے کہ وہ  
مسلمان ہونا چاہتا ہے اور اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ ابو بکر  
سے کرنا چاہتا ہے مگر اسوس کہ آپ کے چند عاقبت نا اندیش  
سرداروں نے حالات بگاڑ کر رکھ دیے ہیں۔“  
خلیفہ نے شہزادے کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ”ابو بکر!  
تیرا کیا خیال ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! ہمیں اتنا  
مضبوط ہونا چاہیے کہ جب ہلاکو خان ہماری طرف دوستی کا  
ہاتھ بڑھائے تو دوستی برتری کی بنیاد پر ہو۔ ایک طاقتور ہو  
اور دوسرا کمزور، ایسی دوستی ناقابل اعتبار اور مشتبہ ہوگی اور  
اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔“

خلیفہ نے شہزادے کو رخصت کر دیا اور ابن علقمی سے  
سرگوشی میں پوچھا۔ ”ہاں، اب بتا تیری کیا رائے ہے؟“  
ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! شہزادہ  
ابھی نا تجربہ کار ہے۔ اس کی عالمانہ اور عاقلانہ باتیں دلوں  
پر اثر انداز تو ہو سکتی ہیں مگر ان میں حقیقت نام کو بھی نہیں  
ہوگی۔ جب انہیں واقعات اور تجربات کی کسوٹی پر رکھا  
جائے گا تو ان کا اثر کافور کی طرح کافور ہو جائے گا۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“  
ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”آپ سلیمان شاہ ترکمان،  
سلطان ایک اور عز الدین کرد کو فوراً واپس بلا لیں اور انہیں  
حکم دیں کہ وہ دارالخلافہ بغداد میں رہ کر جو کچھ کر سکتے ہیں  
کریں۔ ادھر میں ہلاکو خان کی خدمت میں ایک معذرت  
نامہ روانہ کیے دیتا ہوں۔“

خلیفہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا، پوچھا۔ ”پھر کیا

الگ ہوتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ سلطان ایک اپنے دشمن کے  
تعاقب میں جانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے کو سر پٹ بھگاتا  
ہوا سلطان ایک کے پاس لے گیا اور کہا۔ ”سلطان ایک!  
منگولوں کا تعاقب ہرگز نہ کرنا کیونکہ ان کی شکست بھی  
نہایت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا کرتی ہے اگر منگول  
شکست کھا گئے ہیں تو انہیں بھاگ جانے دیجیے اور ان کے  
چھوڑے ہوئے مسکن پر آپ قبضہ جمالیں۔“

سلیمان شاہ کو ان باتوں کا پتا نہیں تھا، اس نے چیخ کر  
سلطان ایک سے پوچھا۔ ”سلطان ایک! کیا بات ہے؟  
کیا فتح کے احساس نے تمہیں ست کر دیا ہے؟ تم منگولوں کا  
پیچھا کیوں نہیں کرتے؟“

درداغ بھاگا بھاگا سلیمان شاہ کے پاس پہنچا اور  
درخواست کی۔ ”مخترم سلیمان شاہ! آپ اپنے آدمیوں کو منع  
کریں کہ وہ دشمنوں کا پیچھا نہ کریں۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”میں منگولوں کے حملے  
سے اتنا پریشان نہیں ہوں جتنا اس خیال سے کہ بھگوڑے  
منگول جب پلٹ کر اچانک جوابی حملہ کر دیتے ہیں تو اس  
وقت تک لڑتے رہتے ہیں جب تک وہ مکمل فتح نہیں حاصل  
کر لیتے۔“

سلطان ایک کو تعاقب نہیں کرنے دیا گیا اور سلیمان  
شاہ نے اس پورے علاقے پر قبضہ کر لیا جس پر پہلے منگول  
قابض تھے۔ سپاہ نے منگولوں کے سامان پر بھی قبضہ کر لیا  
تھا۔ انہوں نے اس سامان کو کیجا کیا اور دوسرے دن وہاں  
کے مقامی لوگوں کے سامنے اس کی نمائش کی۔ وہ ہر ایک  
سے یہی کہتے پھر رہے تھے کہ کہاں کیا وہ عقیدہ اور خیال  
خام کہ منگول ناقابل شکست ہیں، ناقابل تسخیر ہیں۔ جوش  
ایمانی، بے داغ کردار اور بے مثال عزیمت اور شجاعت  
سے انہیں بھی شکست دی جاسکتی ہے۔

مسلمان اس فتح سے بہت خوش تھے مگر وہاں کی مقامی  
آبادی خوفزدہ تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ یہ بھگوڑے  
منگول سیدھے ہلاکو خان کے پاس جائیں گے اور پھر ہلاکو خان  
اپنے عظیم الشان عساکر کے ساتھ بلائے بے درماں اور قضائے  
مہرم کی طرح ہم سب پر ٹوٹ پڑے گا اور پھر ہر طرف ایک  
آگ اور خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوگا۔

سلیمان شاہ نے کوشش کی کہ مقامی آدمیوں کا ایک چھوٹا  
مونا دستہ ملازم رکھے مگر وہاں سے ایک بھی سپاہی نہ مل سکا۔  
سلیمان شاہ نے اپنی فتح کی خبر بغداد میں  
امیر المومنین اور شہزادہ ابو بکر کو فوراً روانہ کر دی۔ یہ خبر دونوں



ہوگا؟“ عزالدین نے پوچھا۔ ”اور ان علاقوں کا کیا ہوگا جو منگولوں سے بمشکل حاصل کیے گئے ہیں۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”میں انہیں یہاں کے مقامی لوگوں کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔ شاید خدا کو یہی منظور ہے کہ مسلمان ذلیل و خوار ہوں۔“

سلیمان شاہ کو معلوم تھا کہ اگر اس نے خلیفہ کا حکم نہیں مانا تو اسے معزول کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے خلیفہ کو لکھ دیا کہ میں فوراً واپس آ رہا ہوں۔

☆☆☆

سلیمان نے سرحدوں سے بھی منگولوں کو مار بھگا یا اور اس کی اطلاع بھی خلیفہ اور شہزادہ ابو بکر کو روانہ کر دی۔ خلیفہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سرحدوں سے جو خبریں آرہی ہیں، وہ درست بھی ہیں یا محض خوش فہمیاں اور گپ بازی۔

اس بار ابن علقمی برافروختہ ہو گیا، بولا۔ ”امیر المومنین نے ابھی تک سلیمان شاہ کو واپس نہیں بلایا؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ فرمان روانہ تو کر دیا ہے، وہ لوگ کسی روز بھی بغداد میں داخل ہو سکتے ہیں۔“

ابن علقمی نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! جب تک میں یہاں موجود ہوں، آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“

خلیفہ اتنا پریشان تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ان حالات میں وہ کیا کرے۔

سلیمان شاہ جہاد میں مشغول تھا کہ دربار خلافت کی طرف سے اس کو ایک خط موصول ہوا۔ اس خط میں سلیمان شاہ، عزالدین کرد اور سلطان ایک کو نام بنام یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ جہاں تک پہنچ چکے ہیں، اب اس سے آگے نہ بڑھیں اور فوراً واپس آ جائیں۔

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”دوستو! اس میں ابن علقمی کا ہاتھ ضرور ہوگا۔“

عزالدین کروڑے کہا۔ ”دوستو! تم سب کی خاطر میں ایک کام کر سکتا ہوں۔“

سلطان ایک نے پوچھا۔ ”کون سا کام؟“

عزالدین نے جواب دیا۔ ”میں ابن علقمی کو قتل کر سکتا ہوں تاکہ ہم سب اس کی خواست سے بچ جائیں۔“

سلیمان شاہ نے اس کی تردید کی، کہا۔ ”کم از کم میں اس قتل کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں ایک ایسی ریت پڑ جائے کہ ہر شخص کا اعتبار ہی جاتا رہے۔“

عزالدین کروڑے نے پوچھا۔ ”اب ہم کیا کریں گے؟“

سلیمان شاہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب ہمیں واپس بغداد چلنا ہوگا۔“

درداغ کو واپسی سے ذرا دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ دکھ اس بات کا کہ جب کامیابیاں ان کے قدم چومنے لگی تھیں تو خلیفہ نے انہیں واپس بلا لیا تھا۔ واپس بلانے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا اور خوشی اس بات کی کہ اب شاید علیہ سے ملاقات ہو جائے اور صفیہ بھی مل جائے۔ اس کے برعکس عزالدین کرد اور سلطان ایک کو غصہ آ رہا تھا۔

انہوں نے بھگت واپسی اختیار کی۔ دشمن سے چھینا ہوا سامان اونٹوں، گدھوں اور گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔ منگولوں سے نجات پانے والی بستیاں سلیمان شاہ اور اس کی سپاہ پر حیرت زدہ تھیں۔ یہ لوگ بغداد میں داخل ہوئے تو انہیں شہزادے اور اس کے ساتھیوں کے علاوہ ایک شخص بھی استقبال کے لیے کھڑا نہیں نظر آیا۔ فوج کو چھاؤنی میں چھوڑا اور بقیہ تینوں سیدھے خلیفہ کے دربار میں چلے گئے۔ شہزادہ ان کے ساتھ تھا۔ دربار میں بھی ان کا پرجوش استقبال نہیں ہوا۔

اس وقت امیر المومنین محل کے اندر تھے۔ انہیں سلیمان شاہ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کی اطلاع دی گئی۔

خلیفہ کچھ توقف سے یوں ناک بھوں چڑھائے نمودار ہوا کہ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھیوں کو بڑا افسوس ہوا۔ انہیں امید تھی کہ خلیفہ ان سے شفقت اور محبت سے پیش آئے گا اور ان کی فتح مندی کی خوب خوب داد دی جائے گی لیکن یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔

خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا منگولوں کو صحرائے گوبی کے اس پار دھکیل دیا گیا؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! مجھے اتنا موقع کہاں دیا گیا کہ میں انہیں صحرائے گوبی کے اس پار دھکیل دیتا۔ اتنی مختصر مدت میں اپنے دشمنوں کو اپنی سرحدوں سے دھکیل دینا ہی ایک کارنامہ ہے لیکن میں اپنے اس کارنامے پر فخر نہیں کرتا۔“ پھر آہستہ سے کہا۔ ”افسوس کہ میں گس دور میں پیدا ہوا؟“



خليفة نے سنی ان سنی کر دی۔ "افسوس کہ ہم نے تمہیں سرحدوں پر بھیج کر سخت غلطی کی۔ ہمیں منگولوں کو چھیڑنا نہیں چاہیے تھا۔"

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ "اگر ہم منگولوں کو نہیں چھیڑیں گے تو وہ ہم کو چھیڑیں گے اور ایک نہ ایک دن ہمیں اپنے ملک، اپنی زمین اور ہر چیز سے دستبردار ہونا پڑے گا۔" عزالدین کر دے عرض کیا۔ "امیر المومنین! آپ یقین کریں منگول ناقابلِ تسخیر ہرگز نہیں، آپ ہمت کریں ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

Downloaded From  
Paksociety.com

سلطان ایک نے کہا۔ "امیر المومنین! ہمارے پاس فوج کی کمی ہے۔ اگر ہمیں سو لاکھ یا ڈیڑھ لاکھ آدمی مل جائیں تو ہم منگولوں کے وجود کو ناپید کر سکتے ہیں۔" خليفة نے کہا۔ "لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان کی دشمنی مول لی جائے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے، بہت خطرناک ہے۔ ہمارے پاس سو لاکھ ڈیڑھ لاکھ فوج بھی نہیں۔"

سلیمان شاہ نے عرض کیا۔ "اگر مجھے اس کی خبر ہوتی کہ میری عدم موجودگی میں لوگ اپنی چال چل جائیں گے تو میں اس کا تذکرہ کرتا چلتا۔"

خليفة نے برہمی سے پوچھا۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میں کہتا یہ چاہتا ہوں کہ جب تک ابن علقمی ہم میں موجود ہیں، ہم اپنی کسی مہم یا منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ اس کو نکال کیوں نہیں دیتے؟"

خليفة نے بگڑ کر پوچھا۔ "اگر ہم اس کو نکال دیں تو اس کی ذمہ داریاں، اس کے فرائض کون سنبھالے گا؟" سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! اگر ابن علقمی کی موت واقع ہو جائے تو پھر یہ ذمہ داریاں اور فرائض کون سنبھالے گا؟"

خليفة نے اور برہمی کا اظہار کیا۔ "ہم میں ابن علقمی کی نگر کا ایک آدمی بھی نہیں، اگر ہے تو اس کو ہمارے سامنے لاؤ، ہم اس کو ابن علقمی کی جگہ دے دیں گے۔"

سلطان ایک نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! آپ شہزادہ ابو بکر کو کیا سمجھتے ہیں؟"

خليفة نے سوال کیا۔ "وہ میرا بیٹا ہے، اس کو میں بہتر سمجھ سکتا ہوں یا کوئی اور یا تم لوگ؟"

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ "اس کو میں، ہم لوگ زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ شہزادے کی صلاحیتوں سے ہم زیادہ واقف ہیں اور وہ لوگ جو شہزادے کے عزیز رشتے

دار ہیں، وہ شہزادے کو کیا سمجھیں گے؟" خليفة نے نرمی اختیار کی۔ "شہزادے کے بارے میں تم لوگ جتنی اچھی رائے رکھتے ہو، میں اس سے خوش ہوا لیکن میں اب بھی اپنی اس رائے پر قائم ہوں کہ ابن علقمی کا کوئی جواب نہیں، وہ عدمِ انتظار ہے۔"

عزالدین کر دے خليفة کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، اس نے کہا۔ "امیر المومنین! ابن علقمی غدار ہے وہ موقع پرست ہے، ابن الوقت، زمانہ ساز، وہ چالاک ہے عیار ہے لیکن عقلمند ہرگز نہیں۔"

خليفة نے کہا۔ "اگر ابن علقمی عقلمند نہیں ہے تو تم لوگ ایک ایسے آدمی کو تلاش کر لاؤ جو منگولوں کو ٹھنڈا کر دے۔ ہلا کو خان کے غیظ و غضب کا رخ موڑ دے۔"

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! افسوس کہ ایسا ممکن نہیں رہا۔ منگولوں کو ٹھنڈا کون کر سکتا ہے؟ ہلا کو خان کے غیظ و غضب کا رخ کوئی بھی نہیں موڑ سکتا۔ ان مصائب اور آفات کا ایک ہی علاج ہے، ایک ہی حل ہے، ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ان کے سامنے سینہ سپر ہوا جائے۔"

خليفة نے چٹکی بجا کی اور ان سب کا مذاق اڑایا۔ "فضول باتیں مت کرو، ہمارے پاس اتنی طاقت اور اتنی فوج کہاں کہ ہم ہلا کو خان کا مقابلہ کریں۔ ابن علقمی کہتا ہے کہ وہ یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے۔ وہ منگولوں کو ٹھنڈا کر سکتا ہے وہ ہلا کو خان کے غیظ و غضب کا رخ موڑ سکتا ہے، وہ بغداد اور خلافت عباسیہ کا لائق آدمی ثابت ہوا یا نہیں؟"

سلیمان شاہ نے کہا۔ "امیر المومنین! آپ ہماری باتوں پر غور کریں۔ ابن علقمی نے جو ذمہ داری قبول کی ہے وہ جھوٹ ہے، دھوکا ہے، سراسر فریب ہے اور ایک غدار کی خطرناک ترین چال ہے۔"

خليفة نے جواب دیا۔ "ہم تم سے بحث نہیں کریں گے مگر تمہیں یہ حکم دیں گے کہ آئندہ تم لوگ ابن علقمی کے خلاف بات نہیں کرو گے۔ اب تم لوگ جاسکتے ہو اور تم جس منصب پر ہو، اس پر برقرار رہو گے۔"

وہ لوگ بادل ناخواستہ قصر خلافت سے باہر آ گئے۔ شہزادے کو بڑا ملال ہوا کہ اس کی اور اس کے دوستوں کی کوششیں بیکار ہو گئی تھیں، اکارت گئی تھیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فوجی تیاریاں جاری رہیں اور ہلا کو خان کی حملہ آوری کے خیال کو نظر انداز نہ کیا جائے۔"

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ "بہر حال میں اپنی



خاموشی، سوچنے کا انداز یہ سب اس بات کے گواہ ہیں کہ تو بغداد سے بیزار ہو چکا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”اور اگر میں کہیں چلا جاؤں تو؟“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”تو یہ کہ میں اس صورت میں اپنی صفیہ کو نہیں دے سکتا۔ وہ بہت آرام سے میرے پاس رہی ہے..... میں چاہتا ہوں، اتنے ہی آرام سے وہ تیرے پاس بھی رہے۔ اس معاملے میں مجھ کو تیری مدد کرنا پڑے گی۔“

درداغ نے نفرت سے کہا۔ ”کوئی قوم جب اخلاقی دوالیا پن کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتی ہے، وہ اپنے وعدوں سے منحرف ہو جاتی ہے، جموٹے وعدے کرتی ہے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”لیکن میں اخلاقی دوالیا پن کا ابھی تک شکار نہیں ہوا۔ تو کچھ عرصہ بغداد ہی میں رہ۔ اس کے بعد جہاں چاہے چلے جانا۔“  
درداغ نے بھی حقارت اور بیزارگی سے کہا۔ ”لیکن میں بغداد میں نہیں رہنا چاہتا، میں صفیہ کو لے کر کہیں بھی چلا جاؤں گا۔“

شہزادے نے مجھے مجھے دل سے کہا۔ ”بہتر ہے، میں صفیہ کو تیرے حوالے کر دوں گا اور میں دیکھوں گا کہ تو بغداد سے کس طرح جاتا ہے۔“  
شہزادہ یہ کہہ کر باہر آ گیا۔ درداغ رسماً باہر تک آیا اور فوراً ہی اندر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

ہلاکو خان نے خلیفہ کو پیغام بھیجا کہ میں بغداد آ رہا ہوں، بغداد کے دروازے کھلے رکھیے کیونکہ یہ دروازے سلجوقیوں کے لیے بھی کھلے رکھے گئے تھے۔ ہم آپ کے مہمان بن کے رہیں گے اور اگر دروازے بند رکھے گئے تو ہمیں معلوم ہے کہ انہیں کس طرح کھولا جاتا ہے۔ ہم انہیں کھول لیں گے اور آپ کو شرف میزبانی بخش کے رہیں گے۔  
خلیفہ کو حیرت تھی کہ ہلاکو خان نے اپنے خط میں اپنے ساتھیوں کی شکست کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا اسے منگولوں کی شکست کا علم ہی نہیں۔ خلیفہ نے اپنے امراء اور منصب داروں کو ایک ضیافت میں مدعو کر لیا۔ اس میں ابن عظمیٰ، سلطان ایبک، سلیمان شاہ، عز الدین کرد اور شہزادہ ابوبکر بھی مدعو تھے۔ خلیفہ نے ہلاکو خان کا خط ان سب کے سامنے رکھ دیا اور پوچھا۔ ”ہلاکو خان نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں بغداد سے باہر اس کا استقبال کروں اور اس

استطاعت بھر کوششیں جاری رکھوں گا۔“  
درداغ بالکل خاموش تھا۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”درداغ! تو چپ کیوں ہے؟ تو کیا سوچ رہا ہے؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میں کیا سوچوں گا، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔“  
شہزادے نے پوچھا۔ ”کون سی غلطی؟ کیسی غلطی؟“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھے اسلام قبول کر کے ہلاکو خان کے پاس واپس چلا جانا چاہیے تھا۔ میں اپنے اسلام کو چھپا سکتا تھا اور یوں بھی اگر میں اپنے اسلام کو نہ بھی چھپاتا تب بھی ہلاکو خان شاید دینی معاملے میں مجھ پر معترض نہ ہوتا۔ بہر حال غلطی ہو گئی، اب اس کی تلافی کس طرح ہو؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔“

شہزادے نے درداغ کی بات بڑے بڑے کرب بڑے دکھ سے سنی تھی، اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تو اس قسم کی باتیں اس لیے کر رہا ہے کہ ابھی تک تو علیہ کو حاصل نہیں کر سکا۔ تو شرمندہ نہ ہو، پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“  
اس دن وہ خود درداغ کے گھر چلا گیا۔ وہ بڑی دیر تک درداغ کے ساتھ رہا اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ درداغ خود کو تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ڈراسی رنگینی اور لطف پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شہزادے سے پوچھا۔ ”شہزادے! میں محافز جنگ سے کامیاب و کامران واپس آیا ہوں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں درداغ! میں ہر بات جانتا ہوں لیکن میں کیا کروں؟ کچھ مجھ میں نہیں آتا۔“  
درداغ نے کہا۔ ”شہزادے! آپ نے مجھ سے کوئی وعدہ کیا تھا؟“

شہزادے نے کہا۔ ”میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔“  
درداغ نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”میں صفیہ کی بابت سوچ رہا تھا، اس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کے بارے میں یہ سوچا ہے کہ وہ تیرے حوالے کر دی جائے۔“  
درداغ نے کہا۔ ”پھر دیر کیوں؟ یہ تسال یہ تامل کیوں؟“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”بات صاف اور سیدھی سی ہے۔ تو صفیہ کو کہاں لے جائے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں صفیہ کو یہیں بغداد میں رکھوں گا کیونکہ ابھی میں کہیں بھی نہیں جا رہا ہوں۔“  
شہزادے نے بددلی سے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ تو بغداد میں نہیں رہے گا۔ تیرا چہرہ، چہرے کے تاثرات،



کے مقابلے کا دل نہیں تو آپ لوگ مزید تلخی نہ پیدا کریں۔ جس شہر کو وہ بزورِ شمشیر حاصل کر سکتے ہیں، اس کو یوں ہی شریفانہ انداز میں پیش کر دیں تو مناسب ہوگا کیونکہ اس سے بچت، حفاظت اور فائدے کے امکانات موجود ہیں۔ آپ لوگ رعایت، مروت اور رحم کے سحق قرار پائیں گے۔“

ابن علقمی دردراغ سے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی نظریں دردراغ پر لگی ہوئی تھیں اور چہرہ مسکرا رہا تھا۔

خلیفہ کی نظریں کبھی دردراغ کے چہرے کا جائزہ لیتیں اور کبھی ابن علقمی کے چہرے پر جم جاتیں۔ اس نے ابن علقمی سے کہا: ”ابن علقمی! کیا بات ہے تو کیوں خاموش ہے؟ تو کیوں نہیں بولتا؟“

ابن علقمی نے جواب دیا: ”امیر المومنین! اس منگول کو خدا جزائے خیر دے۔ اس نے ایمان اور دیانت سے کام لے کر وہی کچھ کہا جو میں کہنا چاہتا تھا بہر حال میں اس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اتنی محفل میں حق کی بات کہہ دی۔“

خلیفہ نے کہا: ”نہیں، بس اتنی سی بات کافی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنی رائے کا صاف صاف اور برملا اظہار کر دے۔“

ابن علقمی نے حاضرین پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی اور رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔ ”امیر المومنین! ہمارے چند تائیکجہ اور عاقبت نااندیش سرداروں نے بات بگاڑ دی ہے۔ ہمارا دشمن بہت طاقتور ہے مگر اس کا ظرف قابلِ داد ہے۔ وہ اگر چاہتا تو ہم سے ہماری زیادتیوں اور حماقتوں کا جواب طلب کرتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ مہمان بننے پر مصر ہے..... کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے، وہ مسلمان ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ خلافت عباسیہ سے قرابت داری کا خواہاں ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ ابوبکر سے کر دینا چاہتا ہے۔ ان حالات میں ہمارا فرض ہے کہ ہلا کو خان کی ہر بات مان لیں، وہ کہتا ہے کہ ہمارے لیے بغداد کے دروازے کھول دو مگر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں دردراغ کے کھول کر چند فرخ چل کے اس کا استقبال کرنا چاہیے۔“

خلیفہ مسکرا رہا تھا، بولا: ”سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ کیسی صائب رائے ہے، واللہ دل خوش کر دیا۔“

سلیمان شاہ نے افسردگی سے ابن علقمی کی طرف دیکھا۔ ”خدا تجھ کو ہدایت اور توفیق دے۔ اسلام اور مسلمانوں پر ایسا وقت آج سے پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔“ پھر خلیفہ سے کہا: ”امیر المومنین! اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ آپ

کے لیے بغداد کے سارے دروازے کھلے رکھوں، تو حضرات اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

شہزادہ ابوبکر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا، بولا: ”ہمیں ایسی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔“

سلیمان شاہ نے کہا: ”شہزادے! خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔“

عزالدین کرد نے کہا: ”کیا ہم بھیڑیے پر اعتبار کر سکتے ہیں؟“

سلطان ایک نے جواب دیا: ”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہم بھیڑیے پر اعتبار نہیں کر سکتے۔“

خلیفہ نے دردراغ کی طرف دیکھا، پوچھا: ”تو کیوں خاموش ہے، تو بھی تو کچھ بول۔“

دردراغ نے جواب دیا: ”ان بہت سارے لائق آدمیوں کی موجودگی میں، میں کیا بولوں؟“

ابن علقمی نے کہا: ”دردراغ! تو اپنی رائے ضرور دے گا۔“ پھر خلیفہ سے کہا: ”امیر المومنین! آپ اس کو جواب کا پابند فرما دیجیے۔“

خلیفہ نے دردراغ کو گھور کر دیکھا اور کہا: ”یہ بات آدابِ محفل کے خلاف ہے کہ کسی سے کچھ پوچھا جائے اور وہ اس کا جواب ہی نہ دے۔“

دردراغ نے جواب دیا: ”میرا خیال ہے دروازے کھول دینے چاہئیں، اس میں ہماری عزت اور فلاح ہے۔“

دردراغ کے اس جواب نے ہر ایک کو چوکنا اور حیرت زدہ کر دیا کیونکہ کسی کو بھی یہ یقین نہیں تھا کہ دردراغ کوئی ایسی رائے دے گا جو ابن علقمی کے مطابق اور اس کے مخالفین کے خلاف ہوگی۔

سلیمان شاہ نے حیرت سے سوال کیا: ”منگول دوست! تجھ کو کتنے میں خرید لیا گیا؟“

عزالدین کرد نے شبہ ظاہر کیا: ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو واقعی بغداد میں ہلا کو خان کا نمائندہ ہے؟“

سلطان ایک نے شریفانہ انداز اختیار کیا: ”مجھ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ دردراغ بدل گیا ہے، مجھ کو اس پر اعتماد ہے اور یہ سچا مسلمان ہے۔“

شہزادے نے پوچھا: ”دردراغ! میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ میری وعدہ خلافی کے زیر اثر تو نہیں؟“

دردراغ نے جواب دیا: ”نہیں شہزادے! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس وقت بھی پکا مسلمان ہوں۔ میں نے یہ رائے اس لیے دی ہے کہ جب آپ لوگوں میں ہلا کو خان



میری قسم پر یقین کریں گے تو میں اسی وقت قرآن پاک کو دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھ کر یہ قسم کھاتا کہ امیر المومنین! آپ کو، ہمیں اور مسلمانوں کو دھوکا دیا جا رہا ہے۔ مہمان کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے، وہ تنہا آتا ہے اور ایک آدھ کو اپنے ساتھ لاتا ہے مگر میں نے ایسا مہمان آج تک نہیں دیکھا کہ لاکھ سوا لاکھ فوج کے ساتھ مہمان ہونے کی خواہش کرے۔ ہمارا یہ مہمان اپنے ساتھ اردوئے معلیٰ لا رہا ہے۔ زرہ بکتروں، خودوں، ہتھیاروں، منجنیقوں اور دمدموں کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسا شاندار مہمان چشم فلک نے نہ تو پہلے بھی دیکھا ہوگا اور نہ آئندہ بھی دیکھ سکے گا۔“

ابن علقمی نے خلیفہ سے شکایت کیا۔ ”امیر المومنین! آپ اس کو بیخ فرمادیں کہ یہ میری ذاتیات پر حملے نہ کرے۔“ عزالدین کرد نے کہا۔ ”ہم وہی کہیں گے جسے حق سمجھیں گے۔“

خلیفہ نے ابن علقمی سے کہا۔ ”ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے ابن علقمی کہ درداغ کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ بقیہ حضرات کی رائے سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں مگر وہ رائے جذباتی ہے اور ایسا لگتا ہے گویا ان بھسوں نے بغداد اور اہالیان بغداد کی ہلاکت، تباہی اور بربادی کا اپنے اپنے دلوں میں تہیہ کر لیا ہے۔“

اس مجلس کے اختتام پر کھانوں کی ضیافت تھی۔ سلیمان شاہ، شہزادہ ابوبکر، عزالدین کرد اور سلطان ایک نے کھانا نہیں کھایا اور کسی سے بھی ملے بغیر ہی وہاں سے چلے گئے۔ درداغ ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

اس مجلس میں ابن علقمی کی خصوصی توجہ درداغ پر تھی، وہ بہت خوش تھا۔ اس نے درداغ کو اپنے پاس بٹھایا۔ حاضرین کی نظریں ان دونوں پر بار بار پڑ رہی تھیں۔ خلیفہ بھی انہیں بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔

ابن علقمی نے درداغ کی پشت تھپتھپائی، کہا۔ ”درداغ! تو نے دل خوش کر دیا۔ تو نے بغداد کو بچا لیا۔ آج میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”وزیر محترم! میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بعض حضرات ایسے الٹے سیدھے قدم اٹھا رہے ہیں کہ خدا کی پناہ! پھر مجھے احساس ہوا کہ میں غلط آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔“

ابن علقمی نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے تو بڑی کوشش کی کہ تو ان کا ساتھ چھوڑ کے میرے پاس چلا آ لیکن تو منحرف رہا۔“

خدا کا شکر ہے کہ تجھ کو ہوش آ گیا اور سیدھی راہ پکڑ لی۔“ وہ دونوں کھانا کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے، ابن علقمی نے خواہش ظاہر کی کہ درداغ اس کے ساتھ گھر چلے۔ درداغ نے وزیر کی بات مان لی۔

ابن علقمی اس کو اپنے گھر لے گیا۔ قصر وزارت میں مشجر پردوں نے ہر کمرے کو تاریکی میں ڈبو رکھا تھا۔ یہاں اندھیروں کی حکومت تھی۔ ابن علقمی نے اس کو جس کمرے میں بٹھایا تھا، وہاں کئی شمعیں روشن تھیں۔ درداغ کا دل گھبرانے لگا، بولا۔ ”وزیر محترم! کیا باہر چن میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کریں؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”ہے کیوں نہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں کو دوسرے بھی باتیں کرتے دیکھ لیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔“ ابن علقمی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر اچانک پوچھا۔ ”درداغ! کیا خیال ہے، کچھ چلے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں اتنا کھا چکا ہوں کہ اب ذرا سی بھی گنجائش نہیں رہی۔“

ابن علقمی بار بار پہلو بدلتا رہا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”درداغ! کیا تجھ کو معلوم ہے کہ ہلاکو خان نے تیری بابت کیا فیصلہ کیا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھ کو نہیں معلوم۔“ ابن علقمی نے پوچھا۔ ”تو نے اسلام میں ایسی کون سی خوبی دیکھ لی ہے کہ اس پر یوں قربان ہو گیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیا دیکھ لیا مگر اب یہ میرے دل سے نہیں نکل سکتا۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”ہلاکو خان عراق میں داخل ہوتے ہی تجھ کو گرفتار کر لیتا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”وزیر محترم! کیا آپ ہلاکو خان سے مجھ کو معافی دلوا سکتے ہیں؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”میں بیٹگی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا لیکن خیال تو یہی ہے کہ میں معافی دلوا دوں گا۔“

اس کے بعد اس نے اسی جگہ موٹے منگول کو بھی بلوایا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، درداغ نے اس کو پہچان لیا۔ ابن علقمی نے بے آواز بلند کہا۔ ”موٹے منگول! دیکھ یہ کیسا انقلاب آ گیا۔ درداغ ہمارے پاس چلا آیا۔“

موٹا منگول بے اختیار گلے لگ گیا۔ اس نے درداغ کی پیٹھ ٹھوکی، بولا۔ ”دوست! مجھ کو یقین تھا کہ تو ضرور واپس آئے گا مگر یہ تو بتا ان لوگوں سے کس بات پر جھگڑا ہوا؟“



درداغ نے جواب دیا۔ ”میرا جھگڑا کسی بات پر نہیں ہوا، بس مجھے وہ لوگ پسند نہیں آئے۔“

موٹے منگول نے کہا۔ ”بہت اچھا ہوا، ورنہ یوں بھی تم چند دنوں کے مہمان تھے، ان کے پاس۔ ہلاکو خان تمہیں عنقریب گرفتار کرالیتا۔“

درداغ نے پھر وہی سوال کیا۔ ”مجھ کو معافی بھی مل سکتی ہے بھلا؟“

موٹے منگول نے تامل سے جواب دیا۔ ”شاید نہیں، بہت مشکل کام ہے یہ۔ ہلاکو خان معاف کرنے کا قائل نہیں۔“

ابن علقمی نے ایک بار پھر تسلی دی۔ ”تو ایسا کر کہ میرا ہم عقیدہ ہو جا۔ میں تیرے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا ہلاکو خان آپ کی بات مان لے گا؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”امید تو ہے کیونکہ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”اگر اس نے آپ کی بات نہ مانی تو؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں تمہیں دور دراز کسی ایسے ملک میں بھجوا دوں گا جہاں یہ منگول نہ پہنچ سکیں۔“

موٹے منگول نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔ ”اگر تم کہیں دور چلے گئے تو مجھ کو بہت دکھ ہوگا۔ تم اپنے آبائی مذہب سے بیگانہ کیوں ہو گئے؟ جو لوگ اپنی چیزوں پر دوسروں کی چیز کو ترجیح دیتے ہیں، وہ خوش نہیں رہتے۔ میرا مشورہ ہے کہ تو اسلام کو چھوڑ دے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی بات نہ کر، میں اسلام نہیں چھوڑ سکتا۔“

ابن علقمی نے پوچھا۔ ”اگر تو ہمارا ایک کام کرنے پر آمادہ ہو جائے تو امید ہے کہ میں ہلاکو خان سے تیری زبردست سفارش کر سکوں گا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کون سا کام؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”تو شہزادہ ابو بکر وغیرہ سے دوبارہ تعلقات قائم کر لے اور ان کی مصروفیات اور منصوبوں کی خبریں مجھے پہنچایا کر اور میں یہ خبریں ہلاکو خان کو بھیج دیا کروں گا۔ میرا خیال ہے جب ہلاکو خان کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ عظیم الشان کام درداغ انجام دے رہا ہے تو وہ خوش ہو کر تجھ کو ضرور معاف کر دے گا۔“

درداغ وہاں کافی دیر رکا رہا۔ موٹا منگول درداغ کے معاملے میں کچھ زیادہ پر امید نہیں تھا کیونکہ وہ ہلاکو خان کے

مزارج سے واقف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ہلاکو خان اپنے دادا چنگیز خان کی طرح اپنے آدمیوں پر بہت مہربان تھا۔ وہ اپنے وفادار اور غیر مشتبہ ساتھیوں کو ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر فراخ دلی سے معاف کر دیا کرتا تھا لیکن غداروں اور مشتبہ ساتھیوں کے لیے اس کے دل میں کوئی گنجائش نہ تھی اور بد قسمتی سے درداغ کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس نے غیر مہذب منگول کی طرح صاف صاف کہہ دیا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ ہلاکو خان درداغ کو معاف کر دے گا۔ ایل خان (ہلاکو خان) کی نظر میں درداغ غدار ہے اور یا سلا میں غداری کی سزا موت ہے۔“

ابن علقمی نے موٹے منگول کو آنکھ دکھائی اور درداغ کو تسلی دی۔ ”میرا خیال ہے ہلاکو خان اپنے کام کے آدمی کو ہلاک نہیں کرے گا اور پھر میں خود درداغ کی سفارش کروں گا۔“

یہ ایک ابن علقمی کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ کمرے کے ایک گوشے میں پانی رکھا تھا۔ موٹا منگول پانی کے لیے اٹھا لیکن کھانسی کا دورہ اتنا شدید تھا کہ ابن علقمی موٹے منگول کا انتظار نہ کر سکا اور پانی تک دونوں ایک ساتھ پہنچے۔ موٹے منگول نے پیالے میں پانی انڈیل کر ابن علقمی کی طرف پھینک دیا۔ ایک گھونٹ پیتے ہی کھانسی میں کمی واقع ہو گئی۔ ابن علقمی نے موٹے منگول کو سمجھایا۔ ”کھانسی کا دورہ بناوٹی تھا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں تجھ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہمیں درداغ کے ذریعے بہت ساری باتیں معلوم کرنا ہیں۔“

وہ پانی کا پیالہ لیے ہوئے درداغ کے پاس واپس آ گیا، ایک آدھ بار کھانا اور سینے کو دونوں ہاتھوں سے داب کر بولا۔ ”اور تو بہ تو خدا بھی قبول کر لیتا ہے۔ ہلاکو خان تو پھر بھی انسان ہے، آدمی ہے وفادار یاں رنگ ضرور لاتی ہیں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”وزیر محترم! میں خود بھی منگول ہوں اور منگولوں کی سرشت سے خوب واقف ہوں۔ اب میں اس لائق نہیں ہوں کہ ہلاکو خان سے امید غنہ رکھوں۔ میں جو کچھ بھی کروں گا صلہ و معاوضہ سے بے نیاز ہو کر، تلافی یافتہ کے لیے۔“

ابن علقمی اس کی باتوں سے متاثر نظر آ رہا تھا، اس نے درداغ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آہستہ آہستہ دبانے سہلانے لگا۔ ”درداغ! تو عظیم ہے، لوگ تجھے سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کریں گے لیکن جب تو پہچان لیا جائے گا تو لوگ دل سے تیری عزت کریں گے۔“

درداغ نے کہا۔ ”اب مجھے ایک پریشانی اور درپیش ہے گی، میں نے امیر المومنین کے دربار و صاف صاف اور



کھری کھری باتیں کر کے اچھا نہیں کیا۔ شہزادہ ابوبکر اور سلیمان شاہ وغیرہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ بہر حال میں اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کروں گا۔“  
 موٹے منگول نے کہا۔ ”وہ کٹر مسلمان لوگ ہیں، اگر تو اسلام پر سختی سے قائم رہا تو اسی سے تیرا اعتماد دوبارہ بحال ہو جائے گا۔“

اس دن دردراغ پر شدید مایوسی کا دورہ پڑا۔ وہ ابن علقمی کے پاس سے اٹھا تو اداسی اور مایوسی نے اسے نڈھال اور مختل کر رکھا تھا۔ وہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ تنہائی نے اور زیادہ غمگین اور افسردہ کر دیا۔ ماضی کی تصویریں خیالوں میں متحرک تھیں۔ اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں معلوم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عام طور پر ہر کسی کی زندگی کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ زندگی ویران اور اداس کیوں ہو جاتی ہے؟ اسی تسلسل میں علیہ بھی داخل ہو گئی اور افسردگی اور اداسی میں اچانک کی واقع ہو گئی۔ رگ و پے میں کیف و لذت کا اثر و نفوذ شروع ہو گیا۔ علیہ کی یادوں میں تلخیاں بھی تھیں اور ان میں چند ایسے کردار بھی موجود تھے جن کی یاد نے کیف و لذت میں زہر سا گھول دیا اور منہ کا مزہ برا ہو گیا۔

☆☆☆

وہ دو دن تک گھر کے اندر ہی رہا، اس دوران کوئی اسے پوچھنے بھی نہیں آیا۔ عدم پرسی نے اسے اور زیادہ مایوس کر دیا۔ تیسرے دن سلطان ایک کا آدمی آیا اور بتایا کہ سلطان نے اسے یاد کیا ہے۔ دردراغ کے جی میں آئی کہ منہ کر دے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ نہیں آئے گا لیکن وہ انکار نہیں کر سکا۔

جب وہ سلطان ایک سے ملا تو وہاں عزالدین کرد سلیمان شاہ اور شہزادہ ابوبکر پہلے سے ہی موجود تھے۔ انہوں نے دردراغ کا مسکراہٹوں سے استقبال کیا لیکن ان مسکراہٹوں میں سرگرمی نہیں تھی، جوش و خروش نہیں تھا۔ سلیمان شاہ نے اعلان کیا۔ ”ہلاکو خان چل چکا ہے، اب باتوں کا وقت نہیں رہا۔ اس سیلاب کو روکنے کی عملی تدابیر اختیار کرنے کا وقت آ گیا ہے۔“

عزالدین کرد نے کہا۔ ”لیکن ہمارے ساتھی تھک چکے ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ ان میں جوش و خروش کس طرح پیدا کیا جائے؟“

سلطان ایک نے کہا۔ ”ہمیں اپنے ساتھیوں کو منانا آتا ہے۔ ان کی شکایات دور کر دی جائیں گی، غلط فہمیوں کا

ازالہ ہو جائے گا۔“  
 شہزادہ ابھی تک خاموش تھا، وہ بار بار دردراغ کی طرف دیکھتا اور جب دردراغ کی نظریں شہزادے کی طرف اٹھتیں تو شہزادہ نظریں چرا جاتا۔

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے، میں اپنا کام جاری رکھوں گا۔ میں کل اپنی فوج کے ساتھ موصل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا کیونکہ ہلاکو خان اسی سمت سے آرہا ہے۔“

شہزادے نے دردراغ سے کہا۔ ”ہلاکو خان کی آمد نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا ہے، روزمرہ کی زندگی میں چہل پہل کی جگہ خوف و ہراس نے قبضہ جمالیا ہے۔ میں اس ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا..... یا تو اس کو بدل دوں گا یا پھر اپنی جان دے دوں گا۔“

دردراغ نے پوچھا۔ ”مجھ کو کیوں بلایا گیا ہے؟“  
 سلیمان شاہ نے پوچھا۔ ”کیوں بلایا گیا ہے، کیا معنی؟ کیا تو ہم لوگوں سے علیحدہ ہو چکا ہے؟ کیا تو اس جنگ میں، فیصلہ کن آخری معرکے میں ہمارا سامنے نہیں بنے گا؟“  
 دردراغ نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی رائے امیر المومنین کے سامنے دے دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہلاکو خان سے مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔“

سلیمان شاہ نے مایوسی سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا تو ہمت ہار چکا۔“

عزالدین کرد نے کہا۔ ”اس جیسے معلوم نہیں اور کتنے ہیں، جو دردراغ کی طرح ہمت ہار چکے ہوں گے لیکن ہمیں اپنے حوصلے بلند رکھنا ہیں۔ میں سلیمان شاہ کا ساتھ دوں گا۔ یا تو منگولوں کو واپس دھکیل دوں گا یا میں خود مر جاؤں گا۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”ساتھیو! اور دوستو! خبر کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ موصل کا حکمران بدرالدین ہلاکو خان کی طرف سے اس کا ٹکراؤ اور مشاہد مقرر ہوا ہے۔ اب وہ ہلاکو خان کا آدمی ہے۔ سنا ہے اس نے اپنی حدود کا پل منگولوں کے حوالے کر دیا ہے، گویا اب ہلاکو خان اور ہمارے درمیان پل بھی حاصل نہیں رہا۔“

عزالدین کرد نے پوچھا۔ ”ہم سب یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”یہ فیصلہ کرنے کے ہم اپنے جملہ وسائل اور بہادری سے ہلاکو خان کے اعلان جنگ کو قبول کر چکے ہیں۔“

دردراغ نے سلیمان شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔



سلطان ایک نے اپنی رائے دی۔ ”جس طرح سواری کے دوران گھوڑے کی لگام ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے، اسی طرح میں خود بھی جنگ کے اونٹ کی ٹیل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہوں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”تب پھر یہ بات طے پاگئی کہ ہلاکو خان سے جنگ کرنا ہے۔“

تینوں نے بیک آواز کہا۔ ”ہاں، یہ بات طے پاگئی۔“

مجلس ختم ہوئی اور ہر کوئی تھکا تھکا اٹھا اور اپنے اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ راستے میں شہزادے نے اپنا گھوڑا درداغ کے برابر لاتے ہوئے کہا۔ ”درداغ! تو اس وقت میرے گھر چلے گا؟“

درداغ نے کوئی جواب نہیں دیا، بدستور چلا رہا۔ شہزادے نے اپنا گھوڑا اتنا قریب کر دیا کہ اتصال کے لیے ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں اپنا قرضہ چکا دوں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میں بغداد سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ نہ میں کسی کا مقروض ہوں نہ کوئی میرا مقروض ہے۔ مجھے کسی سے کوئی گدہ نہیں ہے۔“

شہزادے نے کہا۔ ”کچھ بھی سہی، آج تو تجھے میرے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد میں تجھے کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔“

درداغ شہزادے کے ساتھ اس کے قصر چلا گیا۔ بڑے بڑے درختوں کے اندر سے جھانکتا ہوا شہزادے کا محل دور سے نظر آ رہا تھا۔ شہزادے نے درداغ کو اسی حصے میں بٹھایا جہاں وہ ایک بار پہلے بھی بیٹھ چکا تھا۔ جالی دار دیواروں نے محل کے اندرونی حصے کو الگ کر رکھا تھا اور جالیوں کے پیچھے رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس عورتیں خوش رنگ تیلیوں کی طرح اتراتی پھر رہی تھیں۔ درداغ کو صفیہ یاد آگئی اور اس نے اس کے اندر ایک پھل بریا کر دی۔

شہزادے نے پوچھا۔ ”درداغ! تو اکھڑا اکھڑا کیوں رہتا ہے؟“

درداغ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”شہزادے! اس ذکر کو جانے دیجیے، کچھ اور باتیں کیجیے۔“

شہزادے نے اصرار کیا۔ ”نہیں، اس وقت یہی باتیں ہوں گی۔“

”میں نے جنگی ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا اور زندگی کے اس طویل دور میں میں نے ایک بات ہر جگہ دیکھی ہے۔ جنگوں کے محاذ ہمیشہ دو ہوتے ہیں۔ ہر جنگ دو محاذوں پر لڑی جاتی ہے۔ آپ لوگ اس میدان میں ابھی طفل کتب ہیں۔“

ہر کوئی درداغ کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ سبھی کا انداز گوش بر آواز تھا۔

درداغ بولتا رہا۔ ”میری باتیں غور سے سنئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جنگیں ہمیشہ دو محاذوں پر لڑی جاتی ہیں اور وہ جنگ جو میدان جنگ میں لڑی جاتی ہے، دوسری ہوتی ہے۔ پہلی جنگ، یا کسی بھی جنگ کا آغاز زمانہ امن سے ہوتا ہے۔ اس کو ہم خاموش جنگ (سرد جنگ) کہہ سکتے ہیں۔ اس کا آغاز خط و کتابت، تقریر اور دشمن کی صفوں میں اپنے آدمی داخل کر کے انتشار اور نفاق پھیلانے کی صورتوں میں ہوتا ہے۔ ہلاکو خان نے اس جنگ کا آغاز اسی طرح کیا تھا، جب وہ اس جنگ میں کامیاب ہو گیا تو زخمی حریف پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے میدان جنگ میں اتر رہا ہے۔ میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے بھی یہ جنگ دو محاذوں پر لڑی ہے؟ نہیں کیونکہ آپ لوگ اس کے ماہر نہیں ہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں اس جنگ کے نتائج سے بالکل مطمئن نہیں، ہم جنگ سے پہلے ہی اس جنگ کو ہار چکے ہیں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”درداغ! تیری باتوں میں وزن ہے۔ اگر تیرے جیسا ہوشیار اور بیدار مغز ہمیں پہلے میرا جانا تو شاید ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ بہر حال، ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس وقت تو اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان کے سامنے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرو۔ اس کو خوش آمدید کہو۔ اگر آپ کی خوش اخلاقی ہلاکو خان کے دل پر اثر کر گئی تو سمجھ لو نجات مل گئی ورنہ تباہی و بربادی اور ہلاکت ہر دو صورتوں میں یقینی ہے۔“

سلیمان شاہ نے بے دلی سے کہا۔ ”میں درداغ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میں اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میں میدان جنگ میں ہلاکو خان کا اس طرح استقبال کروں گا جس طرح ہونا چاہیے۔ اگر میں اس راہ میں مارا بھی گیا تو میرا ضمیر مطمئن ہوگا کہ میں تقدیر الہی سے نہیں جیت سکا۔“

درداغ نے کہا۔ ”اپنا اپنا انداز فکر ہے۔“



بات کر لیں لیکن اگر میں آزاد ہوتا تو میں اسی وقت بات کیے بغیر ہی چلا جاتا۔“

شہزادے نے تلخ و ترش لہجہ اختیار کیا۔ ”بات بے بسی یا قید کی نہیں ہے، تو یہاں بھی آزادی ہے۔ جب بھی جانا چاہے، جاسکتا ہے لیکن میں نے تجھ میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ پایا، وہ بہت عجیب اور تکلیف دہ ہے۔“

درداغ نے تحقیر آمیز لہجہ میں کہا۔ ”شہزادے! بادشاہوں اور شہزادوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ عہد شکنی کریں، اپنے وعدوں سے منحرف ہو جائیں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں نے عہد شکنی کی ہے، وعدہ خلافی کی ہے۔ میں نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کروں گا۔“

درداغ نے منہ بنا کر کہا۔ ”بہر حال اگر آپ کو اپنی آنکھ کا شہسیر نہیں نظر آ رہا تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ دل جزیں گے، دل ملیں گے پھر الگ ہو جائیں گے، یہ تو پرانی ریت ہے اس دنیا کی۔“

شہزادے نے کہا۔ ”درداغ! میں نے تجھ کو ہمیشہ غیر معمولی نوجوان سمجھا ہے لیکن جب ایک لڑکی یا عورت آزمائش بن کر سامنے آکھڑی ہوئی تو تو اور تیرا کردار ریت کی دیوار کی طرح ڈھسے گیا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! اپنے محل میں بیٹھ کر جو چاہو کہہ سکتے ہو لیکن بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا جو پورا نہیں کیا۔ میں نے بھی آپ کو بڑا سمجھا تھا لیکن جب وعدے اور معاہدے کی کسوٹی پر آپ کو کسا گیا تو آپ کھوٹے ثابت ہوئے۔“

شہزادہ تھملا گیا، وہ تیزی سے اندر گیا اور کچھ دیر بعد جب واپس آیا تو صفیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ شہزادے نے صفیہ کو درداغ کے آگے ڈال دیا۔ ”میں وعدہ خلاف یا معاہدہ شکن ہرگز نہیں۔ میں صفیہ کو جس طرح تیرے حوالے کرنا چاہتا تھا، وہ ایک شاندار طریقہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک محل اور شاندار باغ بھی دیتا لیکن تو نے مجھ پر شبہ کیا، مجھ کو ذلیل و خوار کیا، مجھ سے کنارہ کشی اختیار کی اور مجھ سے بولنا، بات چیت کرنا ترک کر دیا۔ بتا کیا تو نے انصاف کیا میرے ساتھ؟ نہیں، بالکل نہیں۔ صفیہ کو لے اور اسی وقت میرے محل سے نکل جا۔ میں آئندہ تیری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔“

درداغ صفیہ کو یوں اپنے قریب دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا۔ اس کو اپنی آنکھوں اور حواس پر یقین نہیں

آ رہا تھا۔

شہزادے نے سختی سے کہا۔ ”تو یہاں سے جاتا ہے یا نہیں۔ میں آخری بار تجھ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دے رہا ہوں۔ اس کے بعد میں غلاموں کو بلوا کر تجھ کو دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔“

درداغ نے چند باتیں کرنے کی اجازت طلب کی، بولا۔ ”شہزادے! میں چلا جاؤں گا لیکن مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں جانے سے پہلے چند باتیں کرتا جاؤں۔ آپ کی باتوں کا میرے پاس بھی جواب ہے۔“

شہزادے نے بدرجہا مجبوری اجازت دے دی۔ ”اجازت ہے لیکن اس کے لیے میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔“

درداغ نے کہا۔ ”آپ نے کھیا کر جب اپنا وعدہ پورا بھی کیا تو روپیہ ایسا رکھا کہ میں خوفزدہ ہو کر اپنے آپ پر نادم ہو جاؤں لیکن میں نادم ہونے کو تیار نہیں۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”تو اپنی بات کہہ چکا یا کچھ اور کہنا ہے؟“

درداغ نے صفیہ کو دوبارہ شہزادے کی طرف دیکھ کر دیا۔ ”جس طرح آپ اپنا عہد پورا کر رہے ہیں، اس طرح میں صفیہ کو قبول نہیں کروں گا۔“

شہزادہ ایک بار پھر الجھن میں پڑ گیا، بولا۔ ”درداغ! بات ختم کر اور صفیہ کو لے کر دفعان ہو جا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! بات اپنے اپنے کردار کی ہے۔ جب میں نے ہلا کو خان کو چھوڑ دیا، اپنا آبائی دین ترک کر دیا پھر یہ صفیہ اور علیہ کیا چیز ہیں۔ اب میں معرچلا جاؤں گا اور وہاں پر قسمت آزمائی کروں گا۔“

شہزادہ نرم پڑ گیا، بولا۔ ”تو کہیں بھی چلا جا، اپنے ساتھ صفیہ کو ضرور لیتا جا۔“

درداغ نے باہری دروازے کا رخ کیا، بولا۔ ”میں اس کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا، میں تنہا آدمی اس کو کہاں کہاں لیے پھروں گا؟“

شہزادے نے انتہائی سلجھا ہوا انداز اختیار کیا۔ ”لیکن مجھ کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”آپ کو ان سے دلچسپی ہو یا نہ ہو لیکن مجھ کو آپ سے دلچسپی ضرور ہے۔“

شہزادے نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ ”تو صفیہ کو اسی وقت اپنے ساتھ لے جا، اب میں اس کو اندر نہیں لے جاؤں گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میں صفیہ کو



میں طوفان سا کھڑا کر دیا، پوچھا۔ ”اور وہ خط جو علیہ نے لکھا تھا امیر المومنین کے نام، اس کا کیا مقصد تھا؟“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”جب میں نے یہ دیکھا کہ علیہ کی مفقود انجیری نے تجھ کو اور زیادہ پریشان کر دیا ہے اور تو مایوس مایوس سا سردوں کی طرح چلتا پھرتا رہتا ہے تو میں نے علیہ کی موجودگی کو اس خط کے ذریعے عیاں کر دیا۔ وہ بوڑھا جو خط لے کر تیرے پاس گیا تھا اور بعد میں کسی جگہ تجھ کو نظر بھی آیا تھا، میرے محل کا ایک خدمت گار ہے۔“  
درداغ نے گویا مدہوشی میں سوال کیا۔ ”اس وقت علیہ کہاں ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”اسی محل میں، یہیں کہیں قریب ہی۔“  
درداغ نے پوچھا۔ ”کیا میں اس کو دیکھ سکتا ہوں؟“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں! تیرا یہ سوال کہ کیا میں اس کو دیکھ سکتا ہوں، اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ تو نے ابھی تک میری باتوں پر یقین نہیں کیا اور سمجھ رہا ہے کہ میں تجھ سے جھوٹ بول رہا ہوں۔“  
درداغ نے کہا۔ ”شہزادے! کیا آپ اس کی ایک جھلک دکھا سکتے ہیں؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”ہاں، دکھا سکتا ہوں۔“  
درداغ نے کہا۔ ”پھر براؤ کرم میں اس کی ایک جھلک اسی وقت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”تب پھر کچھ دیر صبر کر..... میں ابھی اس کا دیدار کرادوں گا۔“  
شہزادہ اندر چلا گیا۔ صفیہ دونوں کی باتیں غور سے سن رہی تھی، شہزادے کے جانے کے بعد پوچھا۔ ”کیا تو علیہ سے محبت کرتا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، بہت زیادہ۔ میں علیہ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں، کیا وہ اندر موجود ہے؟“  
صفیہ نے کہا۔ ”ہاں، وہ اندر موجود ہے۔ میں نے اس کو دیکھا ہے، وہ اداس اداس غمزہ سی لڑکی۔ میں نے اس کی بابت یہ سنا تھا کہ وہ محل میں کسی کی امانت ہے۔“  
شہزادہ، علیہ کو لے کر آگیا۔ درداغ اس کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کی بے تالی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، خود علیہ بھی درداغ پر نظریں جما کر تصویر کی طرح ساکت و جامد ہو گئی۔

شہزادے نے کہا۔ ”درداغ! تو علیہ کو بھی اسی وقت اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ اب میں اس کو محل میں نہیں

اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر ایسی صورت میں، جب آپ سچے دل سے اور نرمی سے صفیہ کو میرے حوالے کریں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں زندگی بھر اس آگ میں جلتا رہوں گا کہ میں نے صفیہ کو آپ سے زبردستی حاصل کیا۔“  
شہزادے نے درداغ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”اچھا اب تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جاتا کہ میں اپنی طبیعت پر قابو پا لوں، اس دوران چند ضروری باتیں اور ہو جائیں گی۔“  
درداغ نے شہزادے کو موم کی طرح پگھلا ہوا دیکھا تو اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

شہزادے نے کہنا شروع کیا۔ ”درداغ! میں تیری حیل جتوں کا دل سے قائل ہوں، میں تیرا بہت بڑا قدردان ہوں۔ تو یہ جان کر اور زیادہ حیرت زدہ رہ جائے گا کہ علیہ کو تیرے لیے میں نے ہی آٹھ ہزار دینار میں استاد شمس الدین سے خرید لیا تھا، تیرے لیے، تیری خاطر..... لیکن میں نے اس کو راز میں رکھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اس کو اس وقت تک راز میں رکھوں جب تک ہلا کو خان اور ہماری فوجوں میں فیصلہ کن تصادم نہ ہو جائے کیونکہ پہلے میرا یہ خیال تھا کہ ہم ہلا کو خان کو شکست دے دیں گے اور اس وقت فتح کی خوشی میں میں علیہ کو تیرے حوالے کر دیتا۔“

درداغ کو ایسا لگا، گویا وہ خواب دیکھ رہا ہو، پوچھا۔ ”پھر..... پھر کیا ہوا؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”پھر جب میں نے صفیہ کے سلسلے میں تجھ کو بے صبر اور گرم طرف پایا تو مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے بیک وقت دو فیصلے کیے، ایک تو یہ کہ میں تجھ کو ذلیل اور شرمندہ کر کے صفیہ کو تیرے حوالے کر دوں گا اور دوسرے یہ کہ میں.....“

درداغ شہزادے کا سکوت برداشت نہ کر سکا، جلدی جلدی پوچھا۔ ”اور وہ دوسرا فیصلہ کیا تھا؟“

”دوسری تجویز یہ تھی کہ میں علیہ کو تیرے حوالے نہیں کروں گا۔ شہری افراتفری میں وہ خود تیرے پاس پہنچ جائے گی اور اس وقت میں تجھ کو مصروف نہ کر دوں گا۔ ایسا میں اس لیے کرتا کہ میں تجھ پر یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں علیہ کو تیری خاطر آٹھ ہزار دینار میں خرید کر کوئی احسان کر رہا ہوں۔“ شہزادے نے فرط غم میں اپنا سر جھکا لیا۔ ”لیکن تو نے جو روش اختیار کی، اس سے میرا دل ٹوٹ گیا اور میں وہ کچھ نہ کر سکا، جو کرنا چاہتا تھا۔“

علیہ کے امید افزا ذکر نے درداغ کے دل و دماغ



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                   |                 |                  |
|---------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد    | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو    | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ       | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



ہر راستہ اجنبی اور بے مروت سا ہو جائے گا۔ بہر حال، میں یہی کہوں گا کہ انسان کو وقت سے پہلے ہی کچھ کر لینا چاہیے کیونکہ جب بیماری اور مصائب یلغار کر دیں تو پھر ان سے پناہ کیونکر ملے گی۔“

”درداغ اپنے مسائل سے نمٹنا جانتا ہے۔ میں اس وقت تک بغداد ہی میں رہوں گا جب تک کہ ہلا کو آنے جائے۔ اس کے بعد میں سوچوں گا کہ کیا کروں؟“

شہزادے نے سوچا کہ شاید فرط جوش میں درداغ کا دماغی توازن درست نہیں رہا۔ اس نے درداغ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

درداغ نے علیہ اور صفیہ کے ہاتھ پکڑے اور شہزادے سے جانے کی اجازت چاہی۔ شہزادے نے ان دونوں کے لیے گاڑی کا انتظام کر دیا۔ جب وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں تو درداغ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر گاڑی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

☆☆☆

سلیمان شاہ، جنگی تیاریوں میں مشغول تھا۔ ابن علقمی، درداغ کا انتظار کر رہا تھا لیکن درداغ عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ عزالدین کرد اور سلطان ایک اس فکرمیں کھلے جارہے تھے کہ ان کے پاس ہلا کو خان سے مقابلہ کرنے کے لیے معقول ساز و سامان نہیں ہے۔ اس افراتفری اور یوم النشور میں ابن علقمی، درداغ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ آخر کار یہ دونوں ایک چوراہے پر مل گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بڑے اشتیاق سے دیکھا اور گلے لگ گئے۔ ابن علقمی نے کہا: ”میں تو حیران انتظار ہی کرتا رہ گیا۔“

درداغ نے جواب دیا: ”میں بھی کسی خبر کا انتظار کرتا رہ گیا۔ سلیمان شاہ، عزالدین کرد اور سلطان ایک اپنے دوستوں اور حلیفوں کے درکھنڈارے تھے لیکن ہر جگہ سے انہیں مایوسی ہی میں جواب ملا اور وہ مجھ کو کوئی نئی خبر نہ دے سکے۔“

ابن علقمی نے شک و شبہ سے پوچھا: ”کیا یہ درست ہے کہ شہزادے نے علیہ اور صفیہ نامی دو لڑکیاں تجھے بخش دی ہیں؟“

اس نے جواب دیا: ”ہاں، یہ خبر درست ہے اور میں اسی خوشی میں گھر سے باہر نہیں نکلا۔“

ابن علقمی نے کہا: ”کچھ کر، کوئی چھوٹی موٹی ہی خبر فراہم کر، میں اس کو نمک مرچ لگا کر آگے بڑھا دوں گا۔“

درداغ نے جواب دیا: ”ایک خبر ہے، میں نے سلیمان شاہ سے سنا ہے کہ ہلا کو خان نے موصل کے فرماں

رکھوں گا۔“

درداغ اپنے دل میں کچھ کچھ شرمندہ ہوا، آہستہ سے بولا۔

”شہزادے! میں اپنی روش اور سخاوتوں پر شرمندہ ہوں۔“

شہزادے نے کہا: ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو جاسکتا ہے۔“

درداغ نے شہزادے کا ہاتھ گرم جوش سے پکڑ لیا، بولا: ”میں نے آپ کو جو تکلیف پہنچائی ہے، اس پر معذرت خواہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔“

شہزادے نے کہا: ”میں نے کہہ جو دیا کہ اب تو جاسکتا ہے۔ میں اپنے دل میں کینہ یا کدورت نہیں رکھتا۔“

درداغ نے علیہ اور صفیہ کو باری باری دیکھا، بولا: ”بہتر ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے کہ اب میں یہاں نہ رکوں تو میں چلا جاؤں گا۔“

شہزادے نے پوچھا: ”تو اپنے ساتھ علیہ کو لے جائے گا یا صفیہ کو؟“

درداغ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ”یعنی اس سوال سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ صفیہ عہد باہمی کا ایفا ہے اور علیہ میرا انعام۔ میں دونوں ہی کو ساتھ لے جاؤں گا۔“

شہزادے نے جواب دیا: ”دیکھ جب تجھے علیہ سے عشق ہے تو صفیہ کو میرے پاس ہی رہنے دے۔ تیری مالی حالت بھی اچھی نہیں ہے اور پھر یہ کہ تو حالت سفر میں دونوں کو سنبھال نہیں سکے گا۔ دونوں کو خوش اور مطمئن نہیں رکھ سکے گا۔ اس لیے میں تجھ کو یہی مخلصانہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کا انتخاب کر لے اور یہاں سے مصر چلا جا۔“

درداغ نے تیوریوں پر مل ڈالے، بولا: ”یہ آپ مجھ کو بار بار مصر کیوں بھیج رہے ہیں؟“

شہزادے نے جواب دیا: ”جب ہمیں تیرے اس فیصلے کا علم ہوا کہ ہمیں منگولوں سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے تو ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کہ توجنگ سے گریز کر رہا ہے..... تو جنگ سے بچنا چاہتا ہے، تب میں نے سوچا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے تجھ کو مصر کیوں نہ روانہ کر دیا جائے۔“

درداغ نے کہا: ”لیکن میں اس طرح مصر نہیں جاؤں گا۔ میں آپ لوگوں کے شانہ بشانہ ہلا کو خان کا مقابلہ کروں گا۔“

شہزادے نے کہا: ”تیری مرضی لیکن تجھ کو راہ فرار اختیار کرنی چاہیے۔ ہلا کو خان تجھ سے ناراض ہو کر تیری موت کا خواہش مند ہے اور ہلا کو خان کے آجانے کے بعد



روابد الدین کو اس علاقے کا ٹکرا اور مشاہد مقرر کیا ہے۔  
سننا ہوں بد الدین بہت خوش ہے اس خبر سے۔“  
ابن علی نے کہا۔ ”ہاں، یہ خبر ہوئی۔ اب یہ بتا کہ تجھ کو یہ خبر دی کس نے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”خود سلیمان شاہ نے۔“  
ابن علی نے کہا۔ ”اس وقت تو میں چلا جاؤں گا لیکن کسی اور وقت کے لیے ملاقات کا وقت ابھی سے طے پا جانا چاہیے۔“  
درداغ نے جواب دیا۔ ”میں کل شام کو آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“

ابن علی نے کہا۔ ”میں تیرا انتظار کروں گا۔“  
ابن علی سے پیچھا چھڑاتے ہی وہ سیدھا گھر پہنچا، وہاں علیہ اور صفیہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ دونوں نے درداغ کا منہ بنا کر استقبال کیا۔ درداغ نے ان دونوں کی سرزنش کی، بولا۔ ”مہ پارو! میں ایک سیدھا اور شریف انسان ہوں، مجھ پر کسی قسم کا شبہ بھی نہ کرنا۔“  
علیہ نے جواب دیا۔ ”بات شیعے کی نہیں ہے۔ میں تو یہ جانتا چاہتی ہوں کہ میں کب تک اس طرح رہوں گی؟“  
درداغ نے کہا۔ ”اس وقت تک جب تک خدا چاہے گا۔ جہاں خدا ہم پر مہربان ہوا، ہمارے بگڑے کام بھی بن جائیں گے۔“

صفیہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن میں یہاں نہیں رہوں گی۔“  
درداغ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟ اس گھر میں خرابی کیا ہے؟“  
صفیہ نے جواب دیا۔ ”اس گھر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ سنان اور ویران ہے۔“  
درداغ نے سختی سے کہا۔ ”تو میں اس ویرانے ہی میں رہ لوں گا، آخر علیہ شکایت کیوں نہیں کر رہی؟“  
صفیہ نے بدستور تلخی سے کہا۔ ”میں کیا جانوں کہ علیہ شکایت کیوں نہیں کر رہی۔ میں تو اپنی بات جانتی ہوں کہ مجھ کو یہ گھر ویران اور سنان لگتا ہے۔“

درداغ نے صفیہ سے پوچھا۔ ”صفیہ! میں ایک بات جانتا چاہتا ہوں۔ تم سچ بتانا، جھوٹ نہ بولنا۔“  
صفیہ نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”پوچھو، بہر حال میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔“  
درداغ نے پوچھا۔ ”کیا تو شہزادہ ابو بکر سے محبت کرتی ہے؟“

صفیہ نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں، میں شہزادے سے محبت کرتی ہوں یا نہیں لیکن اتنا پتا ضرور ہے کہ جو محبت اور جو سکھ مجھ کو شہزادے نے دیا ہے، شاید کہیں اور نہ مل سکے۔“

درداغ نے کہا۔ ”صفیہ! تو جس قسم کی بھی باتیں کر سکتی ہے کر لے لیکن میری توبہ جو میں آئندہ کبھی کسی بیوہ یا مطلقہ سے ملوں۔ بزرگوں سے سنا تھا کہ ایک مرد کو، بیوہ یا مطلقہ سے شادی کرتے وقت.....“

صفیہ نے ناراض ہو کر ٹھلنا شروع کر دیا۔ ”درداغ! میں محسوس کر رہی ہوں کہ آج کل تم دماغی توازن کھو چکے ہو۔ میں تو بیوہ ہوں نہ مطلقہ..... پھر یہ تم بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“

علیہ نے درداغ کی طرف سے جواب دیا۔ ”اس سے ان کا یہ مطلب ہے کہ تو پہلے ہی شہزادے کے پاس رہ چکی ہے اور تیری بھی وہی حیثیت ہے جو ایک بیوہ یا مطلقہ کی ہو کرتی ہے۔“

صفیہ رونے لگی۔ ”علیہ! تجھ پر میرا صبر پڑے، تو نے مجھے بیوہ اور مطلقہ کی صف میں ٹھادیا ہے۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ مجھ کو شہزادے کے پاس پہنچا دو۔“  
درداغ اس ہنگامے سے اتنا بدحواس ہوا کہ وہ گھبرا کر باہر نکل گیا۔ اس کو شام تک ادھر ادھر گھومتے دیکھا گیا۔ راہ میں شہزادہ بھی ملا اور سلیمان شاہ بھی لیکن پریشان حال درداغ نے انہیں دیکھا تک نہیں۔ اس نے اس پریشانی میں سوچا کیا پریشانی، افراتفری، انتشار اور نفاق بغداد اور بغداد والوں کا مقدر بن چکا ہے؟ وہ اپنے سوال کا جواب لیے بغیر ہی شہزادے کے پاس پہنچ گیا اور اس سے درخواست کی کہ براہ کرم صفیہ کو اس سے واپس لے لیا جائے۔

لیکن شہزادہ فی الحال اس پر تیار نہیں تھا، اس نے کہا۔ ”درداغ! مجھ کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہوگا کہ تو ان دونوں میں سے کسی ایک سے بیزار ہو جائے گا اور کسی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! ادھر میں عورتوں کی وجہ سے بہت گرچکا ہوں، میں حیران ہوں کہ یہ مجھ کو ہو کیا گیا۔ شاید دوسرے مجھ پر ہستے ہوں گے اور میں اپنے آپ پر روتا رہتا ہوں، بتائیے میں کیا کروں؟“

لیکن شہزادہ، صفیہ کو واپس لینے پر تیار نہیں ہوا۔ اس کا عذر یہی تھا کہ منگول بغداد کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں اور وہ خود غیر معینہ مدت کے لیے بغداد کو چھوڑ کر باہر جا رہا ہے۔

درداغ ادھر سے مایوس ہو کر اپنے گھر پہنچا، وہاں عزالدین کرد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”درداغ! اب ہمیں تیری ضرورت پیش آگئی ہے۔ ہلا کو خان بغداد



سے دس فرسخ (ساتھ میل) دور رہ گیا ہے اور موصل کی طرف سے اس کا سردار تاجو اتی ہزار سواروں کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔

درداغ نے جواب دیا۔ ”دوست! میں نے علیہ اور صفیہ کو قبول کر کے بڑی غلطی کی ہے۔ شہزادہ ان دونوں کو ابھی میرے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے غلطی اور جلدی کی۔ اب میں پریشان ہوں کہ ان دونوں کو ہنگامی حالات میں کس کے پاس چھوڑوں اور یہ ناممکن ہے کہ اس آڑے وقت میں اسلام اور بغداد کا ساتھ نہ دوں۔“

عزالدین نے پیشکش کی۔ ”اگر تو پسند کرے اور ہم پر اعتبار ہو تو ان دونوں کو ہماری خواتین میں چھوڑ دے۔“  
درداغ فوراً راضی ہو گیا۔ عزالدین کی پیشکش ڈوبتے کوٹھکے کا سہارا ثابت ہوئی۔ علیہ اور صفیہ کو عزالدین کر دے گھر پہنچا دیا گیا۔ صفیہ نے تھوڑا سا ہنگامہ بھی کیا مگر پھر رضامند ہو گئی۔

پورے بغداد کی خوش حال فضا ابتری اور انتشار میں بدل گئی۔ مگلوں کی آمد کی خبر نے سبھی کو پریشان کر دیا تھا۔ بغداد کا ایک فرقہ اور مسیحی بہت خوش تھے۔ بازار بند ہو گئے اور گھروں میں تہ خانے آباد ہونے لگے۔ وجہ کے مشرقی ساحل کی آبادی مغرب میں منتقل ہونے لگی۔ کشتیاں ادھر سے ادھر بھاگتی نظر آرہی تھیں۔ مشرقی ساحل پر چڑھنے والوں کا اور مغربی ساحل میں اترنے والوں کا جھوم تھا۔

شہزادہ ابوبکر، سلیمان شاہ، عزالدین کرد، سلطان ایک سردوات دار اور درداغ وفد کی شکل میں قصر خلافت پہنچے۔ اس وقت خلیفہ اپنے کتب خانے میں مشغول مطالعہ تھا۔ خلیفہ کو ان سب کی آمد سے مطلع کیا گیا کہ ہنگامی حالات میں امیر المومنین سے چند مشورے ضروری ہو گئے ہیں۔

خلیفہ نے کہلا دیا۔ ”وزیر ابن علقمی سے رجوع کیا جائے۔“ لیکن شہزادہ کتب خانے میں داخل ہو گیا۔ وہ بہت دل برداشتہ اور پریشان تھا، اس نے کہا۔ ”امیر المومنین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حملہ اور موصل کی طرف سے منگول سردار تاجو اتی ہزار سواروں کے ساتھ بغداد کی طرف بڑھ رہا ہے اور اصفہان کی طرف سے ہلاکو خان آ رہا ہے، اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ ہم سب آپ سے مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔“

خلیفہ نے اجازت دے دی۔ ”سب کو یہیں بلا لو۔“ چنانچہ سلیمان شاہ، عزالدین کرد، سلطان ایک سردوات دار اور درداغ کو کتب خانے میں بلا لیا گیا۔

سلیمان شاہ نے نہایت موثر انداز میں سنگین حالات کی منظر کشی کی اور پوچھا۔ ”ہم اپنے دشمن کی اتنی بڑی فوج سے کیونکر مقابلہ کریں گے؟“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگوں نے ابن علقمی سے ملاقات کی؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”ابھی نہیں اور ہم لوگ اس سے ملنا بھی نہیں چاہتے۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”وجہ؟ اور میں یہی کہوں گا کہ جاؤ ابن علقمی سے ملو اور اس سے پوچھو کہ اس نے منگولوں کو روکنے کا کیا انتظام کیا ہے؟“

سلیمان شاہ کو غصہ آ رہا تھا، کہا۔ ”ہم اس غدار سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ یہ ساری مصیبت اسی کی لائی ہوئی ہے۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”بدظنی اچھی بات نہیں۔ جاؤ ابن علقمی سے مشورہ کرو۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! اگر آپ کوئی مشورہ نہیں دیے سکتے تو پھر ہمیں اپنے طور پر سب کچھ کرنا ہوگا۔ ہم ابن علقمی کے پاس نہیں جائیں گے۔“  
خلیفہ کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”وزیر ابن علقمی سے کہہ دیا گیا ہے اس سے جواب لینا چاہیے۔“

سلطان ایک نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”چلو، باہر نکل کر کوئی تدبیر سوچتے ہیں۔ ابن علقمی سے کیا پوچھنا۔“  
خلیفہ نے جواب دیا۔ ”عزیز از جان! جو جس کا کام ہے اسی کو انجام دینے دو۔ جاؤ مدرسہ مستنصریہ کے علما سے جہاد کا فتویٰ لو اور مگلوں کے مقابل صف آرا ہو جاؤ لیکن بہتر طریقہ یہی ہے کہ وزیر ابن علقمی کے پاس جاؤ اور اس کے مشورے کے مطابق کوئی قدم اٹھاؤ۔“

یہ لوگ بادل ناخواستہ باہر نکلے اور مدرسہ مستنصریہ کی طرف چل دیے۔ شہزادے نے مستنصریہ کے علما کو یکجا کیا اور ان سے جہاد کا فتویٰ مانگا۔ رضی الدین علی بن طاووس کو علما میں ممتاز اور بہت لائق سمجھا جاتا تھا۔ شہزادے نے ان سے کہا۔ ”حضرت! اس نازک وقت میں آپ کے فتوے کی ضرورت ہے۔“

جہاد کا فتویٰ حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ فتویٰ مل گیا، افراتفری میں پیادوں کی تعداد بڑھ گئی۔ سوار کم تھے۔ سلطان ایک فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔ مغرب سے تاجو بڑھا چلا آ رہا تھا۔ سلیمان شاہ، عزالدین کرد اور سلطان



ایک نے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا شدید اور اچانک تھا کہ منگولوں کے پاؤں اکٹڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

عزالدین کو خوشی میں نعرہ بلند کیا۔ ”وہ مارا..... انہیں دوڑا دوڑا کر مار دو تا کہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کریں۔“ لیکن درداغ نے اس سے اختلاف کیا، بولا۔ ”نہیں، ان کا پیچھا مت کیجیے کیونکہ منگولوں کی شکست ان کی ایک چال ہوتی ہے۔“

سلیمان شاہ نے عزالدین کو روکی ہمنوائی کی، بولا۔ ”عزالدین کی تجویز پر عمل کیا جائے۔“ لیکن سلطان ایک نے درداغ کا ساتھ دیا اور عزالدین کو دو متنبہ کیا۔ ”درداغ صحیح کہتا ہے، ان کا پیچھا نہ کیا جائے۔“

مسلمانوں کا لشکر نشیب میں تھا۔ عزالدین نے منگولوں کا پیچھا کیا۔ اس دوران ابن علقمی کے آدمیوں نے بلندی پر پہنچنے والی نہر شیر کا بند توڑ دیا۔ پانی کا ریلہ تیزی سے اسلامی سپاہ میں داخل ہو گیا۔ مسلمانوں کے پاؤں پھسلنے لگے، لباس بھیک گئے اور ہتھیاروں میں پانی نے خرابی پیدا کر دی۔

عزالدین کو منگولوں کے تعاقب میں کافی دور تک لٹکا چلا گیا پھر منگول اچانک پلٹے اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب ان کے پاؤں اکٹڑ گئے اور منگولوں نے انہیں گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان میں جو بھاگ کر اپنے مستقر تک پہنچ گئے، وہ پانی اور کچھڑ میں پھنس گئے۔ گھڑ سوار منگول ان پیادوں کو نیزے چھو چھو کر ہلاک کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو بہت آسانی سے شکست دی جا چکی تھی۔

سلیمان شاہ، سلطان ایک اور عزالدین کو روکنے بھاگ کر بغداد میں پناہ لی۔ شہزادہ عملاً اس جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ درداغ بھی بغداد واپس آ گیا، مغربی دروازے بند کیے جا چکے تھے۔

چار محرم 656 ہجری جمعرات کے دن بغداد والوں نے مشرقی اتر پر گردوغبار کا ایک بادل سا اٹھتا دیکھا۔ سامنے یعقوب نامی سڑک تھی۔ گردوغبار نے سورج کو چھپا دیا اور بغداد والے اپنی چھتوں پر چڑھ کر یہ پریشان کن منظر دیکھنے لگے۔ شہر تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ شہریوں کی پریشانی کچھ عجیب سی تھی۔ وہ اپنی چھتوں سے شہر کے باہر مشرقی سڑک پر ہلاکوخان کو آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ منگول

سپاہ کے... گھوڑے اور دوسرے مویشی صاف نظر آرہے تھے۔ درداغ نے اس ہوشربا منظر کو ایک چھت سے دیکھا۔ سلیمان شاہ بہت پریشان تھا۔ اس کی دور رس نظریں سمجھ چکی تھیں کہ اب مسلم سپاہ کا جیتنا ناممکن ہے۔

ہلاکوخان نے بغداد کے باہر کچھ فاصلے پر پڑاؤ کیا۔ اب بغداد بری طرح محصور ہو چکا تھا۔ مغرب میں تاجو اپنی اتنی ہزار سپاہ کے ساتھ بغداد کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ سلیمان شاہ، عزالدین کو رو اور سلطان ایک ہر طرف سے مایوس ہو کر خلیفہ کے پاس پہنچے۔ درداغ اور شہزادہ وہاں سے مصلحتاً ہٹ گئے۔ سلیمان شاہ نے اپنی شکست اور بغداد کے محصور کیے جانے کا حال خلیفہ کے سامنے بیان کر دیا، پوچھا۔ ”امیر المومنین! آخر جس بات کا ڈر تھا، وہی ہو کر رہی۔“

خلیفہ کے چہرے سے غم و اندوہ کا اندازہ ہو رہا تھا، کہا۔ ”لیکن منگول اور ہلاکوخان ہم سے جنگ کرتے تو نہیں آئے۔“ سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”خدا کے لیے امیر المومنین! حق بھولے نہ بیٹے۔ وہ ہم سے جنگ کر کے تباہ و برباد کرنے آیا ہے۔“

خلیفہ نے بے بسی سے کہا۔ ”پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! اب بھی وقت ہے، ہم دجلہ میں کشتیوں پر آپ کا ضروری سامان بار کر کے حرم، دوسری خواتین اور آپ کی اولاد کو بھی سوار کرا دیں گے۔ ایک کشتی پر آپ سوار ہو جائیں اور بصرہ چلے جائیں۔ ہلاکوخان کو اس کا پتا بھی نہ چلے گا۔ پھر بصرہ میں تیاری کر کے ہلاکوخان کا مقابلہ کر لیں گے۔“ عزالدین اور سلطان ایک نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔

خلیفہ نے کہا۔ ”وزیر ابن علقمی کہاں ہے، اس کو بلوایا جائے۔ دیکھتا ہوں، وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔“ سلیمان شاہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! خدا کے لیے اس غدار کا نام نہ لیجیے۔ آپ کو جو مشورہ دیا گیا ہے اس پر فی الفور عمل کیا جائے۔“

لیکن خلیفہ نے اسی وقت ابن علقمی کو طلب کر لیا۔ اس کے سامنے سلیمان شاہ کی تجویز رکھ دی، پوچھا۔ ”اب تو بتا کہ مجھ کو اس پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں؟“

ابن علقمی نے سلیمان شاہ سے کہا۔ ”کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو؟ امیر المومنین کو کیسی لچر اور بے ہودہ رائے دے رہے ہو..... اگر ہلاکوخان آ گیا ہے تو اس میں پریشانی



درداغ کو بہت تلاش کیا گیا مگر وہ نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد کسی نے درداغ کا ایک خط خلیفہ کے حوالے کیا۔ خلیفہ نے پڑھا، اس میں لکھا تھا۔

”امیر المومنین اور میرے ساتھیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم بغیر لڑے ہی اپنی بازی ہار چکے ہیں، اس لیے میں جارہا ہوں۔ ہلاکو خان مجھ کو تلاش کرے گا، مجھ کو لایع دیا جائے گا، خوش کن وعدے کیے جائیں گے لیکن میں ان میں سے کسی ایک پر بھی خود کو ہلاکو خان کے حوالے کرنے کو تیار نہیں۔ میں ہلاکو خان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ دغا باز ورنہ ہے۔ جھوٹا، مکار، چھپ کر دار کرنے والا۔ ہلاکو خان دوست بنا کر دار کرتا ہے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا، آپ کی عنایات اور نوازشوں کا بہت بہت شکریہ۔“

خط کے آخر میں درداغ کے دستخط تھے۔ ابن علقمی نے پوچھا۔ ”مگر درداغ ملے گا کہاں؟ میں بڑی دیر سے اس کو تلاش کر رہا ہوں۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”درداغ عقلمند تھا، چلا گیا۔“ خلیفہ کے خدمت گار خاص نے مطلع کیا۔ ”کمال الدین احمد بن شحاک، وزیر ابن علقمی سے ملنا چاہتا ہے۔“ ابن علقمی خوشی سے اچھل پڑا۔ خلیفہ سے کہا۔ ”امیر المومنین! یہ میرا بھانجا ہے۔ میں نے کمال الدین کو ہلاکو خان کے پاس بھیجا تھا، وہ جواب لے کر آچکا ہے اگر اجازت ہو تو اس کو یہیں بلوایا جائے۔“

خلیفہ نے اجازت دے دی۔ کمال الدین کو خلیفہ کے پاس ہی بٹھا دیا گیا۔

ابن علقمی نے پوچھا۔ ”میں نے سلطان ہلاکو خان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے، اس نے اس کا کیا جواب دیا ہے؟“

کمال الدین نے جواب دیا۔ ”صلح کی بات چیت بہت خوشگوار رہی۔ ہلاکو خان کہتا ہے کہ میں یہاں لڑنے مرنے نہیں آ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ امیر المومنین مجھ سے دوستی یا صلح کر لیں۔“

خلیفہ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔

ابن علقمی نے پوچھا۔ ”اور کیا کہا؟ ہلاکو خان چاہتا کیا ہے؟“ کمال الدین نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان نے کہا ہے کہ میں اس سلسلے میں کس سے بات کروں؟ کوئی ذمے دار انسان میرے پاس آجائے اور بات چیت مکمل کر لے۔“ خلیفہ نے ابن علقمی کو حکم دیا۔ ”تو چلا جا اور صلح کی بات چیت مکمل کر لے۔“

لیکن ابن علقمی پیچھے ہٹ گیا، بولا۔ ”امیر المومنین!

کی کیا بات ہے؟“ سلیمان شاہ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”کیا آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں غافل بیٹھا ہوا ہوں، یا میں سویا ہوا ہوں؟ ارے بھائی! میں ہلاکو خان سے صلح صفائی کی بات کر رہا ہوں اور اس کوشش میں ہوں کہ ہم کسی نقصان کے بغیر ہی باعزت دوستی کا اعزاز حاصل کر لیں۔“

عزالدین کرد نے حقارت سے ابن علقمی کی طرف دیکھا۔ ”ابن علقمی! سچ بتا، تو خلیفہ، اسلام اور مسلمانوں کو کب تک ذلیل و خوار کرتا رہے گا؟“

ابن علقمی نے کہا۔ ”ذلیل تو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ میں تو امیر المومنین کو باعزت دوستی کی طرف لیے جارہا ہوں۔“ سلطان ایک نے پوچھا۔ ”پھر امیر المومنین نے کیا فیصلہ کیا؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”ابن علقمی کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ میں اس کی رائے کا انتظار کروں گا۔“ سلیمان شاہ نے کہا۔ ”کنزور انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”کنزور انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔“ سلیمان شاہ نے کہا۔ ”اگر حضور کو اپنے نفع نقصان کا اندازہ نہیں ہے تو اس میں ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔“ خلیفہ نے وزیر ابن علقمی سے پوچھا۔ ”ہلاکو خان سے کیا بات ہو رہی ہے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”میں اس سے صلح کی بات کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بات بن جائے گی۔“ ابن علقمی اچانک کسی کو تلاش کرنے لگا، سلیمان شاہ سے پوچھا۔ ”یہ درداغ کہاں ہے؟“

سلیمان شاہ اور اس کے ساتھیوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ یہیں موجود تھا، اب پتا نہیں کہاں چلا گیا؟“

ابن علقمی نے کہا۔ ”میں نے اس کی معافی کی بات کی ہے۔ ہلاکو درداغ سے بہت ناراض ہے لیکن میں نے یہ سوچا کہ درداغ مسلمان ہو چکا ہے، وہ ہمارا دینی بھائی ہے پھر اسے معافی کیوں نہ دلوادی جائے۔“

خلیفہ نے حکم دیا۔ ”درداغ کو تلاش کر کے میرے پاس لایا جائے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اس کو بھی معافی مل جائے گی۔“



مجھ کو تو اپنے ساتھ لے چلے گا اگر آپ کا ہلا کو خان کے پاس جانا ہوا تو۔“

خلیفہ نے سلیمان شاہ کی طرف دیکھا مگر ابن علقمی نے شہزادہ ابوبکر کا نام لیا، کہا۔ ”میرا خیال ہے شہزادہ ابوبکر ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے ہلا کو خان سے بات کر سکتے ہیں۔“ خلیفہ خوشی سے اچھل پڑا، بولا۔ ”خوب خوب، نہایت مناسب نام لیا۔“

شہزادہ ابوبکر نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔ ”تو میں، یعنی مجھ کو ہلا کو خان کے پاس جانا پڑے گا کیا؟“ خلیفہ نے جواب دیا۔ ”ہاں کیونکہ تجھ سے زیادہ مناسب یہاں دوسرا کوئی ہے ہی نہیں۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! آپ ہلا کو خان کو تنہا بلوائیں، اگر اس کی نیت صاف ہوگی تو فوراً چلا آئے گا ورنہ نہیں آئے گا۔ میں شہزادہ ابوبکر کو بھیجنے کے حق میں نہیں ہوں۔“

ابن علقمی برا سامنہ بنا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”شاید تم نہیں چاہتے کہ صلح ہو جائے۔ تم سب بربادی کے خواہش مند ہو۔“ سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہلا کو خان سے جو شخص بھی ملے گا، اس کو اس بات کی ضمانت ملنی چاہیے کہ وہ مارا نہیں جائے گا۔“

خلیفہ نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے ابن علقمی کو دیکھا۔ ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! اختلاف آراء بہت اچھی بات ہے لیکن آپ کے دربار میں اختلاف آراء کے علاوہ کچھ ملتا ہی نہیں اور میں بذات خود اس سے عاجز آچکا ہوں۔“

خلیفہ نے شہزادہ ابوبکر کو حکم دیا۔ ”تو ہلا کو خان کے پاس چلا جا اور اس سے معلوم کر کہ کیا وہ واقعی صلح کا خواہش مند ہے؟“

شہزادہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابن علقمی نے اپنے بھانجے کمال کو حکم دیا کہ شہزادے کے ساتھ وہ بھی چلا جائے۔ چنانچہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شہزادہ ہلا کو خان کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

سلیمان شاہ اور سلطان ایک نے خلیفہ سے درخواست کی۔ ”امیر المومنین! شہزادے کو تنہا نہ بھیجیے، ہم دونوں شہزادے کے ساتھ جائیں گے۔“

خلیفہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”میرا بھی یہی خیال

ہے۔ جب پھر تم دونوں بھی شہزادے کے ساتھ چلے جاؤ۔“ دوسری طرف ابن علقمی نے اپنے بھانجے کمال الدین کو علیحدہ لے جا کر سمجھانے لگا۔ ”تو شہزادہ ابوبکر سے پہلے ہی ہلا کو کے پاس چلا جا اور میری طرف سے اسے سمجھا دے کہ سارا کام ہو چکا ہے، بس ذرا سا باقی رہ گیا ہے۔ ہلا کو خان سے کہنا کہ وہ شہزادے کا احترام کرے کیونکہ جب وہ شہزادے کو اعتماد میں لے لے گا تو بقیہ کام آسان ہو جائے گا۔“

شہزادہ ابوبکر، سلیمان شاہ اور سلطان ایک ابھی ہلا کو خان کے لشکر میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ ہلا کو خان نے نمائندہ سردار منگولوں کے ایک شاندار دستے کے ساتھ شہزادے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے شہزادے کو خوش آمدید کہا اور انہیں اپنے درمیان میں لیے ہوئے ہلا کو خان کے خیمے کے قریب پہنچے۔ ہلا کو خان کے در پر الاؤ روشن کر دیا گیا تھا۔ دروازے کے سامنے دونوں طرف۔ شہزادے کو ان دونوں الاؤ کے بیچ سے گزار کر ہلا کو خان کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ ہلا کو خان نے انہیں اپنے خیمے میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ ننگے پاؤں بھاگتا ہوا شہزادے کے پاس پہنچا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی جگہ پر لے گیا۔

شہزادہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، اس پر یقین کرنے کو دل تیار نہ ہوتا تھا۔ ہلا کو خان شہزادے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”میں خلیفہ کی خدمت میں حاضری دینے آیا ہوں۔ برقا کی خان میرا چچا ہے، وہ شیخ سیف الدین باخرزی کے ہاتھوں پر مسلمان ہو گیا۔ میں بھی مسلمان ہو جاتا لیکن جب میں نے اپنے شیروں و ذریروں سے پوچھا کہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسلمان کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ امیر المومنین مستحکم باللہ۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کیا کہ میں دنیا کے سب سے بڑے مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہو جاؤں گا۔“

یہاں ہلا کو خان کے دربار میں جو لوگ موجود تھے، ان میں موصل کا فرماں روا بدر الدین بھی تھا۔ سلیمان شاہ کی نظریں اس سے ٹکرائیں تو وہ مسکرایا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں نصیر الدین طوسی جو ہلا کو خان کا وزیر تھا، آگے بڑھا اور کہا۔ ”محترم ایل خان! آپ اتنا زیادہ انکسار نہ اختیار کریں۔ آپ تخت ہی پر شہزادے کے پاس بیٹھ جائیں۔“ اس کے بعد اس نے شہزادے کو قسم بھائی۔ ”شہزادے! اگر کوئی تمہارا احترام کرتا ہے تو تم بھی اس کا احترام کرو۔“

ہلا کو خان تخت پر شہزادے کے پاس بیٹھ گیا۔ اس



نے نصیر الدین طوسی سے پوچھا۔ ”ان تینوں میں سلیمان شاہ کس کا نام ہے؟“

نصیر الدین طوسی نے شہزادے سے کہا۔ ”آپ اپنے سردار سلیمان شاہ کا تعارف کرا دیں۔“  
شہزادے نے سلیمان شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے سلیمان شاہ اور اس کے پاس جو بیٹھا ہے، سلطان مجاہد الدین ایک ہے۔ مجاہد الدین سردوات دار (چیف سیکریٹری) بھی ہے۔“

ہلاکو خان نے ان دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ جب یہ دونوں ہلاکو کے سامنے کھڑے ہوئے تو ہلاکو خان نے ازراہ مذاق کہا۔ ”میں تم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ تم دونوں تیس سال سے میرے آدمیوں کو پریشان کر رہے ہو۔ اصفہان کی راہ سے جتنی فوجیں ادھر بھیجی گئیں، تم دونوں نے انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا اور ہاں، تم دونوں کے ساتھ ایک اور شخص ہوا کرتا تھا، کیا نام تھا اس کا؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”عزالدین کرد۔“  
ہلاکو خان نے کہا۔ ”ہاں عزالدین کرد۔ وہ کہاں ہے؟“  
سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کہاں ہے؟ معلوم نہیں زندہ بھی ہے یا مارا گیا۔“

نصیر الدین طوسی نے والی موصل بدرالدین کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں معلوم نہیں کیا باتیں ہوئیں کہ بدرالدین اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور دور ہی سے کہا۔ ”محترم ایل خان! ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہوا کرتا تھا، درداغ۔ اس کی بابت بھی پوچھ لیجیے۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”ہاں، میں نے درداغ کی بابت تو کچھ پوچھا ہی نہیں..... وہ کہاں چلا گیا؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”درداغ بھی لاپتا ہو چکا ہے، پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر گیا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”لاپتا تو ہر کسی کو ہو جاتا ہے۔ تو بھی لاپتا ہو سکتا ہے، یہ دونوں بھی لاپتا ہو سکتے ہیں۔ میں بھی لاپتا ہو سکتا ہوں۔“ اس کے بعد اس نے شہزادے سے شکایتا کہا۔ ”شہزادے! مجھ کو آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے درداغ سے میرے خلاف کام لیا حالانکہ دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ اس کو بغداد سے نکال باہر کرتے، یا اس کو میرے آدمیوں کے حوالے کر دیتے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! درداغ نے اسلام قبول کر لیا تھا.....“

ہلاکو خان نے بات کاٹ دی۔ ”ہاں، کسی لڑکی کے عشق میں جھٹلا ہو کر۔ میں جانتا ہوں۔ اگر درداغ بغداد میں موجود ہو تو اس کو میرے حوالے کر دیا جائے۔“  
شہزادے نے جواب دیا۔ ”اگر وہ مل گیا تو ضرور آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”شہزادے! آپ واپس جا کر خلیفہ سے کہہ دیں کہ میں یہاں جنگ کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اگر خلیفہ مناسب سمجھے تو اپنے وزیر ابن علقمی کو لے کر میرے پاس آجائے۔ میں خود بھی خلیفہ کی خدمت میں حاضری دے سکتا تھا مگر اس خوف سے بغداد میں داخل نہیں ہونا چاہتا کہ میرے ساتھ میرا لشکر بھی بغداد میں داخل ہونا چاہے گا اور جب لشکر بغداد میں داخل ہوگا تو پھر یہ بے قابو ہو جائے گا اور شکایت پیدا ہو جائے گی اور میں نہیں چاہتا کہ خلیفہ یا بغداد والوں کو مجھ سے کسی قسم کی شکایت پیدا ہو۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا پیغام امیر المومنین تک پہنچا دوں گا۔“  
ہلاکو خان نے ان تینوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

واپسی میں شہزادے نے پوچھا۔ ”آپ دونوں نے ہلاکو خان کے بارے میں کیا رائے قائم کی؟“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”میں ہلاکو خان پر اب بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔“

سلطان ایک نے کہا۔ ”درمیان میں اگر ابن علقمی نہ ہوتا تو میں اس کی باتوں پر اعتبار کر سکتا تھا۔“

اتنے میں بدرالدین لولو والی موصل بھاگا بھاگا ان تینوں کے پاس پہنچا، بولا۔ ”سلیمان شاہ تو میرا دوست ہے، ہلاکو خان بہت اچھا آدمی ہے۔ یہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے۔ اب اگر اس نے تم لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو یہ تم سب کا فرض ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے دو جس سے ہلاکو خان کو دکھ پہنچے اور وہ انتقامی کارروائی پر آمادہ ہو جائے۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”دوست! تم مجھے مشورہ دو کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

والی موصل نے جواب دیا۔ ”ابھی تمہاری عدم موجودگی میں تمہارا ذکر چھڑا تھا۔ ہلاکو خان تمہاری بہادری سے بہت متاثر ہے۔ تم اپنے خاندان کے ساتھ ہلاکو خان کی خدمت میں چلے جانا۔ وہ تم دونوں کو کوئی اعلیٰ منصب دینا



چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ان دونوں کو میں فوجیں فراہم کر دوں گا تاکہ یہ دونوں فی سبیل اللہ جہاد میں مشغول ہو جائیں۔“

سلیمان شاہ نے پوچھا۔ ”سچ؟ واقعی؟“

والی موصل نے جواب دیا۔ ”میں جھوٹ کیوں بولوں گا، وقت ہے قائدہ اٹھا لو۔“ والی موصل یہ مشورہ دے کر واپس چلا گیا۔

سلطان ایک نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ہلاکو خان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے خدا نے اس کے دل میں نیکیاں ڈال دی ہوں۔“

سلیمان شاہ نے کہا۔ ”بہت ممکن ہے۔“

خلیفہ ان تینوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران ابن علقمی نسطوری عیسائی جاٹلیق کے ساتھ ہلاکو خان کے دربار میں پہنچا۔ ہلاکو خان کے بعد ان دونوں نے ہلاکو خان کی بیوی دو قوز سے ملاقات کی۔ اس وقت دو قوز اپنے چھیل میں مصروف عبادت تھی۔ نسطوری عیسائی جاٹلیق نے دو قوز کو دعا کہیں دیں اور ابن علقمی کا خاص طور پر تعارف کرایا۔ دو قوز ہنسنے لگی، جاٹلیق سے کہا۔ ”تو یہ ہے وہ شخص جس نے بغداد کی فتح کو آسان بنا دیا ہے۔“

جاٹلیق نے جواب دیا۔ ”جی محترم خاتون! آپ نے صحیح فرمایا۔“

دو قوز نے کہا۔ ”پھر تو عیسائی کیوں نہیں ہو جاتا؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”محترم خاتون! یہ ساری باتیں ہدایت اور توفیق کی ہیں۔ میں دن رات اپنے رب سے یہی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ خدا جو سچ راہ ہو، اسی پر چلائے۔“

ابن علقمی جب بغداد میں واپس گیا تو اس کے پاس ہلاکو خان کی درخواست بھی تھی۔ ہلاکو خان نے ایک بار پھر خلیفہ کو بلایا تھا۔ ابن علقمی نے خلیفہ کو سمجھایا۔ ”امیر المومنین! آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا چاہیے کیونکہ دوسری طرف ہلاکو خان کا اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے اور وہ خلیفہ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں ہلاکو خان کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں لیکن کیا ہلاکو خان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”شہزادے نے آپ کو کیا بتایا؟ سلیمان شاہ کیا کہتا ہے؟ سلطان ایک نے کیا تاثر دیا؟ ایک اکیلے میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ امیر المومنین! ہلاکو خان کو میں نے تنہا نہیں دیکھا ہے، آپ ہلاکو خان کے بارے میں بدظنی کی بات نہ کریں۔“

خلیفہ چپ ہو گیا اور ہلاکو خان کے پاس جانے کی

تیاریاں کرنے لگا۔ چپ خلیفہ ہلاکو خان کے پاس جا رہا تھا تو اس کے ساتھ ابن علقمی تھا اور بغداد کے بارہ سو معززین بھی تھے۔ ان میں بغداد کے ممتاز سردار بھی تھے، صدر بھی، علما بھی، اکابر بھی، تاجر بھی اور حکومت کے اعلیٰ کارکن بھی۔ خلیفہ خوش خوش ہلاکو خان کے لشکر کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس کو شہزادہ بتا چکا تھا کہ جب وہ منگولوں کی حدود میں داخل ہوا تھا تو ہلاکو خان کے معزز سرداروں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا تھا، خلیفہ کو یقین تھا کہ اس کا استقبال زیادہ شاندار ہوگا۔

جب یہ لوگ ایک کھلے میدان میں بیوت النخل (شہد کی مکھیوں کے چھتے) جیسے شہر میں داخل ہوئے تو خلیفہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میلوں کے رقبے میں آباد یہ عارضی شہر بہت دیدہ رکھتا تھا۔ اس نے ابن علقمی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ ہلاکو خان کی طرف سے کوئی استقبالی دستہ نہیں آیا؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! آپ فکر نہ کریں..... وہ ضرور آئے گا۔“

خلیفہ خاموش ہو گیا۔ خلیفہ کی نظریں سامنے جی ہوئی تھیں، انڈوں کی طرح نصف مدور آبادی کے فوجی شہر کی طرف۔ اچانک اس کی نظر ان سواروں پر پڑی جو ان کی طرف بھاگتے چلے آ رہے تھے۔

ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! ادھر سامنے تو دیکھیے۔ ہلاکو نے ہماری پیشوائی کے لیے ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔“

خلیفہ ان کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا، وہ بہت خوش تھا۔ ہلاکو خان جیسا وحشی اور جنگجو بھی خلیفہ کی عزت کرنے پر مجبور تھا۔ خلیفہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ سوار دم بدم ان کے قریب آتے جا رہے تھے۔ جب یہ سوار بالکل ان کے پاس آگئے تو انہوں نے غیر متوقع طور پر انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔

خلیفہ گھبرا گیا، پوچھا۔ ”ابن علقمی! یہ کیا چکر ہے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”چکر و کرکچہ نہیں، یہ سب آپ کے استقبال کو آئے ہیں۔“

منگول سردار قائم و سوار کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی زینیں اطلس سے آراستہ تھیں۔ شانوں پر بھیڑیوں کی بھوری کھالیں پڑی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کی لگاموں میں چاندی کے زیور پڑے ہوئے تھے اور جب یہ آپس میں ٹکراتے تھے تو موسیقی کی لہر س گونج جاتی تھیں۔



سے ان سب کو امیر المومنین کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔ ان سب سے ہتھیار رکھوا لیے جائیں تاکہ جب وہ آجائیں تو صلح نامے کی شرائط طے کر لی جائیں۔“

ابن علقمی نے فہرست تیار کی اور خلیفہ کی طرف سے ایک حکم نامہ تیار کر کے اس پر خلیفہ کے دستخط لیے۔ خلیفہ نے رعشہ زدہ ہاتھ سے دستخط کیے تو نصیر الدین طوسی کو اس پر اعتراض ہوا کہ خلیفہ کے دستخط مشتہ ہو گئے ہیں۔

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”کوئی پروا نہیں۔ حکم نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔ جب تک وہ لوگ نہیں آئیں گے، خلیفہ ان کا انتظار کرتا رہے گا۔ ویسے بھی ہماری فوجیں تاجیکی سرکردگی میں بغداد کے باپ کوازی سے داخل ہو کر برج نمچی پر چڑھ چکی ہیں اور اب وہاں ہمارے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔“

یہ حکم نامہ بغداد روانہ کر دیا گیا۔ ہلاکو خان اپنی جگہ پر واپس گیا۔ ابن علقمی بھی کچھ خوفزدہ تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”محترم ایل خان! کیا میری جاں بخشی ہو چکی ہے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”ہاں، تیری جاں بخشی ہو چکی ہے۔“

خلیفہ نے ابن علقمی کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا، گویا کہہ رہا ہو۔ ”ابن علقمی! میری سفارش بھی کر دو۔“

ہلاکو کے خیمے میں اس کا ایک دربان داخل ہوا اور ایل خان کو مطلع کیا۔ ”شہزادہ ولی عہد، سلطان ایک اور سلیمان شاہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ آچکے ہیں، ان کے لیے کیا حکم ہے؟“

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”ان تینوں کو قید اور ان کے اہل و عیال کو قتل کر دیا جائے۔“

خلیفہ اتنا سہا ہوا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا بھی اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اس نے آہستہ سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”منگول سلطان! انہیں تو عزت اور تحفظ دیا جا چکا ہے۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”چپ رہ، مجھے معلوم ہے کہ کس وقت کیا کرنا ہے اور کس کو عزت، تحفظ اور کس کو ذلت اور رحلت سے دو چار کرنا ہے۔“

کچھ دیر بعد شہزادہ، سلطان ایک اور سلیمان شاہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہلاکو خان کے سامنے لائے گئے۔ ابن علقمی انہیں اس حال میں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ سلیمان شاہ نے داعی جانب کی دوسری صف میں موصل کے فرماں روا بدرالدین کو بیٹھ دیکھا۔ بدرالدین جو سلیمان شاہ کا گہرا دوست تھا۔ بدرالدین نے نظریں چراکیں اور منہ پھیر لیا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”بدرالدین! ان تینوں میں تیرا

ہتھیاروں سے آراستہ، کسی کسی کے ہاتھ میں پاک کی دموں کے پرچم اور نیلے جھنڈے تھے۔ عام سوار پوشتینیں پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً پانچ سو منگولوں نے ان سب کو اپنے نرغے میں لے لیا۔

خلیفہ نے ابن علقمی سے پوچھا۔ ”یہ منگول ہمارا استقبال کر رہے ہیں یا گرفتار کرنے آئے ہیں؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”مستعصم! معاملہ کچھ گہمیر معلوم ہوتا ہے۔“

خلیفہ خوفزدہ ہو گیا۔ ابن علقمی نے امیر المومنین کے بجائے خلیفہ کا نام لیا تھا۔ فوراً ہی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ابن علقمی کی بے ادبی اور بدتمیزی نے خلیفہ کو بڑا دکھ پہنچایا تھا، وہ مزید کوئی سوال نہ کر سکا۔

ایک منگول سردار آگے بڑھا اور ابن علقمی اور خلیفہ کو الگ کر لیا۔ بقیہ کو منگول دستے کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ان سب کو لے کر منگول عساکر کے پیچھے چلا گیا۔ منگول سردار ان دونوں کو ہلاکو خان کے خیمے کی طرف لیے چلا گیا۔ ہلاکو خان کے خیمے کا دروازہ جنوب کی طرف تھا اور دروازے کے دونوں طرف آگ کے الاؤ روشن تھے۔ خلیفہ اور ابن علقمی کو دونوں الاؤ کے بیچ سے گزار کر ہلاکو خان کے سامنے پہنچا دیا گیا۔

یہاں ابن علقمی کو خلیفہ سے الگ کر دیا گیا۔ اس کو سامنے کی رو میں داہنی طرف بٹھا دیا گیا۔ خلیفہ یکہ و تنہا کھڑا قمر تھرکانپ رہا تھا۔

ہلاکو خان اپنی جگہ سے اٹھا اور خلیفہ پر نظریں جمائے اس کے قریب گیا۔ ابن علقمی سے پوچھا۔ ”اس کو عالم اسلام میں کیا کہا جاتا ہے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین۔“

ہلاکو خان نے طنزاً کہا۔ ”امیر المومنین! مسلمانوں کے امیر! تیری امارت کی نشانیاں کہاں ہیں؟ نہ ہتھیار، نہ فوج، نہ دبدبہ۔ ان کے بغیر امارت؟“ پھر ہلاکو خان نے ابن علقمی سے پوچھا۔ ”بغداد میں موجود عمائدین سلطنت اور اکابر ملت اب بھی موجود ہوں گے؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”جی محترم ایل خان۔“

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”ان سب کی ایک فہرست تیار کر۔ ان میں علما اور ان فوجی سرداروں کو بھی شامل کر لیا جائے جو ذرا سی بھی مزاحمت کر سکتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔ فہرست کے ساتھ ایک حکم نامہ بھی تیار کیا جائے، امیر المومنین کی طرف سے۔ اس حکم نامے کی رو



ایک دوست بھی ہے، اس کا نام تو بتا۔“

بدرالدین نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”ان میں میرا کوئی دوست نہیں۔“

لیکن ابن علقمی نے نشان دہی کر دی، بولا۔ ”محترم ایل خان! بدرالدین، سلیمان شاہ کی دوستی پر شرمندہ ہے۔“  
ہلاکو خان نے بدرالدین کو تسلی دی۔ ”بدرالدین! تو میرا وفادار ہے۔ میں اس سے خوش ہوں لیکن اب خبردار! میرے کسی دشمن سے دوستی ہرگز نہ کرنا کیونکہ میں غنودرگزر کا قائل ہی نہیں۔“

ہلاکو خان کے خیمے کے سامنے جو میدان تھا وہاں شہزادہ، سلیمان شاہ اور سلطان ایک کے رشتے داروں اور خلیفہ کے ساتھ بارہ سو آنے والے عمائدین سلطنت، ارکان دولت، علماء و فقہا کو قتل کر دیا گیا۔ قتل کے بعد ان کی لاشیں خندقوں میں پھینکوا دی گئیں۔ اس دردناک منظر کا انتہائی روح فرسا یہ نظارہ تھا کہ جب مذکورہ ہجوم کو قتل کیا جا رہا تھا تو خلیفہ، ابن علقمی، شہزادہ ابوبکر، سلیمان شاہ اور سلطان ایک کو قتل ہونے والوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ ابن علقمی اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے خلیفہ سے کہا۔ ”مستعصم! یہ اس کا جواب ہے جو تیرے آباؤ اجداد نے فاطمی خلافت کے ساتھ کیا تھا۔ آج میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔“

شہزادے نے خلیفہ سے کہا۔ ”امیر المومنین! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ابن علقمی نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟“  
خلیفہ کے ہوش و حواس ہی ٹھکانے نہیں تھے، اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ابوبکر! یہاں ایسی باتیں نہ کر۔ ابن علقمی ہمارے باتیں سن نہ لے کہیں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! جو ہونا تھا ہو چکا۔ جلاد کی تلوار ہماری خنجر ہے، اب ڈر کس بات کا؟“  
ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”یہ دونوں کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟“

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”یہ دونوں مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔“ پھر ہلاکو خان سے نہایت لطیف ہیرائے میں عرض کیا۔ ”محترم ایل خان! ان کی زندگیوں کے پیمانے لبریز ہو چکے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ انہیں بھی ان کے مرحوم اعزہ کے پاس پہنچا دیا جائے؟“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”نہیں، ابھی نہیں۔ حساب کتاب لیے بغیر کسی کو نہیں جانے دیا جائے گا۔“

نصیر الدین طوسی نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ ”انہیں

بغداد میں لے جا کر، ان سے حساب کتاب ضرور لیا جائے گا۔“  
خلیفہ، ولی عہد شہزادہ، سلطان ایک اور سلیمان شاہ کو ایک خیمے میں قید کر دیا گیا۔ دوسرے دن خلیفہ کے حکم نامے کے بموجب سارے ہی مذکورہ لوگ آگئے، ہلاکو خان اپنی گردن پر چھری پھیرنے کی نفل کرنے لگا، یوں ہی جھوٹ موٹ، فروئی۔ اس نے ان سب کو تڑپا تڑپا کر قتل کر دیا۔  
ابن علقمی کو تشویش تھی کہ اگر کسی طرح خلیفہ رفو چکر ہو گیا تو بات بہت زیادہ بگڑ جائے گی اور عباسی خلیفہ ایک بار پھر برسرِ اقتدار آجائے گا۔ اس نے ہلاکو خان سے کہا۔ ”محترم ایل خان! خلیفہ اور ولی عہد کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟“

ہلاکو خان نے ابن علقمی کو ڈانٹ دیا۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ مجھے ان سے حساب کتاب کرنا ہے، حساب کتاب لیتا ہے۔“

اس بار ہلاکو خان نے ابن علقمی سے ایک اور فرمان تیار کرایا، اہالیانِ بغداد کے نام۔ اس کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ بغداد کے شہری اپنے ہتھیار شہر کے دروازے پر ڈال کر نہتے منگولوں کے عساکر میں چلے آئیں تاکہ انہیں معاف کر دیا جائے۔ خلیفہ نے اس فرمان پر بھی دستخط کر دیے۔

یہ فرمان شہریوں کو پڑھ کر سنایا گیا تو شہر کے باہر ہتھیاروں کا ڈھیر لگ گیا اور نہتے شہری جوں ہی منگولوں کے لشکر میں داخل ہوتے، قتل کر دیے جاتے۔ یہ دلدوز منظر بھی خلیفہ، ولی عہد، سلطان ایک اور سلیمان شاہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ابن علقمی بہت خوش تھا۔

آخر ہلاکو خان کی فوجیں بغداد میں داخل ہو گئیں۔ انہیں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی اجازت دے دی گئی۔

نہتے اور امن پسند بچے کچھے شہری اپنے سروں پر قرآن پاک اٹھائے اور دوا حسرتا و ماصپتا و دوا حسرتا اور دوا بلا کی دلدوز آوازیں بلند کرتے اپنے گھروں سے نکلے اور منگولوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ سڑکوں، گلی کوچوں اور بازاروں میں خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ تالیوں اور نالوں میں خون بہہ رہا تھا۔ دجلہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ان لاشوں کو ان خندقوں میں ڈال دیا گیا جنہیں ہلاکو خان کی آمد سے پہلے جنگی حکمت عملی سے کھدوایا گیا تھا لیکن پھر بھی بغداد کے گلی کوچے لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ لوٹ مار کے بعد مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ ہر طرف شعلے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔

ہلاکو خان اپنے قیدیوں کے ساتھ قصرِ خلافت میں داخل ہوا۔ اس نے حکم دیا۔ ”مستعصم کو برباد نہ کیا جائے اور اس



کے اساتذہ، علماء اور فقہاء کو اس کے رو برو حاضر کیا جائے۔“  
جب مستنصریہ کے علماء اساتذہ اور فقہاء کو ہلاکو خان کے سامنے حاضر کر دیا گیا تو ہلاکو خان نے نصیر الدین طوسی سے کہا۔ ”بقیہ کام تو انجام دے۔“ اور ابن علقمی سے پوچھا۔ ”میرے خلاف جہاد کا فتویٰ کن لوگوں سے کس کی خواہش پر جاری کیا گیا تھا؟“  
ابن علقمی نے شہزادہ ابوبکر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی خواہش اور حکم پر۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”یہ فتویٰ کس نے تیار کیا تھا اور اس پر کس کس نے دستخط کیے تھے؟“  
ابن علقمی نے رضی الدین علی بن طاووس کے سینے پر انگلی رکھ دی، کہا۔ ”اس نے۔“ اور دوسرے علماء، اساتذہ اور فقہاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پر ان سب نے دستخط کیے تھے۔“

ہلاکو خان کے چہرے پر کرب اور غصے سے تناؤ پیدا ہو گیا اور پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ انجی کوئی حکم بھی نہ دے سکا تھا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی آگے بڑھا، بولا۔ ”محترم ایل خان! ان کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تابعدار اور فرماں بردار لوگ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”ان فرماں بردار لوگوں نے میرے خلاف جہاد کا فتویٰ دے کر جو جرم کیا ہے، اس کی سزا تو انہیں ملنی ہی چاہیے۔“

خواجہ طوسی نے عرض کیا۔ ”انہیں ان کی غلطی کی سزا ضرور ملے گی محترم ایل خان۔“

اس کے بعد خواجہ طوسی نے ان علماء سے پوچھا۔ ”علمائے کرام و فقہائے عظام! محترم ایل خان تم سے بے شک فتویٰ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کافر مگر عادل فرماں روا بہتر ہے یا مسلمان غیر عادل سلطان؟“

علماء اور فقہاء ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ خلیفہ نے سر جھکا لیا۔ شہزادہ ابوبکر، سلیمان شاہ اور سلطان ایک اپنی اپنی سائیس رو کے فقہاء کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔

ذرا سے توقف کے بعد رضی الدین علی بن طاووس نے ایک کاغذ پر صاف صاف لکھ دیا۔ ”کافر عادل، غیر عادل مسلمان سے بہتر ہے۔“ اس کے نیچے رضی الدین علی بن طاووس نے سب سے پہلے دستخط خود کیے، بعد میں دوسرے علماء و فقہاء نے بھی دستخط کر دیے اور یہ فتویٰ خواجہ طوسی کے ذریعے ہلاکو خان تک پہنچ گیا۔ خواجہ طوسی نے کہا۔ ”یہ لوگ مجبور و بے بس ہیں۔ حکمران جب اور جیسا فتویٰ طلب

کرتے ہیں، یہ دے دیتے ہیں۔“  
ہلاکو خان نے انہیں محاف کر دیا۔  
اب ہلاکو خان، شہزادہ ابوبکر سے مخاطب ہوا، پوچھا۔ ”ولی عہد! تو میرے خلاف کوششیں کرتا رہا اور منگول عساکر کے خلاف فوج کشیاں کراتا رہا، آخر کیوں؟ کیا تجھ کو معلوم نہیں تھا کہ خاقان ناقابل شکست ہے اور نیلے جاودانی آسمان نے ہمیں ظالموں اور جابروں کے خلاف اپنا قہر بنا کے نازل کیا ہے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان! ہمارا خیال تھا تیری اصل اونچی اور اعلیٰ ہے اور تیری فتوحات کے پیچھے ایک مرد کامل کی ذات کا فرما ہوگی۔ ہم نے تجھے بہادر اور با اصول بادشاہ سمجھا تھا مگر تو تو نہ بادشاہ ہے، نہ مرد۔ تو نے غداری کی حالانکہ بادشاہ غدار اور نامرد نہیں ہوتے۔“  
ہلاکو خان نے ایک منگول سردار کو اشارے سے قتل کا حکم دیا اور شہزادے کو قتل کر دیا گیا۔

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”ہماری فوج میں جو مسلمان موجود ہیں، انہیں حاضر کیا جائے اور انہیں بھی جو خلیفہ کا ساتھ چھوڑ کے میرے پرچم تلے آچکے ہیں۔“  
دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان سرداروں سے محل سرا کا بہت بڑا حصہ بھر گیا۔ ان میں ابن علقمی اور دالی موصل بدر الدین بھی شامل تھے۔

ہلاکو خان نے سلیمان شاہ سے کہا۔ ”پُر جوش مگر بے وقوف سردار! انہیں پہچان۔ یہ سب مسلمان ہیں اور میرے سایہ عاطفت میں آکر امن و چین کی زندگی گزار رہے ہیں اگر تو چاہتا تو آج تو بھی ان لوگوں میں آزاد اور بے خوف و خطر کھڑا ہوتا۔“

سلیمان شاہ نے جواب دیا۔ ”ہلاکو خان! اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کر۔ شہزادے کی طرح ہمیں بھی قتل کرادے۔“

ہلاکو خان نے طنزاً کہا۔ ”میں نے سنا ہے تو نجوی بھی ہے؟ تو نے اپنے مستقبل کی بابت علم نجوم سے پہلے ہی سے کیوں نہ معلوم کر لیا تھا؟“

سلیمان شاہ نے خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”افسوس کہ امیر المومنین نے اپنی اور ہماری بد نصیبی سے ابن علقمی جیسے غدار پر اعتماد کر لیا تھا۔ اگر ہم پر اعتماد کیا جاتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔“ اس کے بعد سلیمان شاہ نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ”ہلاکو خان! میں نے بچپن میں، ایک حکایت پڑھی تھی۔ لوہا کسی درخت کے تنے کے پاس



کہا۔ ”میں انہیں کس طرح کہا سکتا ہوں؟“  
ہلاکو خان نے کہا۔ ”جب تم اسے کھا نہیں سکتے تو اسے  
خرج کیوں نہیں کیا؟ اس سے فوج تیار کر کے تم اپنی اور  
لاکھوں مسلمانوں کی جانیں بچا سکتے تھے۔“  
خلیفہ، ہلاکو خان کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

ہلاکو خان نے خواجہ طوسی سے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے  
اب اس کا قصہ پاک کر دیا جائے۔“  
خواجہ طوسی اور ابن علقمی نے تقریباً ایک ہی بات کہی۔  
ہلاکو خان وہاں سے ہٹ گیا۔

جب سب چلے گئے تو ابن علقمی اس کچلی ہوئی مسخ لاش  
پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ”آج میرا انتقام  
پورا ہوا۔“

العاضہ آخری فاطمی خلیفہ بن ہجری کے اعتبار سے فاطمی  
خلافت کو تقریباً نوے سال پہلے خلیفہ مستنصری بامر اللہ کے لیے  
اسی کے حکم پر صلاح الدین نے ختم کر دیا تھا اور فاطمی خلافت  
عباسی خلافت میں ضم کر دی گئی تھی۔

ہلاکو خان نے خلافت کے کتب خانے کو دریاے دجلہ  
میں پھینکوا دیا۔ کتا بن پانی کے بہاؤ کے لیے پشتہ بن گئیں اور  
پانی ادھر ادھر خشکی پر بہنے لگا پھر جب کاغذ گلا اور سیاہی چھوٹی  
تو دجلہ کا رنگ سرخ ہونے کے بجائے سیاہ ہو گیا۔

اسی دوران اس نے واپی موصل بدرالدین کو حکم دیا  
کہ سلیمان شاہ کا سر اس دروازے پر لگا دیا جائے جہاں  
بدرالدین نے اس کو ایک دوست کی حیثیت سے ٹھہرایا تھا۔  
سلطان ایک کا سر دوسرے دروازے پر نصب کر دیا گیا۔

بدرالدین نے سلیمان شاہ کا سر اپنے گل کے ایک  
دروازے پر نصب تو کر دیا مگر وہ جب بھی ادھر جاتا اور دیکھتا تو  
اس کی آنکھیں بھر آتیں اور دل ڈوبنے لگتا اور وہ ہر بار زہر برب  
یہی کہتا۔ ”دوست! سلیمان شاہ! میں مجبور تھا، میں مجبور ہوں۔“

عزالدین کر دکا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں، کس طرح  
اور کس کے ہاتھوں ہلاک ہوا مگر در داغ بہت چالاک نکلا۔  
وہ ہلاکو خان اور اس کے نامی گرامی فوجی سردار تاجو کی آمد  
سے پہلے ہی علیہ اور صفیہ کو لے کر براہ حلب مصر چلا گیا۔

مصر..... جہاں مملوک چھائے ہوئے تھے۔ جہاں شامی محل  
سرا کے محافظ سلطان بننے کی تیاری کر رہے تھے۔

کیا اور کہا..... میں تجھے کو کاٹ دوں گا۔ درخت نے لوہے کا  
مذاق اڑایا اور کہا.... تو مجھے نہیں کاٹ سکتا۔ لوہا واپس گیا اور  
لکڑی کا دستہ لگا کر کھاڑے کی شکل میں واپس آیا اور  
پوچھا..... بول اب کیا کہتا ہے درخت لوہے میں لکڑی کا دستہ  
دیکھ کر اداس ہو گیا اور جواب دیا..... ہاں اب تو ہمیں کاٹ  
سکتا ہے کیونکہ تجھے میں لکڑی کے دستے کی شکل میں ایک غدار  
جو شامل ہو گیا ہے۔“

خواجہ طوسی اور ابن علقمی کے چہرے لٹک گئے۔ ہلاکو خان  
سے کہا۔ ”محترم اہل خان! اس گستاخ کو زیادہ موقع نہ دیجیے۔“

ہلاکو خان کے حکم پر سلیمان شاہ اور سلطان ایک کو بھی  
قتل کر دیا گیا۔ اب صرف خلیفہ ہی رہ گیا تھا، وہ اتنا گھبرایا ہوا  
تھا کہ اس کی ایک ایک بات اس کو باؤ لاٹھایت کر رہی تھی۔

ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا۔ ”مستعصم! ہم تیرے  
مہمان ہیں، ہمارے لیے کچھ حاضر کر۔“

اس کے سامنے کنجیوں کے کچے پڑے ہوئے تھے مگر  
بدخواہی اور دہشت نے سوچنے بھننے کی صلاحیت ہی سلب کر رکھی  
تھی۔ اس نے خزانے کے تالے تڑوا ڈالے اور اس میں سے  
دو ہزار نہایت نفیس پوشاکیں، ہزار دینار اور بہت سارے  
سونے کے زیورات ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کر دیے۔

ہلاکو خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مستعصم! یہ  
چیزیں تو میری ہی ہیں۔ اگر تو نہ دیتا تب بھی میں انہیں  
حاصل کر لیتا۔“

ہلاکو خان نے یہ چیزیں اپنے سرداروں میں تقسیم  
کر دیں اور کہا۔ ”ان خزانوں کے پتے بتا جن کا پتا  
تیرے سوا کوئی نہیں جانتا..... وہ کہاں دفن ہیں؟“

خلیفہ نے کسی پس و پیش کے بغیر خزانوں کا پتا بتا دیا۔  
یہ زمین میں دفن تھے اور انہیں کھود کر نکال لیا گیا۔

خلیفہ کو دودن سے کھانا بھی نہیں دیا گیا تھا۔ پیاس الگ  
ستار ہی تھی۔ اس نے ہلاکو خان سے درخواست کی۔ ”محترم اہل  
خان! تیرے آدمیوں نے دودن سے مجھ کو نہ تو کھانا دیا اور نہ  
ہی پانی..... براہ کرم ان دونوں کو فراہم کر دیا جائے۔“

ہلاکو خان نے جواہرات سے بھرا طشت خلیفہ کے  
سامنے رکھوا دیا اور کہا۔ ”امیر المومنین نوش فرمائیں۔“  
خلیفہ نے حسرت سے ہلاکو خان کی طرف دیکھا اور

### ماخذات

تاریخ تمدن اسلام، جوہی زیدان، الفہرست ابن ندیم، طبقات ناصری، منهاج سراج، الفغری،

ابن طباطبایا، تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی، تاریخ الخلفاء، مولانا جلال الدین سیوطی



تقلید کرتے ہوئے مجھے ٹی وی بند کرنے کی زحمت سے بچالیا۔  
سٹ کام دیکھنے سے مجھے سوچنے میں مدد ملتی ہے۔ اس  
روز بھی میرے پاس دو کیس تھے۔ ایک مقامی جیولری شاپ  
سے ہیرے کی انگوٹھی چوری ہو گئی تھی۔ دوسرا کیس ایک خاتون  
سے متعلق تھا جس کے بارے میں اس کے شوہر نے شبہ ظاہر کیا  
تھا کہ وہ اس سے بے وفائی کی سرکب ہو رہی ہے۔ ان مزاحیہ  
پروگراموں کے قہقہے اور بے معنی مکالمے سن کر میرا ذہن تیزی  
سے کام کرنے لگتا ہے اور میں مسئلے کے حل کے قریب پہنچ جاتا

رنگو میرا پالتو بند ہے لیکن عام بندروں کے مقابلے  
میں کہیں زیادہ ہوشیار اور ذہین واقع ہوا ہے۔ اس لیے جیسے ہی  
اس نے ساحل پر کھڑی میری کشتی کے باہر کسی کے آنے کی  
آواز سنی تو فوراً ہی وی بند کر دیا حالانکہ اس وقت میرا پسندیدہ  
پروگرام ڈا اینڈی گر فٹھ شو چل رہا تھا لیکن میں ان لوگوں میں  
سے ہوں جو مہمانوں کے آنے پر ٹی وی بند کر دیتے ہیں تاکہ  
ان کی بات توجہ سے سن سکیں اور میرا اندازہ ہے کہ رنگو نے مجھے  
ایسا کرتے ہوئے کئی بار دیکھا ہوگا۔ اسی لیے اس نے میری

## انگوٹھی کا راز

تئویر ریاض

بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت کو بھی انسان جھٹلانے پر مجبور  
ہو جاتا ہے مگر... اس کا انحصار اس وقت اس کی ذہنی کیفیت پر ہوتا  
ہے کہ سامنے کا منظر اسے کس حوالے سے، کس طرح نظر آ رہا ہے۔ وہ  
بھی اس وقت ایک ایسے ہی سحر میں گرفتار تھا جس کی روشنی میں  
اسے وہ منظر ویسا ہی نظر آیا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔

مادرانی واقعات کے حوالے سے تاریخ کے طالب علم کا انداز نظر



Downloaded From  
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM 61 ستمبر 2016



ہوں۔ اسی لیے میں دن کے گیارہ بجے بیڑ پینے کے ساتھ ساتھ سٹ کام بھی دیکھ رہا تھا۔

میں نے عرشے پر آکر دیکھا کہ میرا مہمان ہوئے، تھا جسے میں نے گزشتہ ایک سال سے نہیں دیکھا تھا لیکن سرخ رنگ کے ڈاج پاور وین ٹرک کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق کاؤ بوائے ہیٹ پہن رکھا تھا جس کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اسے نہاتے وقت بھی نہیں اتارتا ہوگا۔ اس نے ایک ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ میں نے فریج سے دو عدد دبیر کی بوتلیں نکالیں اور عرشے پر رکھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوئے.....“

میرے دوست اکیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں صرف یہ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

بہت کم لوگوں کو میرے اس ٹھکانے کے بارے میں معلوم ہے لیکن میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس نے کاغذ کے تھیلے میں سے پیاز کے کٹے ہوئے گول ٹکڑوں کا پیکٹ نکالا اور اسے رنگو کی طرف اچھال دیا جسے اس نے فوراً ہی دبوچ لیا۔ عام طور پر بندر ایسی چیزیں نہیں کھاتے لیکن رنگو کی عادتیں سب سے مختلف تھیں۔ اسے جو چیز پسند آجائے، وہ منٹوں میں چٹ کر جاتا ہے۔

ہوئے ٹانگیں پھیلا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے کاؤ بوائے بوٹ اتار دینے اور بیڑ کے گھونٹ لینے لگا۔ اس کا اصل نام جانی چنگ تھا لیکن لوگ اسے ہوئے کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اس کے باپ دادا کا کارڈن سیلائی اور زسری کا بہت بڑا کاروبار تھا اور اس کے باپ نے بچپن ہی سے اسے کھدائی کے کام پر لگا دیا تھا۔ وہ سارا دن کدال، پیلے اور کھرنی کی مدد سے مٹی کھودتا، پودے لگاتا اور انہیں پانی دیتا پھر وہ تاریخ کی تعلیم حاصل کرنے فیکس یونیورسٹی چلا گیا لیکن یہ نام اس کی ذات سے چپک کر رہ گیا۔ اب وہ عجائب گھر میں ٹانگم کے طور پر کام کر رہا تھا۔

”تمہاری ٹانگ کا کیا حال ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی اس میں دیمک نہیں لگی۔“ میں نے اپنی لکڑی کی ٹانگ پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔ اس مصنوعی ٹانگ کی بھی ایک الگ کہانی ہے لیکن اس کا تعلق صرف میری ذات سے تھا اس سے کسی کو دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس نے پیاز کے باقی بچے ہوئے چھلے رنگو کے لیے عرشے پر رکھ دیے اور کاغذ کی تھیلی گوموڑ کر اپنی جینز کی جیب میں رکھ لیا۔ پیاز کی بوسوگھ کر کئی بگلے اس جانب لپکے لیکن رنگو کو

وہاں بیٹھا دیکھ کر واپس چلے گئے۔

”بلی امیرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“

اس نے مسکراتے ہوئے بیڑ کے گلاس پر نظریں جمائیں پھر وہ سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ دور قاصلے پر کوسٹ گارڈ کی کشتی اپنا معمول کا گشت مکمل کر کے واپس جا رہی تھی۔ میں نے بے چین ہو کر گھڑی دیکھی۔ اینڈی گرفتھ کا شو ختم ہونے میں دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔

”اب کچھ بولو گے بھی یا یونہی میرا وقت ضائع کرتے رہو گے؟“ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

”ایک بھوت مجھے تنگ کر رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یا پھر یہ اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔“

میں بیڑ کا گھونٹ لینے ہی والا تھا لیکن اس کی بات سن کر رک گیا اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”مجھے معلوم ہے کہ کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کرے گا لیکن میں نے خود اسے دیکھا ہے۔ وہ گزشتہ رات بھی آئی تھی۔ وہ عرشے پر رو رہی تھی اور میں نے اسے اتنے قریب سے دیکھا جتنا کہ تم اس وقت میرے پاس ہو۔ یہاں تک کہ میں اس کے وجود کی مہک بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے جسم سے سبز سیبوں جیسی خوشبو آرہی تھی۔ خدا کے واسطے میری مدد کرو۔“

میرا خیال تھا کہ وہ بھی رودے گا لیکن وہ بیڑ کے گلاس کو دیکھتا رہا جیسے اس کے سوال کا جواب بلبلوں کی تہ میں ہو۔

”کون؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے کسے دیکھا تھا؟“

”رات کے چوکیدار کی بیوی کو۔“

کھانے کا وقت ہو گیا تھا، میں نے چولہا جلایا اور فریج سے مچھلی نکال کر اسے تلنے لگا۔ اس کے ساتھ جھینگے اور ٹماٹر کا ساس بھی تھا۔ ہم نے عرشے پر بیٹھ چھتری کے سائے تلے کھانا کھایا گوکہ اکتوبر کا آخری دن تھا لیکن اس کے باوجود دھوپ میں تیزی تھی اور ہوا بھی بالکل بند تھی پھر بھی مزے دار کھانے میں لطف آ رہا تھا۔

لیکچرنگٹن جہاں ہوئے کام کرتا تھا، امریکا کا قدیم ترین طیارہ بردار جہاز تھا جسے اب تیرتے ہوئے عجائب گھر کی شکل دے دی گئی تھی۔ اسے کورپس کرسٹی کے شمالی ساحل پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اسے جاپانی ریڈیو نے دابلو گھوسٹ کا نام دیا تھا کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانی افواج کی جانب سے یہ خبر دی گئی تھی کہ یہ جہاز ڈوب چکا ہے لیکن ایک رات



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

**All Done**

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow



نہیں پڑتا۔“  
 ”تم میری بات کا غلط مطلب لے رہے ہو۔“ ہوئے  
 نے کہا۔ ”میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ شاید تم میری مدد کے لیے  
 کچھ وقت نکال سکو۔ تم وکیل رہ چکے ہو اور پولیس سے بھی تمہارا  
 تعلق رہا ہے اور اب تم ایک پرائیویٹ سرائے میں رہتے ہو۔“  
 ”میرے پاس لائسنس نہیں ہے اور میرا ریکارڈ بھی  
 جرائم سے پاک نہیں ہے۔ اس لیے میں خود بخود ہی اس کام  
 کے لیے نااہل ہو گیا ہوں۔“

”میں نے تم سے یہ سب نہیں پوچھا۔“ اس نے کہا۔  
 ”لیکن میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ  
 تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں کیونکہ میں نے کبھی بھوتوں کی  
 جاسوسی نہیں کی۔“  
 کافی ختم ہو چکی تھی اور میں اس گفتگو کو سینٹا چاہ رہا تھا۔  
 میں نے حجت تمام کرنے کے لیے کہا۔

”تم واقعی بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے؟“  
 ”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے ہاں۔ میں  
 یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے  
 گزشتہ شب دیکھا تھا۔۔۔۔۔ نصف شب کے فوراً بعد اور یہ وہی  
 وقت ہے جب جہاز پر خودکش حملہ ہوا تھا۔ وہ عرشے پر گھنٹوں  
 کے بل جھکی ہوئی تھی۔ میں اپنی طرف سے کوئی کہانی کیوں  
 گھڑوں گا؟“

”تاکہ تمہارے ٹکٹ زیادہ سے زیادہ فروخت  
 ہو سکیں۔“ میں نے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ایک  
 اضافی بونس ہو سکتا ہے لیکن میں نے ابھی تک اس بارے  
 میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ممکن ہے کہ اس طرح کچھ ٹکٹ زیادہ  
 فروخت ہو جائیں لیکن اس کے ساتھ وہ میری ذہنی حالت  
 پر بھی شبہ کریں گے۔ میرا مطلب ہے کہ کیا تم بھوتوں پر یقین  
 رکھتے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے پلیٹیں صاف کر کے کوڑے دان  
 میں کچرا پھینکا اور ایک سگریٹ سلگایا۔ ہوئے نے بھی اپنے  
 دونوں ہیر میز پر رکھے اور سگریٹ جلا کر بیٹھ گیا۔

ہم دونوں دیر تک سمندر کا نظارہ کرتے رہے پھر  
 ہوئے مجھے اپنے عجائب گھر میں آنے کی دعوت دے کر چلا  
 گیا۔ رگوبھی چھلانگیں مارتا ہوا واپس آ گیا۔ وہ کافی تھکا ہوا لگ  
 رہا تھا اس لیے ناگئیں پھیلا کر میرے برابر میں ہی لیٹ گیا۔  
 ”بہت زیادہ آرام طلب مت بنو۔“ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ  
 اب ہمیں بھوتوں کو پکڑنا ہوگا۔“

اس کی نیلی روشنیوں نے اسے جھوٹ ثابت کر دیا۔ ہوئے نے  
 فیکس اس یونیورسٹی سے تاریخ میں بی ایچ ڈی کیا تھا۔ اس نے  
 اس جنگی جہاز کو سیاحوں کے لیے پُرکشش بنانے پر کافی کام کیا  
 اور اب وہ اس عجائب گھر کے سربراہ کے طور پر کام کر رہا تھا۔  
 ”اس جہاز سے بھوتوں کی کئی کہانیاں وابستہ ہیں۔“  
 ہوئے نے پھلی کا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔  
 ”گوکہ مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی بلکہ ان سے لوگوں  
 کی دلچسپی بڑھتی ہے اور وہ زیادہ تعداد میں عجائب گھر دیکھنے  
 آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے سپاہیوں کو  
 دوسری جنگ عظیم کی وردیوں میں ملبوس دیکھا ہے اور پراسرار  
 نوعیت کی چٹخیں بھی سنی ہیں۔ ایک دفعہ جاپانی طیارہ، جہاز سے  
 ٹکرایا تھا اور انجن روم میں کئی لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ غالباً  
 میوزیم دیکھنے کے لیے آنے والوں نے اسی طرح کی عجیب  
 و غریب باتیں سن رکھی ہیں۔“

”لیکن اب تک تم نے اس طرح کی کوئی پراسرار بات  
 دیکھی اور نہ ہی سنی؟“ میں نے کہا۔  
 ”میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔“ اس نے کہا۔  
 ”لیکن گزشتہ رات جو کچھ ہوا، وہ غیر معمولی تھا۔ میں نہیں جانتا  
 کہ اسے کیا نام دیا جائے۔“  
 ”ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟“

”ایک بھوت نما عورت عرشے پر نظر آئی۔ وہ اس طرح  
 گھنٹوں کے بل جھکی ہوئی تھی جیسے کوئی گمشدہ شے تلاش کر رہی  
 ہو۔ جیسا کہ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر ناٹ وائچ مین  
 تھا جب فلیائن میں جہاز پر خودکش حملہ ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ  
 عورت اکثر و بیشتر اپنے شوہر کو تلاش کرتی ہوئی دیکھی گئی ہے  
 تاکہ اسے اپنے ساتھ واپس فیکس لے جاسکے۔“  
 ”یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔“ میں نے اظہارِ ہمدردی  
 کے طور پر کہا۔

”تمہیں بھی اسے دیکھنا چاہیے۔“  
 میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم خاموشی سے کھانا  
 کھاتے رہے۔ اس دوران میں نے اس کا دھیان بانٹنے کی  
 خاطر دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن  
 اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مسلسل پہلو بدل رہا  
 تھا اور اس کی کیفیت دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے وہ عورت ہمارے  
 ساتھ ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے کافی  
 بنائی اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، میں نہیں جانتا کہ جو کچھ تم نے دیکھا اس پر  
 کیا مہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں اس قسم کے معاملات میں



اس کا مضمون ہے اور وہ اس جہاز کی تاریخ کو نمک مرچ لگا کر بیان کر سکتا ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ بسا اوقات ان سالیوں کے پیچھے کوئی نحوست چھپی نہیں ہوتی۔

وہ ہالوین کی رات تھی جب لوگ بھیس بدل کر اور بچے ڈراؤنے ماسک لگا کر شوخیاں کرتے ہیں۔ میں پارکنگ لاٹ میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے پہلے کارل کنگ سے فون پر بات کی پھر وہاں آنے والی فیملیئر اور بچوں سے باتیں کرنے لگا جنہوں نے مختلف روپ دھار رکھے تھے۔ کوئی دیہات پر بنا ہوا تھا تو کوئی اہرام مصر کی تھی۔ اور کسی نے سفید چادر اوڑھ کر بھوت بننے کی کوشش کی تھی۔ وہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں راستے میں یہی سوچتا رہا کہ کسی نے بھوت کا روپ دھار کر ہوئے کو تنگ کرنے کی کوشش تو نہیں کی۔

ہوئے کے مزاج میں غصہ تھا اسی لیے وہ عجیب و غریب حرکتیں کیا کرتا تھا۔ جیسے کار کے ہوتے ہوئے ٹرک چلانا اور اپنے جوتوں میں اعشاریہ دو دو کار پو اور رکھنا گوکہ وہ اس طرح کی کوئی چیز اپنی کام کی جگہ پر لے کر نہیں آتا تھا۔ کالج کے دنوں میں، میں ایک دفعہ اس کے ساتھ فٹ بال میچ دیکھنے ٹیکس اس گیا تھا جہاں نشے میں دھت تین لڑکوں نے اس سے الجھنے کی کوشش کی تو وہ جان دین بن گیا اور ان لڑکوں نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔ اس لیے یہ امکان بہت کم تھا کہ کوئی اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہو۔ کم از کم جو لوگ اسے جانتے تھے، ان سے اس حرکت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

جب میں کورپس کرٹی جانے والی شاہراہ ہائی وے پینتیس پر پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے ہل پر چڑھنے کے بجائے گاڑی کا رخ نارنگ شور کنٹری کلب کی جانب موڑ لیا کیونکہ میں اپنے دوسرے موکل جیمز ڈین جیولرز سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں نے جیب پارکنگ لاٹ میں گھڑی کی لیکن اس کا انجن بند نہیں کیا تاکہ ڈکواتر کٹڈ لشر کی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہوتا رہے۔

جیمز ڈین بھاری بھر کم شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے گول شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا شوکیس میں کسی گھڑی کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے سفید تھری پیس سوٹ اور سرخ رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ دکان میں کافی گا ہک موجود تھے جن سے ڈین کے معاونین نمٹ رہے تھے۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”ڈین! میں ویڈیو شپ لینے آیا ہوں۔“

مسٹر ڈین نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور اپنے پیچھے

میں نے نصف شب سے پہلے ہوئے سے لیکوٹن میں ملنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اس سے پہلے مجھے شہر میں کچھ اور کام نمٹانے تھے۔ میں نے غروب آفتاب کے وقت اپنی جیب نکالی اور شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ رنگو معمول کے مطابق میرے برابر والی نشست پر چوکنا بیٹھا ہوا تھا۔ راستے میں ایک اسٹور پر رک کر میں نے سگریٹ کا پیکٹ اور بے فون کے لیے ایک ڈالر کا کارڈ خریدا۔ مجھے اپنے دو موٹوں کو فون کرنا تھا۔ ان میں سے ایک وہ شخص تھا جسے اپنی خوب صورت اور عمر میں تیس سال چھوٹی بیوی پر بے وفائی کا شبہ تھا۔ عام طور پر میں اس طرح کے کیسز لینے سے انکار کر دیتا ہوں لیکن بیچ کنگ موٹیل کے مالک کارل کنگ نے گزشتہ مہینے مجھ پر ایک احسان کیا تھا اس لیے اسے انکار نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ مجھے اس سے ہمدردی بھی تھی۔ وہ گزشتہ ہفتے جب میرے پاس آیا تو بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس نے فریاد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوراروئے زمین پر آخری ہستی ہوگی جو مجھ سے بے وفائی کرے گی۔ اسے پراسرار قسم کے فون آتے ہیں۔ اکثر رات کو دیر سے گھر آتی ہے اور اگر میں کچھ کہوں تو روئے بیٹھ جاتی ہے۔“

میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ چند روز تک اس کی بیوی کا تعاقب کر کے اصل بات کا پتا لگانے کی کوشش کروں گا لیکن میں نے ابھی تک اس کام کا آغاز نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے اس طرح کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اسی روز اس کی جاسوسی شروع کرنے کا پروگرام بنایا تھا کہ ہوئے اپنی پریشانی سمیت بیچ میں کود پڑا۔

میں نے اسٹور کی پارکنگ لاٹ سے کارل کو فون کیا تاکہ اسے سلی دے سکوں۔ اسے مطمئن کرنے کے لیے مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا اور میں نے کارل سے کہا کہ ابھی تک اس کی بیوی کی کوئی غیر معمولی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی جبکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ساری ساری رات غیر مردوں کے ساتھ کلب میں ڈانس کرتی رہتی تھی۔ میں نے اس معاملے کو اگلے روز تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ آج کی رات مجھے ہوئے کو یہ یقین دلانا تھا کہ اس کے جہاز پر کوئی بھوت نہیں ہے اور جو کچھ اس نے دیکھا، وہ اس کا وہم بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے اس سے یہ بات مذاق میں نہیں کہی تھی کہ میں بھوتوں پر یقین رکھتا ہوں لیکن میرا یہ بھی ماننا ہے کہ بہت سے لوگ وہی کچھ دیکھتے ہیں جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہوئے تمام دن وہاں آنے والوں کو بھوتوں کی کہانیاں سناتا رہتا۔ تاریخ



”اوہ کتنا پیارا ہے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”تمہارا چھوٹا  
سایندر بالکل دلی ٹکسن لگ رہا ہے۔“  
میں نے رنگو کو دیکھا۔ پلاسٹک کی تلواریں غائب ہو چکی  
تھی، صرف رومال باقی رہ گیا تھا اور دونوں بچے دائرے کی  
شکل میں اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

”یہ بلی ہے۔“ ہوئے نے میرا تعارف کرواتے ہوئے  
کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ یہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش  
کرے گا۔“

”اوہ!“ وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم  
بھوتوں کا قلع قمع کر سکتے ہو؟“

”ہاں۔“ ہوئے نے میری طرف سے جواب دیتے  
ہوئے کہا۔ ”اور یہ بہت محتاط ہے۔ رات کو جیسے ہی میوزیم بند  
ہوگا، میں اور بلی اس کے ہر حصے کا معائنہ کریں گے۔“

”میں نے مسٹر ڈائمن کو یہاں چھوہوں کی موجودگی  
کے بارے میں بتا دیا ہے۔“ ہوئے نے کہا۔

”ہمیں امید رہتی تھی چاہیے کہ یہ تمہارے عام سیاہ چوہے  
ہی ہوں۔ انہیں بھورے چوہوں کی نسبت تباہ کرنا زیادہ  
آسان ہوتا ہے۔“

”واؤ۔“ وہ عورت بولی۔ ”واقعی تمہاری معلومات  
حیرت انگیز ہیں۔“

میں نے تعظیماً اپنا سر جھکا دیا۔ اس عورت کے جانے  
کے بعد ہوئے نے میرا بازو پکڑا اور اپنے دفتر کی جانب لے  
جاتے ہوئے بولا۔ ”تم چوہوں کے بارے میں اتنا زیادہ  
کیسے جانتے ہو؟“

”میں نیویارک میں ایک موسم گرما گزار چکا ہوں۔“  
میں نے کئی سال سے لیکوئٹن نہیں دیکھا تھا لیکن یہاں  
آنے کے بعد محسوس کیا کہ اگر یہاں کوئی بھوت آیا ہوگا تو اسے  
یہ جگہ گھر جیسی لگی ہوگی۔ جب یہ جہاز قابل استعمال تھا تو اس  
کے ہنگر میں بیک وقت سوڑا کاٹھیا رے کھڑے ہوتے تھے۔  
ان میں سے باقی رہ جانے والے جہازوں کو دوبارہ رنگ و  
روغن کر کے عرشے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

”ہم آج کے دن بچوں کے لیے مختلف کھیلوں اور  
تفریحات کا بندوبست کرتے ہیں۔“ ہوئے نے اپنی میز پر  
بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا اور  
کھڑکیوں کے پردے گرا دیے تھے۔ اس نے اپنی میز کی  
دراز سے مشروب کی بوتل نکالی اور دو گلاس بنائے۔ اس کے  
دفتر کے باہر بچے کھیل رہے تھے اور والدین کے باتیں کرنے  
کی آواز آرہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی بیس بال کے میچ سے

آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا اور دروازہ بند  
کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بعید از قیاس ہے لیکن ممکن ہے کہ  
میرے کسی ملازم نے وہ انگوٹھی چرائی ہو لیکن مجھے اس کا امکان  
صفر نظر آتا ہے۔“

”کیا تمہیں کسی خاص ملازم پر شبہ ہے؟“  
”نہیں۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے  
ہوئے کہا۔ ”اس انگوٹھی کی قیمت انیس ہزار ڈالر ہے اور کسی  
نہ کسی کو یہ قیمت ادا کرنا ہوگی۔“

ڈین ایک ہوشیار شخص تھا لیکن زیادہ تر ناخوشگوار موڈ  
میں رہتا۔ ہم دونوں نارنگی شور کنٹری کلب کے ممبر تھے۔ گزشتہ  
بچے اس نے گالف کھیلنے کے دوران مجھ سے اس چوری کا  
تذکرہ کیا تھا۔ غالباً انشورنس مسائل کے سبب وہ ابھی اس  
محافلے میں پولیس کو ملوث نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ایک  
ویڈیو ٹیپ لفافے میں بند کر کے میرے حوالے کی اور کہا۔  
”میرے پاس جدید قسم کا فول پروف سیکورٹی سسٹم ہے۔  
اس ویڈیو ٹیپ میں ان تمام لوگوں کی فوج موجود ہے جو انگوٹھی  
گم ہونے والے دن دکان میں آئے یا گئے۔ ان میں گا ہک،  
ملازمین اور دیگر لوگ بھی شامل ہیں۔ وہ چور بھی اس ٹیپ میں  
موجود ہے اور اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے تلاش کرو۔“  
”ٹھیک ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔“

جیسے ہی میں نے اپنی جیب لیکوئٹن کی پارکنگ لاٹ  
میں کھڑی کی، مجھے پچاس بچوں نے گھیر لیا۔ ان کے ہاتھ میں  
پلاسٹک کی تلواریں تھیں جو اندھیرے میں روشنی بکھیر رہی  
تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے لباس پکڑ کر کھینچ رہے تھے اور  
ان کے ہاتھوں میں کینڈی، پاپ کارن اور لولی پاپ کے  
پیکٹ تھے۔ میں نے جیب میں سے ایک بڑا سا سرخ رومال  
نکال کر رنگو کے کندھوں پر ڈال دیا جو میری کوئی سابق محبوبہ  
جیب میں بھول کر چلی گئی تھی۔ مجھے ایک پلاسٹک کی تلواریں بھی  
مل گئی۔ رضا کاروں نے لیکوئٹن کو بھوت گھر کی شکل دے دی  
تھی۔ وہاں اسکول کے بچوں کے لیے ڈریس اپ پارٹی کا  
بھی اہتمام تھا۔ وہ جیسے کی شب تھی اس لیے کسی کو بھی دوسرے  
دن اسکول جانے کی فکر نہیں تھی۔ رنگو فوراً ہی بچوں کی توجہ کا  
مرکز بن گیا لیکن مجھے ہوئے سے ملنے کی جلدی تھی اور اس  
تک پہنچنے کے لیے مجھے بھوت گھر میں داخلے کا ٹکٹ پانچ ڈالر  
میں خریدنا پڑا۔

ہوئے کسی نوجوان عورت سے باتیں کر رہا تھا جو مصری  
مئی کے روپ میں تھی اور دو بچے ان کے گرد اس طرح منڈلا  
رہے تھے جیسے پتھر روشنی کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔



لطف اندوز ہو رہے ہوں۔  
 ”میں جو کچھ دیکھ چکا ہوں، اس کی وجہ سے مجھے یہ  
 پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔“ ہوئے نے مجھے مشروب کا گلاس  
 پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہم نے بھوت گھر صبح سویرے ہی  
 کھول دیا تھا تاکہ لوگ پورے دن اس سے لطف اندوز  
 ہو سکیں۔“

”تم چوہوں کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے کہا۔  
 ”ہاں۔ میں نے لوگوں کو یہی بتایا ہے کیونکہ خود بھی  
 نہیں جانتا کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ اس لیے میں نے بھوت  
 والی بات کسی کو نہیں بتائی ورنہ سچے ڈر جاتے۔“  
 ”اچھا نکتہ ہے۔“

اس نے اپنا گلاس صاف کیا اور بولا۔ ”میں یہ سوچ کر  
 حیران ہو رہا ہوں کہ وہ اتنے سالوں بعد کیوں واپس آگئی؟“  
 ”کون؟“

”دبی جو کیدار کی بیوی۔“ اس نے کہا۔  
 اس نے میز کے نیچے سے ایک پاکس اٹھایا اور میز کے  
 اوپر رکھ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“  
 ”میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور آج  
 کل اس کی ایڈیٹنگ ہو رہی ہے۔ یہ خطوط کا مجموعہ ہے اور اس  
 میں سو کے قریب خطوط شامل ہیں۔ یہ سب ان ملاحوں کی  
 بیویوں کے خط ہیں جو انہوں نے جنگ عظیم دوم کے دوران  
 اپنے شوہروں کو لکھے تھے۔ اس میں نچلے درجے کے عہدے  
 سے لے کر ایڈمرل تک کے لوگ شامل تھے۔“  
 ”اچھا آئیڈیا ہے لیکن میں اس کے عنوان کے بارے  
 میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”میں نے کئی خطوط منتخب کیے ہیں اور نقل نویسیوں کی  
 ایک ٹیم کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ میں ان خطوط کو پڑھ کر  
 ٹیپ ریکارڈر میں منتقل کر رہا ہوں۔“ اس نے ایک ٹیپ  
 ریکارڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جو خطوط  
 ٹائپ کروانے ہیں، انہیں بہ آواز بلند پڑھتا ہوں اور پھر یہ  
 کیسٹ نقل نویسیوں کو بھیج دیتا ہوں۔ یہ کام نصف شب کے  
 قریب کرتا ہوں جب میوزیم بند ہو جاتا ہے اور میں بھی اپنے  
 تمام کاموں سے فارغ ہو جاتا ہوں۔“

”اور تم اس کے علاوہ بھی دوسری پراسرار آوازیں سنتے  
 رہتے ہو؟“

”نہیں لیکن گزشتہ شب میں نے محسوس کیا کہ ان میں  
 سے ایک خط اسی عورت ایڈیلیڈ بیو ماؤنٹ کا تھا جو ناٹ واج  
 مین کی بیوی ہے۔ اس کا شوہر ہنری بیو ماؤنٹ مکینیکل انجینئر

تھا جس نے ایشیم ٹراپائن کی خصوصی مہارت حاصل کر رکھی تھی  
 جو جہاز کو چلاتی ہے۔ اس خط میں کوئی خاص بات نہیں تھی  
 سوائے اس کے کہ وہ اپنے شوہر کو بری طرح یاد کر رہی تھی۔“  
 ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہوں لیکن یہ بہت عجیب  
 بات ہے۔ ادھر میں نے اس کا خط پڑھا اور اسے جہاز پر دیکھ  
 بھی لیا۔“

”تم نے گزشتہ شب جو کچھ دیکھا، اس کے بارے میں  
 تفصیل سے بتاؤ۔“

”مجھے یوں لگا جیسے میں نے دروازہ کھول کر اسے جہاز  
 پر آنے اور اپنے شوہر کو ڈھونڈنے کی دعوت دی ہو۔“

ہم دونوں ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو  
 دیکھنے لگے۔ رنگو نے بھی اس بے چینی کو محسوس کیا اور آنکھیں  
 کھول دیں۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ  
 آواز بڑی واضح تھی۔ ہم سب اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ رنگو  
 چھلانگ لگا کر فائل کیبنٹ پر چڑھ گیا پھر دروازے پر دستک  
 ہوئی۔ ہوئے نے ہمت کر کے کہا۔ ”آ جاؤ۔“

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور بولی۔ ”ڈاکٹر  
 چنگ! میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ ہم ایک گھنٹے بعد  
 عجائب گھر بند کرنے والے ہیں۔“

”شکریہ مسز براؤن۔“ ہوئے نے کہا۔ وہ عورت  
 دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ ہوئے نے میرے لیے ایک اور  
 گلاس بھرا۔ جب ہم سب نوشی سے فارغ ہوئے تو گیارہ بج  
 چکے تھے اور لگتا تھا کہ اب جہاز خالی ہو چکا ہے۔ بچوں اور  
 رضا کاروں کی چیخ و پکار کی جگہ اب پورے ماحول پر خاموشی  
 چھا گئی تھی جس میں ہلکی سی آواز بھی واضح سنائی دیتی۔

ہوئے نے اپنی دراز سے دو عدد ٹارچیں نکالیں، ان  
 میں سے ایک اس نے مجھے پکڑا دی۔ میں نے دفتر سے باہر  
 نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہمیں ٹارچ کی ضرورت پیش  
 آسکتی ہے؟“

”ہاں تاکہ تمہیں اندھیرے میں ڈر نہ لگے۔“ وہ ہنستے  
 ہوئے بولا۔ ”خیر، یہ تو مذاق کی بات تھی۔ دراصل بجلی والے  
 کام کر رہے ہیں اس لیے زیادہ تر حصے کی لائٹ بند ہے۔“

ہم ٹارچ کی روشنی میں عرشے سے باہر آئے اور جہاز  
 کے پچھلے حصے کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے  
 لگے۔ ہوئے نے کہا۔ ”ہم یہاں سے شروع کرتے ہیں اور  
 باری باری ہر حصے کو دیکھیں گے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ  
 ایک گھنٹا لگے گا اور جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ یہاں کوئی



## مہکتی کلیاں

☆ محبت اندھی ہوتی ہے، اس کے باوجود اس کی آنکھیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں۔

☆ چاند اپنی روشنی پورے جہاں میں پھیلا دیتا ہے لیکن داغ اپنے سینے تک محفوظ رکھتا ہے۔

☆ اعتماد روح کی طرح ہوتا ہے جو ایک بار نکل جائے تو پلٹ کر واپس نہیں آتا۔

☆ زندگی وہ خطر آگہ ہے، جو موت کا انتظار کرتی ہے۔

☆ دنیا میں کہیں بھی آپ کی سیرت پر آپ کی صورت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔

☆ اپنی خوشی منانے سے پہلے دوسروں کے غموں کا خیال کرو۔

☆ دنیا کے لیے ایک بندہ مرتا ہے اور مرنے والے کے لیے ساری دنیا مر جاتی ہے۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

☆ زندگی کا سانس لے کر گر چکر لگا یا اور سانس سے اس پر نارنج کی روشنی ڈالی۔

☆ وہ ایک کٹا ہوا کدو تھا اور رنگو اس کے بیج کھا رہا تھا۔ اس

☆ کوشش میں کدو کا ریشہ دار گودا اس کے منہ سے چپک گیا تھا

☆ اور وہ اپنے جبروں سے اسے پُر شور آواز میں کھا رہا تھا۔ میں

☆ نے یہ دیکھ کر اپنے کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے اور ایک طویل

☆ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”پیارے دوست! ہم بھول گئے

☆ تھے کہ آج اس جگہ کو بھوت گھر بنایا گیا ہے اور یہاں ایسی

☆ ہی چیزیں ملیں گی۔“

☆ رنگو نے اپنا ہاتھ نیچے کیا اور عین اس وقت جب وہ مزید

☆ کچھ بیج منہ میں ڈالنے والا تھا تو ہم نے ایک زوردار چیخ سنی۔

☆ وہ عورت ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی۔ رنگو کا بچہ فضا میں

☆ منجمد ہو گیا۔ میں بھی اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے

☆ کان اسی جانب لگا دیے جہاں سے آواز آئی تھی پھر میں نے

☆ ہوئے کے بھاری بوٹوں کی دھمک لوہے کے فرش پر سنی۔ مجھے

☆ یوں لگا جیسے کوئی مشین گن چل رہی ہو۔ پھر مجھے اس کی آواز

☆ سنائی دی۔ ”بلبل، بلبل، جلدی آؤ۔“

☆ ”تم کہاں ہو؟“ میں نے کہا اور تیزی سے اس جانب

☆ لپکا جہاں سے اس کی آواز آئی تھی۔ نارنج کی روشنی ناکافی تھی

☆ اور مجھے نیم تاریکی میں کہیں بھی ٹھوکر لگ سکتی تھی لیکن یہ وقت

☆ ان باتوں کے سوچنے کا نہیں تھا۔ بالآخر وہ مجھے ہال کے سرے

☆ پر نظر آ گیا۔ اس نے اپنی نارنج سے ایک جانب اشارہ کرتے

☆ نہیں ہے تو ہم نصف شب کے قریب عرشے پر اسی جگہ واپس

☆ آجائیں گے جہاں اس عورت کے شوہر کی موت واقع ہوئی

☆ تھی اور وہیں میں نے اس عورت کو گزشتہ رات دیکھا تھا۔“

☆ اس نے اپنے کاؤ بوائے ہیٹ کو مضبوطی سے باندھا اور

☆ میرے آگے چلنے لگا۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک ایک کے بعد

☆ ایک کمرہ دیکھتے رہے۔ ہوئے نے کہا۔ ”اس طرح بہت دیر

☆ لگ جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں الگ ہو کر کام کرنا

☆ چاہیے۔ تم پورٹ سائڈ پر جاؤ۔ میں دائیں جانب دیکھتا

☆ ہوں۔ اگر میں نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی تو چیخ مار دوں گا

☆ اور تم بھی اسی طرح کرنا۔“

☆ ”اوہ..... یقیناً۔ تم بے فکر رہو۔“ میں نے کہا اور اسے

☆ اندھیرے میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ رنگو میرے ساتھ ساتھ چل رہا

☆ تھا۔ تمام کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے ہر

☆ کمرے میں نارنج کی روشنی سے جائزہ لیا۔ زیادہ تر میں عام

☆ استعمال کی چیزیں مثلاً بالٹیاں، باکس، فالتو پرزے، اوزار

☆ اور مختلف مشینوں کے حصے پڑے ہوئے تھے۔ آگے چل کر

☆ میری نظر انجن روم پر گئی جس میں بڑی بڑی مشینیں اور پائپوں

☆ کا جال بچھا ہوا تھا۔

☆ انجن روم میں قدم رکھتے ہوئے میں نے اپنے جسم میں

☆ ایک سرد لہری محسوس کی۔ جہاز کا بھاری بھر کم ڈیزل پلانٹ

☆ اسکول بس سے بھی بڑا تھا۔ اس کے کنٹرول پینل پر لگے

☆ ہوئے گلاس بیج نارنج کی روشنی پڑنے پر چمکاوڑکی آنکھوں کی

☆ طرح چمکنے لگتے۔ کمرے کے آخری سرے پر میں نے کسی کو

☆ کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور

☆ وہ ایک چھوٹے کنٹرول پینل کے سامنے منہ کیے ہوئے تھا۔

☆ مجھ پر ٹپکی طاری ہو گئی۔ کمرہ کسی کونسلے کی کان کی طرح سیاہ اور

☆ تاریک تھا لیکن میں نے نارنج کی مدد سے روشنی میں دیکھا۔ اس

☆ کے کندھے سخت اور چوڑے تھے اور اس کا سر میری نظروں

☆ سے اوجھل تھا۔ اس کے برابر میں ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔

☆ ”ہم نے تمہیں سوتے ہوئے پکڑا ہے۔“ میں نے اس

☆ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

☆ وہ ساکت بیٹھا رہا۔ میں نے رنگو کی طرف دیکھا۔ اس

☆ نے چھلانگ لگائی اور دوڑتا ہوا اس کے زانو پر بیٹھ گیا پھر بھی

☆ اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے اس جگہ ایک گہرا سرخ

☆ دھبہ دیکھا جہاں اس کا سر ہونا چاہیے تھا اور ایک جھٹکے سے پیچھے

☆ ہٹ کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ”رنگو! اسے مت چھوٹا۔“ میں نے

☆ اس کی گود میں جہاں رنگو بیٹھا ہوا تھا ایک گیلی چیز چد کرتی آواز

☆ سنی۔ جو کچھ میں نے دیکھا اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس



ہوئے کہا۔ ”یہ سبز براؤن کی آواز ہے۔ آؤ دیکھتے ہیں۔“

ہم دونوں اور رنگو ہوئے کے دفتر کی طرف دوڑ پڑے۔  
لوہے کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم نے ایک تنگ راہداری عبور کی  
اور دفتر کے دروازے پر پہنچ کر کان لگا دیے۔

”سبز براؤن“ میں نے بآواز بلند اسے پکارا۔

”اوپر آ جاؤ۔“ عرشے سے آواز آئی۔ ہم ایک بار پھر  
سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچ کر کھنڈی ہوا کے جھونکوں نے  
ہمارا استقبال کیا۔ سبز براؤن بے ڈھنگے پن سے بیٹھی ہوئی  
تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں عرشے پر پھیلا رکھی تھیں۔ ہم  
دوڑتے ہوئے اس کے پاس گئے۔ رنگو اپنی عادت کے  
مطابق اس کی گود میں بیٹھ کر گلے لگ گیا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ ہوئے نے سبز براؤن سے پوچھا۔

”کیا معاملہ ہے؟“ میں نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

اس عورت نے گہرے گہرے سانس لیے اور بولی۔

”میں نے اسے دیکھا ہے۔“

”کسے؟“ میں نے پوچھا اور ہم دونوں مل کر اسے کھڑا  
کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

”چوکیدار کی بیوی کو۔“ اس نے کہا۔ ”وہاں کنٹرول  
روم میں۔“

میں نے جہاز کے ٹاور کی طرف دیکھا جہاں وہ انگلی  
سے اشارہ کر رہی تھی۔ سرمئی کنٹرول ٹاور کے ساتھ ریڈار کا  
اشیئنا، تار، کئی قسم کے ہارن اور سائرن لٹکے ہوئے تھے اور  
وہاں سے پھوٹنے والی ٹیلے رنگ کی روشنی جہاز کے اس  
حصے پر پڑ رہی تھی جہاں جہاز کا نام بڑے بڑے حروف  
میں کندہ تھا اور اس کے دائیں جانب ایک کھڑکی میں وہ  
عورت کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا تم نے دیکھا؟“ ہوئے بولا۔

”ہاں، میں اسے دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے اپنے اندر  
کے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہوئے نے اپنا اعشاریہ دو دو کا ریوالور نکالا لیکن میں  
نے وہ اس کے ہاتھ سے چھین کر عرشے پر پھینک دیا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔

”تم ٹی وی بہت دیکھتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”یہ کون سی نئی بات ہے..... کیا تم ٹی وی نہیں دیکھتے؟“

”ہاں لیکن ہتھیار استعمال کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا

چاہیے کہ نشانے پر کون ہے۔“

میں نے کنٹرول ٹاور کی طرف دوڑ لگا دی۔ حالانکہ کھڑی  
کی ٹانگ کی وجہ سے میرے لیے تیز دوڑنا محال تھا۔ اس کے

باوجود میں ممکنہ حد تک تیز بھاگ رہا تھا۔ پولیس کی نوکری کے  
دوران خوب تیزی سے دوڑتا تھا لیکن اب ایک ٹانگ کی وجہ  
سے مشکل پیش آرہی تھی جبکہ ہوئے اور رنگو کو ایسا کوئی مسئلہ نہیں  
تھا اور وہ پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ سبز براؤن ہمارے  
مقابلے میں زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی اور اس نے اپنی جگہ پر  
رکنے کو ہی ترجیح دی۔

میں ٹاور کی اندرونی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جانا چاہ  
رہا تھا لیکن جیسے ہی میں دروازے پر پہنچا، میں نے عرشے  
کے اس حصے میں جو کنٹرول ٹاور اور جہاز کے مرکزی برج کے  
درمیان واقع تھا، ایک کپڑے کی جھلک دیکھی۔ لہذا میں نے  
بھی اپنی سمت تبدیل کر لی اور اس جانب قدم بڑھانے لگا۔

وہ ایک نوجوان عورت تھی اور اس کا شفاف چہرہ

آنسوؤں سے تر تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اس کی چمک دار

جلد واضح طور پر نظر آرہی تھی اور اس کے لمبے بال تیز ہوا کی

وجہ سے لہرا رہے تھے۔ اس نے سفید رنگ کا گاؤن پہن رکھا

تھا۔ وہ ڈیک پر بھگی ہوئی فرش پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اس کی

بڑی بڑی آنکھوں میں اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔ آہٹ سن

کر اس نے میری طرف دیکھا اور بے اختیار میرے حلق سے

ایک چیخ برآمد ہوئی۔ رنگو نے بھی میرا ساتھ دیا۔

ہوئے کی آنکھیں پھڑپھڑا کر بند ہو گئیں اور وہ پیچھے کی

جانب گرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فرش سے ٹکراتا میں

نے اسے پکڑ لیا اور اس کا ہیٹ اتار کر اس سے ہوا دینے لگا۔

وہ عورت آہستہ سے کھڑی ہوئی اور اس نے دوڑ لگا دی۔ ہم

نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ میں لنگڑاتا ہوا تیزی سے ٹاور کے

پاس سے گزرا۔ وہ عورت بے آواز قدموں سے دوڑ رہی تھی۔

میں نے اپنے سامنے اس کے لہراتے ہوئے بال اور ہوا میں

پھڑپھڑاتا گاؤن دیکھا۔ میں نے اپنے سینڈل اتارے اور

پوری قوت سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ رنگو نے اپنی جدوجہد

ترک کر دی تھی اور وہ تھک کر عرشے پر بیٹھ گیا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن اچانک ہی تیز ہو گئی جب میرا

پاؤں زور سے اچھلا اور میں عرشے پر تقریباً گھسنے لگا۔ میرے

دونوں بازو فضا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو

پانے کی بہت کوشش کی لیکن دیر ہو چکی تھی اور میں پیچھے رہ گیا

تھا۔ عرشے کے کنارے پر پہنچ کر اس عورت نے چھلانگ

لگائی اور وہاں کھڑے ہوئے ایک پرانے ٹڑکا طیارے کے

پیچھے بھاگ گئی جو بھی اس جہاز کا حصہ تھا۔ میں نے اپنے جسم کا

رخ اس جانب موڑا اور اسے ایک آخری دھکا دیا۔ اچانک ہی

طیارے کے دوسری طرف فلائٹ ڈیک میرے راستے کی



رکاوٹ بن گیا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرے کی چادر تن گئی۔ میں نے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کی۔ وہاں کوئی رینگ بھی نہیں تھی جس کا سہارا لے سکتا اور ایک سیکنڈ کے لیے میرا سر نیچے کی جانب لٹک گیا۔ میں نے اپنے بازو پھیلائے اور برق رفتاری کے ساتھ جہاز سے نیچے آن گرا۔

میں تنگی زمین پر چت لینا اپنی سانسیں درست کر رہا تھا پھر میں نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک سرد آہ بھری۔ ٹائٹ وائچ مین کی بیوی جا چکی تھی۔ ہفتے کی صبح میں اپنی گتتی پرواپس آیا۔ میں نے راستے میں رک کر کچھ کھانے کا سامان لے لیا تھا کیونکہ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ عام طور پر ہم عرثے پر موم بتیوں کی روشنی میں رات کا کھانا کھاتے پھر میں کچھ پڑھنے بیٹھ جاتا اور رنگو جھانپا لیتا ہوا اپنی جگہ پر سونے کے لیے چلا جاتا لیکن اس رات لیکزنگٹن سے واپس آتے ہوئے ہم اتنا تھک چکے تھے کہ اپنے کیمین میں آرام کرنے کو ترجیح دی۔

میں نے اپنا سامان میز پر رکھا۔ ان میں کچھ خطوط تھے جن کی نقول ہوئے نے مجھے دی تھیں۔ لیکزنگٹن پر ایک کتاب اور جیمز ڈین کی دی ہوئی ویڈیو شیپ بھی شامل تھی۔ میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ اس وقت مورک اینڈ منڈی شو چل رہا تھا۔ یہ ایک بے معنی مزاحیہ پروگرام تھا جسے دیکھنے کے لیے دماغ پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس وقت مجھے ایسے ہی پروگرام کی ضرورت تھی۔

مجھے بہت زور کی نیند آرہی تھی لیکن پاؤں کی تکلیف نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔ جب میں نے اس جگہ کو ہاتھ سے چھوا تو مجھے وہاں خون کی موجودگی کا احساس ہوا۔ عرثے پر پھسلنے کی وجہ سے وہ جگہ چھل گئی تھی۔ میں نے الماری کھول کر فرسٹ ایڈ باکس نکالا پھر زخم صاف کر کے دوا لگائی اور پٹی باندھ دی۔ اب میری نیند غائب ہو چکی تھی چنانچہ میں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگایا۔ اچانک میری نظر میز پر رکھے ہوئے ویڈیو شیپ پر گئی۔ مجھے نیند تو ویسے بھی نہیں آرہی تھی اور نہ ہی ٹی وی پر کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا چنانچہ میں نے وہ ویڈیو اپنے وی سی آر میں لگا دی۔ بالائی شاٹ سے اسٹور میں آنے والے ہر فرد کو دیکھ جاسکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ شیپ کافی طویل ہے اور میں صبح ہونے تک بھی پوری شیپ نہیں دیکھ سکوں گا اور نہ ہی مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں دیکھنا چاہ رہا ہوں وہ مجھے مل سکے گا یا نہیں لیکن تجسس کی وجہ سے میں نے کچھ دیر مزید جاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ریموٹ کے ذریعے غیر ضروری حصوں کو نظر انداز کر کے شیپ

میں نے اپنا سامان میز پر رکھا۔ ان میں کچھ خطوط تھے جن کی نقول ہوئے نے مجھے دی تھیں۔ لیکزنگٹن پر ایک کتاب اور جیمز ڈین کی دی ہوئی ویڈیو شیپ بھی شامل تھی۔ میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ اس وقت مورک اینڈ منڈی شو چل رہا تھا۔ یہ ایک بے معنی مزاحیہ پروگرام تھا جسے دیکھنے کے لیے دماغ پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس وقت مجھے ایسے ہی پروگرام کی ضرورت تھی۔

مجھے بہت زور کی نیند آرہی تھی لیکن پاؤں کی تکلیف نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔ جب میں نے اس جگہ کو ہاتھ سے چھوا تو مجھے وہاں خون کی موجودگی کا احساس ہوا۔ عرثے پر پھسلنے کی وجہ سے وہ جگہ چھل گئی تھی۔ میں نے الماری کھول کر فرسٹ ایڈ باکس نکالا پھر زخم صاف کر کے دوا لگائی اور پٹی باندھ دی۔ اب میری نیند غائب ہو چکی تھی چنانچہ میں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگایا۔ اچانک میری نظر میز پر رکھے ہوئے ویڈیو شیپ پر گئی۔ مجھے نیند تو ویسے بھی نہیں آرہی تھی اور نہ ہی ٹی وی پر کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا چنانچہ میں نے وہ ویڈیو اپنے وی سی آر میں لگا دی۔ بالائی شاٹ سے اسٹور میں آنے والے ہر فرد کو دیکھ جاسکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ شیپ کافی طویل ہے اور میں صبح ہونے تک بھی پوری شیپ نہیں دیکھ سکوں گا اور نہ ہی مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں دیکھنا چاہ رہا ہوں وہ مجھے مل سکے گا یا نہیں لیکن تجسس کی وجہ سے میں نے کچھ دیر مزید جاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ریموٹ کے ذریعے غیر ضروری حصوں کو نظر انداز کر کے شیپ

میں نے پہلے سے ہی ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا اور صبح ہی صبح جا کر بیٹی بیٹ کی دکان سے تازہ سینڈویچ لے آیا تھا۔ میں انہیں پلیٹوں میں رکھ ہی رہا تھا کہ کارل کنگ کی گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس کی بیوی ڈیورا بھی برابر والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں میاں بیوی کار سے باہر آئے، ہوئے انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ کیا وہ چوکیدار کی بیوی کے ساتھ ناشتا کرنا پسند کرے گا۔ جیسے ہی کارل اور اس کی بیوی قریب آئے، ہوئے نے اپنا کاؤ بوائے بیٹ اٹھایا اور



دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا جیسے وہ درد سے پھٹا جا رہا ہو۔  
 ”اوپر آ جاؤ دوستو۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“

ناشتے کے دوران مکمل خاموش رہی پھر میں نے گلا صاف کیا اور جو کچھ ویڈیو میں دیکھا تھا، وہ تفصیل سے بیان کر دیا۔ وہ کارل کی بیوی ڈیپورا تھی جسے دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ وہ خود ہی وضاحت کر دے کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس نے سر اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہم کھانے کے وقت کے دوران جیمز ڈین جیولرز گئے تھے۔ میرے ساتھ ڈی لیون ایلمینٹری اسکول کی دو ٹیچرز اور بھی تھیں۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور اونچے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”ہم محض وقت گزاری کے لیے وہاں گئے تھے۔ اسی روز سہ پہر میں ہم بچوں کو لے کر لیکوٹن گئے۔ وہاں گھومنے پھرنے کے دوران میری نظر اتفاقاً اپنے ہاتھ پر گئی اور میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ میں نے اسٹور میں گھومنے کے دوران انگلی سے ایک انگلی اپنی انگلی میں پکڑ لی تھی جو میں واپس کرنا بھول گئی۔ میں نے سوچا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد اسٹور جا کر انگلی واپس کر دوں گی۔“

”اوہ بے بی!“ کارل نے کہا۔ اس کے لہجے میں اپنی بیوی کے لیے ہمدردی اور پیار اٹھ آیا تھا۔ ڈیپورا نے ٹیپکن سے آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ ”ڈاکٹر چنگ! تم نے ہمارے گروپ کو پورا جہاز دکھایا، ہم ہر جگہ گئے۔ انجن روم، ہینڈلز اور تمام نمائشی مقامات دیکھے۔ اسی دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ انگلی ہمیں گر گئی ہے۔ بہر حال وہ میرے سائز کی نہیں تھی۔“

ہوئے بتاؤ لی انداز میں مسکرایا اور اپنا سر ہلانے لگا جیسے اسے ڈیپورا کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

”اسکول واپس جا کر میں خوب روئی۔ وہ انگلی جہاز پر ہی کہیں گر گئی تھی لیکن میں یہ بات جیمز ڈین کو نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ بھی اس پر یقین نہیں کرتا اور نہ ہی تمہیں پریشان کرنا چاہ رہی تھی ڈاکٹر چنگ!“ پھر وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ہم ایک فضول سی انگلی کے لیے بیس ہزار ڈالرز خرچ کر سکتے تھے۔“

مسٹر کنگ نے ازراہ ہمدردی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”تمہارا جہاز بیچ کنگ موٹیل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ لہذا میں نصف شب کے قریب شب خوابی کے لباس میں باہر نکلی اور لیکوٹن کے عرشے پر پہنچ گئی۔ میں نے انجی

طرح چاروں طرف کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ میں نے جہاز کا کونا کونا چھان مارا۔ چھ دفعہ وہاں جا چکی ہوں لیکن ابھی تک وہ انگلی نہیں ملی۔“

”ڈیپورا!“ کارل چلاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں اور ڈاکٹر انگلی کی تلاش میں تمہاری مدد کر سکتے تھے۔“

”براہ کرم مجھے ہوتے کہو۔“ اس کے دل سے سارا خوف دور ہو چکا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے سینڈویچ کھا رہا تھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم انگلی ڈھونڈ لیں گے۔ میں آج ہی اپنے عملے کو ہدایات دیتا ہوں اور انہیں ایک چھوٹے سے انعام کی پیشکش بھی کروں گا۔“

کارل اور اس کی بیوی فریڈ مسرت سے آپس میں لپٹ گئے۔ ڈیپورا نے مجھے بھی گلے لگالیا۔ اس کے جسم سے وہی مخصوص سبز سیبوں کی خوشبو آرہی تھی۔

”صرف ایک سوال.....“ میں نے کہا۔ ”گزشتہ رات تم کنٹرول ٹاور سے عرشے تک اتنی جلدی کس طرح پہنچ گئیں اور اس کے بعد ڈاکٹر کا طیارے کے پیچھے غائب ہو گئیں جبکہ ہم نے تمہیں کھڑکی میں دیکھا تھا۔“

اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے بالوں کو پونی ٹیل کے انداز میں باندھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے پورا یقین تھا کہ تم مجھے پکڑ لو گے لیکن وہاں عرشے کے کنارے پر ایک چھوٹا دروازہ ہے جہاں سے ایک راستہ میوزیم کے عقب تک جاتا ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں زمانہ طالب علمی میں ریس پیمنٹ رہ چکی ہوں۔“

”بہت خوب!“ ہوئے نے کہا۔ ”میں اس راستے کو تو بھول ہی گیا تھا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں اس وقت کتنا پریشان تھا اور میرا دماغ ان خطوط میں الجھا ہوا تھا جن کی مدد سے میں اپنی کتاب مرتب کر رہا ہوں۔“

میں نے ہوئے کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ اسے چوکیدار کی بیوی کیوں سمجھ رہا تھا کیونکہ جس وقت اس نے کارل کی بیوی کو سفید گاؤں اور کھلے بالوں میں دیکھا تو اس وقت وہ ایڈیلیڈ بیو ماؤنٹ کا خط پڑھ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں وہی عورت سوار تھی اس لیے وہ یہی سمجھا کہ چوکیدار کی بیوی اپنے شوہر کو ڈھونڈنے آئی ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اب تو ہمیں بھوت کی حقیقت معلوم ہو گئی ہوگی۔“

وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔ مجھے اپنی کتاب پر کام کرنا ہے۔“



لفظوں کے کھلاڑی ہوں یا قلم کے لکھاری... عادی ہوں یا پیشہ ور...  
یہ لوگ بے موسم بھی مال فروخت کر دیتے ہیں مگر اتنی تیز رفتاری کے  
باوجود کوئی لمحہ، کوئی ایک جملہ ان کے اندر آگہی کے درکھول دیتا  
ہے جو انہیں صحیح یا غلط کی نشاندہی ضرور کرتا ہے... ایسے ہی  
ایک لمحے کی گرفت میں وہ بھی آگیا تھا جس کا قلم معاشرے کی بے  
حسی پر نوحے لکھتے لکھتے تھک چکا تھا۔

ذہن کی بے ثباتی پر ایک زہریلی مگر... منفرد تحریر

**بانجہ**  
علی اختر



Downloaded From  
Paksociety.com

ہو جاتا۔ ان اسپیکروں کے ارد گرد چھوڑی خالی جگہوں پر مختلف انواع  
کے پرندوں نے اپنے اپنے ٹھکانے بنارکھے تھے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی  
وہ ان ٹھکانوں سے نکل جاتے اور دن کی آنکھ میں شام کا سرمہ پھیلتے  
ہی دوبارہ اپنی جگہ لوٹ آتے۔  
وہ دونوں اس جگہ شاید نئے آئے تھے..... اس لیے

عبادت گاہ کے فلک بوس میناروں کی چوٹی پر چاروں  
طرف لگے اسپیکروں کا زیادہ تر وقت خاموشی میں گزر جاتا تھا۔ بس  
دن میں جب عبادت کے لمحات آتے تو گنبد اور میناروں کے درمیان  
ٹھہری ہوا کو چیرتی آواز عبادت کرنے والوں کو چند لمحوں کے لیے  
اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ اس کے بعد ان پر وہی سکوت دوبارہ طاری



بیشی۔۔۔ نرچیل پر بری طرح چھٹی تھی۔۔۔ دونوں فضا میں آگے مگر دونوں کا توازن ہوا کے ساکت ہونے کی وجہ سے ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔۔۔ تب نرچیل اپنا آپ چھڑا کر اسے جھکائی دے کر دوسری طرف نکل گئی۔ مادہ چیل اس کے پیچھے لپکی اور جب وہ اس کی دسترس میں نہ آئی تو دونوں فضا میں اپنے پر پھیلا کر تیرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مادہ چیل دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی اور اپنے پیچھے سے اپنی چونچ صاف کرنے لگی۔۔۔ نرچیل اس دوران دور نکل گئی تھی۔

”اب بھی تو تھک ہار بیٹھی ہو۔“ وہ بڑبڑایا اور خود ہی ہنس دیا۔

اتنی دیر میں اس کی بیوی ریمونہ کی کان پھاڑتی آواز اسے سنائی دی۔ وہ غالباً نیچے صحن سے اسے آوازیں دے رہی تھی۔

”جواد۔۔۔ اٹھ جاؤ۔۔۔ دیکھو اب تو دھوپ دیواروں کو چومنے لگی ہے اور تم ہو کہ ابھی تک چار پانی توڑ رہے ہو۔“

”ارے۔۔۔ میں کونسا سرکاری ملازم ہوں جو صبح صبح اٹھ کر کام پر جانے کے لیے کمر کئے لگوں۔۔۔ اٹھ جاتا ہوں۔ کونسا جلدی پڑی ہے۔۔۔“ اس نے کسلندی سے جواب دیا۔

”کاش تم سرکاری ملازم ہی ہوتے۔۔۔ کم از کم ایک لگی بندی تنخواہ کی آس امید تو رہتی۔۔۔ اور یوں بے نام خواہشوں کا روز اس گھر میں ماتم تو نہ کرنا پڑتا۔“ ریمونہ نے افسردگی سے کہا۔

”خواہشیں یوں پوری ہونے لگیں تو ذہن کی وسیع عمارت ان کے بے گوردن لاشوں کے تابوتوں سے یوں بھری نہ رہتی۔“ جواد بھی بڑبڑایا۔

”میری راہوں میں تو شروع دن سے ہی خواہشوں اور نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی میخیں گڑی ہیں۔ ایک سے پاؤں بچاتی ہوں تو پھر دوسری سے چھل جاتا ہے۔“ شاید اس نے جواد کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی، ابھی چھت پر آتے آتے اس نے مایوسی سے جواب دے ڈالا تھا۔

”دن نکلتے ہی شروع ہو جاتی ہو۔۔۔ اللہ کی بندی۔۔۔ دن تو روشن ہو لینے دیا کرو۔۔۔“ جواد نے مفاہمت کی راہ نکالی۔

”اٹھو گے تو کاغذوں کے اچلے بدن رنگنے لگو گے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”اپنا اپنا کام ہے۔۔۔ مجھے اس کام سے رزق ملتا ہے تو پھر اس میں کوتاہی کیوں کروں۔“ جواد نے ہنس کر جواب دیا۔

وہ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔ بالکل کسی نوبت پر جھڑے کی طرح۔۔۔ جن کے مزاج روٹھتے مانتے۔۔۔ اور مفاہمت کی نئی راہیں تلاشتے وقت اختیار کرتے ہیں۔ وہ آنکھیلیاں کرتے۔۔۔ ایک دوسرے کی چونچ میں چونچ ڈال کر لڑتے جھگڑتے تھے۔ کئی بار تو یوں لگتا جیسے وہ ابھی زمین پر گر پڑیں گے مگر پھر وہ جلد ہی سنبھل کر فضا میں اپنے پر پھیلا کر یوں تیرنے لگتے جیسے پانی کی ہموار سطح پر بلطیں تیرتی ہیں۔ ان میں ایک نرچیل تھی۔۔۔ اور دوسری مادہ۔

شاید ان کا جوڑا ابھی نیا بنایا تھا۔۔۔ جیسی ان کے مزاج آپس میں میل نہ کھاتے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایسا کرنے سے مینار میں چھوڑی گئی خالی جگہ پر رکھا اسپیکر احتجاج کرنے لگ جاتا۔۔۔ وہ یوں شور کرتا جیسے تیز ہوا زور کی آندھی میں اپنے اکیلے ہونے پر ادھر ادھر سرخ کر احتجاج کرتی ہو۔

وہ اپنی چھت پر لیٹا اکثر یہ تماشا دیکھا کرتا تھا۔۔۔ اب تو موسم بدلنے لگا تھا۔ گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر، راتوں کا جس اور اُس دھیرے دھیرے دم توڑنے لگا تھا۔۔۔ خشکی کا احساس بھی جاگنے لگا تھا انہی دنوں میں یہ جوڑا مینار کی خالی جگہ آ کر ٹھہرا تھا۔

آوارگی کے دنوں میں سر چھپانے کے لیے تھوڑی جگہ بھی بہت لگتی ہے۔ شاید اسی لیے انہیں بھی یہ جگہ ایسے موسم میں پسند آگئی تھی کہ وہ ادھر کے ہی ہو رہے۔ ہر روز صبح سویرے ہی مادہ چیل کے چیخنے کی آوازیں اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ عبادت گاہ کے یہ فلک بوس مینار اس کے گھر کی چھت کے بالکل نزدیک تھے مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان میناروں سے اپنی طرف بلانے والی آواز پر اس کی آنکھ بہ مشکل ہی کھلتی تھی۔ لیکن مادہ چیل کے شور مچانے پر وہ ہمیشہ جاگ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر خود بھی حیران ہو کر مسکرا دیتا۔

صنف نازک کسی بھی صورت میں ہو۔۔۔ ان کا چیخنا، چلانا ہمیشہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے، بالکل اس کی بیوی ریمونہ کی طرح جو اس کی کاہلی اور ست روی پر اسی مادہ چیل کی طرح چیختی چلاتی تھی۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ دن نے رات بھر کی مسافت سے اپنے بدن پر طاری ہونے والی کسلندی ابھی اتاری نہ تھی کہ عبادت گاہ کے اسپیکر کی بغل میں بنائی جگہ پر ٹھہری مادہ چیل حسب معمول چیخنے چلانے لگی۔۔۔ تب اس کی آنکھ کھل گئی۔

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے وہ مادہ چیل کی حرکات دیکھنے لگا۔۔۔ محض دل بہلانے کو۔۔۔ مادہ چیل چیخنے ہوئے قریب



بہترین تحریریں، لاجواب رد و ادا اور  
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے  
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

## سرگزشت

ماہنامہ کراچی

شمارہ اکتوبر 2016ء

کی جھلکیاں

فیض رسال

ایک عالم دین کی سرگزشت جس نے پچھل پچادی تھی

جہد مسلسل

کراچی کی اس نو عمر و شیرازہ کی داستان  
جسے ہالی ووڈ کی اداکارہ سالما بائیک  
اور ٹلوکارہ میڈونا تعظیم دیتی ہیں

عزا کے بچے

ظلم و ستم کی چکی میں پسے والے بچوں  
کی آواز، ایک الگ اندازہ کی داستان

لاکھوں میں ایک

پاکستان کی ایک منفرد اداکارہ  
کے شب و روز کا احوال

شیشہ پل سے نورانی

یورپ میں بسنے والے پاکستانیوں کے  
مصائب کا ادراک، ایک دلچسپ سفرنامہ

تشنہ لب

اس نے خود اپنی زندگی سراب بنالی، تاعمر  
تشنہ لب رہی۔ دل دکھا دینے والی سچ بیانی

”کاش..... ایسا ہوتا..... میں نے تو اب اپنی  
خواہشوں کا گلا گھونٹ ڈالا ہے مگر پھر بھی تمہاری اس ہوائی  
روزی نے کہیں بھی میری امیدوں کی انگلی نہ پکڑی۔“ اس  
کے لہجے میں تلخی کے ساتھ ساتھ مایوسی بھی جھلکنے لگی تھی۔

”ریمونہ بیگم! ہم سب اپنی اپنی سوچ اور پسند کی  
کایوں میں بیٹھے آنکھیں بند کیے آنے والے سہانے  
موسموں کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور یہ موسم یا تو ہماری بند  
آنکھوں سے پرے پرے گزر جاتے ہیں اور یا پھر ہم پر  
اترتے ہی نہیں۔“ جواد نے دھیرے سے جواب دیا اور جھکائی  
دے کر اس کی دسترس سے نکلنا چاہا۔

”بس..... بس..... تم یہی کر سکتے ہو..... جب تمہیں  
جوش آتا ہے اس میز کے گرد آ بیٹھتے ہو..... اور میرے  
ہونٹوں پر امید بھرا تالا لگا دیتے ہو.....“ ریمونہ کا غصہ ابھی  
ختم نہ ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی چھت سے نیچے آگئی تھی۔  
”اب چپ ہو جاؤ۔ مجھے آج کا کالم لکھ کر اپنے اخبار کو  
ڈیپج کرنا ہے۔“ وہ بولا۔

”نا جواد..... مجھے ایک بات سمجھاؤ..... جتنی مغز ماری  
تم ان کاغذوں کا حلیہ بگاڑنے پر کرتے ہو اگر یہی محنت کسی  
اور کام میں کرتے تو انسانی بھلائی کی کوئی نہ کوئی نئی ایجاد کر  
ڈالتے۔“ ریمونہ کے لہجے میں شدید کٹ تھی۔

اس کی باتیں کسی حد تک ٹھیک بھی تھیں۔ جواد ایک  
معروف ملکی اخبار کا مستقل کالم نگار تھا..... جس کی گہری  
نظریں ارد گرد کے ماحول، ملکی سیاست اور بین الاقوامی  
حالات پر رہتی تھیں۔ اس کے پڑھنے والے اس کی تحریر میں  
چھپے گہرے طنز..... فقروں اور جملوں کے بین السطور حقیقت  
نگاری کی کٹ کے بے حد دلدادہ تھے..... یہی وجہ تھی کہ اس  
کے ہر چھپنے والے کالم پر ای میل کے ذریعے بے شمار لوگوں  
کی آراء اس تک پہنچتی تھیں تو وہ پھولے نہ سنا تا تھا۔ ایک لکھاری  
کا سب سے بڑا اعزاز تو یہی ہوتا ہے کہ اس کے پڑھنے  
والے اس کو دل کی گہرائیوں سے چاہیں۔ جب بھی اسے کسی  
قاری کا ای میل ملتا یا ٹیلی فون آتا تو اس کے حوصلوں کو مزید  
تقویت مل جاتی اور وہ دوبارہ نئی توانائیوں سے لکھنے لگتا۔

اخبار کے مالکان پہلے پہل اس کے کالم اعزازی طور  
پر چھاپتے تھے اور کبھی گنہگار اس کے کالموں کی تعریف  
گر کے اس کا دل بہلا دیتے تھے لیکن جب پڑھنے والوں  
نے اس کی تحریروں کو پسند کرنا شروع کر دیا اور جواد کو بھی  
اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا، تب اس نے مالکان سے اپنے  
کالموں کا معاوضہ طے کر لیا۔ اس کا یہ انداز مالکان کو پسند نہ

اکتوبر 2016ء

73

سپینس ڈائجسٹ



تمہاری تساہل پسند طبیعت کسی اور راہ پر چلنے کو تیار نہ تھی۔“  
ریمونہ نے شوخی سے جواب دیا۔

”بس یوں ہی جان لو..... انسان ہمتوں کی جولانی سے ایک بار پھسل جائے تو دوبارہ اس طرف جانے کو دل نہیں مانتا اور میں ہمتوں کی اونچائی تک پہنچتے پہنچتے تھک چکا تھا۔ جو اد نے اپنی شکستگی کا پہلی بار اعتراف کیا لیکن پھر اس کا یہی اعتراف اس کے حوصلوں کی دیواروں کو ہمیشہ کے لیے مسمار کرنے لگا تھا۔ زندگی گزرتے گزرتے لکھوں کی سان پر چڑھ کر مزید ٹھیکسی اور مشکل ہونے لگی تھی اور اس پر اس کی بے ترتیب کمائی ہر بار شرمندگی میں منہ چھپائے گزرنے لگی تو ریمونہ کی طبیعت بھی چڑچڑے پن کا شکار ہونے لگی۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہر روز ان کے درمیان نوک جھوک ہونے لگی تھی۔ باوجود اس کے..... گھر سے باہر اس کے بے شمار لوگ ولدادہ تھے۔ اس دوران اس کی ایسی تحریریں بھی منظر عام پر آئیں جنہوں نے معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر اسے اخباری دنیا میں بڑا دھانسو کالم نگار تسلیم کیا جانے لگا۔ معاشرے میں موجود نا انصافیوں اور بے اعتدالیوں پر اس کا قلم اس قدر دلیری سے چلتا تھا کہ پڑھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ اسے پتا تھا کہ معاشرے کو کہاں کہاں ”میخیں“ درکار ہیں۔

یہ سب اس نے اپنے کالموں میں کیا۔ انسانوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافی، لوٹ کھسوٹ، حق تلفی، خوشامد اور سازشی لوگوں کے بدلتے رویوں پر بے تحاشا تحریریں لکھیں۔ منہ شدہ معاشرے کو اس کی درست سمت کا ادراک بھی کروایا مگر معاشرہ اس قدر لعین زدہ اور کینہ لگی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اس کی ان تحریروں سے کسی نے بھی اپنا قبلہ درست نہ کیا۔ بڑی دیر بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اب تنہا جو لکھتا چلا آ رہا ہے، لوگوں کے نزدیک وہ محض نفی طبع تھی۔ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ کالم کی زندگی صرف ایک دن کی ہوتی ہے۔ جو نہی دن اتر..... کالم وقت کی قبر میں اتر گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب اسے ریمونہ کی بہت سی باتیں سچ لگنے لگی تھیں۔ یہ ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے ایک کالم میں کسی ذخیرہ اندوز کے بارے میں اشارہ لکھا..... تو اسی روز اس کا ٹیلی فون آ گیا۔

”جواد..... تم جس اسکول میں پڑھتے تھے“ میں بھی وہیں سے پڑھا ہوں۔ میں تم سے ایک سال آگے تھا۔ مجھے کچھ روز پہلے اس کا علم ہوا۔ یار..... اپنے دوستوں پر لکھتے وقت ہاتھ ہلکا رکھا کرو۔ تمہارے بھتیجے کی پیدائش کی خوشی میں تمہارے گھر ملٹائی بھجوا رہا ہوں۔“

آیا تو انہوں نے ایک دوبارہ اخبار میں اس کے کالم چھاپ کر معذوری ظاہر کر دی۔

اب تک اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بن چکی تھی۔ جن کے تقاضوں پر جواد کو دوبارہ اس کی شرائط پر چھاپنا شروع کر دیا لیکن اس کے معاوضے کی ادائیگی کرتے ہوئے انہیں روز اول کی طرح تکلیف ہوتی رہی۔ معاوضہ ایک ترتیب سے ملے تو آسودگی کی راہیں ہموار ہونے لگتی ہیں مگر اس کی بے ترتیبی..... مالی پریشانیوں میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ یہی جواد کے ساتھ ہوا تھا۔ معاوضے کی بے ترتیبی سے مالی پریشانیاں مستحلاً اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھیں جس سے اس کے اندر کی گھٹن بڑھتی چلی گئی۔

اندر کی گھٹن جب بڑھنے لگے تو اظہار کی قوت میں خود بخود اضافہ ہونے لگتا ہے۔ وہ چاہے کسی صورت میں بھی ہو..... جواد کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک تو اظہار کی قوت کا دباؤ..... اوپر سے پڑھنے والوں کی پسندیدگی..... دونوں نے مل کر اس کے جذبات کو اس قدر ہوا دی کہ اس نے اظہار کے اس وسیلے کو اپنا روزگار بنا لیا۔

ریمونہ سے شادی کے دو چار سال تو پلک جھپکتے ہی گزر گئے پھر حالات اس کے قابو سے باہر ہونے لگے۔ مہنگائی کا بھوکا عفریت.... سارے وسائل کھانے لگا۔ تو شکوے شکایت کے دروازے بھی آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ وہ ایک ایسا ہی دن تھا جب پہلی بار ریمونہ نے اپنی خواہشات کی بڑھتی ہوئی کھنگنی سے مجبور ہو کر شکایت کی تو جواد نے اسے سمجھایا۔

”ریمونہ! ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں انسانی عمروں کا ایک بڑا حصہ تعلیم کا حصول کھا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کہیں پاؤں لڑکھڑا جائے تو سالوں کا دائرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ جو عمر کو بچھوندی کی طرح لگ جاتا ہے اور جیتے جی ختم نہیں ہو پاتا۔ تعلیمی گرداب میں میرا پاؤں تو نہ پھسلا مگر جب عملی زندگی میں پہلی بار داخل ہوا تو پتا چلا، اس کے حصول کا فائدہ بھی ہو سکتا تھا جب اس کے ساتھ دوسری بیساکھیاں بھی میرے ہاتھ میں ہوتیں۔ ریمونہ! نہ تو میرے آباؤ اجداد اس قدر استطاعت رکھتے تھے کہ وہ ایسے وقت میں میرا ساتھ دے سکتے..... اور نہ ہی ہمارے آگن میں دولت کے پھول کھلتے تھے کہ اتار اتار کر دوسروں کے کوٹ کالروں میں لگا کر اپنے مقاصد حاصل کر لیتے۔ چنانچہ عمر بڑھتی رہی اور ڈگریوں کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔“

”راستے تو اور بھی بہت سے تھے..... یوں کہو



رہنے والے سارے بے حس ہو چکے تھے۔ اس کے دوستوں نے درست کہا تھا۔ جس معاشرے پر بددیانتی اور بدعتی کے گہرے بادل چھا جائیں، ان کا ہٹنا بہت مشکل ہوتا ہے اور پھر بانجھ سے کی انگڑائی اور جھاڑے کی چاندنی یوں ہی بیکار جاتی ہے۔

وہ ساری رات انہی سوچوں میں پریشان رہا۔ یہ اس سے اگلی صبح تھی، جب وہ چھت پر لینا عبادت گاہ کے ان فلک بوس میناروں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کاش جس معاشرے میں وہ جی رہا ہے، اس کا کردار بھی ان میناروں کی طرح بلند اور عبادت گاہوں کے ارد گرد پھیلی خوشبودار ہواؤں کی طرح پاک اور قابل احترام ہوتا..... تو معاشرہ جنتِ نظیر ہوتا۔

اس کی نظریں میناروں میں موجود خالی جگہوں پر رکھے اسپیکروں کے ارد گرد ٹھہرے پرندوں کی طرف اٹھ گئیں۔ شاید کوئی نیا اسے دیکھنے کو مل جائے..... اس نے سوچا۔ کتنے ہی موسم گزر چکے تھے لیکن اس جگہ ٹھہرنے والے پرندوں نے اپنے ٹھکانے نہ بدلے تھے۔ آج صبح ہی وہاں رہنے والی مادہ جیل اپنی چونچ میں پکڑے بہت سے ننھے لے کر اپنے ٹھکانے کی طرف آئی تھی۔ وہ ننھے وہاں چھوڑ کر دوبارہ پلٹ گئی۔

لگتا تھا، وہ ان ننھوں سے اپنا نیا گھر بنانے کی کوشش میں ہے اور نرچیل اس معاملے میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی سوچوں میں لمحہ بھر کو ایک طوفان اٹھا کہ پرندے بھی کسی نہ کسی موسم میں..... اپنی زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں اپنے گھر بنانے کا سوچتے ہیں مگر اس کے مقابل ایک ہم ہیں۔ کتنے ہی برس آگے گزر گئے ہیں لیکن ہم میں سے کسی نے اپنے ملک کی تعمیر کے بارے میں کبھی نہیں سوچا..... بلکہ اپنی اپنی ہمت اور استطاعت بھر اسے کھانے، پچوڑنے اور توڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا ہم ان پرندوں سے بھی کمتر ہیں.....؟ اس کے ذہن میں اندھیرے اترنے لگے تھے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ گھٹن جب زیادہ بڑھ جائے تو اظہار کی تلخی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا..... جب ایک تند و تیز کالم لکھنے پر اسے اقتدارِ اعلیٰ نے گھر سے اٹھوایا..... لوگ تب بھی خاموش رہے۔ جھوٹے موسموں میں نحیف سا ج برداشت کے ذہن پر چرکا لگا جاتا ہے۔ شاید اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

”اگر..... تعلیم انسان کے کردار کو اجال نہ سکے تو اس میں ادارے بے قصور ہوتے ہیں۔“ جواد نے ہنس کر جواب دیا اور فون بند کر ڈالا۔

اسی شام مٹھائی کی ایک بڑی ٹوکری کے ساتھ ایک لفافہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے لفافہ کھولا تو اس میں اس قدر رقم موجود تھی جو اس کی کسی بھی بڑی ضرورت کو پورا کر سکتی تھی۔

”یہ اچھا ہوا..... اس وقت ہمیں رقم کی بے حد ضرورت تھی۔“ ریمونہ نے اسے لفافہ کھول کر رقم گنتے ہوئے دیکھ لیا۔ ”تمناؤں کا پیٹ بھرنے کے قابل ہوتا تو حرص وہوس کے بے لگام گھوڑے معاشرے میں یوں بگاڑ نہ پیدا کرتے۔ میں یہ لفافہ واپس کر رہا ہوں۔“ جواد نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا تو ریمونہ ایک بار پھر اس کی نااہلی پر بگڑ گئی۔

”معاشرے کی دوڑ میں تم اسی لیے پیچھے ہو..... تمہاری طرح لفظوں کو سینت سینت کر رکھنے والے بھوکے ہی مرتے ہیں۔ کبھی ان کی طرف دیکھا ہے جنہوں نے ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھایا اور آج خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری طرح ترس ترس کر نہیں جی رہے..... اور جن کے لیے تم لکھ رہے ہو..... کبھی دیکھا ان کی طرف..... وہ تو بے حس ہو چکے ہیں۔ ماحول کی خشکی میں ٹھہر چکے ہیں۔“

لیکن جواد نے اس کی باتوں پر دھیان نہ دیا اور لفافہ واپس کر دیا۔ یہ بات اس کے ساتھیوں تک پہنچی تو سب نے اس کے جذبات کو بے حد سراہا لیکن کئی دوستوں نے اس کے اس اقدام کو بزدلی سے تعبیر کیا اور کہا۔ ”ایسے مواقع زندگی میں کبھی کبھی ملتے ہیں۔ جواد نے اس کی قدر نہیں کی..... بچھتاے گا۔“ موسم اور وقت بدلتے دیر ہی کہاں لگتی ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس نے ایک بڑے سیاست دان کی بے اعتدالیوں اور کرپشن کے بارے میں لکھا تو اسے ٹیلی فون آ گیا۔

”تمہارا آج کا کالم بڑا مزیدار تھا..... لیکن یار..... تم نے ہماری تعریف میں بہت کم لکھا..... تم نے جو کچھ لکھا، وہ ہماری ہنرمندی اور عقل مندی کا معمولی سا اظہار ہے۔ ہم تو اس سے بہت آگے ہیں۔ کبھی تم اس بارے میں کبھی لکھو..... شہرت بنتی ہے اور نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے..... پھر بھی ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔“

اس روز کے ٹیلی فون نے اس کے ذہن میں ایک طوفان سا برپا کر ڈالا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ بدلتے لوگوں کے رویوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے ارد گرد



# Downloaded From Paksociety.com

## شیش محل

قسط نمبر: 14

اسماء تادوی

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رپ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا قریب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے مروجوں میں ملوث سطرنگ، لہجے و ادوات قلبی کی عکاسی دلچسپ داستان

1 اکتوبر 2016ء

76

سپینس ڈائجسٹ



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-







Downloaded From  
paksociety.com



یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیت ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شادی بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیت کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے مکمل کراہتا نہیں کرتی اور ایک جاگیردار سیاست داں ولد آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولد آغا کا گھر گیس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیت اپنے اخبار کی طرف سے ولد آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولد آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیت مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے بیانات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیت کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیت کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شاس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروادیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیت گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جو زمین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیت عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیت اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش قاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ قاروق رین دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیت کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیت اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک خنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولد آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ تکفیش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیت کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جو زمین نے اس کے لیے ایک صندوق میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیت صندوق کی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، میرے جڑ ایک لاکھ اور چند لاکھ ہونی ایک بلیک اینڈ وہ اسٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جو زمین اور ایک انجینیئر کی جوانی کی ہے۔ جو زمین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جو زمین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر قاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر قاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھائیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ رین دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق قاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں سیٹھ بھائیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھائیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو یہودی تھی۔ بملا اور قاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادوی چاند بانو جو قاروق سے محبت کرتی ہے اور قاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سکی گروہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ رین دادا محلے کی ایک بیوہ شریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ بھوادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو خنڈوں کے ذریعے رین کے ایک آدمی کو قتل کر دیتا ہے رین کو اب بھوک تھلاش ہوتی ہے۔ رین جولیت سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جولیت کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ بملا ایک خنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسٹنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمر دہائی جان سے جاتی ہے قاروق بملا سے حساب لینے کا سوچتا ہے۔ ادھر رین قاروق کا حساب چکانے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس رین کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ تاہم رین اڈے سے نکل کر پنجاب روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر قاروق پر بمبئی والسی کے دوران ٹرین میں ماحول حملہ کرتا ہے اور اسی لڑائی کے دوران ماحول چلتی ٹرین سے گر کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ پولیس کارروائی کے لیے انہیں ایک چھوٹے شہر میں رکنا پڑتا ہے۔ وہاں گھومنے پھرنے کے دوران انہیں ایک لڑکا اکبر ملتا ہے جس پر ایک ہندو خاندان تشدد کر رہا ہوتا ہے۔ قاروق اسے وہاں سے بچا کر اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ قاروق بمبئی لوٹ آیا تھا لیکن یہاں آتے ہی اسے پتا چلا کہ رین پر ولیم نامی گورے افسر پر بدترین تشدد کا الزام ہے۔ ادھر رین جولیت کا بدلہ لینے کے لیے پنجاب میں ولد آغا کی رہائش گاہ پہنچا لیکن ولد آغا ملک سے باہر تھا اس لیے رین کو وہاں آنا پڑا۔ رین اور قاروق نے ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیں اور قاروق کو اسی سلسلے میں ٹھکرتے جانے کا کہا گیا۔ ادھر جولیت نے اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لی تھی اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدر آباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی پہنچ گئی وہ نواب صاحب کے سامنے کھڑی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنے کے لیے تیار تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے



”میں نواب زادی جولیت اسد اللہ ہوں۔“ اس کا دل یہ جملہ ادا کرنے کے لیے شدت سے تڑپ رہا تھا لیکن اس نے اپنے دل کی اس خواہش کو دبایا اور متانت سے بولی۔

”میں نواب زادی صاحبہ کو تعلیم دینے کے ارادے سے آئی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے خاندان کی خواتین باپردہ ضرور ہیں لیکن آپ اپنی حویلی میں ہی ان کو جدید تعلیم دینے کا اہتمام کرتے ہیں۔ میں نے ایم اے کر رکھا ہے اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔“

”بہت خوب! لیکن آپ سے کس نے کہا کہ ہمیں نواب زادی صاحبہ کے لیے استانی کی ضرورت ہے..... ہم نے تو اس سلسلے میں کوئی اشتہار بھی نہیں دیا تھا؟“ نواب سلیم اللہ نے اس کے اعتماد کو محسوس کیا۔

”کسی نے نہیں کہا، میں خود ہی قسمت آزمانے آگئی ہوں۔ سنا ہے آپ کے ہاں ملازمت مل جانا بڑی خوش قسمتی کی علامت ہے۔“ جولیت نے جواب دیا۔

”اور شاید آپ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے بڑے پوتے حبیب اللہ کی بیٹی کی رسم بسم اللہ دو دن پہلے ہی ادا کی گئی ہے۔ نواب زادی کی دینی تعلیم کا آغاز ہو چکا ہے اور اب ہم اسی فکر میں تھے کہ ان کی انگریزی تعلیم کا بھی کوئی بندوبست ہو جائے۔ آپ کے چلے آنے سے ہمیں اپنا یہ مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا ہے۔ آپ فی الحال حویلی میں قیام کریں۔ آپ سے تفصیلی انٹرویو ہمارے صاحب زادے اسد اللہ لیں گے۔ ضعف نے اب ہمارے اندر اتنی ہمت باقی نہیں رکھی ہے کہ ہم کسی کے ساتھ بہت طویل ملاقات کر سکیں۔“ انہوں نے بڑے سلیقے سے ملاقات ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ جولیت جو اپنے دل میں اس حویلی کے افراد کے لیے شدید نفرت کا جذبہ لے کر آئی تھی، چاہتے ہوئے بھی ان کی شخصیت کے رعب و دبدبے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دوسری طرف نواب زادہ اسد اللہ کے نام نے بھی اس کے دل کی دھڑکنوں میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ اس کے لیے اپنے حقیقی باپ سے ملاقات کا خیال ہی سنسنی خیز تھا۔ وہ شخص جس کے نام سے بھی وہ چند دن پہلے تک واقف نہیں تھی، اس سے اپنے باپ کی حیثیت سے ملنا یقیناً ایک انوکھا تجربہ تھا۔ نواب صاحب کے مٹی نے اسے زنان خانے میں پہنچایا، تب تک وہ اسی بارے میں سوچتی رہی۔

”بیجے سروری بیگم، انہیں خاص اہتمام سے ٹھہرایے۔ یہ نواب زادی ماہ نور کی انگریزی تعلیم کے لیے

تشریف لائی ہیں۔“ زنان خانے کی مہتمم سے مٹی نے کہا تو جولیت چونک گئی۔ سروری نام اس کے لیے شناسا تھا۔ جوزفین نے اپنی ڈائری میں جن کرداروں کو بیان کیا تھا، ان میں سے ایک کردار سروری کا بھی تھا۔ جوزفین کے بیان کے مطابق اس زمانے میں سروری ایک نو عمر اور چاق و چوبند لڑکی تھی لیکن اب اتنے برسوں بعد وہ ایک پختہ عمر اور قدرے قریب عورت میں تبدیل ہو چکی تھی جو نو عمر سروری کی طرح فراک اور چوڑی دار پاجامے کے بجائے ساڑی باندھے ہوئے تھی اور اس کے بال جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ نرم نقوش والی اس عورت کو دیکھ کر قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ ماضی میں وہ جوزفین کے خلاف کی جانے والی سازش کا ایک حصہ رہی تھی۔ وہی تو تھی جس نے نواب زادی عالیہ کے زیورات جوزفین کی الماری میں رکھے تھے اور پھر وہ زیورات کئی گواہان کی موجودگی میں جوزفین کی الماری سے برآمد کیے گئے تھے۔

”تشریف لائیے مس صاحبہ! آپ کے آرام کا پورا خیال رکھا جائے گا۔“ سروری نے اس کی تم صمی کیفیت کو محسوس کیا اور خوش اخلاقی سے مخاطب ہوئی۔ اسے لگا تھا کہ یہ نئی آنے والی استانی شاید کچھ گھبراہٹ کا شکار ہے۔

”آپ کا اسم مبارک کیا ہے؟“ جولیت کو اپنی راہنمائی میں لیے اندر کی طرف جاتے ہوئے اس نے دریافت کیا تو وہ ایک بار پھر چونکی۔ زنان خانے کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ مسلسل اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ کم عمری جوزفین نے جب نہایت غربت سے نکلنے کے بعد اس حویلی کی شان و شوکت دیکھی ہوگی تو وہ کتنی مرعوب ہوگی ہوگی، اس بات کا اندازہ وہ آج بھی لگا سکتی تھی کیونکہ حویلی کی وہ شان و شوکت اب بھی برقرار تھی۔ طرز تعمیر اور سجاوٹ دونوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہر شے کا بہت باقاعدگی سے خیال رکھا گیا ہے، جب ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ بالکل نیا ہے لیکن وہ جو ایک قدیم آرٹسٹک ٹچ تھا، وہ بتا رہا تھا کہ برسوں سے یہ حویلی اسی انداز سے قائم ہے۔ طویل برآمدوں کی دونوں جانب بے کمروں میں سے جب اسے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا تو بھی اسے جوزفین یاد آئی بلکہ حقیقتاً وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے ساتھ ہی موجود تھی کیونکہ حویلی میں پہنچ کر اس کو بھی وہی کچھ دیکھنے کو ملا جو برسوں پہلے اس کی ماں نے دیکھا تھا۔ ان ہی سارے مراحل سے گزر کر جب وہ نواب زادہ اسد اللہ کے روبرو پہنچی تو پہلے بھر کے لیے ساکت رہ گئی۔ جوزفین نے اپنی



ڈائری میں ان کا حلیہ بہت تفصیل سے لکھا تھا لیکن پڑھنے اور دیکھنے میں بہر حال فرق ہوتا ہے۔ نواب زادہ اسد اللہ کے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو گئے تھے، اس کے باوجود ان کی شخصی وجاہت پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ جولیٹ کو تسلیم کرنا پڑا کہ اگر اس کی ماں نواب زادہ اسد اللہ کے آگے اپنا سب کچھ ہار بیٹھی تھی تو ایسا ہونا ہی تھا کہ وہ تھے ہی اتنی شاندار شخصیت کے مالک۔ انہیں دیکھ کر جولیٹ کو خیال آیا کہ اس کی اپنی شخصیت میں جو چیزیں جوزفین سے مختلف تھیں تو کیوں تھیں۔ اسے دیکھنے والے کہتے تھے کہ وہ اپنی ماں جیسے نقوش کی مالک تو ضرور ہے لیکن پھر بھی اس سے بہت الگ ہے تو اس میں جو کچھ ”الگ“ تھا، وہ اپنے باپ کی طرف سے آیا تھا۔ وہی سیاہ جھکتے ہوئے بال، گھور سیاہ آنکھیں، اجلی رنگت اور دراز قامت اسے بھی ملی تھی جو نواب زادہ اسد اللہ کی شخصیت کا حصہ تھی۔

”تشریف رکھیے۔“ جولیٹ کے رکنے کو محسوس کر کے نواب زادہ اسد اللہ اس سے انگریزی میں مخاطب ہوئے۔

”شکریہ۔“ جولیٹ بھی بے زبان انگریزی بولی۔

”آپ مجھ کی رہائشی ہیں۔ صحافت کے پیشے سے بھی وابستہ رہی ہیں پھر کیسے خیال آیا کہ یہاں حیدر آباد آکر قسمت آزمائی جائے، وہ بھی بطور ایک معلم۔ یہ تو آپ کے پیشے سے قطعی مختلف کام ہے۔“ نواب زادہ اسد اللہ نے اس کی اپنی خدمت میں پیشی سے قبل ہی اس کی تعلیمی اسناد اور دیگر کوائف منگوا بھیجے تھے اور اب اسی فائل کو اپنے سامنے رکھے اس سے سوال جواب کر رہے تھے۔

”صحافت کا پیشہ خواتین کے لیے بہت مشکل ہے۔ فیلڈ میں رہ کر کام کرنے کی کوشش کرو تو لوگ جینا حرام کر دیتے ہیں اور دفتر کی میز پر بیٹھ کر کام کرنے میں کچھ نہیں رکھا کیونکہ اس صورت میں اوپر والے سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ کر رہی نہیں رہے ہیں اور کام کے انبار پر انبار لگاتے جاتے ہیں۔ اس کے بدلے میں کوئی بیستھینٹ بھی نہیں ملتا اور نہایت کم ملتا۔ تنخواہ میں گزارہ کرنا پڑتا ہے تو میں نے سوچا کہ پیشہ بدل لیا جائے۔ صحافت سے ہٹ کر معلمی کے پیشے پر نظر گئی تو ایک دوست نے مشورہ دیا کہ عام درس گاہوں میں قسمت آزمانے کے بجائے کسی ریاست سے وابستہ ہو جاؤ کیونکہ اس صورت میں عام درس گاہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھا مشاہرہ مل سکتا ہے۔ اس دوست نے ہی حیدر آباد میں قسمت آزمائی کا مشورہ دیا اور یہ معلومات بھی جمع کر کے دیں کہ نواب سلیم اللہ اپنے خاندان کی خواتین کو انگریزی

تعلیم دلوانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ماضی میں ان کے خاندان کی خواتین انگریزی تعلیم حاصل کرتی رہی ہیں۔ نئی نسل میں ایک عدد نواب زادی کی موجودگی کا بھی علم ہو گیا تو بس میں یہاں چلی آئی۔“ جولیٹ کے پاس ان کے سوال کا جواب تیار تھا۔

”ایک طرح سے آپ اعتراف کر رہی ہیں کہ شوقِ معلمی سے زیادہ آپ کی دلچسپی مالی فائدے میں ہے۔“ اسد اللہ کے ماتھے پر ناگواری کا اظہار کرتا ایک بل نمودار ہوا۔

”آپ کو میری دلچسپی سے زیادہ میری اہلیت پر نظر رکھنی چاہیے۔ یہ میری راست گوئی ہے کہ میں نے آپ کو حقیقت سے آگاہ کر دیا ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اپنے شوقِ معلمی پر آپ کے سامنے ایک زوردار تقریر کر ڈالتی اور اس امر میں مجھے کوئی مشکل بھی پیش نہ آتی کہ الفاظ کو برتنا میرا پیشہ رہا ہے اور یقیناً آپ کے پاس ایسا کوئی پیمانہ بھی نہیں ہے کہ آپ میرے سچ جھوٹ کو پرکھ پاتے تو کیا آپ اسے بہتر نہیں سمجھتے کہ میں نے آپ سے وہی کہا جو سچ ہے۔ میری نیت پر گرفت کرنے کا آپ حق بھی نہیں رکھتے، ہاں اگر مجھ سے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو تو میں آپ کے سامنے جواب دہ ہوں کیونکہ میں نے اس ملازمت کے لیے درخواست اس یقین کے ساتھ دی ہے کہ میں اس کی اہلیت رکھتی ہوں۔“ اس نے نواب زادہ اسد اللہ کی ناگواری کو خاطر میں لائے بغیر اتنے اعتماد سے اپنے حق میں دلائل دیے کہ انہیں قائل ہونا پڑا اور وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولے۔

”آپ کی اہلیت تو آپ کی اسناد سے بھی ظاہر ہے اور گفتگو میں بھی ثبوت مل رہے ہیں۔ بہر حال آپ کو اس ملازمت کے لیے عارضی طور پر تعینات کیا جاتا ہے۔ آپ کی اہلیت خود آپ کو اس ملازمت پر مستقل کر دے گی اور آپ وہ معقول و پرکشش مشاہرہ بھی حاصل کر سکیں گی جس کی امید میں یہاں تک آئی ہیں۔“

”شکریہ نواب زادہ صاحب! مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے معیار پر پوری اتروں گی۔“ جولیٹ نے ایک اہم مرحلہ طے ہو جانے پر خوشی محسوس کی۔

”یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ہمارا تجربہ ہے کہ انسانی عقل و شعور کے فیصلوں کے مقابلے میں وقت کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ وقت انسان کی شخصیت پر پڑے نقاب اتار دیتا ہے اور یہ نقاب اترنے پر عموماً تکلیف دہ انکشافات کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ اسد اللہ نے جولیٹ کے



کوائف دیکھے تھے۔ وہ ماں باپ کے سائے سے محروم ایک ضرورت مند لڑکی تھی اور مذہب کے علاوہ اس قدر مشترک نے انہیں اس جوزفین کی یاد دلا دی تھی جو برسوں قبل ان کے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہوئی تھی اور پھر ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کر کے ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ اپنے سامنے بیٹھی جو لیٹ جوزف میں وہ جوزفین کے نقوش کی مانوسیت کو بھی محسوس کر رہے تھے لیکن وہ اپنے قد کاٹھ اور رنگ روپ میں جوزفین سے مختلف تھی۔ ان کا دل چاہا کہ وہ اس سے اس کی ماں کا نام دریافت کریں لیکن پھر انہوں نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ جوزفین کی بیٹی تھی بھی تو کیا فرق پڑتا تھا۔ جوزفین ان کی زندگی سے نکل چکی تھی اور وہ اس کا ذکر چھیڑ کر خود کو دیکھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ادھر جو لیٹ کو بھی ان کے الفاظ نے چونکا دیا تھا اور اسے لگا تھا کہ شاید اسد اللہ کو اس کی ذات پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے اور اس بات کو سوچتے ہوئے وہ تھوڑی سی گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی لیکن اس کی فطری خود اعتمادی نے اسے فوراً ہی سنبھالا دے دیا اور وہ ہونٹوں پر کاٹ داری مسکراہٹ سجا کر بولی۔

”پھر بہتر ہے کہ ہم وقت کے فیصلے کا ہی انتظار کر لیں کیونکہ یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ وقت سب سے بڑا منصف ہے ہوتا ہے اور اس کی عدالت میں ہر چھوٹے بڑے کی کبھی نہ کبھی پیشی ہو ہی جاتی ہے۔“ نواب زادہ اسد اللہ کو اس کے الفاظ سے اختلاف نہیں تھا لیکن اس کی کاٹ دار مسکراہٹ پر انہوں نے اپنے اندر بے چینی اترتی محسوس کی۔

”کون ہے یہ لڑکی اور کیوں آئی ہے؟“ وہ خود سے سوال کیے بنا نہیں رہ سکے اور اپنی جگہ کم صم سے ہو گئے۔ جو لیٹ کو خود ہی ان سے رخصت کی اجازت طلب کرنی پڑی جو انہوں نے اسی کیفیت میں رہتے ہوئے اسے عطا کر دی۔

☆☆☆

فاروق بنا اطلاع کے کلکتہ پہنچا تھا۔ اڈے والوں نے اس کا حیرت آمیز خوشی سے استقبال کیا۔ پہلے ملنے ملانے اور خاطر مدارت کا سلسلہ چلا پھر فاروق نے اڈے کے دادا عبدالرحیم عرف عبدل کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ عبدل نے اسے یقین دلایا کہ اس کی طرف سے بھرپور تعاون کیا جائے گا اور ایک چھوڑ دس بندے گواہی دینے عدالت پہنچ جائیں گے کہ ولیم والے واقعے کے دنوں میں ربن کلکتہ میں مقیم تھا۔ عبدل، ربن کے بہترین دوستوں میں

سے تھا اور اس نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ربن پر ولیم کے حوالے سے جو الزام لگایا جا رہا تھا، وہ صحیح تھا یا غلط۔ عبدل سے معاملات طے ہو گئے تو فاروق نے اس سے اجازت چاہی۔ وہ اس کے یوں آنا فانا روانہ ہونے کے ارادے پر حیران ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ کچھ عرصے تو اڈے پر قیام کرے۔ عبدل خود متعدد بار بمبئی آچکا تھا اور فاروق بھی دو ایک بار ربن کے ساتھ کلکتہ کا چکر لگا چکا تھا اس لیے عبدل اور وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور ایک طرح سے ان کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ عبدل کی حیرت اور اصرار کے جواب میں فاروق نے اسے بتایا کہ بمبئی سے اس کے ساتھ ایک خاتون بھی آئی ہے جسے وہ لوگ ایک ہوٹل میں ٹھہرانے کے بعد اڈے پر آئے ہیں اور اب انہیں اپنی ہم سفر خاتون کی خبر گیری کے لیے واپس ہوٹل جانا ہوگا۔ آج کے دن آرام اور کچھ خریداری کے بعد اس نے اگلے دن ثریا بانو کے سسرال جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ ساتھ ہی وہ عبدل کا شکریہ بھی ادا کرتا رہا کہ اڈے کی طرف سے ثریا بانو کا خاطر خواہ خیال رکھا گیا اور عبدل کا ہاتھ اس کے سر پر ہونے کی اطلاع کی وجہ سے دشمنوں کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ثریا بانو کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کر پاتے۔ عبدل نے اس کے شکریے کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے اپنی دوستی کا فرض قرار دیا اور اسے اور اکبر کو اس وعدے کے ساتھ اڈے سے رخصت کیا کہ کل وہ ثریا بانو سے ملاقات کے بعد دوبارہ اڈے پر آئیں گے۔ فاروق نے اس کے اصرار کو دیکھتے ہوئے ہامی بھر لی ورنہ وہ اپنے دل میں ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ ثریا بانو کی خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد کل ہی بمبئی کے لیے واپس روانہ ہو جائے گا۔ عبدل کے اصرار کے آگے اس نے اپنے اس پروگرام کو مزید ایک رات کے لیے آگے بڑھا دیا۔ وہ اور اکبر، عبدل کے اڈے سے جس تانگے میں روانہ ہوئے اس کا انتظام بھی عبدل ہی نے کیا تھا۔

”جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا تو مجھے لگا تھا کہ آپ میں کوئی خاص بات ہے۔ کوئی آدمی تو کبھی کسی انجان شخص کو بچانے کے لیے یوں بے دھڑک قدم نہیں اٹھا سکتا جیسے آپ نے میرے لیے اٹھایا تھا لیکن اب آپ کے ساتھ ہوں تو اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ میرے اندازے سے بھی زیادہ خاص لوگوں میں سے ہیں۔“ تانگا اڈے سے ہوٹل کی طرف روانہ ہوا تو اب تک خاموشی سے سب دیکھتے اکبر نے اس سے کہا۔ وہ اپنے شہر سے اپنی محبوبہ کی جدائی کا



غم دل میں لے کر آیا تھا اور اس کم عمری میں یہ اتنا بڑا دکھ سہنا آسان نہیں تھا اس لیے عموماً وہ کم صدمہ سی کیفیت میں ہی رہتا تھا۔ فاروق کو اس کی کیفیت کا احساس تھا اسی لیے اس نے اس سفر میں اپنے ساتھ کے لیے اکبر کا انتخاب کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اکبر دنیا کی مصروفیت اور رنگوں میں اچھے تو اسے اپنی اس کیفیت سے نکلنے کا موقع ملے اور شاید بہت آہستگی سے یہ عمل شروع بھی ہو چکا تھا جب ہی تو اکبر نے اس سے اتنی بات کی تھی۔ فاروق اس کی بات سن کر مسکرایا اور بولا۔

”دنیا کا ہر آدمی خاص ہوتا ہے یا۔۔۔۔۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کون کس کے لیے خاص ہے۔“

”آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن آپ جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو جس سے ملتے ہیں اس کے لیے خاص ہو جاتے ہیں۔“ اکبر اس سے اتفاق کرنے کے باوجود اپنی بات پر قائم رہا۔

”ایسا بھی نہیں ہے میرے بھائی! بہت جگہ سے دھکارا ہوا آدمی ہوں میں۔“ فاروق نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

”میں نہیں مان سکتا۔ آپ اتنے شاندار ہیں کہ آپ کو کوئی حق ہی دھکار سکتا ہے۔“ اکبر نے یقین نہیں کیا۔

”مجھ میں شان والی بھلا کیا بات ہے۔ اڈے کی دنیا کا آدمی ہوں اور ہماری دنیا کے لوگوں کو باقی دنیا کن نظروں سے دیکھتی ہے یہ تم بھی جانتے ہو گے۔ میں تو تمہیں بھی یہ مشورہ دوں گا کہ مجھ سے الگ رہ کر اپنی زندگی بناؤ اور عام لوگوں کی طرح ہنسی خوشی رہو۔ ہاں، میری مدد کی جہاں ضرورت پڑے، وہاں بتا دینا۔۔۔۔۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“

فاروق نے اداسی سے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

”تیمی اور مفلسی نے مجھے دنیا کی اتنی پہچان کرادی ہے کہ بڑے اور بھلے آدمی کا فرق جان سکتا ہوں اور اگر قسمت نے مجھے ایک بھلے آدمی کا ساٹھ عطا کر ہی دیا ہے تو اسے چھوڑ کر چلے جانا میری حماقت ہوگی۔“ اکبر کا جواب واضح تھا۔ ان ہی باتوں میں وہ ہونٹ پہنچ گئے۔ کیتھرائن اس عرصے میں تازہ دم ہو چکی تھی۔ اس نے فاروق کا چیک اپ کر کے اپنی ڈیوٹی نبھائی۔ اب فاروق کی طبیعت میں خاصی بہتری آچکی تھی لیکن کیتھرائن پہلے دن کی طرح اب بھی پوری تندرستی سے اس کا خیال رکھتی تھی۔ اب بھی اس نے فاروق کو سختی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور خریداری کو شام تک ملتوی کیے رکھنے کو کہا۔ اصل میں وہ بمبئی سے جس عجلت اور جن حالات میں نکلے تھے، انہیں خریداری کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور ثریا بانو کے سسرال خالی ہاتھ جانا ممکن

نہیں تھا چنانچہ رہن نے بہت سی رقم اس کے حوالے کر کے اس سلسلے میں ہدایت دے دی تھی۔

فاروق نے کیتھرائن کے حکم پر سرخم کر دیا اور خریداری شام تک ملتوی کر دی۔ شام تک بھرپور آرام کر لینے کے بعد وہ تینوں خریداری کے لیے نکلے۔ اس موقع پر اکبر ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا لیکن فاروق نے زبردستی اسے اپنے ساتھ رکھا اور خریداری کے دوران کیتھرائن کے ساتھ ساتھ اس کی رائے بھی لیتا رہا۔ ثریا بانو اور اس سے متعلقہ افراد کے لیے تحائف لینے کے علاوہ اس نے اکبر اور کیتھرائن کے لیے بھی تحائف خریدے۔ ان دونوں نے بہت انکار کیا خصوصاً کیتھرائن کے انکار میں تو بڑی شدت تھی کیونکہ فاروق اسے چند ہی گڑھ اور شملہ سے بھی متعدد چیزیں دلا چکا تھا لیکن فاروق نے ایک برادرانہ ڈانٹ پلاتے ہوئے اس کے انکار کی پروا نہیں کی۔ خریداری سے فارغ ہو کر انہوں نے ہوٹل کی راہ لی اور رات کا کھانا کھا کر جلد سو گئے۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد وہ ثریا بانو کے گھر جانے کے لیے تیار تھے۔ تحائف تو وہ پہلے ہی لے چکے تھے، راستے سے تازہ پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکڑے تیار کروائے اور ثریا بانو کے گھر جا پہنچے۔ آج ہفتہ وار چٹھی کا دن تھا اس لیے ثریا بانو کا شوہر گھر پر ہی تھا۔ اس کی اس سے قبل فاروق سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ثریا کی زبانی بے حد ذکر سن چکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو مجھو دادا کے قصبے میں جانے سے بچانے کے سلسلے میں فاروق کی بے حد شکرگزار تھی اور اسی حوالے سے اس نے اپنے خاوند سے فاروق کی بے حد تعریف بھی کی تھی۔

یہ ثریا بانو کی خوش قسمتی تھی کہ پہلی شادی کے بھیا تک تجربے کے بعد دوسری شادی اسے اس آگنی تھی اور اس کا دوسرا شوہر سمجھ دار اور نیک طبیعت کا آدمی تھا۔ ثریا بانو خود بھی بہت اچھی عادت کی مالک تھی اور شوہر کی پہلی بیوی سے ہونے والی ننھی بچی کو بالکل سگی ماں جیسی محبت اور توجہ سے پال رہی تھی۔ گھریلو امور میں اپنا خاطر خواہ کردار ادا کرنے سے بھی سب پر اس کا اچھا تاثر پڑا تھا، الغرض مختصر عرصے میں اس نے سسرال والوں اور میاں کے دل میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب فاروق اور اس کے ساتھی اس کے میکے والوں کی حیثیت سے وہاں پہنچے تو ان کا بہت کچھ دل سے استقبال کیا گیا۔ فاروق کو لدا اچھا اپنے سسرال کی دہلیز پر کسی نئے بھائی کی طرح میکے کے سے مان سے پا کر ثریا بانو کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ بہت دیر تک اس کی طبیعت



پوچھتی رہی۔ ربن کا حال بھی بہت تفصیل سے پوچھا اور اہل محلہ کے بارے میں بھی دریافت کرتی رہی پھر خاطر داری کے لیے باورچی خانے میں مصروف ہو گئی۔ کیتھرائن کو وہ اپنے ساتھ زنان خانے میں ہی لے گئی تھی جہاں کیتھرائن نے چپکے سے اسے ہدایت کر دی کہ فاروق سے جولیٹ کے بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ ادھر مردانے میں بھی فاروق اور ثریا بانو کے شوہر کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ ثریا کے سر بھی اس محفل میں شامل تھے۔ غفور چاچا نے انہیں ثریا بانو کے جملہ حالات سے آگاہ کرنے کے بعد یہ رشتہ طے کیا تھا اس لیے انہیں پیش آنے والے کسی واقعے پر اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بہت دیر تک ربن کی نیک دلی اور بصیرت کی تعریف کرتے رہے تھے۔ انہوں نے کوکا بھی خصوصی ذکر کیا تھا جس نے اپنی جان دے کر برات کی بمبئی سے کلکتہ بحفاظت واپسی کو ممکن بنایا تھا۔

کوکا کے ذکر پر فاروق کے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ وہ اپنے اس پیارے ساتھی کے جنازے تک میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ بہر حال یہ موضوع بھی بدل گیا اور ملکی حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ وہ لوگ بھی اس بات پر تشویش کا شکار تھے کہ ملک میں جگہ جگہ مسلمانوں سے زیادتی کی جا رہی تھی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ مسلمان اپنی جان، مال اور عزت کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ کئی مقامات پر بلوؤں کی خبریں بھی مل چکی تھیں، ان حالات میں مسلمانوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ جہاں ہیں وہیں ٹکے رہیں یا ملک کے ان حصوں میں ہجرت کر جائیں جن کے مسلم اکثریتی علاقے ہونے کے باعث پاکستان میں شامل ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ ثریا بانو کے سسرال والے بھی اسی کشمکش کا شکار تھے۔ فاروق کو خیال آیا کہ انہوں نے تو اس حوالے سے کچھ سوچا ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ربن کی زبان پر بھی اس حوالے سے کوئی بات نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی ان میں اور وہ سب بمبئی میں ایسے رنج بس گئے تھے کہ جدائی کے بارے میں سوچنا مشکل تھا پھر اڈا کونسا کسی ایک مذہب کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ مسلمان، ہندو، عیسائی سب ہی تو شامل تھے کس کسے میں اور یہ کیسے ممکن تھا کہ کنبے کے کچھ لوگ ہجرت کر جاتے اور کچھ وہیں رہ جاتے اس لیے بس خاموشی ہی مناسب سمجھی گئی تھی۔

گفتگو کے اتار چڑھاؤ میں کب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا، اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ وسیع دسترخوان پر خوش رنگ و خوشبودار کھانے پر دس گئے تو سب کے معدوں میں

چھٹی بھوک بھی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ کھانے کے بعد وہ لوگ ثریا بانو اور دیگر گھروالوں کے اصرار کے باوجود زیادہ دیر وہاں نہیں رہے۔ فاروق کو عبدل سے وعدہ نبھانے کے لیے اڈے پر جانا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ گواہان کو اپنے ساتھ لے کر ہی بمبئی روانہ ہوگا۔ اس ملاقات میں معاملے کی دیگر باریکیوں پر بھی غور کر لیا جاتا تو مناسب ہوتا کیونکہ اس طرح گواہان کے بیان میں اختلاف پیدا ہونے کا احتمال نہ رہتا۔

اکبر اور بمبئی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے اس نے ان لوگوں کو بمبئی آنے کی دعوت دی اور خود بھی وعدہ کیا کہ اگر دوبارہ کلکتہ آتا ہوا تو ملاقات کے لیے ضرور آئے گا۔ ہوٹل واپس پہنچ کر کیتھرائن نے فاروق کو معمول کی دوائیں کھانے کے لیے دیں پھر وہ اور اکبر اڈے کے لیے روانہ ہو گئے۔ کیتھرائن ہوٹل میں ہی مقیم تھی۔ عبدل کے اڈے پر ایک بار پھر ان کے کئی گھنٹے گزرے۔ اس کی ممکن آمد کی وجہ سے عبدل نے آج کے تمام کام ملتوی کر دیے تھے اور اب وہ کل سے بھی زیادہ کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔ عبدل نے جن لوگوں کو بطور گواہان بھیجنے کا ارادہ کیا تھا انہیں بطور خاص اس محفل میں شامل کیا گیا اور جب فاروق ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تب ہی یہ ملاقات اختتام کو پہنچی۔ گفتگو کے دوران عبدل نے بندہ بھیج کر ان کی واپسی کے لیے بنگلہ کروادی تھی چنانچہ جب وہ اڈے سے اٹھ کر ہوٹل پہنچے تو انہیں اس سلسلے میں بے فکری تھی لیکن ہوٹل پہنچ کر انہیں بہت بڑا جھٹکا لگا۔ کیتھرائن ہوٹل کے اس کمرے میں موجود نہیں تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ اس کی غیر موجودگی پر یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کسی ضرورت کے تحت از خود باہر گئی ہے۔ اس کے کمرے کا دروازہ بس یونہی بھڑا ہوا تھا اور اندر سے کٹدی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اس کے جوتے بھی کمرے میں ہی پڑے ہوئے تھے اور کسی طور نہیں سوچا جاسکتا تھا کہ وہ بغیر جوتوں کے کہیں جاسکتی ہے۔ پھر وہ کہاں ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس نے ان دونوں کے ہوش اڑا دیے تھے۔

☆☆☆

”سوری۔ میں یہ لباس نہیں پہن سکتی۔ میرے پاس میرے اپنے کپڑے موجود ہیں اور میں ان کپڑوں میں خود کو زیادہ بہتر محسوس کرتی ہوں۔“ جولیٹ نے ملازمہ کے لائے ہوئے ملبوسات پر ایک نگاہ غلط ڈالی اور ٹھوس لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

”پر مں جی یہ تو ادھر حولی کا رواج ہے۔ آپا بیگم کا



جولہ کی فرد ہیں البتہ اسد اللہ کے بائیں جانب جو جوان بیٹھا تھا، وہ بہت مختلف تھا۔ مضبوط کانٹھی، بے پناہ گوری رنگت، سنہری بال اور چہرے کے نقوش سے جھلکتا کھردرا پن۔ اپنے حلیے سے وہ اس خطے کا باسی ہی نہیں لگ رہا تھا۔

”یہ آصف خان ہیں۔ ہمارے عزیز دوست و آصف خان کے صاحب زادے۔ پشاور سے تشریف لائے ہیں اور ہمارے معزز مہمان ہیں۔“ اسد اللہ کے کرواتے تعارف نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اس نے دونوں حضرات سے سرسری سی علیک سلیک کی اور اسد اللہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سروری نے بتایا کہ آپ کسی اہم مسئلے پر ہم سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ فرمائیے ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔“ اسد اللہ بھی فوری طور پر اصل مقصد کی طرف آ گئے۔

”مسئلہ کوئی نہیں ہے لیکن بنایا جا رہا ہے۔ اگر یہاں ملازمت کے کچھ اصول تھے تو تقرری کے وقت آپ کو مجھے ان کے بارے میں آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ ایسا کوئی اصول جس سے میری شخصی آزادی پر حرف آئے، میرے لیے قطعی قابل قبول نہیں ہے۔ میں نے یہاں بطور معلم ملازمت اختیار کی ہے اور میں اس بات کی پابند ہوں کہ وقت مقررہ پر نو اب زادی ماہ نور کو بہترین تعلیم دوں۔ میری اس خدمت کے علاوہ کسی کو میرے کسی عمل پر پابندی لگانے یا شرائط رکھنے کی قطعی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ میرا لباس، کھانا پینا اور سونے جاگنے کے اوقات قطعی میرے ذاتی معاملات ہیں اور ان معاملات میں کسی کی دخل اندازی کو میں اپنی شخصی آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف تصور کرتی ہوں۔“

اے علم تھا کہ سروری نے اسد اللہ کو مسئلے کی نوعیت سے بھی آگاہ کر دیا ہوگا چنانچہ کھل کر ایک ہی بار ان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس حویلی کے اصولوں سے واقف تھی اور ان پر ضرب لگانے کا فیصلہ کر کے آئی تھی۔

”اصل میں زنان خانے کا سارا انتظام ہماری پھپھی بیگم کے ہاتھوں میں ہی ہے اور وہ ذرا اقامت پسند خاتون ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حویلی کی خواتین پر کسی دوسری تہذیب کا اثر نہیں پڑنا چاہیے اس لیے وہ اس قسم کی پابندیاں عائد کرتی ہیں اور عموماً کوئی ان سے اختلاف بھی نہیں کرتا اس لیے ہم نے آپ سے خصوصاً ان معاملات پر گفتگو نہیں کی تھی۔“ اسد اللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت دی۔

حکم ہے کہ زنان خانے میں کوئی کرسیاٹوں کے لباس میں نظر نہ آئے۔“ تو عمر ملازمہ نے اسے حویلی کے ایک ایسے اصول سے آگاہ کیا جس سے وہ پہلے ہی واقف تھی۔ آخر اس کی ماں نے بھی تو یہ سب سہا تھا لیکن وہ جوزفین نہیں جو لیٹ تھی جس کی رگوں میں اسی خاندان کا خون دوڑ رہا تھا اور وہ خود میں ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت پاتی تھی۔

”میں نے کہہ دیا تاکہ میں یہ لباس نہیں پہنوں گی۔ تم جا کر اپنی آپا بیگم کو اطلاع دے دو۔“ اس نے سختی سے ملازمہ کو جواب دیا اور رخ پھیر کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”انہوں بہت اصولوں والے ہیں مس جی۔ آپ ان کی بات سے انکار کو (نہیں) کرو ورنہ آپ کی نوکری چلی جائے گی۔“ معلوم نہیں ملازمہ نے اس سے ہمدردی جتنا کی تھی یا اسے دھمکی دی تھی۔

”یہ تو کمری مجھے نواب زادہ صاحب نے دی ہے اور انہوں نے میرے سامنے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔“ جولیٹ نے بل کھا کر جواب دیا۔

”وہ تو صرف آپ کی قابلیت جانچے ہوں گے ناپر  
زمان خانے کے اصول تو آپا بیگم ہی بتاتے ہیں۔“ ملازمہ  
نے اسے اطلاع فراہم کی۔

”اس صورت میں، میں نواب زادہ صاحب سے ایک ملاقات کرنا چاہوں گی۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا تو ملازمہ بے بسی سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد سروری اس کے سامنے تھی۔ اس کی ماں کے زمانے کی کم عمر سروری اب حویلی میں وہی مقام حاصل کر چکی تھی جو کبھی اکاٹیکیم کا ہوا کرتا تھا۔ وہ یہاں موجود ملازماؤں کی نگراں تھی اور اس کا بیگمات میں خاصا اثر و رسوخ سمجھا جاتا تھا۔ سروری نے بھی اس سے تقریباً وہی ساری باتیں کہیں جو اس سے پہلے ملازمہ کر چکی تھی۔۔۔

نواب میں اس نے بھی نواب زادہ اسد اللہ سے ملاقات کا مطالبہ دہرا دیا۔ ناچار سرسوری نے اس ملاقات کا اہتمام کروا دیا۔ وہ پورے اعتماد سے ملاقات کے لیے جا پہنچی۔ اس وقت اسد اللہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ دو جوان العمر حضرات بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اسد اللہ نے پہلے اسے بیٹھنے کی اجازت دی اور ان دونوں سے اس کا تعارف کروایا۔

”یہ حبیب اللہ ہیں۔ ہمارے بڑے بیٹے اور آپ کی شام گروہ ماہ نور کے والد۔“ پہلے انہوں نے اپنے دائیں جانب کرتہ پاجامے میں ملبوس شخص کا تعارف کروایا۔ حبیب اللہ کے چہرے کے نقوش کو انہی دے رہے تھے کہ وہ اسی



کوئی محاذ جیت لیا ہو۔ اس کی مسکراہٹ نے اسد اللہ کے دل میں چٹکی سی لی اور بے ساختہ ہی وہ گلاب کی پتھری سے ہونٹ یاد آئے جو مسکراتے تھے تو ان کے دل کی دنیا زیرِ روزِ بر ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

دپک ہوٹل میں اس وقت ایک ہنگامہ مچا تھا۔ فاروق زخم کھائے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ وہ تحمل مزاج آدمی تھا اور بلند آواز سے شاذ ہی بات کرتا تھا لیکن اس وقت حادثہ ہی ایسا پیتا تھا کہ اس کی ساری تحمل مزاجی اور دھیمپن اڑن چھو ہو گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ کیٹھرائن جسے اس نے اپنی بہن کا درجہ دے رکھا تھا اور اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا، پراسرار طور پر غائب ہو چکی تھی اور اس کا کوئی اتا پتا بھی نہیں تھا۔ فاروق نے اسے کمرے سے غائب پا کر سب سے پہلے استقبالیہ سے رابطہ کیا لیکن وہاں سے کیٹھرائن کے سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ ہوٹل کے دربان اور بیروں میں سے بھی کسی کو کچھ علم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیٹی ہے۔ ان میں سے کسی نے اسے ہوٹل سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کسی کو ایسے کسی شخص کا علم تھا جو کیٹھرائن کے کمرے میں ملاقات کے لیے گیا ہو۔ یہ صورت حال سخت مخدوش تھی۔ فاروق نے ہوٹل کی انتظامیہ کو اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرایا اور سختی سے عملے کے ساتھ باز پرس کرنے لگا۔ اس موقع پر ہوٹل کا منیجر انوپم اس کے مقابل آگیا اور اپنے ہوٹل کا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں مسٹر! میرے عملے میں سے کسی کو علم نہیں ہے کہ آپ کی ساتھی خاتون کہاں گئی ہیں۔ ممکن ہے وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہوں اور کچھ دیر میں از خود واپس آجائیں۔ ایسے میں آپ کا یہ رویہ ہوٹل کے عملے کے ساتھ زیادتی تصور کیا جائے گا۔“ سوٹ کے ساتھ ہیپنگ ٹائی لگائے منیجر نے شاید فاروق کو مرعوب کرنے کے لیے انگریزی میں یہ جملے ادا کیے تھے۔

”میری ساتھی کے جوتے کمرے میں موجود ہیں اور بغیر جوتوں کے ظاہر ہے وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“ فاروق نے اسے گھورتے ہوئے بہ زبان انگریزی ہی جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے ان کے پاس جوتوں کی کوئی دوسری جوڑی موجود ہو اور وہ اسے بہن کر باہر گئی ہوں۔“ منیجر نے دلیل دی جو قابل قبول سمجھی جاسکتی تھی لیکن فاروق نے کیٹھرائن کے جوتوں کو جس بے ترتیبی سے کمرے میں ادھر

”اگر آپ کو ان کا خوف درست لگتا ہے تو آپ کو چاہیے کہ اپنی ہی برادری سے کسی کو اس ملازمت کے لیے منتخب کریں کیونکہ صرف لباس بدل لینے سے کسی کے نظریات تو نہیں بدل سکتے۔ اصل چیز تو میرے خیال و افکار ہیں جو میں اتنی آسانی سے نواب زادی کے ذہن میں منتقل کر سکتی ہوں کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔“ اس نے دلیل دی جس نے وہاں موجود تینوں ہی حضرات کو متاثر کیا اور وہ دلچسپ نظروں سے اسے دیکھنے لگے، پھر اسد اللہ بولے۔

”آپ نے وہ مقولہ تو سنا ہوگا کہ روم میں رہ کر رومی بن جاؤ تو بس آپ بھی ایسا کریں، بحث سے تو مسائل بڑھتے ہیں۔“

”میں اس قسم کے سمجھوتوں کی قائل نہیں اور نہ ہی بحث کر رہی ہوں۔ میں صرف آپ کو اپنے موقف سے آگاہ کر رہی ہوں۔ آپ کو حق حاصل ہے کہ اسے رد کر کے اپنا فیصلہ سنا دیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں اسد اللہ کی بات کو روکیا۔ اس کے اس انداز پر ان کے چہرے کی رنگت ذرا سی تبدیل ہوئی۔ آنکھوں میں حیرت بھی دکھائی دینے لگی۔

”یہ جو آصف خان صاحب ہیں آپ کے دوست کے صاحب زادے..... یہ بھی تو حویلی میں رائج لباس سے مختلف لباس پہنے ہوئے ہیں۔ انہیں آپ نے روم میں رہ کر رومی بننے کا مشورہ کیوں نہیں دیا۔“ جولیٹ نے ان کی کیفیت بھانپی اور ایک اور ضرب لگائی۔ اس کے اس انداز پر کھلے پانچپوں کی گھیر دار شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس آصف خان کے ہونٹ کھنی مونچھوں تلے بے ساختگی سے مسکرائے۔ حسیب اللہ نے بھی اپنی جگہ پہلو بدلا اور ذرا سا گلا کھٹکھا کر بولا۔

”مس جوزف کی بات کافی حد تک درست ہے چچا جان۔ ہم ان کی شخصی آزادی سلب کرنے کا حق نہیں رکھتے اور اگر ہمارا ایسا کوئی مطالبہ تھا تو انہیں ملازمت پر رکھتے وقت ہمیں انہیں آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ اب ایسی کوئی پابندی لگانا اخلاقیات کے منافی ہے۔“

”ہم بھی ان کے موقف کی تائید کرتے ہیں لیکن پچھی بیگم اسے اپنی اتنا کا مسئلہ بنالیں گی۔“ اسد اللہ نے اصل مسئلے کی نشاندہی کی۔

”انہیں قائل کرنا ہمارا کام ہے۔ ان کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔“ حسیب اللہ نے گویا مسئلہ حل کر دیا۔

”تو پھر شیک ہے۔ ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔“ اسد اللہ نے جواب دیا اور جولیٹ یوں مسکرائی جیسے اس نے



اُدھر پڑا ہوا دیکھا تھا وہ اس کے مزاج کے قطعی خلاف تھا۔ پھر کمرے کا دروازہ بھی مقفل نہیں تھا۔ اگر کیتھرائن اذخود کہیں جاتی تو دروازہ مقفل کرنے کے بعد چابی استقبالیہ پر دے کر جاتی۔ اس نے ہوٹل کے منیجر کو یہ دلائل دیے تو منیجر پہلے بھر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن پھر دوبارہ خم ٹھونک کر میدان میں اتر اور بے رخی سے بولا۔

”فرض کر لیں کہ آپ کی ساتھی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، تب بھی ہوٹل انتظامیہ اس سلسلے میں ذمے دار نہیں ہے۔ خاتون کے اس طرح اغوا ہونے کے پیچھے یقیناً آپ کی کسی دشمنی کا ہاتھ ہوگا اور ہم اپنے گاہکوں کو صرف یہاں قیام و طعام کی سہولت فراہم کرنے کے پابند ہیں۔ انہیں ان کے دشمنوں سے محفوظ رکھنا ہماری ذمے داری نہیں ہے۔“

”اس طرح کی باتیں کر کے تم خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں کہ میری ساتھی کسی پرانی دشمنی کا نشانہ بنی ہے پھر بھی ہوٹل کی انتظامیہ کو اپنے ہوٹل کی حدود میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کا علم ہونا چاہیے۔ میری ساتھی ایک جوان لڑکی تھی، کوئی کبھی نہیں جسے لے جانے والا مارجس کی ڈبیا میں بند کر کے لے گیا ہوگا۔ اسے اگر زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے تو لازماً کچھ لوگوں کو اس واقعے کا عینی شاہد ہونا چاہیے تھا لیکن عینی شاہد کے نہ ہونے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ہوٹل کے عملے میں سے کچھ لوگ اغوا کاروں سے ملے ہوئے تھے جنہوں نے میری ساتھی کو خفیہ طور پر غائب کرنے میں دشمنوں کا ساتھ دیا اور مجھے وہ لوگ درکار ہیں جنہوں نے یہ کام کرنے میں مدد دی ہے۔“ فاروق استقبالیہ کاؤنٹر پر زور سے ہاتھ مار کر چلایا تو لکڑی کے کاؤنٹر پر رکھی چیزیں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ ایک خوب صورت نیلے رنگ کا گلدان لڑھک کر نیچے گرا اور چکنا چور ہو گیا۔

”اپنا یار بالکل ٹھیک بولتا ہے منیجر۔ اپنے کو تمہارے اسٹاف میں سے وہ سالانہ لوگ نکال کر دو، اپن ان کے حلق سے خود ہی لڑکی کا پتا نکلوالے گا۔“ گلدان ٹوٹنے پر غصے سے دانت کچکچاتا منیجر فاروق کو کوئی سخت بات کہنے ہی والا تھا کہ اس نے فاروق کی پشت پر کھڑے عبدل کو دیکھا اور عبدل کی زبان سے نکلے کلمات نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ عبدل کے آدمی شہر کے ہر قابل ذکر مقام پر موجود رہتے تھے اس لیے شہر میں ہونے والے ہر اہم واقعے کی اطلاع اس تک پہنچ جاتی تھی۔ دیکھ ہوٹل میں بھی اس کے دو آدمی موجود تھے۔ جن میں سے ایک صورت حال کا جائزہ لینے

کے لیے وہیں رک گیا تھا جبکہ دوسرے نے برق رفتاری سے اڈے پر اطلاع پہنچا دی تھی، نتیجتاً عبدل یہاں موجود تھا۔ ”سب لوگ تمہارے سامنے ہیں دادا۔ میں کس کا نام لوں؟“ عبدل کو سامنے پا کر منیجر کا سارا کردار رخصت ہو گیا اور وہ مٹھکھلاتے ہوئے بولا۔

”بس تو پھر اب اپنا منہ بند رکھنا۔ لڑکی کو ہم خود تلاش کر لیں گے۔“ عبدل نے اسے تنبیہ کی اور بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ اس کی ہدایت پر انہوں نے سب سے پہلے ہوٹل کے خارجی راستے بند کیے اور پھر ایک ایک کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ اس عمل پر کئی مسافروں نے احتجاج بھی کیا لیکن منیجر انہیں سمجھاتا بھجاتا رہا اور دلیل دی کہ یہ لڑکی کے اغوا کا معاملہ ہے اور اگر ہم نے پولیس کو کال کی، تب وہ بھی یہی سب کرے گی۔ لوگ قائل ہوئے یا نہیں لیکن عبدل اور اس کے ساتھیوں کی دہشت کے باعث انہیں تعاون کرنا پڑا۔ عبدل اپنے ساتھ شاید آدھے سے زیادہ اڈے کے لوگ اٹھالایا تھا چنانچہ تلاشی کا کام بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔ اس کام کے دوران ہوٹل کے تمام بیروں، باورچی اور دیگر ملازمین کو ایک جگہ جمع کر لیا گیا تھا اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”فکر نہ کرو فاروق استاد۔ تمہاری ساتھی کو صحیح سلامت تمہارے حوالے کرنا عبدل کی ذمے داری ہے۔ اپنے آدمی اس ہوٹل کو ادھیر کر رکھ دیں گے۔ آس پاس بھی بندوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ سب کتوں کی طرح سونگھتے پھر رہے ہیں۔ لڑکی اُدھر سے نکلی ہے تو میرے بندے اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“ عبدل نے بے چین فاروق کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی، جواب میں فاروق صرف ہونٹ بچھ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ موجود اکبر بھی اس صورت حال پر متوحش تھا اور بار بار فاروق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے اسے خاموش تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ عبدل کے آدمی تیزی سے تلاشی کا عمل جاری رکھے ہوئے لمحہ بہ لمحہ اس تک اطلاعات بھی پہنچا رہے تھے۔ ابھی تک کیتھرائن کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

”تم میں سے کسی کو کچھ معلوم ہے تو بول دو ورنہ بعد میں اپن بخشے گا نہیں۔“ عبدل نے ایک جگہ جمع کیے گئے جملہ اسٹاف کو دھمکی دی جس پر کئی کے چہروں پر زردی چھا گئی تاہم زبان سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ غم و غصے میں بل کھاتا فاروق بھی ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور ایک ایک کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً سب ہی



سنسناہٹ دوڑ گئی اور وہ بلک بلک کر اس سے معافی طلب کرنے لگا۔

”پہلے میری بہن کا پتا بتا۔“ فاروق اسی سرد لہجے میں غرایا۔  
 ”لانا ڈری میں میلے کپڑوں کے نیچے۔“ نوجوان بیرے  
 نے لرزتی آواز میں بتایا اور بے ہوش ہو گیا۔ شاید یہ بے ہوشی  
 ارادنا اختیار کی گئی تھی۔ فاروق کے دل میں اس شخص کے لیے  
 کوئی رحم نہیں تھا۔ اس نے بے پروائی سے اس شخص کی گردن  
 چھوڑ دی، نتیجتاً وہ دھڑام سے گئے فرش پر گر گیا۔ فاروق نے  
 اس پر نگاہ غلط ڈالے بغیر نیچر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی نظروں  
 کا مفہوم سمجھ گیا اور مستعدی سے بولا۔

”میرے ساتھ آئیے، میں آپ کو لانا ڈری تک لے  
 چلا ہوں۔“ فاروق، اکبر اور عبدل کے چند ساتھی ان کے  
 ساتھ ہو لیے۔ بے ہوش ویر کو عبدل کے دو ساتھیوں نے  
 اس کے اشارے پر اپنے زرخے میں لے لیا تھا۔ فاروق اور  
 اس کے ساتھی منجھری راہنمائی میں لانا ڈری والے حصے کی  
 طرف بڑھے۔

یہ حصہ زیر زمین تہ خانے میں بنایا گیا تھا۔ یہاں  
 ہوٹل کے عملے کے علاوہ مسافروں کی خواہش کے مطابق ان  
 کے کپڑے دھونے کا مکمل انتظام تھا لیکن بڑی تعداد بستر کی  
 چادروں، نکیہ غلاف اور پردوں وغیرہ کی بھی اور یہ چیزیں  
 ایک ڈھیر کی صورت میں ایک جگہ جمع کی گئی تھیں۔ ایک  
 طرف لکڑی کے بڑے بڑے شیلف بھی بنے ہوئے تھے  
 جن میں دھلی ہوئی چادریں اور پردے وغیرہ رکھے ہوئے  
 تھے۔ دھپک ہوٹل کلکتہ کے اچھے ہوٹلوں میں سے ایک تھا  
 اور یہاں صفائی کا خاص اہتمام رکھا جاتا تھا۔ بستر کی  
 چادریں اور نکیوں کے غلاف روزانہ تبدیل کیے جاتے  
 تھے۔ غسل خانوں میں استعمال ہونے والے تولیے بھی  
 ہمیشہ صاف ستھری حالت میں ملتے تھے اور پردوں کو بھی  
 ہفتہ وار دھویا جاتا تھا۔ منجھرنے بتایا کہ آج پردوں کی تبدیلی  
 کا دن تھا اس لیے کپڑوں کا ڈھیر کچھ زیادہ تھا۔

فاروق ایک بڑے سے ڈھیر کی طرف لپکا اور  
 کپڑے ہٹاتے ہوئے کیتھرائن کو آوازیں دینے لگا۔  
 دوسرے لوگ بھی اس کی مدد کرنے لگے۔ کپڑوں کا ڈھیر ہٹا  
 تو ایک چادر میں لپٹی کیتھرائن نظر آ گئی۔ وہ بے ہوش تھی۔  
 فاروق اسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اوپر کی طرف لپکا۔  
 وہ پتا نہیں کتنی دیر سے میلے کپڑوں کے بوجھ تلے دبئی ہوئی  
 تھی کہ اس سے سانس بھی ڈھنگ سے نہیں لی جا رہی تھی۔  
 فاروق نے باہر لا کر اسے کھلی ہوا میں لٹایا اور اس کے ہاتھ

خوف زدہ تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ عبدل ان سے لڑکی کا پتا  
 اگلوانے کے لیے انہیں تشدد کا نشانہ بنائے گا۔ ان خوف زدہ  
 چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے فاروق کی نظر بیس بائیس سال  
 کے ایک لڑکے پر پڑی۔ وہ بیرے کی وردی میں تھا اور بار  
 بار اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ بے خودی کی  
 کیفیت میں اس عمل کو جاری رکھے ہوئے اسے یہ بھی ہوش  
 نہیں تھا کہ اس طرح کرنے سے اس کا نچلا ہونٹ بری طرح  
 مجروح ہو گیا ہے اور ہونٹ سے خون کی سرخی چھلک رہی  
 ہے۔ فاروق اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور تیر کی طرح  
 جھپٹ کر اس لڑکے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ایک ہی  
 جھپٹے میں اس کے گریبان کے سارے بٹن ٹوٹ گئے اور  
 کھلے گریبان سے اس کا عریاں سینہ جھلکنے لگا۔

”کہاں ہے میری ساتھی۔ جلدی بتا ورنہ تیری ایک  
 ایک ہڈی توڑ ڈالوں گا۔“ فاروق نے اسے مہلت دے بغیر  
 ایک طوفانی گھونسا اس کے دائیں جڑے پر رسید کیا۔ گھونسا  
 اتنا زوردار تھا کہ اس نوجوان کا جڑا ہل کر رہ گیا اور منہ سے  
 خون بہنے لگا۔ اس بہتے ہوئے خون کے ساتھ دو عدد ٹوٹ  
 جانے والے دانت بھی تھے۔ ”زبان تو تجھے کھولنی ہی ہوگی  
 ورنہ میں تیرا ایک ایک جوڑ کھول کر رکھ دوں گا۔“ اس بار  
 فاروق نے اس کی کلائی کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے سے  
 یقیناً اس کی کلائی کا جوڑ کھل گیا تھا کیونکہ نوجوان بیرے نے  
 اس بار بالکل کسی ذبح ہوتے ہوئے جانور جیسی چیخ ماری تھی۔  
 اس کی دلدوز چیخ سن کر عبدل کے رعب کے باعث زبان  
 بندی اختیار کر لینے والا منجھر بلبلہ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور عبدل  
 کے قریب جا کر اس سے بولا۔

”اس وحشی کو روکو دادا، ورنہ وہ اس بے چارے ویر  
 کی جان لے لے گا۔“

”وہ تیرے باپ کا سگا ہے جو تیرے پیٹ میں درد  
 ہو رہا ہے۔“ عبدل نے منجھر کو گھورا تو وہ کھسا کر پیچھے ہٹ  
 گیا۔ عبدل دلچسپی سے فاروق کی کارروائی دیکھنے لگا۔ اب  
 فاروق نے ویر کی گردن کو اپنی آہنی انگلیوں کی گرفت میں  
 لے لیا تھا۔ گردن اس تکنیک سے پکڑی گئی تھی کہ سانس کی  
 نالی پر زیادہ دباؤ نہیں آ رہا تھا لیکن ویر کو ایسا لگ رہا تھا کہ  
 اس کی گردن کو پیچھے سے کسی آہنی ٹکچے نے جکڑ لیا ہو۔

”اب بھی نہیں بولے گا تو گردن کو وہ جھٹکا دوں گا کہ  
 تیری جان نہیں نکلے گی لیکن مرتے دم تک مردوں سے بھی  
 بدتر حال میں بستر پر پڑا رہے گا۔“ فاروق کی غراہٹ میں  
 کوئی ایسی بات تھی کہ نوجوان کی ریزہ کی ہڈی میں



ڈاکٹر سے خواہش ظاہر کی۔

”ویسے تو اتنی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ چاہتے ہیں تو میں نرس کو بھجوا دوں گا۔“ ڈاکٹر نے اسے جواب دیا اور مزید ایک بار کیتھی کا معائنہ کرنے اور فاروق کو تسلی دینے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”تم یہاں کیتھی کے پاس رکو اکبر! میں ذرا اڈے کا چکر لگا کر آتا ہوں۔“ فاروق کے ہاتھوں مار کھانے والے بیرے کو عبدل کے آدمی اپنے ساتھ اڈے لے گئے تھے۔ فاروق کو کیتھرائن کی فکر نہیں ہوتی تو وہ بیرے سے اسی وقت اس کی حرکت کا مقصد بھی اگلو الیتا۔ اب بھی اسے وجہ جاننے کی بے چینی تھی اس لیے کیتھرائن کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی اڈے کا قصد کیا۔ نکلنے سے قبل وہ اکبر کو ہدایات دے کر نکلتا تھا کہ کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں وہ کیا قدم اٹھائے۔ ہوٹل میں انہیں عبدل کا مہمان جان کر فیجر ہر قدم کے لیے تیار تھا اس کے باوجود عبدل اپنے دو آدمیوں کو چھوڑ کر گیا تھا کہ حفاظت بھی ہوتی رہے اور کسی ضرورت کے وقت بھی دشواری پیش نہ آئے۔

”آؤ آؤ فاروق استاد۔ میں تمہاری ہی راہ دیکھتا تھا۔“ وہ اڈے پہنچا تو عبدل کو اپنا خطر پایا۔

”کہاں ہے وہ سورا! کچھ اگلا اس نے یا نہیں؟“ فاروق کا غصہ ابھی بھی قائم تھا۔

”سب اگلو الیتا ہے استاد۔ تم آرام سے بیٹھو۔“ عبدل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ ہی بٹھالیا اور کسی کو آواز دے کر ٹھنڈا شربت لانے کا حکم دیا۔

”کیا بولتا ہے وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا؟“ فاروق کا دماغ بیرے میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

”بھاڑے کا ٹٹو ہے۔ زیادہ کام کی بات نہیں اگلا۔ بس اتنا بتایا کہ دوپہر میں ایک موچھوں والا آدمی ہوٹل آیا تھا اور اسی نے اس آدمی کو بیچ کے واسطے سروس دیا تھا۔ کھانا کھا کر اس آدمی نے سندر نام کے اس ویٹر کو مونی ٹپ دیا اور پھر چپکے سے بولا کہ اگر سندر اس کا ایک کام کر دے تو وہ اسے بھاری رقم دے گا۔ سندر (بیرا) کی بہن کا اگلے مہینے بیاہ ہونے والا ہے اس لیے وہ لالچ میں آ گیا اور تم لوگوں کی غیر موجودگی میں کیتھرائن کو بے ہوش کر کے نیچے تہ خانے میں پہنچا دیا۔ وہ بستر کی چادریں اور پردے وغیرہ تبدیل کرنے کے بہانے کیتھرائن کے کمرے میں گھسا تھا اور چادروں وغیرہ میں ہی اسے چھپا کر نیچے پہنچا دیا تھا۔ اس سے کام لینے والے آدمی کا کہنا تھا کہ وہ موقع دیکھ کر خود ہی اس سے لڑکی کو

بیروں کی بندشیں کھولنے لگا۔ اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا وہ تہ خانے میں ہی نکال چکا تھا۔ اس کے بندشیں کھولنے کے دوران کسی نے کیتھرائن کے چہرے پر پانی کے چھینٹے بھی مارنا شروع کر دیے تھے۔ فاروق اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگا۔ اس کے چہرے پر شدید رنج اور غصے کے تاثرات تھے چنانچہ کسی اور میں اتنی ہمت بھی نہیں ہو سکتی کہ کیتھرائن کو ہاتھ لگا پاتا پھر خواتین میں سے ہی ایک نے ہمت کی اور اس کے منہ میں پانی کیتھرائن کے منہ میں بھی پٹکایا گیا تو بتدریج اس کی حالت میں تبدیلی آتی شروع ہوئی اور وہ دیر دیر سے کسمانے لگی۔

”میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ وہ بس پہنچتا ہی ہوگا۔“ پریشان حال فیجر نے اطلاع دی اور اس کی اطلاع کے پانچ چھ منٹ بعد ہی ڈاکٹر وہاں موجود تھا۔

”ایسا لگتا ہے بہت دیر تک انہیں ڈھنگ سے آکسیجن کی فراہمی نہیں ہوئی اس لیے یہ اس حال کو پہنچ گئی ہیں، ہٹ ڈونٹ وری۔ کچھ دیر میں یہ بہتر ہو جائیں گی۔ میں نے انجیکشن دے دیا ہے۔“ ڈاکٹر نے پوری توجہ سے اس کا معائنہ کیا اور اس کے بازو میں انجیکشن لگاتے ہوئے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”اگر ضرورت ہو تو انہیں اسپتال شفٹ کر دیتے ہیں ڈاکٹر۔“ فاروق نے مضطربانہ انداز میں ڈاکٹر کی رائے چاہی۔

”میرے حساب سے تو ضرورت نہیں ہے۔ بس ان کے گرد جھوم کم کر دیں اور انہیں آرام کرنے دیں۔“ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ عبدل نے بھی اس کی تائید کی اور کیتھرائن کو ہوٹل کے عملے کے تعاون سے اس کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ کمرہ اکھلا اور ہوا دار تھا۔ چھت پر برقی پنکھا بھی موجود تھا، اس کے باوجود فیجر نے ایک اضافی پیڈیٹل فین بھی فراہم کر دیا۔

”یہ بے ہوش نہیں ہیں۔ بس میں نے سکون آور انجیکشن لگا دیا ہے۔ کچھ گھنٹے آرام سے سوتی رہیں گی تو جلدی ری کور کریں گی۔“ ڈاکٹر نے ایک بار پھر فاروق کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔ اصل میں فاروق وغیرہ کی کوشش سے وہ ہوش میں تو پہلے ہی آ گئی تھی لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے حواس ٹھیک طرح کام نہیں کر رہے ہیں۔ اتنی دیر ملے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے بندھی ہوئی حالت میں آکسیجن کی کمی کے ساتھ پڑے رہنا یقینی طور پر اس کے ذہن پر اثر انداز ہوا تھا اور اسے ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔

”ہمارے ساتھ کوئی خاتون نہیں ہیں اگر آپ ان کے لیے کسی نرس کا انتظام کر دیں تو بہتر ہوگا۔“ فاروق نے



ہو کر بک گیا اور ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ ٹھیک ٹھاک مار تو پہلے ہی کھا چکا ہے وہ۔ تم ایسا کرنا کہ میری طرف سے اسے یہ تھوڑی سی رقم دے دینا۔ اپنا علاج بھی کروالے گا اور بہن کی شادی میں بھی کام آجائے گی۔“ فاروق نے اپنی جیب سے نکال کر اچھی خاصی رقم عبدل کے ہاتھ پر رکھی تو وہ ہنس پڑا اور بولا۔

”ہونا آخر رین کے چیلے۔ وہ بھی دیکھو تو ابھی گرم ہے اور ابھی نرم پڑ گیا۔ کس کے ساتھ کیسے پیش آئے گا، ہے پر ہی پتا چلتا ہے۔“

”آدمی دیکھ کر برتاؤ کرنا پڑتا ہے دادا۔ ہم اپنے اوپر اٹھنے والے ہاتھوں کو توڑ ڈالنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن کسی لاچار کے ساتھ زیادتی کرنے کا کبھی نہیں سوچتے۔“ فاروق نے رین کا وضع کردہ سیدھا سادہ اصول بیان کیا۔

”ہماری دنیا میں سب لوگ ایسا نہیں سوچتے۔ رین ایسا ہے جب ہی تو سب سے الگ دکھائی پڑتا ہے۔“ عبدل نے رین کی تعریف کی۔

”یہ تو تم نے سولہ آنے ٹھیک کہا دادا! وہ واقعی سب سے جدا ہے۔ اس جیسا تو بس کوئی کوئی ہی ہوتا ہوگا۔“ عبدل کی تائید کرتے ہوئے فاروق کا دماغ خود ہی ماضی کی یادوں کو کھنگالنے لگا تھا۔ وہ بمبئی میں اس کا چوتھا دن تھا۔ وہ کوئی آٹھ روز قبل اپنے گھر سے نکلا تھا۔ نکلنے وقت دماغ پر غصہ سوار تھا اس لیے تن کے کپڑوں میں خالی ہاتھ ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ جیب میں کچھ رقم ضرور موجود تھی لیکن وہ کب تک ساتھ دیتی۔ بمبئی آنے سے قبل وہ راستے میں ایک دو جگہ رکنا ہوا آیا تھا۔ ریل کے کرائے، رہائش اور کھانے پینے میں اچھی خاصی رقم خرچ ہو گئی تھی چنانچہ جب وہ بمبئی پہنچا تو اس کے ہاتھ میں بہت تھوڑے پیسے تھے۔ یہ پیسے بھی کب تک ساتھ دیتے۔ ختم ہو گئے اور نوبت یہ آگئی کہ کمرے کا کرایہ دینا تو دور کی بات، اس کے پاس پیٹ بھرنے کے لیے بھی کچھ نہ بچا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی عادت نہیں تھی اور زندگی اتنے عیش و آرام میں گزری تھی کہ کبھی ایک وقت کا کھانا بھی چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یوں تو اس نے میٹرک کا امتحان دے رکھا تھا لیکن کسی قسم کا کاغذی ثبوت پاس نہیں تھا اور نہ ہی اتنا تجربہ تھا کہ دفاتروں میں چکر لگا کر نوکری کے حصول کے لیے جدوجہد کر پاتا۔ بس کشمکش کے عالم میں وقت گزرتا رہا اور جب رقم ختم ہو گئی تو خاموشی سے ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر ایک قریبی پارک میں جا بیٹھا۔ شام، رات میں

لے جائے گا اور اسی وقت پیسے بھی دے دے گا لیکن پہلے ہی ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور دونوں ہی کام نہ ہو سکے۔ نہ لڑکی گئی، نہ اس حرام کے پلے کو روپے ملے۔ الٹا پیٹ بھر کر مار کھانے کے بعد آپ پڑا زمین چاٹ رہا ہے۔“

”سندر کو اس آدمی کے بارے میں کچھ معلوم ہے کیا؟ ہو سکتا ہے وہ بھی دھپک ہوٹل میں ہی ٹھہرا ہوا ہو۔“ عبدل کی زبانی ساری تفصیل سننے کے بعد فاروق نے سوال داغا۔

”نہیں۔ وہ آدمی دھپک ہوٹل میں نہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ نہ ہی سندر اسے کسی اور طرح جانتا ہے، ہاں اس نے حلیہ ضرور بتایا ہے۔“ عبدل نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے سندر کی زبانی سنا حلیہ تفصیل سے بیان کر دیا۔ فاروق کی یادداشت میں اس حلیے کا کوئی آدمی نہیں تھا۔

”تم کیا بولتے ہو..... کون ہے اس کام کے پیچھے؟“ عبدل نے اس کی رائے جاننی چاہی۔

”دشمن تو بہت ہیں لیکن اس طرح کی گری ہوئی حرکت ہوئی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ مجھ کے کسی گھر کے کام ہے۔ وہی ہے جو انتقام کی دھن میں گھسیا گھسیا حرکت بھی کر سکتا ہے۔“ فاروق نے فوراً اندازہ لگایا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو استاد۔ اپنے کو بھی یہی شک ہے۔ ادھر رین نے ثریا بانو نامی جس عورت کے لیے کھلوا یا تھا، اس کی تو میرے آدمی پوری خبر گیری کر رہے ہیں۔ میں نے ثریا بانو کے اپنی پناہ میں ہونے کا اعلان بھی کروا دیا تھا اس لیے اس پر تو ہاتھ ڈالنے کی کسی کی ہمت نہیں ہوئی لیکن موقع دیکھ کر سالے یہاں وار کر گئے۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی کہ تمہارے پیچھے ہوٹل میں نگرانی کا بندوبست نہیں کیا ورنہ ایسی نوبت ہی نہ آتی۔“ عبدل نے اس کی رائے کی تائید کرتے ہوئے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا۔

”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ شکر ہے کہ کیتھرائن محفوظ رہی۔ اب کل اگر اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو ہم بمبئی واپس لوٹ جائیں گے۔ پیچھے تم چوکنے رہنا۔ اس حرکت سے ظاہر ہے کہ دشمن نے پیچھا نہیں چھوڑا ہے، بس ڈر کر دیک کر بیٹھا ہوا ہے۔“ فاروق نے رفتہ رفتہ اپنے غصے پر قابو پالیا تھا اور اب معمول کے انداز میں بات کر رہا تھا۔

”اس چھوکرے کا کیا کرنا ہے؟“

”کون، وہ ویٹر سندر.....!“ فاروق نے تصدیق چاہی۔

”ہاں وہی۔ بولو تو اسے چوک میں کھڑا کر کے ڈنڈے لگواؤں۔“

”جائے دو دادا! بے چارہ اپنی ضرورت سے مجبور



ذہلی تو پارک میں دیرانی چھانے لگی۔ اندھیرا، تنہائی، بھوک اور بے سرو سامانی..... ایسی سخت رات فاروق کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ عمر ہی کتنی تھی؟ ماضی کے عیش یاد آئے تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو بہاتے ہوئے اس نے خود سے پوچھا کہ کیا اسے گھر واپس لوٹ جانا چاہیے لیکن خون میں صدمہ تھی اور ساتھ ہی یہ دُغم بھی کہ اس نے ایک اصولی بات پر گھر چھوڑا ہے اس لیے واپسی کے حق میں فیصلہ نہ ہو سکا لیکن یہاں رہنا تھا تو اس مفلسی کے عالم میں کیسے رہا جاتا۔ وہ بے آواز آنسو بہاتا، خود سے الجھتا ایک شیخ پر سکڑا سمٹا پڑا رہا اور اسے خبر نہیں ہوئی کہ وہ کچھ بد خصلت لوگوں کی نظر میں آ گیا ہے۔ اصل میں تو وہ اسے شام سے ہی یہاں بیٹھا دیکھ رہے تھے۔ اس کا لباس اگرچہ میلا تھا لیکن وہ گدڑی کے نعل کی طرح چمک رہا تھا۔ اعلیٰ رنگت، خوب صورت نقوش، انشتی جوانی کا بائٹن اور عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے باعث نرم و ملائم ہاتھ پیر۔ وہ تو قوم لوط کی باقیات کے لیے ایک تر نوالہ تھا۔

بد خصلت شام سے رات ہونے تک اس پر گھات لگائے بیٹھے رہے۔ رات گہری ہوئی اور ہر سونائے کی حکمرانی ہو گئی تو انہوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ پہلے تو ان کے تیور پہچان ہی نہیں سکا اور یہی سمجھا کہ وہ مال و متاع کی خاطر اس کے گرد جمع ہوئے ہیں۔ خوف زدہ لہجے میں انہیں اپنی بے سرو سامانی سے آگاہ کیا تو وہ قہقہے لگانے لگے اور پھر اسے آگاہ کیا کہ انہیں کیا درکار ہے۔ وہ بری طرح بدک گیا۔ خلافِ عادت و تربیت انہیں گالیاں بھی نکلیں اور الٹے سیدھے ہاتھ پیر بھی چلائے لیکن ان بد معاشوں کے ٹولے کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ انہوں نے منٹوں میں اسے بے دست و پا کر دیا۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اس نے دل کی گہرائیوں سے رب کو پکارا۔ اس کے دربار میں اس کی پکار رانگاہیں نہیں گئی اور رب کی رحمت کے فرشتے کی طرح وہاں پہنچ گیا۔ اس کی لٹکار میں شیر کی سی گرج تھی اور بدنِ برق کی طرح لپک جھپک حرکت کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ان تینوں مستندوں کا بھر کس نکال دیا۔ وہ مقابلہ کیا کر پاتے۔ ان کے لیے اپنی جانیں بچا کر بھاگنا مشکل ہو گیا۔ ان سے فارغ ہو کر ربین فاروق کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بارش میں بھیگے بلی کے بچے کی طرح شیخ پر سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔ اس کا کئی دن کا میلا لباس غنڈوں سے ہاتھ پائی میں کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ روشن آنکھوں اور موہنی صورت والا

فاروق اسی پل ربین کے دل پر راج کرنے لگا۔ اس نے فوری طور پر اس سے کچھ نہیں پوچھا اور اسے اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ غنڈوں سے ہونے والی مڈ بھیڑ نے فاروق کو بے حد خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کا خوف شاید اسے ربین کے ساتھ جانے سے بھی روک لیتا لیکن ربین میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس نے اس پر اعتبار کر لیا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ربین نے اس کے لیے لباس کا انتظام کروایا اور جب وہ نہادھو کر اس صاف ستھرے لباس میں فراہم کردہ گرم کھانا کھانے بیٹھا تو ربین بے ساختہ ہی بول اٹھا۔

”تو تو شہزادہ ہے رے! ادھر بمبئی کی گلیوں میں کدھری رلتا پھر رہا ہے؟“ اس کے جملے پر فاروق کی آنکھیں نم ہو گئیں اور نوالہ توڑتا ہاتھ رک گیا۔ ربین نے اس کی کیفیت کو محسوس کر کے اسے دلاسا دیا اور بے اصرار کھانا کھلایا۔ حکم سیری کے بعد فاروق کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ ربین نے اس کے لیے سونے کا انتظام بھی کر دیا۔ فاروق اندر سے سہا ہوا تھا اس کے باوجود اسے اس رات بہت گہری اور پرسکون نیند آئی۔ دوسری صبح اس کے لیے حیرت کا ایک نیا جہان کھل گیا۔ وہ جس بڑے سے مکان میں موجود تھا، وہاں بھانت بھانت کے مرد بھرے ہوئے تھے اور عورت کے وجود کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ مرد و عورت کسرت کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے داؤ بیچ لڑا رہے ہیں، چاقو زنی اور خنجر زنی کی مشقیں ہو رہی ہیں۔ اس نے ایسی دنیا بھلا کہاں دیکھی تھی۔ دیکھی تو دیکھتا رہ گیا۔ اس گہما گہمی میں بھی اس کی طرف سے غفلت نہیں برتی گئی۔ ایک آدمی لپک جھپک اس کے پاس آیا اور اسے صاف ستھرے غسل خانے میں پہنچا دیا۔ وہ ضروریات سے فارغ ہو کر واپس اپنے کمرے میں آیا تو اسے باداموں کا حریرہ پیش کیا گیا۔ حریرہ بہت خوش ذائقہ تھا۔ سجو کے ہاتھ کے ذائقے کے اس اولین تجربے کے بعد بھی اس نے ہمیشہ اس کے ہاتھ کے کھانوں کو بہترین پایا۔ بہر حال وہ اس کی اڈے پر پہلی صبح تھی۔ حریرہ پی چکنے کے بعد وہ کافی دیر اپنی جگہ تذبذب کے عالم میں بیٹھا رہا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اصل میں یہ بات اسے شروع ہی سے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ غصے اور جذبات میں وہ فوری طور پر گھر سے تو نکل گیا تھا لیکن اس کے ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ گھر کے باہر کی دنیا میں وہ کس طرح اپنی بقا کی جنگ لڑے گا اور کیونکر اپنا گزارہ کر پائے گا۔ یہی کیفیت اب بھی تھی۔ ربین نے اسے پیغام بھیج کر ناشتے کے لیے بلوایا تو وہ اس بڑے سے کمرے کا



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                   |                 |                  |
|---------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد    | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو    | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ       | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

صاف ستھری چاندنیوں پر وسیع دسترخوان بچھا ہوا تھا جن کے اطراف وہی سب نہائے دھوئے، صاف ستھرے لباس میں بیٹھے ہوئے تھے جنہیں اس نے کچھ دیر قبل مختلف مشغلوں میں مصروف پایا تھا۔ کمرے میں ہر سو خوشبوئیں اڑتی پھر رہی تھیں۔ انڈے، پرائے، نہاری اور سوچی کا حلوا دسترخوان کی رونق بڑھا رہے تھے۔ بالکل کسی دعوت کا سماں تھا۔ اس کی آمد پر ربین نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ ربین کے کہنے پر اس کے دائیں پہلو میں بیٹھے ہوئے اس نے ربین کے بائیں جانب بیٹھے گولو کو دیکھا۔ وہ اس صحت مند سے بچے کو اتنے مردوں کے درمیان پا کر حیران رہ گیا۔ یہ گمان بھی ہوا کہ شاید وہ ربین کا بیٹا ہے۔ ربین اس کا خیال بھی بہت رکھ رہا تھا لیکن بچے کے انداز میں وہ بے تکلفی نہیں بھی جو باپ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ناشتے کے دوران ربین نے فاروق کا بھی بہت خیال رکھا اور کھانے پر اصرار کرتا رہا۔ ناشا خوش ذائقہ تھا لیکن ایک تو فاروق نے رات کا کھانا بھی بہت تاخیر سے کھایا تھا اور صبح صبح حریرہ بھی پی لیا تھا اس لیے بہت کم کھایا۔ ناشتے کے بعد ربین نے کچھ ضروری امور نمٹانے کے بعد اس سے دوبارہ ملاقات کا عندیہ دیا اور وہ انتظار کا یہ وقت گزار کر دوبارہ ربین کی خدمت میں پہنچا یا گیا تو اس وقت تک وہاں کی گہما گہما بہت کم ہو چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ بیشتر افراد مکان سے باہر جا چکے ہیں۔ گولو البتہ اب بھی ربین کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ ربین نے پہلے تو فاروق سے اس کا احوال دریافت کیا۔ اس نے زیادہ تفصیل سے کچھ نہیں بتایا بس اتنا ہی بولا کہ گھر والوں سے ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا ہے اور واپس گھر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ربین نے اسے نصیحت کی کہ اگر گھر کے حالات بالکل ہی ناقابل برداشت نہیں ہیں تو اسے واپس لوٹ جانا چاہیے کیونکہ باہر کی دنیا کتنی ظالم ہے اس کی ایک جھلک فاروق دیکھ چکا تھا۔ فاروق بھی اس واقعے سے سہا ہوا تھا لیکن مزاج میں ضد اور اتانگی اور دماغ اب بھی واپس پلٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ معلوم تھا کہ واپس جائے گا تو طنزیہ لگا ہوں اور کیلیے جملوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ سب برداشت کرنا اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ ربین نے اپنے طور پر اسے سمجھایا کہ اس میں دنیا کا مقابلہ کرنے کے گھر نہیں ہیں اور خدشہ ہے کہ یہ دنیا اسے نگل لے گی۔ فاروق سب سن رہا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا۔ آخر ربین نے خود ہی موضوع بدل دیا اور اسے اپنے بارے میں آگاہ کرنے

لگا۔ اس نے کھل کر فاروق سے اپنی دنیا کا تعارف کروایا اور بتایا کہ معاشرے میں ان لوگوں کا کیا مقام ہے۔ فاروق نے اڈے پاڈے کی دنیا کا بس ذکر ہی سنا تھا، وہ بھی بہت سرسری سا۔ اس دنیا کو نزدیک سے دیکھنا اس کے لیے انوکھا تجربہ ثابت ہوا۔ اسی نشست میں اس نے گولو کے بارے میں بھی جانا۔ اپنے ساتھ ربین کی نیکی کا تجربہ اسے ہو چکا تھا۔ گولو کی داستان سن کر مزید متاثر ہو گیا۔ سوئلی ماں کے مظالم کا شکار اس بچے کو ربین نے جس طرح اپنے سائے میں لے لیا تھا، ایسا ہر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو کسی صاحب دل کا ہی طرز عمل ہو سکتا تھا۔ وہ صاحب دل اگر دادا کی گدی پر بیٹھا تھا اور بھئی کا ایک اڈا چلاتا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ بہت سے نیک نام لوگوں سے بہتر تھا۔

فاروق نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔ اسے اب اسی دنیا میں رہنا تھا اور وہ سارے ہنر سیکھنے تھے جو اس دنیا کے باسیوں کے لیے ضروری تھے۔ یہ فیصلہ اس نے رات پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے بھی کیا تھا۔ وہ خود کو اتنا مضبوط کرنا چاہتا تھا کہ کوئی ہاتھ اس کی طرف بڑھے تو وہ اسے توڑ سکے۔ ربین نے اسے اپنے فیصلے پر اچھی طرح سوچ بچار کے لیے چند دن کی مہلت دی۔ وہ ایک بار فیصلہ کر کے اس پر قائم رہنے کا عادی تھا چنانچہ مہلت کے بعد بھی فیصلہ وہی رہا اور یوں ربین کے زیر سایہ اس کی تربیت کا آغاز ہوا۔ دوران تربیت اس کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہیں کی جاتی تھی اور وہ سارے اصول و قواعد اس پر بھی لاگو ہوتے تھے جن کے اڈے کے دیگر افراد پابند تھے لیکن اس کے علاوہ اسے خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ ربین نے اسے پہلے دن شہزادہ کہا تھا اور ہمیشہ شہزادوں ہی کی طرح رکھا تھا۔ ہر ہنر میں طاق کر دینے کے باوجود وہ بھی فاروق کو عملی میدان میں نہیں لایا تھا اور یوں فاروق اتنے سال اڈے پر رہنے کے باوجود پوری طرح اس دنیا کا باسی نہیں تھا۔ وہ تو شہزادہ تھا شہزادہ..... خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر لینے والا شہزادہ..... جس کی جزیں بہر حال اب بھی اپنے اصل میں ہی گڑی ہوئی تھیں اسی لیے اڈے پر رہتے ہوئے بھی شخصیت کا بالکل قائم و دائم تھا۔

☆☆☆

حویلی میں رہ کر جولیٹ کو یہاں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ اس کی دادی یعنی نواب زادہ اسد اللہ کی والدہ وقات باجی تھیں۔ نواب سلیم اللہ اب بھی حویلی کے حکمران تھے لیکن بڑھاپے کے



باعث بہت زیادہ فعال نہیں رہے تھے اور عملاً باگ ڈور دونوں بیٹوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپا بیگم بھی بہت ضعیف ہو گئی تھیں لیکن زنان خانے میں بہر حال اب بھی ان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ سارے معاملات سے باخبر رہتی تھیں۔ ان کی بیٹی عشرت جہاں اورنگ آباد میں بیابھی گئی تھی اور سننے میں آیا تھا کہ اس کا شوہر اور سسرالی ذرا سخت مزاج کے لوگ ہیں اس لیے کم کم ہی میکے آ پاتی ہے۔ جولیت نے اندازہ لگایا کہ عشرت جہاں کے سسرالی ذرا کیا زیادہ ہی تیز مزاج کے لوگ ہوں گے جو ماضی کی تنگ مزاج اور غریبی عشرت جہاں کو ٹیکل ڈالنے میں کامیاب رہے۔ عشرت کا بھائی صفر نواب سلیم اللہ کا داماد تھا۔ عالیہ اس حویلی کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی آپا بیگم کی بیہوشی سے ان کے زیرِ عتاب رہتی تھی اور اس کا سارا دن ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں کسن وچھیل حبیب اللہ کی بیوی زیادہ آرام سے رہتی تھی۔ حبیب اللہ کو آپا بیگم کے مزاج میں خاصا دخل حاصل تھا اور اسی رعایت سے اس کی بیوی رحنا کو بھی چھوٹ حاصل تھی۔ عالیہ کی بد قسمتی تھی کہ اول تو اللہ نے اولاد کی دولت سے نہیں نوازا، دوسرے صفر بھی کم کم ہی حویلی میں پایا جاتا تھا۔ اس نے مستقل لندن میں سکونت اختیار کر رکھی تھی اور سال میں صرف ایک ڈیڑھ ماہ ہی یہاں گزرتا تھا۔ یہاں شک کھا جاتا تھا کہ صفر نے لندن میں دوسری شادی کر رکھی ہے لیکن خود اس نے کبھی تائید یا تردید نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ نواب زادہ اسد اللہ نے بھی کبھی اس سلسلے میں زبان نہیں کھولی تھی حالانکہ وہ ایک طویل عرصے تک لندن میں رہے تھے اور اب بھی بھی کبھار وہاں کا چکر لگاتے تھے۔

جولیت کو یہ ساری معلومات اس شوخ سی نوجوان ملازمہ زہرہ سے حاصل ہوئی تھیں جو اس کی خدمت پر مامور تھی۔ جولیت نے معلومات کے حصول کے لیے خاص طور پر اس سے دوستی گانٹھی تھی اور اس کی یہ ترکیب ناکام نہیں رہی تھی۔ پٹر پٹر بولنے والی زہرہ سے اسے بہت سے قصے سننے کو ملتے تھے۔ خود اپنے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ ماضی میں حویلی کی منتظم رہنے والی اکا بیگم کی نواسی تھی۔ اکا بیگم نے طویل عرصے حویلی میں خدمات انجام دی تھیں اور اب صاحب فراش تھیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں حویلی کی طرف سے ان کے لیے تاحیات وقفہ مقرر کر دیا گیا تھا اور اب ان کی یتیم نواسی زہرہ یہاں خدمات انجام

دے رہی تھی۔ زہرہ نے چپکے سے جولیت کو بتایا تھا کہ بھوں تو حویلی والے بہت دیا لوتے تھے لیکن ملازمین کو ذرا سی غلطی پر بڑی تنگ اور بسا اوقات سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زنان خانے میں یہ سزائیں آپا بیگم کی طرف سے جاری کی جاتی تھیں اور اکثر بڑی عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر زہرہ نے ماضی قریب کا ایک قصہ بھی سنایا تھا۔ یہ سزاروٹیاں پکانے والی عورت کو دی گئی تھی۔ اس سے نامعلوم کیسے ایک روٹی بچی رہ گئی اور شوخی قسمت کہ وہ روٹی آپا بیگم کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ انہوں نے ہنگامہ مچا دیا کہ بچی روٹیاں کھلا کر یہ عورت حویلی کے کمینوں کا پیٹ خراب کر دے گی۔ اسے سزا دی گئی کہ وہ ایک وقت کے لیے گوندھا جانے والا آٹا کچا کھائے گی۔ اتنا سارا کچا آٹا کھانا کوئی مذاق نہیں تھا لیکن ملازمہ کو کسی نہ کسی طرح یہ کرنا پڑا۔ زہرہ کے مطابق تازہ گوندھے ہوئے آٹے کو کھاتے ہوئے اس ملازمہ کی حالت غیر ہونے لگی تھی لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس نے آٹے کا تھال خالی کر دیا۔ اس سزا کو قبول کرنے سے انکار کی صورت میں اسے نواب صاحب کے پالتو کتے کے ساتھ ایک کمرے میں بند کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ ظاہر ہے ملازمہ اس خوفناک کتے کے ساتھ بند رہنا قبول نہیں کر سکتی تھی اس لیے کچا آٹا کھانا منظور کر لیا۔ آٹا کھاتے کھاتے اس کی حالت غیر ہو گئی اور وہ الٹیاں کرنے لگی۔ شام تک اس کے پیٹ میں شدید درد بھی شروع ہو گیا۔ علاج کے اخراجات حویلی کی طرف سے ہی ادا کیے گئے لیکن ساتھ ہی منہ بند رکھنے کی دھمکی اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کی تنبیہ بھی کر دی گئی۔ جولیت نے یہ قصہ سنا تو انگشت بدندان رہ گئی۔ صاحب اختیار ہونے کے زعم میں اپنے زیرِ نگیں افراد سے ایسا سلوک..... یہ تو قطعاً انسانیت کی توہین تھی لیکن جہاں بے حد و حساب دولت ہو، وہاں اس طرح کے رویے غیر معمولی بھی نہیں ہوتے۔ تاریخ بھری پڑی تھی صاحب اختیار و صاحب ثروت لوگوں کے ظلم و ستم کی داستانوں سے۔ یہاں تو پھر بھی شاید کچھ رعایت سے کام لیا جاتا تھا۔ کم از کم حویلی کے ملازمین کو تنگ دستی کا سامنا نہیں تھا اور انہیں دل کھول کر نوازا جاتا تھا شاید اسی وجہ سے ملازمین یہاں سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

جولیت نے حویلی کے سب سے اہم کردار نواب زادہ اسد اللہ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں۔ زہرہ نے اسے بتایا تھا کہ کئی برس پہلے نواب زادہ اسد اللہ



نیت سے حویلی پہنچ گئی تھی۔

حویلی میں آمد کے ساتھ ہی یہاں کی کرتا دھرتا آ پاپیگم کے ساتھ اس کے اختلافات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پہلا اختلاف لباس کے سلسلے میں ہوا تھا جس پر حبیب اللہ نے آپا پیگم کو منالیا تھا اور جولیٹ کے حق میں دلیل دی تھی کہ اگرچہ اس کا لباس مسلم خواتین سے مختلف ہے لیکن وہ مکمل لباس پہنتی ہے جو ستر پوشی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اور پھر اس کے لباس میں اسکارف کا بھی اہتمام ہوتا ہے جو کچھ نہ کچھ دوپٹے کا نعم البدل سمجھا جاسکتا ہے۔ حبیب اللہ کو جولیٹ کے حق میں پا کر آپا پیگم کو بھی قائل ہونا پڑا تھا۔ جولیٹ نے دوسرا اختلاف کھانے پینے کے اوقات کے سلسلے میں کیا تھا اور طے شدہ وقت پر کھانے کے کمرے میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے موڈ اور پسند کے مطابق کھانا کھانا پسند کرتی ہے اس لیے ایسی کوئی پابندی قبول نہیں کر سکتی۔ اس معاملے میں اسد اللہ نے اس کا ساتھ دیا تھا اور آپا پیگم کو سمجھایا تھا کہ وہ حویلی کی فرد جیس ہے اور نہ ہی اس کی حیثیت ذاتی خدمت گاروں جیسی ہے اس لیے اس سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی پچھی صاحبہ کو استاد کے احترام اور مقام کے سلسلے میں بھی کافی دلائل دیے تھے چنانچہ انہیں یہاں بھی پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی اور ان کی یہ پسپائی جولیٹ کے لیے باعث مسرت تھی۔ جوزفین کے حالات زندگی پڑھنے کے بعد اسے حویلی میں آپا پیگم کے غیر معمولی اثر و رسوخ کا اندازہ ہو گیا تھا اور اس کا اندازہ تھا کہ آپا پیگم جو کہ اپنی کم رو بیٹی عشرت جہاں کو نواب زادہ اسد اللہ کے سر منڈھنے کی شدت سے خواہاں تھیں، اپنی وقادار ملازماؤں کی زبانی جوزفین اور اسد اللہ کے عشق کی داستان سن کر چونکی ہو گئی ہوں گی اور اس سے قبل کہ محبت کی یہ کہانی شادی کے انجام تک پہنچ پاتی، انہوں نے سازش کا ایسا تانا بانا بنا کہ جوزفین کو تا صرف حویلی بلکہ اسد اللہ کی زندگی سے بھی نکالنے میں کامیاب ہو گئیں، پر افسوس کہ وہ اپنی بیٹی کو پھر بھی اسد اللہ کی بیوی نہ بنا سکیں اور یہ امر بھی جولیٹ کے لیے خوشی کا باعث بنا تھا۔

اس کی ماں کو اسد اللہ کی زندگی سے نکالنے والے خود اپنے مقاصد میں بھی کامیاب نہیں رہے تھے، اس انکشاف نے دل کو ایک گونا گوں سی تلی دی تھی۔ دل کو یہ احساس ہوا تھا کہ انسانوں کی تمام تر فرعونیت کے باوجود ایک نظام انصاف تھا جو کہیں نہ کہیں سے چل رہا تھا اور اسی کے تل پر

کی شادی ہوئی تھی لیکن ان کی بیوی پہلی زوجگی کے دوران ہی فوت ہو گئی تھی اور اس کے بعد نواب زادہ اسد اللہ نے باوجود اصرار کے دوسری شادی نہیں کی۔ زہرہ نے اسے چپکے سے بتایا کہ نواب زادہ صاحب نے پہلی شادی بھی اپنی والدہ کے شدید اصرار پر اس وقت کی تھی جب وہ بستر مرگ پر تھیں اور اسد اللہ کے لیے مرنے والی ماں کی خواہش کو رد کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ حویلی میں گردش کرتی خفیہ داستانوں میں سے ایک داستان نواب زادہ اسد اللہ کے عشق کی بھی تھی۔ یہ داستان کبھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی لیکن اتنا بہر حال کہا جاتا تھا کہ جوانی میں اسد اللہ کسی کی زلفوں کے اسیر ہو گئے تھے۔ ان کے دل پر راج کرنے والی ہستی کون تھی، اس کا زہرہ کو علم نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اس کی مانی نے بھی کبھی زبان نہیں کھولی تھی اور جتنا اسے علم تھا، وہ بھی حویلی کی دوسری ملازماؤں کے سبب۔ اسد اللہ نسبتاً خاموش مزاج اور لیے دیے رہنے والے آدمی تھے جنہوں نے کبھی کسی کو ایک لفظ نہیں کہا تھا پھر بھی سب کے دلوں پر ان کا رعب تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جامداد کا انتظام و انصرام سنبھالتے تھے اور باقی کا وقت پڑھنے لکھنے میں گزرتا تھا۔ جولیٹ کے لیے ان کے بارے میں حاصل ہونے والی یہ معلومات انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔ وہ اپنے دل میں ان کے لیے نفرت اور انتقام کے جذبات لے کر آئی تھی کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق وہ ایک عیاش نواب زادے تھے جنہوں نے اس کی کم عمری کو اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑ کر اپنا مطلب نکالا تھا جب ہی تو جوزفین کے سازش کے تحت حویلی بدر کیے جانے کے بعد اس کی کوئی خیر خبر نہیں لی تھی۔ اگر وہ جوزفین سے سچی محبت کرتے تھے تو اس پر لگائے گئے چوری کے الزام کو کھنساں ہی جانتے اور کچھ نہیں تو الزام کی حقیقت جاننے کے لیے ہی اس سے رابطہ کرتے لیکن انہوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور جوزفین کے حویلی چھوڑنے کے بعد خود اطمینان سے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے پاس جوزفین کا بمبئی کا پتا موجود تھا۔ اس پتے پر جوزفین نے کتنے ہی دن ان کی راہ دیکھی تھی اور پھر مجبور ہو کر جوزف کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام لیا تھا۔ اگر جوزف اپنی محبت میں سچا نہ ہوتا تو جوزفین کا کیا ہوتا اور خود جولیٹ آج کہاں ہوتی؟ یہ دو ایسے سوالات تھے جو وہ نواب زادہ اسد اللہ کی شخصیت کی تمام تر کشش کے باوجود خود کو انہیں معاف کرنے پر آمادہ نہیں کر پاتی تھی اور دماغ میں کوئی خاص منصوبہ نہ ہونے کے باوجود انتقام کی



یہ کائنات قائم تھی ورنہ تو یہ صاحب اختیار لوگ شاید یہ دنیا ہی الٹ کر رکھ دیجے۔ اس نظام انصاف پر یقین بحال ہونے کے باعث ہی اسے یہ آس بھی بندھی تھی کہ ایک نہ ایک دن اس پر ظلم ڈھانے والے دلدار آغا کا بھی احتساب ہوگا اور وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔ وہ اس حویلی میں آتے ہوئے اپنے دل میں بہت سی نفرت لے کر آئی تھی، کچھ کچھ گھبراہٹ بھی تھی کہ معلوم نہیں حالات اس کے قابو میں آج بھی سکیں گے یا نہیں لیکن حیرت انگیز طور پر سب کچھ بہت آسانی سے ہوتا چلا جا رہا تھا اور وہ اتنی تیزی سے حویلی میں ضم ہوتی جا رہی تھی جیسے ہمیشہ سے ہی یہاں رہتی آئی ہو حالانکہ حویلی میں بالخصوص زنان خانے میں اسے اتنے زیادہ کھلے دل سے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ مالکوں کے ساتھ ساتھ ملازما بھی عموماً اس سے گریزاں رہتی تھیں اور شاید ایسا آپا بیگم کی اس کے لیے ناپسندیدگی کی وجہ سے تھا۔ ملازموں میں زہرہ اور مالکان میں واحد حبیب اللہ کی بیوی ہی تھی جو اس سے کھل کر گفتگو کر لیتی تھیں، اس کے باوجود یہاں قیام کے بعد سے وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ جتنا سلگتا دل کچھ حالت قرار میں تھا اور وہ اپنی اس تبدیلی پر خود بھی حیران تھی۔

”کیا اپنے اصل تک پہنچ جانے کے باعث میری یہ کیفیت ہے؟“ حویلی کے پائیں باغ میں بیٹھی اس وقت بھی وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔

”لیکن اصل تک پہنچنا اسے تو نہیں کہتے۔ کتنی ہی معزز اور محترم سہمی، پر کھلاؤں گی تو میں اس حویلی کی ایک تنخواہ دار ملازمہ ہی..... میں کوئی جولیٹ اسد اللہ کی حیثیت سے تو یہاں مقیم نہیں ہوں۔“ اپنے سوال کے جواب میں اس کے پاس یہ ابجھن بھری سوچ بھی جس سے الجھتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی اس کی تنہائی میں دخل اندازی کے لیے وہاں چلا آیا ہے۔ آنے والے نے کھٹکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسد اللہ کے دوست کا بیٹا آصف خان تھا جس نے آج بھی اپنے روایتی گھیردار شلوار قمیص کے اوپر واسکٹ پہن رکھی تھی۔

”کس سوچ میں گم ہیں میڈم۔ بہت دیر سے آپ کو ایک ہی زاویے سے بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ سوچا اگر کوئی مسئلہ ہے تو پوچھ لیتا ہوں، ہو سکتا ہے میں کچھ مدد کر سکوں۔“ یہ وہ بیزبان انگریزی جولیٹ سے مخاطب ہوا۔ حویلی میں موجود بیشتر مرد حضرات انگریزی سے اچھی طرح واقف تھے اور

اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنا پسند کرتے تھے۔ ”آپ کے خیال میں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟“ جولیٹ اسے اپنی سوچوں کے بارے میں کیا بتانی چنانچہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے خود اسے ہی الجھا دیا۔ ”حویلی کے اصولوں میں سے کوئی اصول آپ کی شخصی آزادی کو متاثر کر رہا ہوگا۔“ آصف خان نے جس بے ساختگی سے اندازہ قائم کیا، وہ خود بھی اسی بے ساختگی کے ساتھ ہنس پڑی اور پھر یوں۔

”حویلی والوں نے جان لیا ہے کہ وہ مجھے اپنے کسی اصول میں نہیں جکڑ سکیں گے اس لیے اب میرے سامنے یہاں کا کوئی اصول بیان نہیں کیا جاتا۔“

”ایسا صرف اسد انکل کی مہربانی کی وجہ سے ہے۔ وہ آپ کی پشت پر کھڑے ہیں اور آپ کے پاس اتنا مضبوط سہارا دیکھ کر کوئی آپ کو دھکا دینے کی ہمت نہیں کر پارہا ہے۔“ آصف خان نے گویا اس پر انکشاف کیا۔

”اس ملازمت کے لیے انہوں نے میرا انتخاب کیا ہے اور اپنے انتخاب کو درست ثابت کرنے کے لیے انہیں میرا مددگار بننا ہی چاہیے۔ یہ خود ان کی اپنی عزت کا سوال ہے۔“ آصف خان کے انکشاف نے ہل بھر کے لیے اسے چونکا یا تو تھا لیکن اسد اللہ کے روئے کے لیے جو دلیل اس کے دماغ میں آئی، وہ اس سے بھی کھڑا لی۔

”ایسی بات۔ تو میرے دماغ میں آئی ہی نہیں تھی۔ بس میں یہی سوچ رہا تھا کہ اسد انکل بہت روشن خیال اور معتدل مزاج آدمی ہیں اس لیے ایسا کر رہے ہیں لیکن آپ کی دلیل میں بھی وزن محسوس ہوتا ہے۔“ آصف خان نے اسے سراہنے والے انداز میں کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”آپ بہت پُر اعتماد اور باوقار شخصیت کی مالک ہیں اور مجھے لگتا ہے آپ کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے انکل نے آپ کا انتخاب کیا ہے ورنہ آپ سے زیادہ تعلیمی قابلیت رکھنے والی کسی شخصیت کو اس ملازمت پر رکھ لینا ان لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بے پناہ صاحب ثروت لوگ ہیں۔ میرے والد خود ایک قبیلے کے سردار ہیں اور ہمارا شمار اپنے علاقے کے باحیثیت لوگوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں کی شان و شوکت دیکھ کر تو میں خود دنگ رہ جاتا ہوں۔ میں نامعلوم مدت تک قیام کے لیے یہاں آیا ہوں پھر بھی یہ لوگ ہر روز میری ایسی خاطر مدارت کرتے ہیں جیسے میں چند دن کے لیے آنے والا کوئی خاص الخاص مہمان ہوں۔ یہاں قیام کے عرصے میں میری الماری میں اتنے نئے



جوڑوں کا اضافہ ہوا ہے کہ میں کتنی بھی نہیں کر پایا ہوں۔ ملازم جب بھی دھلے ہوئے کپڑے الماری میں رکھنے آتا ہے تو ساتھ میں چند نئے جوڑے بھی لے آتا ہے پھر بھی یہاں والوں کو شکایت ہے کہ میں اپنی زبان سے اپنی پسند یا خواہش کا اظہار نہیں کرتا۔ میرے پاس بہترین خوشبوؤں کا ڈھیر لگ چکا ہے۔ پھر بھی ہر دو چار دن بعد ملازمہ میرے کمرے میں ایک نئی خوشبو رکھ جاتی ہے۔ اپنی اتنی مہارت پر میں شرمندگی محسوس کرنے لگا ہوں اور کئی بار احتجاج بھی کیا ہے لیکن سب بے کار ہے۔ کوئی میرے احتجاج کو خاطر میں نہیں لاتا۔“ وہ اسے حویلی والوں کی دریا دلی کے قصے سن رہا تھا جس کی ذات ان کی تنگ دلی سے براہ راست متاثر ہوئی تھی۔ وہ اتنے دریا دل ہوتے تو جوزفین کو اسد اللہ کی پسند جان کر قبول کر لیتے اور یوں وہ بمبئی کے اس محلے میں مل کر جوان نہ ہوتی جہاں شاید اس حویلی کا کوئی مکین قدم دھرتا بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

”بہت زیادہ دولت مندوں کو شوق ہوتا ہے اپنی دولت کی نمائش کرنے کا تا کہ دوسروں کو متاثر کر سکیں۔ آپ یہاں سے واپس جائیں گے تو یقیناً اپنے والد سے ان کے دوست کی سخاوت اور مہمان داری کی تعریف کریں گے حالانکہ ہو سکتا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں بڑی بے ایمانیاں اور حق تلفیاں کی ہوں اور ان کی وجہ سے کسی کی زندگی برباد ہو گئی ہو۔“ اس کے اندر کی تلخی خود بخود ہی اس کے لہجے میں در آئی۔

”اوہ نو۔ اسد انکل بالکل بھی ایسے آدمی نہیں ہیں۔ وہ بہت سادگی پسند اور وضع دار آدمی ہیں۔ میرے بابا لندن میں ان کے ساتھ تھے اور وہ ہمیشہ اسد انکل کے اعلیٰ کردار و اخلاق کی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے قیام کے عرصے میں انہیں نہایت نفیس آدمی پایا ہے اور میں یقین نہیں کر سکتا کہ زندگی میں وہ کبھی بے ایمان یا غاصب رہے ہوں گے۔ آپ کس بنیاد پر ان پر اتنا بڑا الزام لگا رہی ہیں۔“ آصف خان کے سفید رنگ میں سرخی سی جھلکی۔

”میں الزام نہیں لگا رہی بس ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔ کسی بھی انسان کی شخصیت کا کوئی ایک پہلو ٹھوڑی ہوتا ہے اور اسے جاننے والے اس کے ہر پہلو سے واقف ہوں، یہ بھی ضروری نہیں ہوتا۔“ جوزیٹ نے تیزی سے بات بنائی۔ ”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اگر اسد انکل کی شخصیت کا ایسا کوئی تاریک پہلو ہوا تو میرے لیے یہ ایک شاک ہوگا۔ میرے نزدیک تو وہ ایک آئیڈیل انسان

ہیں۔“ جوزیٹ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بھی آصف خان اسد اللہ کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا جس پر جوزیٹ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہ مسکراہٹ پھولوں کے بیج کے پیچھے براجمان اسد اللہ نے بھی دیکھی۔ وہ بہت دیر سے اس گوشہ عافیت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوزیٹ ان کے بعد یہاں آئی تھی لیکن نہ تو وہ خود کسی سے بات کرنے کے موڈ میں تھے اور نہ ہی اس کی تنہائی میں خل ہونا چاہتے تھے اس لیے خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ انہوں نے آصف خان کے ساتھ ہونے والی جوزیٹ کی ساری گفتگو سنی تھی اور ان کے دل میں پھر وہی شک ابھرا تھا کہ کہیں جوزیٹ جوزفین کی بیٹی تو نہیں ہے۔ اس کا بمبئی سے یہاں تک از خود ملازمت کے لیے آنا اور پھر حویلی کے اصولوں کو شدت سے رد کرنا انہیں غیر معمولی لگا تھا۔ اس کا رویہ بھی چونکا نے والا تھا۔ وہ پہلی بار اس حویلی میں آئی تھی لیکن اس کے انداز سے یوں لگتا تھا کہ وہ یہاں کے بارے میں سب جانتی ہے۔ پہلے اس کے شناسا نقوش اور بعد میں روپوں نے انہیں شک میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہونہ ہو، وہ جوزفین کی بیٹی ہے۔ اس جوزفین کی بیٹی جسے ان کی پہلی محبت ہونے کا اعزاز حاصل تھا لیکن پھر وہ ان کی زندگی سے یوں نکل گئی تھی کہ وہ اسے تلاش ہی نہیں کر سکے تھے اور اب یہ لڑکی آگئی تھی جو انہیں جوزفین کی یاد دلاتی تھی۔ اس کے نقوش کی مانوسیت نے ان کے دل پر اثر ڈالا تھا وہ زخم جو کچھ مندمل ہونے لگے تھے ایک بار پھر تازہ ہونے لگے تھے اور اپنی زندگی کا وہ دور یاد آتا تھا جو پوری زندگی پر محیط ہو گیا تھا۔ وہ سمجھی خود کو اس دور کی یادوں سے آزاد بھی نہیں کروا پائے تھے اور وہ تھی کہ سب کچھ ختم کر کے چلی گئی تھی اور جب سب ختم ہی کر دیا تھا تو اب یہ نیا سلسلہ کیا تھا؟ کیوں اس نے اپنی بیٹی کو یہاں بھیجا تھا؟ وہ خود سے جوں جوں سوالات کرتے جاتے، ابھن بڑھتی جاتی اور اس ابھن میں جوزیٹ کی آنکھوں کی تحریر کی وجہ سے مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر انہیں یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی طوفان موجزن ہے جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جانا چاہتا ہے لیکن کیوں؟ وہ اس بات کا جواب بھی تلاش نہیں کر پائے تھے لیکن جوزیٹ کے لیے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا۔ جوزفین نے ان کے ساتھ کچھ بھی کیا تھا اور جوزیٹ اپنے دل میں کیسے ہی عزائم لے کر آئی تھی، وہ اپنے دل سے مجبور تھے جو کبھی جوزفین کے خلاف جانی نہیں سکا تھا۔

☆☆☆



فاروق بھی پہنچا تو اس بار سب اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ شملہ سے واپسی پر تو اس کی محض رہن اور رامو سے ہی ملاقات ہو پائی تھی، باقی سب ملاقات کے لیے ترے ہوئے تھے چنانچہ اس کی شکل دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑے اور بے تابی سے اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ ہر ایک فوری طور پر نکلے ملنا چاہتا تھا اس لیے وہ ایک دوسرے کے اوپر چڑھ سے گئے تھے اور اتنے افراد کے اپنے گرد لپٹ جانے کے باعث فاروق کا اپنا وجود گویا گم ہو گیا تھا۔ وہ ان کی دیوانگی پر ہنس رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر بھی ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے اتنی محبتوں سے نوازا رکھا ہے جو دنیا میں بہت کم لوگوں کا ہی نصیب ہوتی ہیں۔ اسٹیشن پر موجود لوگ بھی اس تماشے کو دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ ایسا کونسا خاص آدمی ہے جس کے لیے سب اتنے دیوانے ہو رہے ہیں۔ ان دیوانوں کی دیوانگی کو رہن کی آواز نے لگام ڈالی اور وہ بہ مشکل فاروق سے جدا ہو کر واپسی کے لیے تیار ہوئے۔ مسکراتی ہوئی کیتھرائن بھی فاروق کے ساتھ گئی۔ پیش آنے والے واقعے نے اسے خوف زدہ ضرور کیا تھا لیکن اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ فاروق نے اس سے خاص طور پر معذرت کی تھی کہ وہ ان کی دشمنی کا نشانہ بنی لیکن جواب میں کیتھرائن نے بہت اپنایت کا مظاہرہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ان کے درمیان بہن بھائی کا رشتہ جڑ چکا ہے اور اگر ایک بہن کو اپنے بھائی کے لیے تکلیف اٹھانی پڑی ہے تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی اس وجہ سے ان کے مابین تعلق ٹوٹ سکتا ہے۔ فاروق اپنے دل میں ارادہ کر چکا تھا کہ اب کیتھرائن کو خود سے دور رکھے گا اور شاید یہ بات کیتھرائن نے بھانپ لی تھی چنانچہ از خود کہہ ڈالا تھا کہ اس واقعے سے خوف زدہ ہو کر وہ فاروق سے اپنا تعلق نہیں توڑ سکتی۔ وہ یتیم خانوں اور مشینریز کی مہربانی سے پل کر جوان ہونے والی ایک ایسی لڑکی تھی جس کا دامن رشتوں سے خالی تھا، ایسے میں فاروق کے پُر خلوص ساتھ کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ فاروق بھی اس کے احساسات کو سمجھتا تھا چنانچہ کیتھرائن سے کوئی بحث نہیں کی تھی لیکن اپنے طور پر بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

کیتھرائن نے استقبال کے لیے آئے ہوئے رہن سے کسی بزرگ جیسے احترام سے ملاقات کی۔ رہن بھی اس سے شفقت کے ساتھ پیش آیا اور فاروق سے پہلے خود ہی اس کی قیام گاہ تک واپسی کا انتظام کر ڈالا۔ کیتھرائن کو اس کی منزل کی طرف روانہ کرنے کے بعد ہی ان کا قافلہ واپسی

کے لیے گامزن ہوا۔ فاروق کے استقبال کے لیے وہاں آنے والوں میں منو بھوان بھی شامل تھا۔ راستے میں فاروق کی اس سے جو بات چیت ہوئی، اس سے فاروق کو اندازہ ہوا کہ موہن داس عرف منو یہاں آکر بہت خوش ہے۔ اڈے پر اسے مختلف دائیج سیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا اور بمبئی کی سیریں بھی ہو رہی تھیں۔ رہن مہمان نواز تھا چنانچہ پریشان کن حالات کے باوجود منو کا وہاں ہر طرح سے خیال رکھا جا رہا تھا۔ وہ نانا کی طرف بھی چلا جاتا تھا۔ نانا بھی اس کے چچا سے پرانی دوستی کے باعث اس پر بہت مہربان تھا، یوں منو کی پانچوں انگلیاں بھی میں اور سر کڑا ہی میں ہونے والا معاملہ تھا۔ راستے میں ہی فاروق نے ساتھ موجود رامو سے مقدمے کے حوالے سے معلومات حاصل کیں۔ اس نے بتایا کہ اشوک بچن اپنی مہارت اور قابلیت کا استعمال کرتے ہوئے قبل از گرفتاری رہن کی ضمانت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس لیے انسپٹر و کرم اور اس کے حواری ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر پار ہے تھے۔ وہ بس اتنا کر سکے تھے کہ انہوں نے فوری طور پر عدالت میں کیس شروع کر دیا تھا۔ انگریز افسر کی وجہ سے عدالت بھی تیزی دکھا رہی تھی لیکن یہاں بھی بچاؤ کی ساری تدابیر اور انتظامات ہو چکے تھے۔

فاروق ٹکٹ سے آتے ہوئے اپنے ساتھ دو گواہان لے کر آیا تھا۔ اگلی پیشی پر ان گواہان کو پیش کر دیا جاتا تو کیس میں بالکل ہی جان نہیں رہتی۔ ویسے بھی وکیل اشوک بچن نے جو نکات اٹھائے تھے، انہوں نے خود پولیس کی پوزیشن کو کمزور کر دیا تھا۔ ولیم کے کہنے پر فاروق کو غیر قانونی طور پر زیر حراست رکھنا اور پھر خطرناک تشدد کا نشانہ بنانا معمولی باتیں نہیں تھیں اور ولیم کے ساتھ ہونے والے سلوک کو رہن کی طرف سے انتقامی کارروائی قرار دینے میں خود پولیس کی ہی سبکی تھی۔ ساری صورت حال جان کر فاروق نے اپنے دل میں سکون سا محسوس کیا۔ ہاں، دل کا ایک گوشہ تھا جہاں کسی پل قرار نہیں تھا اور اسے اس وقت بھی قرار نہیں آیا جب وہ لوگ اپنے علاقے میں داخل ہوئے۔ کوچہ جاناں کے لیے تڑپتا دل کوچہ جاناں میں پہنچ کر بھی بے قرار تھا تو یہ حیرت کا مقام تھا اور اس حیرت کو رفع کرنے کے لیے فاروق یہی سوچ سکا کہ عرصے کے پیار سے دیدہ و دل کو جب تک مئے دیدار نہیں میسر ہوگی، قرار بھی حاصل نہیں ہوگا۔

اڈے پہنچ کر وہی معمول کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ وسیع دسترخوان، عمدہ کھانوں کی خوشبوئیں، ساتھیوں کی محبت



لناتی نظریں اور چہکائیں..... سب نے مل ملا کر رقی طور پر اس کے دل کو بہلانے کا انتظام کر دیا۔ مہمان بھی اس ماحول میں بہت خوش تھے۔ بڑی دیر میں جا کر وہ بھی سفر سے آنے والوں کا خیال کر کے یہ محفل برخاست ہوئی۔ فاروق اپنے کمرے میں آیا تو مانوسیت کے احساس نے دل کو جکڑ لیا۔ یہ مانوسیت نہ تو شملہ کی خوبصورتی میں تھی اور نہ ہی بھادیہ سیٹھ کی پریشانیوں میں۔ وہ بستر پر لیٹا تو نیند خود بخود ہی اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ نیند اور خوابوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی آنکھیں بھی خواب دیکھنے لگیں اور خواب میں بس اس ساحرہ کا ہی بسیرا تھا جو خود اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ اس بار فاروق نے اسے پھولوں بھرے ایک باغ میں دیکھا لیکن وہ اس باغ میں بھی خوش نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوش نما پھول تھا اور وہ اس پھول کی پتیاں کوچ کوچ کر پھینک رہی تھی۔ فاروق کی آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی اور دماغ پر اس خواب کا اثر تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور بال سنوارے۔ اتنی دیر میں گولو اس کے لیے چائے لے کر آگیا۔ وہ فاروق کے سونے کے دوران بھی گا رہا تھا اس کے کمرے کا چکر لگاتا رہا تھا اور اب چائے پینے کے دوران اس کے قریب بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ چند گڑھ سے واپسی پر جب وہ فاروق کے حکم کے مطابق کیتھرائن کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑ کر اڑے پہنچا تو فاروق، اکبر اور منو کو وہاں نہ پا کر اس پر کیا گزری اور کیسے اس سمیت سب نے کانٹوں پر وہ وقت گزارا۔ فاروق ان محبتوں سے واقف تھا چنانچہ ساری داستان سننے کے دوران گولو کی دلداری بھی کرتا رہا البتہ اس کا اپنا دل بے قرار تھا اور وہ جلد از جلد جولیٹ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

مئے دیدار کو ترسے ہوئے کو جولیٹ کی آمد و رفت کے سارے اوقات یاد تھے۔ اب بھی اس نے گھڑی دیکھی..... جولیٹ کی دفتر سے واپسی کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا۔ گولو کو چائے کے برتن رکھنے کے بہانے بھجوا کر وہ درجے میں آکھڑا ہوا۔ اتنے عرصے بعد محبوب نظر کی دید کی جاہت میں اس کا دل تو کیا روح بھی آنکھوں میں سمٹ آئی لیکن اسے اس راہ پر کہاں آنا تھا۔ وہ تو یہ شہر ہی چھوڑ کر جا چکی تھی۔ انتہار کی جاں گھڑیاں گزرتی رہیں اور وہ پیاسی آنکھیں لیے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ ڈھلتی شام نے رات کی اوڑھنی اوڑھی تو وہ اپنی مایوسی کو ایک بار پھر نئی امید دلاتا درجے سے ہٹا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گیا۔ نیچے موجود افراد میں

سے کچھ نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی کو بھی جواب دیے بغیر باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ بہت دنوں کا پیاسا تھا اور اب ضبط کا بندھن ٹوٹنے لگا تھا۔ باہر نکل کر اس کے قدم خود بخود گلی میں جولیٹ کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کے دروازے پر پہنچ کر وہ کیا کرے گا، اسے خود بھی علم نہیں تھا بس ایک خیال تھا کہ شاید آج جولیٹ دفتر نہ گئی ہو اور گھر پر ہی موجود ہو، سو وہ بنا سوچے سمجھے اس کے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ اس کے دروازے پر پہنچ کر اس کے جوش میں اٹھتے قدم خود بخود ہی ٹھٹھک گئے۔ دروازے پر تالا تھا یعنی جولیٹ ابھی تک دفتر سے واپس نہیں آئی تھی حالانکہ وہ اتنی دیر سے کبھی واپس نہیں آتی تھی۔ وہ بیک وقت حیرانی اور پریشانی کا شکار ہونے لگا، اسی وقت غلامو چاچا اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکلا۔ فاروق کو گلی میں گھڑے دیکھ کر وہ اسی کی طرف چلا آیا۔

”کیا حال ہے استاد! شملہ سے کب واپس آئے؟ سنا تھا تم ڈاکٹر کے مشورے پر علاج کے لیے وہاں رہ رہے ہو۔“ وہ فاروق سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔

”الحمد للہ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیے مزاج کیسے ہیں؟ باقی محلے والوں کا کیا حال ہے۔“ وہ براہ راست تو جولیٹ کے بارے میں دریافت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مشترکہ طور پر پورے محلے کا حال پوچھ ڈالا۔

”سب ٹھیک ہیں بس یہ اپنی جولی ہی مصیبت میں ہے۔ بے چاری لڑکی بڑے بڑے طوفانوں میں گھری رہی ہے اور معلوم نہیں اب کس مشکل میں پڑی ہے کہ کسی کو اس کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔“ غلامو چاچا جو کچھ بول رہا تھا، وہ اسے پوری طرح سمجھ تو نہیں پار رہا تھا لیکن یہ جان گیا تھا کہ اس کے دل کی بے قراری بے وجہ نہیں تھی اور یہاں جولیٹ کے ساتھ کچھ بہت ہی برا ہو چکا تھا۔ کیا.....؟ یہ جاننے کے لیے وہ غلامو چاچا سے کوئی سوال کرتا اس سے قبل ہی اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ اس مانوس لکس کو پہچانتا تھا اور جانتا تھا کہ خاموشی کی زبان میں کچھ کہتا یہ ہاتھ ربن کا ہے۔ شدید ضبط کی کوشش میں اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ادھر غلامو نے بھی ربن کو دیکھ لیا تھا اور اب تپاک کے ساتھ اس سے حال احوال دریافت کر رہا تھا۔ ربن نے اسے مختصر جوابات دیے اور پھر فاروق سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”اکیلے کیوں نکل کھڑا ہوا شہزادے۔ ابھی تیری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔“



کے جنے کا نام بتا دیتی تو اپن ابھی تک اس کو نرگ (جنم) پہنچا چکے ہوتے پر اس کے منہ نہ کھولنے سے اپن کو تھوڑا نیم لگ گیا اور اپنے پہنچنے سے پہلے وہ ..... ملک سے باہر نکل گیا۔ پر جائے گا کدھری۔ لوٹ کر تو اسے ادھری آنا ہے نا۔ وہ جیسے ہی ہندوستان کی زمین پر قدم رکھے گا، اپن اس کی گردن تاپ لے گا۔“ ربن فاروق کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا تھا چنانچہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”تم نے جولیٹ کی تلاش کے لیے کیا کیا؟“ ساکت بیٹھے فاروق نے ربن سے اس طرح یہ سوال کیا کہ اس کے جسم کا ہر عضو ساکت تھا اور صرف ہونٹ جنبش کر رہے تھے۔

”اپن اسے تلاش کروا رہا ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور مل گیا ہے جس نے اس کو اسٹیشن تک پہنچایا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا ہے کہ جولی پہلے قبرستان گئی تھی پھر وہاں سے اسٹیشن۔ اسٹیشن پر اس نیم کون کون سی گاڑیاں لگی ہوئی تھیں یا لگنے والی تھیں، اپن نے سارا حساب کتاب جمع کر لیا ہے اور تو سمجھ سکتا ہے کہ اس حساب کتاب سے جولی کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کوئی گاڑی کدھری جا رہی تھی اور راستے میں کتنے اسٹیشنوں پر رکی تھی، یہ جاننے کے بعد بھی اپن کیسے طے کرے گا کہ جولی کس شہر یا گاؤں کے اسٹیشن پر اترتی۔ اسے ڈھونڈنا بھوسے میں سے سوئی ڈھونڈنے کے برابر ہے۔“ ربن اسے اپنی کارکردگی سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ مشکلات کو بھی بیان کرتا جا رہا تھا تاکہ فاروق کو اندازہ ہو سکے کہ وہ اب تک جولیٹ تک نہیں پہنچ سکا تو کیوں؟

”اسے ڈھونڈنا کتنا ہی مشکل ہو، میں اسے ڈھونڈوں گا۔“ فاروق نے تلخ لیکن مضبوط لہجے میں اپنے عزم کا اظہار کیا۔

”بس کرو دادا۔ کب تک مجھے یوں ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھو گے۔ موم کا نہیں بنا ہوا کہ ذرا سی حرارت پر پھسل جاؤں گا۔“ ربن کو جواب دیتے ہوئے فاروق کے لہجے میں تلخی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بہت کچھ ہے جو ربن نے اس سے چھپایا ہے اور اب بھی چھپائے رکھنے کی کوشش میں وہ اس کے اڈے سے باہر نکلنے کی اطلاع پا کر خود پیچھے چلا آیا ہے لیکن اسے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تھی اور فاروق نے غلامو چاچا سے چند چوٹ کا دینے والے جملے سن لیے تھے۔

”اپن تیرے کو موم کا بنا کیسے سمجھ سکتا ہے۔ اپن نے تیرے کو نولا دماقی بنایا ہے اور اپنے کو معلوم ہے کہ تو ہمیشہ اپنی تربیت کی لاج رکھے گا۔“ ربن کے جملے اسے پیش بندی کی کوشش محسوس ہوئے۔

”اچھا غلامو بھائی۔ اپن پھر بعد میں ملیں گے تم سے۔ ابھی تو اپنا شہزادہ اتنے نیم کے بعد آیا ہے تو اپنے کو اس کے ساتھ رہنے کا ہے۔“ ربن نے غلامو سے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر فاروق کے شانوں کے گرد اپنے بازو کا گھیرا ڈالے اسے لے کر اڈے کی طرف واپس چلا۔

”جولی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ ربن فاروق کو سیدھا اس کے کمرے میں لے آیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر فاروق نے ربن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پوچھا۔

”چھری تلے ذرا دم لے۔ تو نہیں بھی پوچھتا تو اپن تیرے کو بتانے کا ہی تھا۔ بس اپن ذرا تیری طبیعت سنہلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے بولا تھا کہ دماغ کی چوٹ کا معاملہ ہے اور تیرے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرنے کا ہے جس سے تیرے دماغ پر اثر پڑے۔ اس لیے اپن تیرے کو کچھ نہیں بولا تھا۔“ ربن نے اسے حالات سے باخبر کرنے سے پہلے تمہید باندھی پھر رفتہ رفتہ وہ جولیٹ کے اغواء، اس کے والدین کی یکے بعد دیگرے موت اور آخر میں جولیٹ کے پراسرار غیاب تک کی پوری داستان سناتا چلا گیا۔ یہ سب سنتے ہوئے فاروق کو حیرت تھی کہ اس کا دل ابھی تک کیسے دھڑک رہا ہے، اسے تو غم سے پھٹ جانا چاہیے تھا۔ جولیٹ اتنے بڑے بڑے صدموں اور حادثات سے گزر گئی تھی اور وہ وہاں شملہ میں آرام کر رہا تھا، یہ اس کے لیے کٹ مرنے کا مقام تھا۔

”دیکھ شہزادے! جو اس کی تقدیر میں لکھا تھا وہ ہوا۔ میں یا تو اسے بدل نہیں سکتے تھے پر اپن نے خود سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس کے مجرموں کو چھوڑنے کا نہیں ہے۔ جولیٹ اپنے ساتھ کوآپریت کرتی اور اپنے کو پہلے دن ہی اس حرام

”تو اکیلا نہیں ہے۔ ہم سب تیرے ساتھ ہیں لیکن تو وعدہ کر کہ جو کچھ کرے گا، ہوش میں رہ کر کرے گا۔ اپنے کو معلوم ہے کہ جولیٹ بڑی ذہین اور سمجھدار لڑکی ہے اور اپنے حالات سے لڑ سکتی ہے۔ اپن کو جو بھی ثبوت ملے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ جولیٹ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے اور لازمی ہے کہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی گئی ہوگی۔ اپن کو یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ کہیں وہ خود ہی تو دلدار آغا سے بدلہ لینے کے لیے نہ نکل کھڑی ہوئی ہو لیکن اس کے جانے والے نیم پر اسٹیشن پر ایسی کوئی ٹرین نہیں تھی جو پنجاب کی طرف جا رہی ہو اس واسطے ہمارے لیے فیصلہ کرنا اور مشکل ہو گیا ہے۔“ ربن بہت پیار سے اور بہت سنبھال کر اس سے بات



کر رہا تھا جیسے وہ کوئی نازک آدمی ہو جو ہر اسی شخص سے ملنے کے لئے ٹوٹ جائے گا۔

”ٹھیک ہے دادا۔ تم سے جو بن پڑا تم نے کیا۔ اب آگے کیا کرنا ہے، یہ سوچنا پڑے گا۔ ابھی تو میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا ہے۔“ فاروق کو احساس ہو گیا کہ وہ اس پُر خلوص آدمی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے اڈے کے جو حالات تھے وہ ان سے بالکل ہی بے خبر تھا۔ جو دادا سے دشمنی پالنے کے بعد وہ لوگ مسلسل مشکلات کا شکار تھے۔ ایسے میں ربن نے جولیٹ کے لیے جس حد تک کیا تھا، وہ بھی بڑی بات تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہ اتنا کچھ صرف اور صرف اس کی اپنی خاطر کیا گیا تھا۔ ربن، دلدار آغا کو اس کے لیے کی سزا دینے خود بھی سزا سے اس کے شہر تک گیا تھا تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اب یہ تو آغا کی ہی قسمت اچھی تھی کہ وہ ربن کے شکنجے میں آنے سے پہلے ہی نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ اب تک اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔

”تو دماغ پر جاتی زور مت ڈال۔ اپن ہے نا۔ اپن دیکھے گا سب۔“ ربن نے اسے اطمینان دلایا۔ وہ حیران تھا کہ فاروق کا رد عمل اس کے خدشات کے برعکس اتنا شدید نہیں تھا جتنی کہ وہ توقع کر رہا تھا۔ اسے اس کے ضبط سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ چیخا، چلاتا یا شور مچاتا تو یہ شاید نارمل ہوتا لیکن اب تو کسی طوفان سے پہلے کی سی خاموشی تھی۔

”مجھے تم پر اعتبار ہے دادا۔ بس اب تم جاؤ اور اپنا کام دھندا دیکھو۔ میں تھوڑی دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔“ فاروق نے کس برداشت سے کام لیتے ہوئے یہ جملے ادا کیے، یہ وہی جانتا تھا۔ اگر اسے ربن کی محبت کا پاس نہ ہوتا تو کبھی اتنی برداشت سے کام نہ لے پاتا۔

”جیسی تیری مرضی پر یاد رکھنا کہ تو اکیلا نہیں ہے۔ ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔“ ربن اس کے شانے کو ہلکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ربن کے باہر نکلتے ہی اس نے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھالی۔ اب وہ اپنے کمرے کی تنہائی میں گزری ہوئی پر ماتم کرنے کے لیے آزاد تھا۔ ربن کے سامنے جس برداشت سے کام لیا تھا، اب وہ جواب دے چکی تھی اور وہ دیواروں سے سرکراتا کھل کر اپنے غم پر آنسو بہا رہا تھا۔

☆☆☆

”تشریف رکھیے۔“ جولیٹ، سروری کی راہنمائی میں آپا بیگم کے کمرے میں پہنچی تو وہ لمحہ بھر تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہیں پھر ساٹ لہجے میں اسے حکم دیا۔ وہ بیٹھ

گئی تو انہوں نے منہ سر سے اس کا ساڑھ لٹکا کر دیا۔ سبز رنگ کے لائٹ اسکرٹ کے ساتھ سفید بلاؤز اور سفید ہی اسکارف پہنے ہوئے وہ بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔ نرم نقوش، سیاہ جھکیے بالوں اور سروقامتی نے اس کی شخصیت کو بڑا متاثر کن بنا رکھا تھا اور جانے کیوں وہ اس خوب صورتی سے خائف تھیں حالانکہ اب تو حویلی میں کوئی کنوارا مرد بھی موجود نہیں تھا جس کے بہک جانے کا انہیں ڈر ہو۔

”آپ نے مجھے بلوایا۔۔۔۔۔ آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟“ جولیٹ زیادہ دیر اپنے وجود پر ان کی تنقیدی نظروں کو برداشت نہیں کر سکی اور ان سے پوچھ ڈالا۔

”ہمیں تم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس خدمت گاروں کی فوج موجود ہے جو ہماری آنکھ کے معمولی اشارے پر بھی ہر خدمت کے لیے تیار رہتی ہے۔“ انہوں نے نخوت زدہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

”جی مجھے معلوم ہے لیکن آپ نے مجھے بلایا ہے تو اس کی کوئی توجہ ہوگی۔“ جولیٹ کے لہجے میں خود بخود ہی تلخی سی آگئی۔ اس کے انداز پر آپا بیگم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تھلا کر رہ گئیں۔ یہ لڑکی جب سے حویلی آئی تھی، ان کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ حویلی کی تنخواہ دار اس لڑکی کے یہ انداز انہیں قلعی نہیں بھاتے تھے لیکن وہ اسد اللہ کی وجہ سے مجبور تھیں۔ اسد اللہ جولیٹ کے سفارشی بنے ہوئے تھے اور وہ اسد اللہ کی کسی بات کو نہیں ٹال سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں اپنے بیٹے سے خصوصی ہدایت ملی ہوئی تھی ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ براہ راست بڑے نواب صاحب سے بات کرتیں اور اسد اللہ جیسے بیٹے پر مجبور ہو جاتے۔ وہ جہان دیدہ خاتون تھیں اور اندازہ کر سکتی تھیں کہ اسد اللہ ان کے بیٹے کے بہت سے اعمال سے واقف ہیں اور محض دوستی اور رواداری میں انہوں نے اب تک نواب صاحب کے سامنے منہ سے کوئی بات نہیں نکالی ہے۔ اگر ان کی زبان کھل جاتی تو حویلی میں ایک بھونچال سا آ جاتا۔ نواب سلیم اللہ کے غصے کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ غصے میں وہ اپنے اکلوتے داماد کے ساتھ کیا کریں اور جب داماد ہی زیر عتاب آ جاتا تو وہ اس کی ماں یعنی اپنی بہن کو کب بخشنے۔ نتیجتاً حویلی میں برسوں سے چمکتا ان کے اقتدار کا سورج غروب ہو جاتا اور وہ بنا اقتدار کے نہیں رہ سکتی تھیں۔ انہیں حکم چلانے اور سب پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔

”آپ کو اس حویلی میں آئے ہوئے کتنے دن ہو چکے ہیں؟“ اسے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے آپا بیگم نے



”مجھے حیرت ہوئی اگر آپ کے پاس خود اس سوال کا جواب موجود نہ ہوا۔“ جو لیٹ نے پھر انہیں نیز جواب دیا۔  
”ہم حیران ہیں کہ اتنی کم مدت میں آپ نے کس قدر پر پُر زور نکال لیے ہیں لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نواب سلیم اللہ کی حویلی ہے جہاں کی عورتوں کے سر بھی نیچے نہیں رہتے اور نہ ہی کبھی وہ نامحرم مردوں سے کلام کرتی ہیں۔“ آپا بیگم کے سخت لہجے میں کئی بات پر جو لیٹ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے پہلو بدلتے ہوئے آپا بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور تیز لہجے میں بولی۔  
”یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟ میں حویلی کی فرد نہیں ہوں۔“

”ہماری ملازما میں بھی ان اصولوں پر عمل کرتی ہیں اور فی الحال تو ہم یہ سب آپ کی بھلائی کے لیے آپ کو بتا رہے ہیں۔ آصف خان سے آپ کا بڑھتا ہوا میل جول ہمارے علم میں ہے اور ہم آپ کو آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ آصف خان ذی حیثیت تو بے شک ہیں لیکن ان کے کردار کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جہاں تک ہمارے علم میں ہے، انہوں نے اپنے علاقے میں کسی کو قتل کر دیا تھا اور اب اسی قتل کی سزا سے بچنے کے لیے یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں ایک ذی حیثیت شخص جان کر ان کے ساتھ وابستہ ہونے اور اپنا سماجی رتبہ بڑھانے کی خواہش کر رہی ہوں لیکن ہم نے مناسب سمجھا کہ آپ کو پہلے ہی سے باخبر کر دیں، کہیں بعد میں آپ کو پچھتا نا نہ پڑے۔“

ان کے لہجے میں طنز و تضحیک تھی اور اس خلوص کا کوئی اتا پتا نہیں تھا جس کا وہ اظہار فرما رہی تھیں۔ جو لیٹ سمجھ گئی کہ اس کی آصف خان سے ہونے والی ایک آدھ اتفاقیہ ملاقات کو بہانہ بنا کر وہ اسے بے عزت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں چنانچہ دل میں اٹتے غصے کو اندر ہی دبا کر متانت سے بولی۔  
”آپ کی اس قدر خیال داری کا شکریہ۔ اب میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے آصف خان کے بجائے کسی اور کا انتخاب کروں گی اور اگر یہ انتخاب حویلی میں سے ہوا تو مجھے امید ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ یہ بات نہیں چنگاری تھی جس نے آپا بیگم کے خزاں رسیدہ وجود میں آگ سی لگادی۔ بڑھاپے سے ضعف کا شکار ان کا جسم غصے کی شدت سے کانپنے لگا۔ جو لیٹ اپنی بات کہہ کر وہاں رکی نہیں اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ راہداری میں اس کی نواب زادی عالیہ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اس کا سرخ چہرہ

”نواب صاحب نے اگر اپنی بہن کی عادتیں بگاڑی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری دنیا ان کے ناز اٹھاتی رہے گی۔ دنیا میں بڑے بڑے فاحش ایسے گزرے ہیں جنہیں کہیں نہ کہیں شکست سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ آپ کی چھپی بیگم تو کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ہیں۔“

”یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہی ہیں؟“ نواب زادی عالیہ اس کے الفاظ پر حیران و پریشان ہو گئیں۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو حق اور سچ ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے بھی اس انداز میں کیوں نہیں سوچا۔ یہ حویلی آپ کی ہے۔ آپ بہن بھائی اس کے قانونی وارث

”ہمارے خیال میں آپ کبھی بیگم کی بات کر رہی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ آپ سے خوش نہیں ہیں۔ اصل میں وہ پرانے خیالات کی خاتون ہیں اور ہر معاملے کو اپنے اصولوں کے مطابق چلانا چاہتی ہیں۔ اس سے قبل انہیں اپنی اس خواہش کی تکمیل میں کسی رکاوٹ کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔ آپ کے سلسلے میں بھائی جان کی حمایت کی وجہ سے وہ تھوڑی مجبور ہو گئی ہیں لیکن ہم آپ کو ایڈوائس کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ تھوڑا سا کمپروماز کر لیں تو یہ آپ کے لیے اچھا ہوگا۔ ان کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تو وہ بھائی جان کو کراس کر کے ابا جان تک پہنچ جائیں گی اور ابا جان نے زندگی میں کبھی ان کی بات رد نہیں کی۔“ نواب زادی عالیہ دبے لفظوں میں اسے جو سمجھانا چاہ رہی تھیں، وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی لیکن اسے آپا بیگم جیسی مطلق العنان خاتون سے شکست کھا جانا منظور نہیں تھا۔ وہ کیوں شکست تسلیم کرتی؟ وہ کوئی جوزفین نہیں تھی۔ وہ جو لیٹ تھی جس کی رگوں میں اسی خاندان کا لہر دوڑتا تھا۔

”نواب صاحب نے اگر اپنی بہن کی عادتیں بگاڑی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری دنیا ان کے ناز اٹھاتی رہے گی۔ دنیا میں بڑے بڑے فاحش ایسے گزرے ہیں جنہیں کہیں نہ کہیں شکست سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ آپ کی چھپی بیگم تو کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ہیں۔“

”یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہی ہیں؟“ نواب زادی عالیہ اس کے الفاظ پر حیران و پریشان ہو گئیں۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو حق اور سچ ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے بھی اس انداز میں کیوں نہیں سوچا۔ یہ حویلی آپ کی ہے۔ آپ بہن بھائی اس کے قانونی وارث



اور حق دار ہیں پھر یہاں کسی اور کے نام کا شکر کیوں چلانا ہے۔ کیا آپ نے صرف اس وجہ سے کہ وہ آپ کی ساس ہیں، سارے حقوق ان کے نام کر دیے ہیں۔ حالانکہ خود آپ کو اپنے سارے حقوق حاصل نہیں اور سال میں مشکل سے ایک آدھ بار ہی آپ کو اپنے شوہر نامہ دار کی شکل دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔“ وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ نواب زادی عالیہ کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹ سی گئیں۔ حویلی کی تنخواہ دار لڑکی حویلی کے اندرونی معاملات پر اتنا کھل کر بول سکتی ہے، انہیں اب تک یقین نہیں آرہا تھا۔

”آپ کو کیا حق حاصل ہے ان معاملات میں بولنے کا۔ یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں اور ان میں آپ کی دخل اندازی قطعی ناقابل برداشت ہے۔“ بالآخر انہوں نے اپنی حیرت پر قابو پا کر اسے اس کی گستاخی پر ٹوک ہی دیا لیکن ان کی آواز حیرت اور غصے کی زیادتی سے کانپ رہی تھی۔

”ذاتی معاملات میں دخل اندازی بُری لگتی ہے نا.....؟ یہی بات آپ اپنی پچھلی بیگم کو کیوں نہیں سمجھاتیں جو اپنی طاقت اور بڑائی کے زعم میں دوسرے کے کردار پر انگلیاں اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ وہ جموٹے الزامات لگانے کی عادی ہیں لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر ایک اتنا کمزور نہیں ہوتا کہ الزامات سے ڈر کر بھاگ نکلے۔ مجھ میں اہلیت ہے کہ میں ہر الزام کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکوں۔ میرے قدم بہت مضبوط ہیں اور کوئی اتنی آسانی سے انہیں زمین سے نہیں اکھاڑ سکتا۔“ وہ عالم طیش میں بولتی چلی گئی۔ نواب زادی عالیہ اس کی جرأت و بے باکی پر انگشت بدنداں تھیں۔ جولیت اپنی کہہ کر ان کے سامنے سے ہٹ گئی، تب بھی وہ اسی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔

☆☆☆

شب ماتم بیت گئی تھی اور صبح عمل طلوع ہو چکی تھی۔ رات بھر رنج و الم میں بتانے کے بعد وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جو گزر چکا، اسے کسی طور بدلانا نہیں جاسکتا۔ نہ ہی اس میں کسی کا دوش ہے۔ ربین نے اگر اسے ان سارے حالات سے بے خبر رکھا تھا تو وہ اپنے اس عمل میں درست تھا۔ اگر ربین کی جگہ وہ ہوتا اور اس کے کسی پیارے کو بھی وہی کچھ درپیش ہوتا جو خود اس کے ساتھ تھا تو وہ بھی وہی کرتا جو ربین نے کیا۔ بعد میں بھی اڈے کے نازک حالات کے باوجود ربین نے جولیت کے لیے بہت کچھ کیا تھا اور اب جو کچھ کرنا تھا، اسے خود کرنا تھا۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ بیٹہ کر روئے پیٹنے یا دوسروں پر الزامات

لگانے سے جو حاصل نہیں ہوگا اسے عملی اقدامات اٹھانے ہوں گے اور سب سے پہلا مرحلہ جولیت کی تلاش کا تھا۔ ربین اسے بتا چکا تھا کہ جولیت خود انتقامی کارروائی کرنے کے چکر میں محسوس ہو رہی تھی۔ ایک نازک سی لڑکی کے لیے یہ کوشش خطرناک ہو سکتی تھی اس لیے سب سے پہلے اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنا ضروری تھا۔ سب طے کر چکنے کے بعد اس نے اپنی صبح کا آغاز معمول کے مطابق کیا۔ ورزش اور غسل کے بعد وہ ناشتے کے لیے سب کے درمیان پہنچا تو ربین اسے دیکھ کر مسکرایا۔ یہ بڑی حوصلہ دلائی اور شاباش دیتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ وہ خوش تھا کہ فاروق نے اس کی تربیت کی لاج رکھی اور مشکل ترین وقت میں ڈھنکے بجائے حوصلے سے خود کو سنبھال لیا۔

”آج تیرے کوچیک اپ کے لیے اسپتال جانے کا ہے۔“ ناشتے کے دوران ربین نے اسے اطلاع دی تو پہلے لمحے میں اس کا دل جاہا کہ انکار کر دے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ اچھا تھا کہ اس طرف سے بھی اطمینان ہو جاتا تو پھر وہ یکسوئی سے جولیت کو تلاش کر سکتا تھا۔ محبت نے اسے دوسروں کی محبت کو سمجھنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا اور وہ ربین سمیت اڈے کے ہر فرد کی محبت کا پہلے سے بھی زیادہ قدردان ہو گیا تھا اس لیے فیصلہ کیا کہ پہلے ان محبت کرنے والوں کے اطمینان کا سامان کر دے۔ ناشتے کے بعد وہ اسپتال کے لیے روانہ ہوا تو منو پھلوان اور اکبر اس کے ہمراہ تھے۔ ربین کو پیشی کے لیے عدالت جانا تھا۔ اڈے کے کچھ لوگ اور اس کے ساتھ جارہے تھے۔ رامو، مجود اداوالے اڈے پر تھا لیکن ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی فاروق کے ساتھ اسپتال جانے والا ہی نہیں تھا۔ منو اور اکبر کا انتخاب اس نے از خود کیا تھا۔ بھئی اس کے لیے کوئی اجنبی شہر نہیں تھا کہ اسے کسی کے ساتھ کی ضرورت ہوئی۔ منو اور اکبر کو اس نے اس لیے ساتھ لے لیا تھا کہ وہ بھئی دیکھ لیں گے۔ اسپتال میں کیتھرائن کی موجودگی کی وجہ سے بھی ربین کو اطمینان تھا اس لیے اس نے فاروق پر کسی کو ساتھ لے جانے کے لیے زیادہ دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ فاروق اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اسپتال پہنچا اور کیتھرائن کی مدد سے معائنے کے تمام مراحل سے گزرتا چلا گیا۔ ڈاکٹرز نے اس کی طرف سے اطمینان کا اظہار کیا البتہ حتمی جواب ٹیسٹوں کی رپورٹ آنے کے بعد ہی دیا جاسکتا تھا۔ اسپتال سے فارغ ہونے میں انہیں دوپہر ہو گئی تھی لیکن فاروق واپس اڈے لوٹ کر جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے منو اور اکبر کو اپنے اگلے پروگرام



سے آگاہ کیا اور ان کی تائید پاکر پہلے کہیں کھانا کھا لینے کا فیصلہ سنایا۔ کھانا ایک ایسے ہوں میں کھایا گیا جنہیں دہلی کے کھانے بنانے میں مہارت کا دعویٰ تھا۔ انہوں نے کھانا منگوایا اور کھانا شروع کیا تو کھانے پینے کا شوقین منو ایک ایک نوالے پر کھانے کی تعریف کرتا چلا گیا۔ البتہ اکبر اور فاروق کا معاملہ مختلف تھا۔ اپنی اپنی ذات کے دکھوں میں گھرے وہ دونوں بس دنیا داری ہی نبھاتے رہتے تھے اور زندگی سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے کھاتے پیتے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد انہوں نے حسب پروگرام اسٹیشن کا رخ کیا۔ ان کا انتخاب وہ اسٹیشن تھا جہاں سے جولیٹ کی کسی دوسرے شہر روانگی کی اطلاع ملی تھی۔ اسٹیشن پہنچ کر اس نے منو اور اکبر کو اجازت دے دی کہ وہ اسٹیشن پر گھومیں پھریں اور خود بنگ آفس کا رخ کیا۔ وہاں دو کلرک موجود تھے اور ان کے پاس بات کرنے کی فرصت نہیں تھی لیکن فاروق کی جیب سے نوٹ برآمد ہوئے تو ان کے پاس فرصت بھی نکل آئی اور وہ پوری طرح تعاون کے لیے آمادہ نظر آنے لگے۔ فاروق نے جولیٹ کی روانگی والے دن کا پورا شیڈول حاصل کر لیا۔ جولیٹ کے اسٹیشن پہنچنے کے اوقات میں ایک ٹرین حیدرآباد کے لیے بھی روانہ ہوئی تھی لیکن فاروق پر یقین نہیں تھا کہ وہ حیدرآباد گئی ہوگی۔ راستے میں چھوٹے بڑے بہت سے اسٹیشن پڑتے تھے اور وہ ان میں سے کسی بھی جگہ اتر سکتی تھی۔ حیدرآباد سے تو اس کے خیال کے مطابق جولیٹ کا کوئی تعلق ہی نہیں بنتا تھا لیکن تعلق کسی اور جگہ سے بھی نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ محلے کے ان گھروں سے، جن سے جولیٹ کے خاندان کے قریبی تعلقات تھے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرے گا۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کسی کو علم ہو کہ ان میں سے کسی جگہ جولیٹ کے کوئی رشتے دار پانچا جانے والے رہتے ہوں۔ اپنے سامنے رکھے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے اس اسٹیشنل دودھ پتی چائے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا جو خاص طور پر اس کے لیے منگوائی گئی تھی۔

”اگر کسی خاص سواری کے بارے میں معلوم کرنا ہے تو بتاؤ بابو! ادھر ایک قلی ہے یار محمد..... اس کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کی مشکل حل کر دے۔“ اس کے اندر کی الجھن اور کشمکش اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی اس لیے کلرک نے اسے ایک حل پیش کیا۔ وہ امید کی کسی کرن کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، فوراً ہی اس قلی سے ملنے

کی بامی بھری۔ تھوڑی دیر میں یار محمد اس کے سامنے ٹھہر کر تقریباً پچپن سالہ یار محمد اپنے قد و قامت، رنگت اور نقوش سے پٹھان لگ رہا تھا۔ فاروق نے تنہائی میں اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو وہ اسے ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ اس وقت پلیٹ فارم پر کوئی ٹرین نہیں لگی ہوئی تھی اس لیے رش کے باوجود وہاں زیادہ ہنگامے یا افراتفری کا عالم نہیں تھا۔ یار محمد اسے لے کر ایک خالی بیچ پر براجمان ہو گیا۔ فاروق کو جولیٹ کا ایک ایک نقش از بر تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کی زبانی یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ جولیٹ نے اس روز سیاہ مائنی لباس پہن رکھا تھا چنانچہ وہ یار محمد کو تفصیل سے ایک ایک بات بتاتا چلا گیا۔ یار محمد نے اس کا ایک ایک لفظ توجہ سے سنا اور آنکھیں سکیڑ کر یوں خلا میں دیکھنے لگا جیسے ذہن پر زور ڈال رہا ہو۔ بالآخر وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکلا اور امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا فاروق کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”کچھ یاد آیا بابا؟“ اس کی مسکراہٹ پر فاروق نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”بالکل یاد آیا۔ ہم حیدرآباد جانے والے ایک خاندان کا سامان ڈبے میں رکھ رہا تھا، تب ہم نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کے پاس زیادہ سامان بھی نہیں تھا۔ صورت سے ہی بہت دکھی لگتا تھا۔“ بوڑھے قلی نے اسے بتایا۔

”تو کیا وہ حیدرآباد جانے والی ٹرین میں بیٹھی تھی؟“ فاروق نے ایک بار پھر بے تابی سے سوال کیا۔

”بالکل بیٹھا تھا بابا۔ ہم اور کیا بول رہا ہے۔“ قلی نے یقین سے جواب دیا۔

”کیا وہ حیدرآباد جا رہی تھی؟“ فاروق نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”ٹرین تو حیدرآباد ہی کا تھا، پر ہم کیا بول سکتا ہے کہ وہ سیدھا ادھر ہی جا رہا تھا یا راستے میں کہیں اترنے والا تھا۔“ قلی نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو فاروق کو تسلیم کرنا پڑا کہ اس کا سوال درست نہیں تھا..... بہر حال جتنا کچھ معلوم ہو گیا تھا، وہ بھی بہت تھا۔ کم از کم اس کے سامنے ایک سمت تو تھی ورنہ ابھی تک تو یہی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کس طرف گئی ہے۔ قلی یار محمد کو یہ قیمتی معلومات فراہم کرنے کے عوض اس نے انعام سے نوازا اور منو اور اکبر کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ وہ تو نظر نہیں آئے لیکن اس کی نظروں نے ایک شتا سا چہرے کو اپنی قید میں لے لیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ کھڑا نہیں رہ سکا اور اس کی طرف دوڑا۔ وہ



اسٹیشن سے باہر کی طرف جاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ فاروق نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی اور محسوس میں اس کے برابر پہنچ گیا۔ کسی کو اپنے اتنے قریب پا کر وہ ذرا سا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ہاتھ میں چاقو ہے جو اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں، میں سیدھا تمہارے دل میں اتار دوں گا۔“ اس کے ساتھ بالکل چپک کر چلتے فاروق نے چاقو کی نوک اس کے پہلو میں چھو کر اسے دھمکی دی۔ وہ چاقو کو اتنی مہارت سے پکڑا ہوا تھا کہ دیکھنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا کہ دو دوست ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہوں۔

”تم اتنے لوگوں کے بیچ مجھے قتل نہیں کر سکتے۔“ پہلو میں چھپتی چاقو کی نوک کے باوجود اس شخص نے فاروق کی دھمکی پر یقین نہیں کیا لیکن چاقو کی نوک نے ہی اسے کوئی حرکت کرنے سے بھی روک رکھا۔ اسے معلوم تھا کہ کوئی بھی غلط حرکت خود اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگی۔

”میں تمہیں قتل کرتا بھی نہیں چاہتا لیکن اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں کرتے ہوئے ہچکچاؤں گا بھی نہیں۔“ فاروق کے لہجے میں ایسی غراہٹ تھی کہ اس شخص کو اس کے ارادے کی پختگی پر کوئی شک نہیں رہا۔

”کیا چاہتا ہے اپنا سے۔ اپنا تو تیرے کو جانتا بھی نہیں ہے۔“ وہ فوراً ہی مفاہمت پر اتر آیا۔

”لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم بھائیہ سیٹھ اور اس کی بیٹی کے زر خرید کتے ہو اور ان دونوں کے حکم پر لوگوں کو کانٹے پھرتے ہو۔“ فاروق کے الفاظ اور لہجے کے تغیر پر وہ چونکا اور پھر بولا۔

”اپنے کو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اپنا کا تیرے ساتھ ٹاکرا ہوا ہو۔“

”آج ہو گیا ہے نا ٹاکرا..... اب تو اسے اپنی آخری سانس تک یاد رکھے گا۔“ فاروق پھنکارا اور ساتھ ہی اسے اس سمت میں ہنکارا جہاں بیت الخلا بنے ہوئے تھے۔ وہ بمبئی لوٹے ہوئے بھائیہ سیٹھ کے اس غنڈے سے نمٹنے کا عہد کر کے آیا تھا لیکن یہاں آتے ہی حالات اسے ہو گئے کہ پہلے تو اسے بمبئی میں نکلنا ہی نصیب نہیں ہوا اور ٹنگتے کا سفر اختیار کرنا پڑا پھر جو لیٹ کے ساتھ بیٹنے والے حادثات کی خبر سن کر اسے اس کے سوا کوئی ہوش نہیں رہا لیکن یہاں اسٹیشن پر اسے دیکھ کر وہ خود کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

”دیکھو دوست! لوگوں کو لگتا ہے تیرے سے کوئی شکیں ہو رہی ہے۔“ غنڈا بیٹوں کے باوجود وہ فاروق کے انداز پر تھوڑا سا گھبرا یا ہوا تھا۔

”دوست مت کہو مجھے۔ میرے دوستوں کو نقصان پہنچانے والا میرا دوست نہیں ہو سکتا۔“ فاروق نے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کو دوست پکارنے پر کاٹ دار لہجے میں اعتراض کیا۔

”اپنے کو یہ تو بتا کہ اپنا نے کیا کیا ہے؟“ اس نے فاروق سے مذاکرات کی ایک اور کوشش کی۔ اس دوران میں وہ بیت الخلا کی قطار کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔

”سوال تو نہیں، میں کروں گا۔“ فاروق نے ایک کھلے دروازے سے اسے اندر دھکیلا اور خود بھی اندر گھس کر چھٹی لگالی۔ اب اس نے اپنا چمک دار پھل والا چاقو بھی نمایاں کر دیا تھا۔

”تو تو ایسے ہی اپنا کے گلے پڑ گیا ہے۔“ اس نے فاروق کے چاقو کی چمک اور اس کی آنکھوں کی وحشت کو دیکھتے ہوئے مفاہمت انداز اختیار کیا۔

”ایسے ہی گلے پڑ گیا ہوں.....“ فاروق نے غصے سے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔

”میں ایسے ہی گلے پڑ گیا ہوں تو تو انکار کر دے کہ تو بھائیہ سیٹھ کا کتا کٹیش نہیں ہے اور کچھ دن پہلے تو بملا بھائیہ کے بلاوے پر شملہ نہیں گیا تھا۔“ فاروق نے اسے چاقو کی نوک چھوئی۔

”ٹھیک ہے۔ اپنا گیا تھا۔ پر تیرے کو اس سے کیا لینا دینا ہے؟“ وہ بے شک غنڈا تھا لیکن اس وقت چاقو کی نوک اس کے گلے پر رکھی تھی اس لیے تھوک نگتے ہوئے کچھ خوف زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”سوال نہیں..... سوال سارے اب میں کروں گا۔“

”جیسے صرف جواب دینے ہیں۔“ فاروق غرایا۔ اس وقت وہ، وہ نفیس مزاج فاروق نہیں تھا جو بہت نرم اور مہذب لہجے میں بات کرتا تھا، جسے پھول اور کتابیں اچھی لگتی تھیں، جو بے شک لباس پہنتا تھا اور جس پر دوسروں کو اکثر کسی شہزادے کا گمان ہوتا تھا۔ یہ تو وہ فاروق تھا جسے ربن نے اپنے سارے ہنر منتقل کیے تھے اور جو ضرورت پڑنے پر دشمن کی آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ سکتا تھا۔ بمبئی کی وہ پُرہیت رات جو اسے ربن کی پناہ میں لے گئی تھی اگر اس پر نہ جیتی ہوتی تو وہ یہ سب سیکھ ہی نہیں سکتا تھا لیکن اس نے جانا



## ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

### ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے [abbasnadeem283@gmail.com](mailto:abbasnadeem283@gmail.com)



تھا کہ انسان ہمیشہ انسان نہیں رہتا اور دنیا کبھی کبھی خونخوار وحشی جانوروں سے بھرا ہوا جنگل بھی بن جاتی ہے اور اس جنگل میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے آدمی کو اپنے اندر شیر کا جگر اور اسی کے جیسی سفاکی بھی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ سو اس وقت وہ بھی وہی خونخوار شیر بنا ہوا تھا جو اپنے مقابل کا سینہ چیر کر اس کا کلیجہ نکال سکتا تھا۔

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ کنیش نے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کرنے کی کوشش کی۔

”تو نے نئی فلم اسٹار چاندنی کو کس کے حکم پر قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟“ فاروق کا پوچھا سوال کنیش کو کسی ڈنک کی طرح لگا۔

”کب..... کون چاندنی.....؟ اپن کیوں اسے قتل کرے گا؟“ کنیش اس راست سوال پر بوکھلا گیا۔

”جھوٹ نہیں بول مجھ سے۔ میں سب جانتا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ بملا کے کہنے پر تو نے ہی اس کے شوہر کو جان سے مارا تھا۔“ فاروق نے جیسے اس کے سر پر دھماکا کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے فاروق کو دیکھنے لگا۔

”کیا تو انکار کرے گا کہ شملہ کے جنگل میں تو بملا بھائیہ سے ملا تھا اور وہاں اس نے تجھے کسی کو ٹھکانے لگانے کے لیے بڑی رقم دی تھی۔ میں اس ملاقات کا معنی شاہد ہوں لیکن اس وقت میں جان نہیں سکا تھا کہ وہاں ہونے والی سازش چاندنی کے خلاف ہے۔ بس میں تجھ سے اس بات کی تصدیق کروانا چاہتا ہوں کہ تو نے بملا ہی کے کہنے پر چاندنی کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی تا؟ میں اس ایکسیڈنٹ کا بھی گواہ ہوں اور میں ہی زخمی چاندنی اور مرنے والی کو مڑک سے اٹھا کر اسپتال لے گیا تھا۔“ فاروق جوں جوں بول رہا تھا، کنیش کے چہرے کی رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی پھر بھی اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بولا۔

”اپن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا بول رہے ہو۔ اپن ایسا آدمی نہیں ہے۔“

”میں نے کہا نا کہ جھوٹ مت بولنا۔ مجھے صرف اس بات کی تصدیق کرنی ہے کہ تو نے بملا بھائیہ کے کہنے پر ہی چاندنی پر وہ قاتلانہ حملہ کیا تھا یا نہیں؟“ فاروق نے چاقو کی نوک پر دباؤ بڑھایا تو اس کے گلے سے خون کی چند بوندیں چھلک پڑیں۔ فاروق نے ان چند بوندوں کی فطری پروا نہیں کی کیونکہ اس وقت اس کی نگاہوں میں بے داغ حسن کی مالک چاند بانو کا جھلسا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا۔ چاند بانو کا فطری نام چاندنی تھا اس لیے وہ کنیش سے پوچھ گچھ کے لیے اسی

اپن نے اس بملا کے کہنے پر ہی وہ سب کیا تھا ورنہ اپن کا اس فطری ہیروئن سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔“ چاقو کی نوک کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور فاروق کی آنکھوں میں اترے خون کو دیکھ کر کنیش نے حق و فاداری نبھانے سے زیادہ جرم قبول کر لینے میں ہی عافیت جانی اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ تو صرف ایک ہتھیار تھا جس کا کنٹرول بملا کے ہاتھ میں تھا۔ فاروق کو اس بات کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ کنیش سے وہ صرف تصدیق کروانا چاہتا تھا۔ کنیش نے اعتراف کر لیا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب خود بخود ہی ڈھیلے پڑ گئے اور چاقو کا دباؤ کم ہو گیا۔ کنیش نے اس بات کو فوراً محسوس کر لیا اور ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے فاروق کی ناف پر اپنا گھنٹا رسید کرنے کی کوشش کی۔ فاروق نے بھی ریڈیئل میں اپنے جسم کو حرکت دی اور یہاں اس سے چوک ہو گئی۔ وہ کنیش کی گردن پر رکھی چاقو کی نوک کو بھول گیا تھا۔ خود کنیش نے بھی اپنی نازک پوزیشن کا ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں لگایا تھا اس لیے ایسی حرکت کر گیا تھا۔ اس حرکت کا نتیجہ بے حد خطرناک نکلا اور فاروق کا تیز۔۔۔ پھل دھچکا تو کنیش کی شررگ کو اس طرح کاٹا چلا گیا کہ اسے چیخنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ فاروق اگر بروقت پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو اس کے گلے سے فوارے کی طرح پھوٹا خون اسے بھگو ڈالتا۔ اب بھی کچھ نہ کچھ چھینٹیں اس کے اوپر آئی تھیں۔ اس نے بیت الخلا کی محدود حدود میں کنیش کی خون آگتی لاش کو میزمری حالت میں نیچے گرتے ہوئے دیکھا اور اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گرم گرم خون کی بوندوں کو صاف کیا۔ اس کی ہتھیلی پر خون کی سرخی نمایاں ہو گئی۔ اس نے حیرت سے اس سرخی کو دیکھا، وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا کہ اس سے ایک انسان کا قتل ہو گیا ہے۔ کنیش چاہے غنڈا تھا اور اس کے دل میں اس کے لیے نفرت کا ایک دریا موجزن تھا اس کے باوجود وہ اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس بے ارادہ قتل پر رنگ رہ جانا ایک فطری رد عمل تھا لیکن وہ زیادہ دیر اس کیفیت میں مبتلا نہیں رہ سکا۔ بیت الخلا کے دروازے پر ہونے والی زوردار دھمک نے اسے چونکا کر رکھ دیا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور  
محبت کی قریب کاریوں کا مزید  
احوال اگلے مہینہ ملاحظہ فرمائیں



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

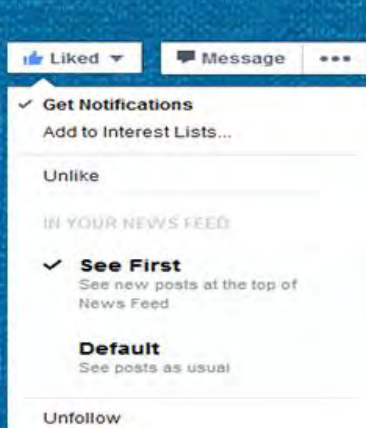
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**







Downloaded From  
Paksociety.com

## نا خدا ہی صلا

ڈاکٹر سجاد امجد

بڑی عجیب و غریب صورت حال ہوتی ہے جب انسان کسی اہم مقام پر پہنچنے کے بعد ادھر کا رہے نہ ادھر کا رہے... نہ جیتے پر دل مائل نہ مرنے پر من قائل... ایسے میں ایک لمحے کے لیے انسان کو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ کہیں ماضی میں اس سے کوئی ایسی لغزش تو نہیں ہوئی جس کی پاداش میں زندگی بذات خود ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے... شاید ایسے ہی پل ہمیں خدا کے نزدیک کر دیتے ہیں... ہمیں اپنی ذات کا ادراک دیتے ہیں... کئی پردے آنکھوں سے اٹھ جاتے ہیں۔ اس کا بھی یہی حال تھا جس کا انجام ہر نگاہ کے لیے عبرت بن گیا تھا۔

لڑکھڑاتی زندگی کو سہارا دینے والے ایک کمزور انسان کا

سکین روپ

ایک دو نہیں کینیڈا میں پورے بائیس سال گزارتے ہوئے شہر یارخاں کو اپنی مرحوم بہن کا خیال تک نہیں آیا تھا لیکن اب جبکہ وہ واپس آگئے تھے، کراچی انرپورٹ پر پہلا قدم رکھتے ہی انہیں شہناز یاد آگئی تھی۔ سہی وہ شہر تھا جس کے ایک قبرستان میں انہوں نے شہناز کو مٹی کے سپرد کیا تھا اور اس کے ایک سال بعد ہی اپنا مستقبل سنوارنے اور بہن کی یادوں سے دور ہونے کے لیے انہوں نے کینیڈا کا رخ کیا تھا اور اب وہ وارنرے کی قفل میں گھوم کر وہیں آگئے تھے۔ وہی شہر تھا، وہی

اکتوبر 2016ء

107

سپنس ڈائجسٹ



بہن کی یاد۔ انہوں نے قریب کھڑے ہوئے اپنے بڑے شریعتی  
کی طرف دیکھا جواب دیا کہیں برس کا غور ہو جاتا ہو چکا تھا۔  
بیوی ان کی اس کیفیت کو دیکھ ضرور رہی تھی لیکن سمجھ نہیں سکی تھی۔  
اگر بھی بھی تو صرف اتنا کہ اتنے دنوں بعد ان کے پیروں نے  
وطن کی مٹی کے لمس کو محسوس کیا ہے۔ اسی لیے ان کی آنکھوں میں  
نئی اتر آئی ہے۔

شہر یار خاں تھکے تھکے قدموں سے لاؤنج سے باہر  
آئے۔ کینیڈا سے واپس آنے سے پہلے ہی انہوں نے چار  
سو گز کا مکان خرید لیا تھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ کے نمائندے کے  
ذریعے اسے ڈیکوریٹ بھی کر لیا تھا۔ انہوں نے ائر پورٹ  
سے فلیکسی لی اور سیدھے اپنے نئے گھر میں اتر گئے۔

وہ کینیڈا کے ایک بینک میں نوکری کرتے رہے تھے  
اور اب اتنا سرمایہ اپنے ساتھ لے آئے تھے کہ چھوٹا موٹا  
بزنس شروع کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست  
سے بات بھی کر لی تھی۔ اب تو انہیں صرف یہ فیصلہ کرنا تھا کہ  
اس کے ساتھ سرمایہ کاری کریں یا اپنا بزنس الگ کریں۔  
شریٹل ایم بی اے کی ڈگری لے کر آیا تھا لیکن بزنس میں  
اس کا دل نہیں تھا۔ وہ ملازمت کے حق میں تھا۔ وہ اگر بزنس  
کے حق میں ہوتا تو شہر یار خاں کو کچھ سہارا مل جاتا، مجبور ہو کر  
انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے دوست کے ساتھ مل کر  
بزنس کرتے رہیں۔ کچھ دنوں کی تنگ و دو کے بعد شریٹل کو  
ایک بینک میں ملازمت مل گئی۔

شہر یار خاں بہت ڈرتے ڈرتے کینیڈا سے واپس  
آئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ جو سرمایہ ان کے پاس ہے، وہ  
کہیں ضائع نہ ہو جائے لیکن اب انہیں اپنی ذہانت پر فخر  
ہو رہا تھا۔ ایک پیسے کے چار پیسے بن رہے تھے اور زندگی  
مزے میں گزر رہی تھی بلکہ صرف ایک سال کے عرصے میں  
انہیں زندگی کی ہر آسائش میسر ہو گئی تھی اور اس آسائش میں  
بہن کی یاد بھی ذہن سے اوجھل ہو گئی تھی لیکن ایک دن ایک  
ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ زخموں کے ٹائٹلے ایک ایک کر کے  
ٹوٹ گئے۔ انہوں نے ایک اخبار کے دفتر کو کچھ مشینیں  
پلائی کی تھیں۔ ان کی فائل پے منٹ میں کچھ تاخیر ہو رہی  
تھی۔ وہ اخبار کے مالک سے میٹنگ کرنے اخبار کے  
ہیڈ آفس پہنچے تھے۔ جب مذاکرات کامیاب ہو گئے تو اخبار  
کے مالک نے آفس کلرک کو طلب کیا تا کہ جلد سے جلد مل  
تیار کر کے پے منٹ کرادے۔ وہ کلرک اندر آیا تو شہر یار  
خاں اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوتے رہ گئے۔ وہ کوئی  
اور نہیں تاثیر علی تھا۔ ان کا سابق بہنوئی اور چچا زاد بھائی۔

انہوں نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ تاثیر علی کچھ کہہ رہا تھا لیکن  
شہر یار خاں نے بے سروقی دیکھ کر چپ ہو گیا۔  
جب تاثیر علی ہدایات لے کر کمرے سے نکل گیا تو  
شہر یار خاں نے بھی اجازت چاہی۔  
”میرا آدمی کل آکر پے منٹ لے جائے گا۔“  
”بس آدھے گھنٹے کی بات ہے۔ پے منٹ آپ ہی کو  
مل جائے گی۔“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ پے منٹ کل سہی۔“  
شہر یار خاں نے کہا اور باہر نکل گئے۔ انہوں نے شیشے کی  
دیوار کے پیچھے تاثیر علی کو دیکھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا  
لیکن شہر یار خاں اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتے  
چلے گئے۔

تاثیر علی وہی شخص تھا جس نے شہر یار خاں کی بہن  
سے شادی کی تھی اور پھر طلاق دے دی تھی۔ یہاں تک بھی  
غیبت تھا لیکن طلاق کے چھ ماہ بعد ہی شہر یار خاں کی بہن  
نے خودکشی کر لی تھی۔ شہر یار خاں اپنی بہن کی موت کا ذمے  
دار تاثیر علی کو قرار دیتے تھے۔ وہ ان کا سگا چچا زاد بھائی بھی  
تھا لیکن طلاق کے واقعے کے بعد انہوں نے رشتے داری کا  
خیال بھی نہیں کیا تھا اور ملنا جلنا بالکل بند کر دیا تھا۔ اس کے  
بعد تو وہ کینیڈا ہی چلے گئے تھے۔

اتنے عرصے بعد تاثیر علی کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کی  
آنکھوں میں خون ضرور اتر آیا تھا لیکن گھر تک پہنچے پہنچے  
انہیں رشتے داری کا خیال بھی آیا تھا اور وہ اس حقیقت کو بھی  
تسلیم کرنے کے قابل ہو گئے تھے کہ دنیا میں ایک ان کی  
بہن ہی نہیں تھی جسے طلاق ہوئی تھی۔ رہی اس کی خودکشی تو وہ  
شہناز کا ذاتی فعل تھا۔ تاثیر علی نے اسے قتل نہیں کیا تھا اور نہ  
ہی اس سے کہا تھا کہ خودکشی کر لے۔

وہ گھر پہنچے تو بخار سے ان کا بدن تپ رہا تھا۔ یہ کسی  
صدے کا باعث بھی ہو سکتا تھا اور اس الجھن کا سبب بھی جس  
سے وہ چند گھنٹے پیشتر دو چار ہوئے تھے۔ ان کی بیگم انہیں  
دیکھ کر ظاہر ہے پریشان ہوئیں۔

”جب آپ کی طبیعت راستے میں خراب ہو گئی تھی تو ڈاکٹر کو  
دکھاتے ہوئے آتے۔ ڈرائیور تو آپ کے ساتھ ہی تھا۔“

”یہ بخار کوئی بیماری نہیں ہے بس تھکن سے ہو گیا ہے۔“  
”کہا ہے اتنا کام نہ کیا کریں۔“

”یہ ذہنی تھکن ہے، جسمانی نہیں ہے۔“  
”میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ گڑھے کھود کر  
آ رہے ہیں۔“



"بھائی صاحب، مجھ سے جو بھی قصور ہوئے ہیں میں ان کی دل سے معافی چاہتا ہوں۔"

"میرے بھائی، تم سے ایک کوتاہی ضرور ہوئی تھی لیکن اتنا عرصہ گزر گیا کہ اب میں سب کچھ بھلا چکا۔ مجھے شہناز کی طلاق کا دکھ ضرور ہے لیکن ہم کب تک گڑے مردے اکھیڑتے رہیں گے۔"

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

"آج کل کہاں رہ رہے ہو؟"

"اسی مکان میں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں بزرگوں کی نشانیوں کی کتنی قدر کرتا ہوں۔"

"اوہ ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔ یہ تو میں ہی ہوں کہ ٹھکانے بدلتا رہتا ہوں۔ اسی مسافرت میں پورے خاندان سے کٹ کر رہ گیا۔"

"آپ تو کینڈا چلے گئے تھے۔"

"ہاں بائیس سال ضائع کر دیے۔ اب لوٹ کر آیا ہوں۔ اب کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے بھائی صاحب۔"

"اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ کسی دن تمہاری طرف آؤں گا۔"

"میرا گھر اس قابل تو نہیں پھر بھی میں آپ کو منع نہیں کر سکتا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ تشریف لائیں گے۔"

شہناز خاں وہاں سے اٹھے تو خوش بھی تھے اور مطمئن بھی۔ اگلے دو چار دن وہ بہت جمع کرتے رہے اور بالآخر

ایک دن تاثیر علی کے گھر پہنچ گئے۔ اس گھر میں تاثیر علی، اس کی بیوی اور تین بچے تھے۔ بڑی بیٹی انیس سال کی تھی، اس

سے چھوٹا پندرہ سال کا بیٹا تھا سب سے چھوٹا بیٹا بمشکل گیارہ سال کا ہوگا۔ تاثیر علی کے سوا اس گھر میں جو بھی تھا، شہناز

سب کے لیے اجنبی تھا۔

تاثیر علی کی بیوی کو دیکھ کر شہناز خاں کو ایک مرتبہ پھر شہناز کی یاد آگئی۔ انہوں نے قسمت کا فیصلہ قبول کر کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"یہ میری بڑی بیٹی مریم ہے۔" تاثیر علی نے تعارف کرایا۔

مریم کو دیکھتے ہی شہناز خاں کی رگوں میں زہر سا دوڑنے لگا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شہناز کی بھی یہی عمر تھی

جب تاثیر علی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ مریم اپنے باپ کے گھر میں ہے، میری بہن منوں مٹی تلے سو رہی ہے۔

"آپ بھابی کو لے کر نہیں آئے؟" تاثیر علی نے

"ایسی کون سی افتاد آن پڑی؟"

"تاثیر علی ملتا تھا۔"

"کون تاثیر علی؟"

"اب تم تاثیر علی کو بھی بھول گئیں۔"

"آپ شہناز کے شوہر کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"ہاں وہی۔"

"کچھ کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تو جب، جب میں اس سے ملتا۔"

"ہاں، اب اس سے ملنا بھی کیا۔ کون سا رشتہ باقی

رہ گیا۔"

"رشتہ تو خیر ہے۔ وہ میرا چچا زاد بھی تو ہے۔"

"رشتے اسی وقت تک اچھے لگتے ہیں جب تک دلوں

میں جگہ ہو۔"

"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"اب آپ آرام کریں۔ سوچتے رہنے سے طبیعت

اور خراب ہوتی۔"

ایک ملازم نے انہیں خواب گاہ تک پہنچا کر اندھیرا

کر دیا اور بیگم شہناز کی ہدایت پر ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ دس

منٹ بعد ہی ڈاکٹر آ گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن دے کر انہیں

سلا دیا۔

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس انجکشن کا اثر صبح تک برقرار

رہے گا لیکن وہ رات ہی کو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کا ذہن اس

انجکشن کے باوجود کام کر رہا تھا۔ آٹھ بجے ہی وہ پھر تاثیر علی

کے بارے میں سوچنے لگے۔ ایک شہناز کی وجہ سے پورا

خاندان مجھ سے چھوٹ گیا۔ شہناز کو مرے ہوئے بائیس

سال ہو چکے ہیں۔ مجھے اب تو سب کچھ بھول جانا چاہیے۔

وہ صبح اپنے بستر سے اٹھے تو کوئی فیصلہ کر چکے تھے لیکن

انہوں نے بیوی کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ ناشتے سے

فراغت کے بعد کچھ دیر اخبار پڑھتے رہے۔ دو چار فون

کئے۔ ڈرائیور نے گاڑی لگا دی۔ انہیں کچھ دیر کے لیے

آفس جانا تھا اور اس کے بعد انہوں نے کچھ اور سوچا تھا۔

آفس میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ اسی اخبار

کے دفتر میں پہنچ گئے جہاں ایک دن پہلے پہنچے تھے۔ آج

انہیں اخبار کے مالک سے نہیں تاثیر علی سے ملنا تھا۔ وہ آفس

میں داخل ہوئے اور شیشے کی دیوار کے اس طرف بیٹھے ہوئے

تاثیر علی کے پاس پہنچ گئے۔ تاثیر علی انہیں دیکھتے ہی اپنی



پوچھا۔ شہریار خاں کا دہریم کی طرف سے ہونے لگا بلکہ مریم خود بھی وہاں سے ہٹ گئی۔  
 ”آج تو میں بس یونہی چلا آیا۔ کسی دن انہیں بھی لے کر آؤں گا۔“ شہریار نے کہا۔ ”کسی دن تم لوگ بھی آؤ۔“  
 قاصد اسی طرح ختم ہوتے ہیں بلکہ کسی دن کیا کل ہی آ جاؤ۔  
 وقت بتا دو۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔“  
 ”کل کا وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کسی دن آؤں گا ضرور۔“  
 ”کس دن آرہے ہو بتا دینا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ ہم آ جائیں گے۔“  
 ”اب تم غیریت برت رہے ہو۔“  
 ”اچھا بتا دوں گا۔“

ایک ہفتے بعد تاثیر علی بچوں سمیت ان کے گھر آیا۔ ایک مرتبہ پھر گلے شکوے ہوئے۔ سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ بڑوں کی لڑائی سے بچوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ہمیں پرانے اختلافات بھلا کر نئی زندگی شروع کرنی چاہیے۔  
 اس روز انہوں نے مریم کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ شہناز انہیں پھر یاد آ گئی۔

تاثیر علی بہت خوش تھا۔ اسے بھی احساس جرم ستاتا رہتا تھا۔ شہریار خاں سے اختلافات دور ہوئے تو وہ مطمئن ہو گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بھائی کے گھر چکر لگاتا تھا۔ شہریار خاں بھی بھی بھی ہو آتے تھے۔ ان کی مہربانیاں خاص طور پر مریم کے ساتھ تھیں۔ قیمتی تحفے دے کر اسے مانوس بھی کر لیا تھا۔

ان مہربانیوں کا سبب آخر ایک روز ظاہر ہو ہی گیا۔ انہوں نے تاثیر علی کو اعتماد میں لینے کے لیے مریم کا ذکر چھیڑ دیا۔

”تاثیر علی! مریم اب سیانی ہو گئی ہے۔ اس کے لیے کچھ سوچا؟“

”ابھی کہاں بھائی صاحب۔ ابھی تو وہ بڑھ رہی ہے۔“  
 ”میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ کل شادی کر دو۔ کوئی اچھا رشتہ ہو تو منگنی کر دو۔ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد شادی کر دینا۔“

”اب وہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ ہی اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ تلاش کریں۔“

”میں نے تلاش کر لیا ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“  
 ”مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں، آپ مالک وغیرہ ہیں۔“  
 ”یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔“

”میں مریم کو اپنے بیٹے شرجیل کے لیے مانگ رہا ہوں۔“  
 ”اچھے انکاری حرات نہیں ہیں آپ کا اور میرا مقابلہ نہیں۔ شرجیل کو آپ نے ناز و نعم میں پالا ہے۔ وہ ایک غریب لڑکی سے شادی کیوں کرے گا؟“  
 ”آپس کی بات ہے۔ میں اس کی تربیتی کر رہا ہوں۔ اس کی پسند ہی ہے، تمہیں بتا رہا ہوں۔ اسی کے کہنے پر میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“  
 ”یہ بات شرجیل کے دل میں برابر کھٹکتی رہے گی کہ میں نے اس کی پھوپھی کو طلاق دے دی تھی۔“  
 ”میرے گھر میں بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ اسے تو معلوم بھی نہیں کہ ہوا کیا تھا۔“  
 ”اگر کسی وقت معلوم ہوا تو اس کے اثرات بُرے مرتب ہوں گے۔“

”ان باتوں کو سنبھالنے کے لیے ہم بڑے جو موجود ہیں اور پھر طلاق میری بہن کو ہوئی تھی۔ جب مجھے اعتراض نہیں تو کسی اور کو کیوں ہونے لگا۔“

”بھائی صاحب! میں بہت محتاط ہو گیا ہوں۔“  
 ”اس قدر احتیاط کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ اس رشتے کو منظور کر لو۔“

”یہ فیصلہ مجھ اکیلے کا نہیں ہوگا۔ میں حمیرا سے بات کروں گا، وہ اس کی ماں ہے۔ مریم سے بھی پوچھنا پڑے گا۔“  
 ”تم کیوں پوچھو گے۔ میں خود پوچھوں گا اپنی بیٹی مریم سے۔“ شہریار خاں نے کہا۔ ”بس یہ بتاؤ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟“

”میں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ خاندان پھر سے جڑ رہا ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ میں مریم سے اور تمہاری بیوی سے خود بات کروں گا۔“

شہریار خاں جیسے شفیق اور دولت مند تائی نے جب اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹے شرجیل کا تذکرہ مریم سے کیا تو اس نے شرم سے گردن جھکا لی۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے حمیرا سے بات کی۔ حمیرا نہ تو ان کے خاندان کی تھی اور نہ بچھلے واقعات کو تفصیل سے جانتی تھی۔ اسے تو شادی کے وقت صرف یہ بتایا گیا تھا کہ لڑکے (تاثیر علی) نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ لڑکوں کے لیے طلاق کا داغ کوئی اہمیت نہیں رکھتا لہذا شادی ہو گئی۔ شہناز کی خود کشی وغیرہ کا قصہ اسے معلوم نہیں تھا۔ شہریار خاں نے جب اس سے



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





## ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

### ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے [abbasnadeem283@gmail.com](mailto:abbasnadeem283@gmail.com)



بات کی تو اس بے چاری نے کسی اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”آپ دونوں بھائی ہیں۔ جو فیصلہ کریں گے میرا بھی

وہی فیصلہ ہوگا البتہ ایک بات ہے، مریم کی تعلیم کا یہ آخری

سال ہے۔ اسے اتنا موقع مل جائے کہ وہ تعلیم مکمل کر لے۔“

”وہ میرے گھر جا کر بھی تعلیم مکمل کر سکتی ہے بلکہ

اسے وہاں تعلیم کے زیادہ مواقع ملیں گے۔“

”نہیں بھائی صاحب، شادی کے بعد ہزار ڈے

داریاں ہوتی ہیں اور پھر کوئی نہیں جانتا کہ کل کن حالات کا

سامنا ہو۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ کل کا حال تو مجھے بھی نہیں معلوم۔“

شہر یار خاں نے کچھ اس طرح کہا جسے انہیں معلوم ہو اور پھر

خود ہی تجویز دی۔ ”ایسا کرتے ہیں منگنی کیے لیتے ہیں۔ مریم

کا رزلٹ آنے کے بعد شادی کر لیں گے۔“

”بھائی صاحب، منگنی کی ضرورت کیا ہے۔ مریم آپ

ہی کی تو ہے۔ وہ امتحان دے لے پھر آ کر لے جائے گا۔“

”نہیں بھائی، میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ منگنی بھی دھوم

دھام سے کروں گا اور شادی بھی۔“

شہر یار خاں کو اب کوئی فکر نہیں تھی۔ بیوی کی طرف

سے تو کوئی خدشہ نہیں تھا لیکن شرجیل سے کل کر بات کرنی

تھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ان کے منصوبے سے اتفاق نہ کرتا۔ وہ

بات کرتے کرتے ڈر رہے تھے۔ بیوی کو اعتماد میں لینے کا

مطلب یہ تھا کہ اگر اس نے مخالفت کر دی تو وہ شرجیل کو بھی

بھڑکا سکتی تھی لہذا انہوں نے پہلے شرجیل سے بات کرنا

مناسب سمجھا۔ وہ بیچ نام میں اس کے بینک پہنچ گئے اور اسے

لے کر قریبی ریسٹورنٹ چلے گئے۔

”تم اپنے چچا تاثیر علی سے تول ہی چکے ہو۔“

”جی ہاں، آپ ہی کے ساتھ تو گیا تھا ان کے گھر۔ ایک

مرتبہ جب وہ ہمارے گھر آئے تھے تو ملا تھا۔ کیوں کیا ہوا؟“

”تم ان سے ملے ضرور ہو گے لیکن کیا یہ بھی جانتے ہو

کہ اس نے میری بہن کو طلاق دے دی تھی؟“

”جی ہاں، سنا تو میں نے بھی ہے لیکن یہ کوئی ایسی

بات نہیں۔ طلاقیں تو ہی جاتی ہیں۔“

”اس نے صرف طلاق نہیں دی تھی۔ وہ میری بہن کا

قائل بھی ہے۔“

”قائل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں، اسی نے شہناز کو قتل کیا تھا اور اس قتل کو خود کشی

کارنگ دے دیا تھا۔“

”آپ کو اسی وقت کوئی کارروائی کرنی چاہیے تھی۔ اب

”ڈیڈی! میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا

”ڈیڈی! مجھ سے یہ ظلم نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے پھر میں کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔ مجھے

تسکین اسی وقت ملے گی جب تاثیر علی کو بھی وہی دکھ پہنچے جس

دکھ سے میں گزرا تھا۔“

شہر یار خاں نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا اور یہ کہہ

کر اٹھ گئے۔ ”اور اچھی طرح سوچ لو، اس کے بعد مجھے فاسل

جواب دے دینا۔ میں تمہیں تین دن کا وقت دیتا ہوں۔“

ان کے چلے جانے کے بعد شرجیل بینک آ گیا لیکن

اس کا ذہن ابھی تک ریسٹورنٹ میں ہونے والی گفتگو میں

الٹا ہوا تھا۔ وہ تمام باتوں کو دہرا رہا تھا۔

وہ بینک سے لوٹا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ ماں سے بات

کرے گا تا کہ وہ ڈیڈی سے بات کریں۔ انہیں مجبور کریں

کہ وہ انتقام کا راستہ چھوڑ دیں لیکن راستے ہی میں اس نے

فیصلہ تبدیل کر دیا۔ اگر ممی بھی ڈیڈی کی ہم خیال ہوئیں تو

اسے مجبور ہونا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے میری باتیں ڈیڈی کی

سمجھ میں آگئی ہوں اور وہ ممی سے بات ہی نہ کریں۔ میں اور

دیکھ لوں کہ ڈیڈی کیا کہتے ہیں۔

شہر یار خاں اس سے روز پوچھ رہے تھے کہ اس نے

کیا سوچا۔ وہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا کہ ابھی سوچ رہا ہے۔ اس

طرح چار دن گزر گئے۔ اسے اپنے باپ کے الفاظ یاد

آ رہے تھے کہ ”میں کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔“ اس نے

سوچا نہ جانے وہ بے قصور مریم کو سزا دینے کے لیے کون سا

طریقہ سوچیں، میں مریم سے شادی کر لوں۔ ڈیڈی سے یہی

کہوں گا کہ طلاق دے دوں گا۔ جب شادی ہو جائے گی تو

ڈیڈی زبردستی طلاق نہیں دلواسکیں گے۔ چچا تاثیر اور مریم

میرے ظلم کا نشانہ نہیں بن سکیں گے۔ شہر یار خاں اس سے

ملاقات کے لیے آئے تو اس نے مریم سے شادی اور پھر

طلاق دینے کی ہائی بھری۔

”ڈیڈی! میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا

”ڈیڈی! مجھ سے یہ ظلم نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے پھر میں کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔ مجھے

تسکین اسی وقت ملے گی جب تاثیر علی کو بھی وہی دکھ پہنچے جس

دکھ سے میں گزرا تھا۔“

”آپ دونوں بھائی ہیں۔ جو فیصلہ کریں گے میرا بھی

وہی فیصلہ ہوگا البتہ ایک بات ہے، مریم کی تعلیم کا یہ آخری

سال ہے۔ اسے اتنا موقع مل جائے کہ وہ تعلیم مکمل کر لے۔“

”وہ میرے گھر جا کر بھی تعلیم مکمل کر سکتی ہے بلکہ

اسے وہاں تعلیم کے زیادہ مواقع ملیں گے۔“

”نہیں بھائی صاحب، شادی کے بعد ہزار ڈے

داریاں ہوتی ہیں اور پھر کوئی نہیں جانتا کہ کل کن حالات کا

سامنا ہو۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ کل کا حال تو مجھے بھی نہیں معلوم۔“

شہر یار خاں نے کچھ اس طرح کہا جسے انہیں معلوم ہو اور پھر

خود ہی تجویز دی۔ ”ایسا کرتے ہیں منگنی کیے لیتے ہیں۔ مریم

کا رزلٹ آنے کے بعد شادی کر لیں گے۔“

”بھائی صاحب، منگنی کی ضرورت کیا ہے۔ مریم آپ

ہی کی تو ہے۔ وہ امتحان دے لے پھر آ کر لے جائے گا۔“

”نہیں بھائی، میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ منگنی بھی دھوم

دھام سے کروں گا اور شادی بھی۔“

شہر یار خاں کو اب کوئی فکر نہیں تھی۔ بیوی کی طرف

سے تو کوئی خدشہ نہیں تھا لیکن شرجیل سے کل کر بات کرنی

تھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ان کے منصوبے سے اتفاق نہ کرتا۔ وہ

بات کرتے کرتے ڈر رہے تھے۔ بیوی کو اعتماد میں لینے کا

مطلب یہ تھا کہ اگر اس نے مخالفت کر دی تو وہ شرجیل کو بھی

بھڑکا سکتی تھی لہذا انہوں نے پہلے شرجیل سے بات کرنا

مناسب سمجھا۔ وہ بیچ نام میں اس کے بینک پہنچ گئے اور اسے

لے کر قریبی ریسٹورنٹ چلے گئے۔

”تم اپنے چچا تاثیر علی سے تول ہی چکے ہو۔“

”جی ہاں، آپ ہی کے ساتھ تو گیا تھا ان کے گھر۔ ایک

مرتبہ جب وہ ہمارے گھر آئے تھے تو ملا تھا۔ کیوں کیا ہوا؟“

”تم ان سے ملے ضرور ہو گے لیکن کیا یہ بھی جانتے ہو

کہ اس نے میری بہن کو طلاق دے دی تھی؟“

”جی ہاں، سنا تو میں نے بھی ہے لیکن یہ کوئی ایسی

بات نہیں۔ طلاقیں تو ہی جاتی ہیں۔“

”اس نے صرف طلاق نہیں دی تھی۔ وہ میری بہن کا

قائل بھی ہے۔“

”قائل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں، اسی نے شہناز کو قتل کیا تھا اور اس قتل کو خود کشی

کارنگ دے دیا تھا۔“

”آپ کو اسی وقت کوئی کارروائی کرنی چاہیے تھی۔ اب

”ڈیڈی! میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا

”ڈیڈی! مجھ سے یہ ظلم نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے پھر میں کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔ مجھے

تسکین اسی وقت ملے گی جب تاثیر علی کو بھی وہی دکھ پہنچے جس

دکھ سے میں گزرا تھا۔“



ہوں کہ مجھے آپ کی بات مان لینی چاہیے۔ میں کسی دولت مند گھرانے میں شادی کا خواہش مند تھا۔ مجھے یہ موقع مل جاتا۔ مریم کو طلاق دینے کے بعد میں کہیں بھی شادی کر لوں گا۔“

”شاہاں شرجیل..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

”بس اب جو کرنا ہے جلدی کیجیے۔“

”وہ لوگ کہہ رہے ہیں شادی ایک سال بعد ہوگی۔  
میریم کے فاضل امتحان کے بعد۔ اس وقت تک کے لیے ہم  
مکلفی کر لیں گے۔“

شرجیل یہ سن کر اور بھی خوش ہو گیا۔ ایک سال بہت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس دوران ڈیڑی اپنے فیصلے میں تہدلی کر لیں۔

شہر یار خاں نے بیٹے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بھی بات کی۔

”تم نے تاشیر علی کی بیٹی مریم کو تو دیکھا ہے۔“

”ہاں دیکھا تو ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے۔“

”میں نے تاثیر علی سے بات کی ہے۔ شرجیل کے لیے مریم کیسی رہے گی؟“

”لوکی تو اچھی ہے لیکن شرجیل کے لیے تو کسی بڑے گھر کی لڑکی ہونی چاہیے۔“

”بڑے گھر سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”آج کل ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ لڑکی دولت مند ہو۔“

”گھر کی لڑکی ہے اور پھر ہمارے پاس اللہ کا دیا

”سب کچھ ہے۔“  
”تاشیر علی کی طرف سے کچھ تلخ یادیں وابستہ ہیں۔“

اس کا بھی سوچ رہی ہوں۔“

”اس کا تو مجھے سوچنا چاہیے۔ تاثیر علی بھی کوئی غیر

نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔ اس رشتے سے ٹوٹا ہوا خاندان جڑ جائے گا۔“

”جب آپ فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو مجھے کیا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ شریعت سے بوجھ لیتے تو اچھا تھا۔“

”تم کیا سمجھتی ہو۔ اس سے پوچھتے بغیر میں اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا تھا۔“

شرجیل اس وقت گھر پر ہی تھا۔ انہوں نے اسے اسی

وقت بلا یا۔ اس نے جی ماں کے سامنے لہو دیا لڑائی کے لیے جو فیصلہ کیا ہے، میری بہتری کے لیے کیا ہوگا لہذا مجھے کیا

شہر پارخاں نے نہایت دھوم دھام سے منگنی کی تیاری کی۔ کچھ تو دولت کی نمائش کا بہانہ تھا، کچھ وہ تاثیر علی پر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس منگنی سے بہت خوش ہیں۔ انہوں نے تاثیر علی کا ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہونے دیا۔ شہر کے ایک بہت بڑے پارک میں نہایت دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔

اس قریب نے اس کے دل میں مریم کی محبت پیدا کر دی۔

پس کے برعکس مریم اس کی طرف سے قدرے باپوس ہوئی تھی۔ شرجیل ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ثابت ہو رہا تھا۔ فضا

نصے پورے لے لیکن وہ تو اس طرح آتا تھا جسے کوئی بیمار کا

دن بدن گزارتے گئے۔ سال ایک کہ امتحان

جیسے خبروں سے ماس ہو کر شرجیل کے سامنے سرخرو ہو سکے۔

اور انگریزی کا ایک لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی

نایاب: اس کی خالہ بھی اسکول سمجھ نہیں سکتی۔ لیکن وہ خود انٹر

... اے کیسے ہی اسوں سپر ہیں۔ بن وہ خود اس کے  
 ہیں، اسے کیا پڑھاتیں۔ باتوں باتوں میں پڑوس کے  
 لڑکے کا ذکر نقل آتا۔

”ہمارے پڑوسی ہیں۔ ان کا لڑکا ہے راشد۔ پچھلے سال ایم اے انگریزی میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن پر آئے۔“



”وہ لڑکا ہے۔ بتائیں امی کی لڑکے سے پڑھنے کی اجازت دیتی ہیں یا نہیں۔“

”وہ لڑکا ہے کوئی خوشخوار شیر تو ہے نہیں کہ تمہیں کھا جائے گا۔ آج کل تو لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ ہی پڑھ رہے ہیں۔“

”وہ تو ہے خالہ مگر ماں کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔“

”وہ میں سنبھال لوں گی۔ تو جلدی سے تیار ہو جا۔ میں تجھے اس کے گھر لے کر چلتی ہوں۔“

”دیکھ لیں خالہ..... امی۔“

”کیا امی امی کی رٹ لگا رہی ہے۔ چل میرے ساتھ۔“

راشد کے گھر میں داخل ہوتے ہی مریم کو پہلا احساس یہ ہوا کہ یہ بہت غریب لوگ ہیں۔ تاثیر علی کوئی رئیس آدمی نہیں تھے لیکن یہ گھرانا مریم سے بھی زیادہ غریب تھا۔ پڑوسن نہایت سادہ اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ راشد بھی گھر پر ہی تھا۔ مریم کی خالہ نے جب اپنا مدعا بیان کیا تو راشد کی ماں نے اسے آواز دی۔ اس آواز کے جواب میں راشد اپنے کمرے سے باہر آیا۔ ابھی مریم اس کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتی تھی کہ وہ بے حد خوب صورت لڑکا ہے اور کسی قدر شرمیلا بھی۔ نظریں نیچی کیے ہوئے کمرے سے باہر آیا اور اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

”بیٹا شاہدہ خالہ آئی ہیں اور یہ ان کی بھانجی ہے مریم۔“

”جی۔“

”یہ بی اے کا امتحان دے رہی ہے۔ شاہدہ خالہ کہہ رہی ہیں تم اسے انگریزی کے پڑے کی تیاری کروادو۔“

”امی! میں خالہ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں لیکن امتحان میں پندرہ بیس دن رہ گئے ہیں۔ اس میں کیا تیاری ہوگی۔ پھر بھی میں اتنا کروں گا کہ یہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائیں۔“

”بس میں اتنا ہی چاہتی ہوں۔“ مریم کی خالہ نے کہا۔ ”دو گھروں کے بیچ ایک دیوار ہی تو ہے۔ اب بتاؤ تم آؤ گے پڑھانے یا یہ آجایا کرے؟“

”خالہ! یہ کہاں گھر سے نکلیں گی۔ میں آجایا کروں گا۔“

وہ مریم کو پڑھانے کے لیے آنے لگا۔ دو چار دن تو وہ صرف پڑھانے پر زور دیتا رہا لیکن آہستہ آہستہ اس کے مزاج کی شوخی اس پر غالب آگئی۔ اس گھر میں شاید وہ بچپن سے آتا جاتا رہا تھا لہذا خالہ سے اس کی بے تکلفی تھی۔ پڑھانے کے بعد بھی گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ مریم بھی اس سے جلد ہی بے تکلف ہو گئی بلکہ وہ تو کبھی کبھی یہ سوچا کرتی کہ اس کے لیے ایسا ہی شوخ و شنگ لڑکا ہونا چاہیے تھا۔ وہ شرجیل اور

راشد کا سوا ذرا بڑا بھائی تھا۔ راشد کے حق میں جاتا پڑا پھر وہ لڑکا ہی اپنا ذہن بھٹک دیتی۔

اسی دھوپ چھاؤں میں پندرہ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے۔ انگریزی کا پرچہ ہو گیا۔ باقی مضامین کے پرچے بھی اس نے خالہ کے گھر رکھ دیے۔ ان پرچوں کی تیاری میں بھی راشد اس کے ساتھ رہا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، راشد کی شوخی، اداسی میں تبدیلی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا دیکھ کر ایک دن مریم نے پوچھ لیا۔

”راشد! میں دیکھ رہی ہوں تم کچھ دنوں سے بچھے بچھے سے ہو۔ مجھے نہیں بتاؤ گے کیا بات ہے؟“

”میری اداسی کا سبب تم ہو مریم۔“

”میں نے ایسا کیا کر دیا کہ تم اداس ہو گئے۔“

”کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم آج نہیں توکل اپنے گھر چلی جاؤ گی؟“

”وہ تو ہے۔ کیا میں مگر بھر کے لیے یہاں آگئی ہوں۔“

”مریم! بات یہ ہے کہ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”راشد! تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ میری معافی ہو چکی ہے۔“

”مگنی ہوئی ہے، نکاح تو نہیں ہو گیا ہے۔ تم میری خاطر یہ مگنی توڑ دو۔“

”یہ کوئی اتنی آسان بات ہے؟“

”مشکل بھی کیا ہے۔ مگنی کیا ٹوٹی نہیں ہے۔“

”یہ مگنی میرے ابو نے کی ہے۔ میری مگنی نے برسوں کی تنخیاں ختم کی ہیں۔ خاندان ایک مرتبہ پھر بکھر جائے گا۔“

”یہ مگنی نہیں ٹوٹی تو میں مرجاؤں گا یا کسی اور کو مار دوں گا۔ تم میری محبت ہو۔ میں اپنی محبت کو اتنی آسانی سے کسی اور کے حوالے نہیں ہونے دوں گا۔“ اس نے اتنی بڑی بات نہایت آسانی سے کہہ دی اور اٹھ کر چلا گیا۔

مریم کو اسی دن اپنے گھر جانا تھا، وہ چلی گئی۔ اس کے پیچھے ہی شرجیل اس سے ملنے آیا۔ وہ آتا ہی تھا لیکن اب آیا تو مریم کی ایک آنکھ شرجیل کو دیکھ رہی تھی، دوسری آنکھ راشد پر جمی ہوئی تھی۔ پھر دونوں آنکھیں راشد پر جم گئیں۔ وہ دونوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ شرجیل کو صرف اتنی برتری حاصل تھی کہ وہ دولت مند تھا۔ اس کے علاوہ راشد کا اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔



”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ شرجیل سے میرا ذہن نہیں ملتا۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”شادی کے بعد سب کے ذہن مل جاتے ہیں۔ تم کوئی انوکھی شادی نہیں کر رہی ہو۔“

”جو میں اپنے لیے بہتر سمجھتی تھی، وہ میں نے کہہ دیا۔“ مریم نے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ اس تک محدود رہ جاتی۔ شام آئی تو گھر میں قیامت آگئی۔ تاثیر علی نے سنا تو اسے تو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔

اس کی ماں نے اس سے پھر بات کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ ابھی تک اپنی ضد پر قائم تھی۔ تھک ہار کر اس سے پوچھا گیا کہ آخر اس نے اپنا فیصلہ کیوں بدل دیا۔ اس نے ماں کو یہ بتانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ وہ راشد کو پسند کرنے لگی ہے اور اس سے شادی کرے گی۔ تاثیر علی نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ وہ بھائی کو کیا جواب دے گا۔ ایک مرتبہ پھر ان کا بھائی ان سے چھوٹ رہا تھا۔ انہوں نے مریم سے بات کی۔ دھمکیاں دیں، اللہ رسول کے واسطے دیے۔ جتنا برا بھلا کہہ سکتے تھے کہہ لیا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

مگنی ختم ہوئی تو شہریار سے تعلقات ختم ہوئے سو ہوئے، مریم کی خالہ کا گھر بھی چھوٹ گیا۔ راشد چونکہ ان کے پڑوس میں رہتا تھا لہذا سارا الزام ان کے سر گیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر مریم اور راشد کو ملنے کے مواقع فراہم کئے۔ دونوں بہنوں میں خوب جنگ ہوئی اور بالآخر تعلقات ختم ہو گئے۔

تاثیر علی مگنی ٹوٹ جانے کے بعد بھی کسی صورت اس شادی پر تیار نہیں تھا۔ خاندان کے بہت سے لوگ بیچ میں پڑے اور بالآخر تاثیر علی اس شرط پر شادی کرانے پر تیار ہوا کہ وہ مریم سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ مریم نے یہ شرط بھی قبول کر لی اور اس کی شادی راشد سے ہو گئی۔

مگنی ٹوٹنے ہی شہریار خاں سانپ کی طرح مل کھا کر رہ گئے۔ ایک اکیلی مریم نے ان کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اب وہ انتقام لیتے تو کس سے لیتے۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں تاثیر علی کا کوئی قصور نہیں، یہ سب مریم کا کیا دھرا تھا۔ اب تاثیر علی سے انتقام لینے کا ایک ہی منصوبہ اس کے پاس رہ گیا تھا اور وہ تھا باپ بیٹی کے درمیان فاصلے بڑھاتے رہنا۔ اس گھر میں آگ لگانے کے لیے ضروری تھا

ابھی دو دن نہیں گزرے تھے کہ وہ کسی بند کی پہاڑی سے خالہ کے گھر پہنچ گئی۔ خالہ سے باتیں کرنے کے بعد وہ راشد کے گھر گئی۔ راشد کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ کس کرب سے گزر رہا ہے۔ برسوں کا بیمار معلوم ہو رہا تھا۔ مریم کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر پہلے جیسی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آخر میری محبت تمہیں سمجھ ہی لائی۔“

”راشد! میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن میں مگنی نہیں توڑ سکتی۔ تمہیں مجھے بھلانا ہوگا۔“

”مگنی توڑنا تمہارے اختیار میں نہیں، تمہیں بھول جاؤں یہ میرے اختیار میں نہیں۔ میں آہستہ آہستہ مر رہا ہوں، تم وقفے وقفے سے آتی رہنا۔“

”میری مجبوری کو سمجھو۔“

”سمجھ رہا ہوں۔ بس اب تم جاؤ۔“

وہ کچھ اور کہتی لیکن اسی وقت اس کی والدہ کمرے میں آ گئیں۔ وہ کچھ اور باتیں کرنے لگی اور پھر اٹھ کر آ گئی۔ خالہ کے گھر آتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ گئی۔ اس کا ذہن برابر ستر میں تھا۔ وہ ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں اس کو راستے کا آئینہ کرتا تھا۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ راشد کچھ دن ماتم کرے گا پھر سنبھل جائے گا۔

وہ اسی دن شام کو اپنے گھر لوٹ آئی۔ وہ گھر تو آگئی تھی لیکن اس کا دھیان خالہ کے گھر میں تھا۔ رہ رہ کر راشد کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے وہ دن بڑی مشکل سے گزارا اور نہ چاہتے ہوئے بھی موبائل کا سہارا لے کر راشد کو مخاطب کر لیا۔ پھر دونوں طرف سے یہ سلسلہ چل نکلا۔ فون پر باتیں کرنا رنگ لایا۔ بات فون سے آگے بڑھ کر ملاقاتوں تک چلی گئی۔ دونوں کے گھر والوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان ملاقاتوں میں وہی باتیں دہرائی گئیں جو ان ملاقاتوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ مریم کو اب یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی کی مگنی تر ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک راشد کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ اس بے ہوشی سے ہوش میں وہ اس وقت آئی جب گھر میں اس کی شادی کی تاریخ طے کرنے کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد بالآخر وہ ماں کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”اماں! مجھے شرجیل سے شادی نہیں کرنی۔“

”تجھے خبر ہے تو کیا کہہ رہی ہے۔ ایک شخص تیرے لیے آٹھ مہینے سے بیٹھا ہوا ہے اور تو کہہ رہی ہے شادی



## صحیح وارث

لڑکی نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ تمام گھر والے فوراً اکٹھے ہو گئے۔ گھبرایا گھبرایا سا باپ بھی پہنچ گیا اور لرزیدہ آواز میں بولا۔

”کیا بات ہے بیٹی! آج خیریت تو ہے؟“  
”ابو جان! ایک لڑکا مجھے مسلسل دو ماہ سے تنگ کر رہا ہے۔“ لڑکی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

”میں اس کینے کو ابھی حوالات میں بند کروا کر الٹا لٹکوا کر چھترول کرواتا ہوں۔ آج کل کے لڑکوں میں تو ذرا شرم و حیا نہیں ہے۔“ باپ نے غصے سے کہہ کر جیب سے موبائل نکالنا چاہا تو بیٹی اس سے بولی۔

”نہیں ابو جان! میں اسے اس سے بھی سخت سزا دینا چاہتی ہوں۔“  
”مگر وہ کیا بیٹی؟“

”ابو جان! وہ یہ کہ آپ میری اس سے شادی کروادیں۔“ لڑکی نے چہرے کو سخت اور ہاتھوں کی مٹھیاں بچھتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی باپ نے تالی بجا کی اور مسکرا کر بولا۔ ”بیٹی! تم انتقام کے معاملے میں بالکل اپنی ماں پر گئی ہو۔“

## انتظار

ایک بار سردار جی کے گھر والے ان کی منگنی کے ارادے سے لڑکی دیکھنے گئے۔ واپس آئے تو انہوں نے سردار جی سے کہا۔

”ویسے تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔ لڑکی تم سے ایک سال بڑی ہے۔“

سردار جی نے بڑی سمجھ داری سے جواب دیا۔ ”تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟ میں ایک سال انتظار کر لوں گا۔“

مرسلہ۔ ماہا ایمان، پنجاب

کہ وہ یہاں آنا چاہتے تھے مگر سریم چاہ کر رہے تھے۔ سرال گئی، شہر یار خاں تا شیر علی کے گھر پہنچ گئے۔

”تا شیر علی! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ میں نے تو یہ چاہا تھا کہ مریم پھولوں کی سچ پر سوئے، دنیا کی ہر نعمت اسے میسر ہو۔ میرے پاس جو کچھ تھا اسی کا تو تھا۔ اس کی بد نصیبی کہ اس نے ایک اسکول ماسٹر کو پسند کیا۔ تمہاری ناک بھی کنوائی اور خود کو غریبی کی دلدل میں بھی دھنسا دیا۔ ہفتہ بھر نہیں گزرے گا کہ روٹی ہوئی نہیں آئے گی۔“

”میں نے تو کہہ دیا ہے کہ مجھ سے تعلق رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”یہ تم نے ٹھیک کیا۔ ایسی سرکش اولاد کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔ ایسی اولاد کا فائدہ ہی کیا جسے باپ کی عزت کا خیال ہی نہ ہو۔“

وہ ہر دوسرے تیسرے دن آتے اور یہی باتیں کر کے چلے جاتے۔ تا شیر علی کا یقین پختہ ہو جاتا کہ اس نے جو کیا اچھا کیا۔

شرجیل کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ طلاق دینے سے بچ گیا لیکن منگنی ٹوٹنے کو اس نے اپنی توہین سمجھ لیا۔ کچھ نہیں سکتا تھا لیکن کسی مناسب وقت کے انتظار میں اس توہین کو چھپا کر تو رکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے اس جذبے کو باپ سے بھی چھپا کر رکھا۔ اس نے بھی شہر یار خاں کی طرح تا شیر علی کے گھر جانا نہیں چھوڑا تھا تا کہ وہاں کے حالات سے باخبر رہ سکے۔

وہ جب اپنی شاندار گاڑی میں ان کے گھر پہنچتا تو تا شیر علی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ کاش! مریم اس سے شادی کر لیتی تو اس گاڑی میں وہ بیٹھی ہوتی۔ اس کے دل میں مریم کی طرف سے ایک لکیر کا اور اضافہ ہو جاتا۔ تا شیر علی یہ سوچ کر شرجیل پر فخر کرتا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے ہم سے تعلق ختم نہیں کیا۔ ایک میری بیٹی ہے کہ ہم سے تعلق ختم کر لیا لیکن اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹی۔

مریم کو ان دنوں دھوب بھی سپانی معلوم ہو رہی تھی۔ اسے کوئی ہوش نہیں تھا کہ کس سے تعلق ٹوٹا کس سے قائم رہا، ماں کے گھر جا نہیں سکتی تھی۔ خاندان کے دوسرے لوگوں نے بھی کنارہ کر لیا تھا۔ ایک خالہ تھیں جن سے تعلق برقرار تھا، کبھی فرصت ملتی تو ان کے گھر چلی جاتی تھی۔ ایک دن وہاں گئی تو شرجیل کو وہاں بیٹھے ہوئے



بہر حال مجھ کو وہ ہے، وہ دل کھول کر خرچ کر رہی تھی۔ مجھے  
کے اعصاب پر دونوں کے درمیان خوب جھگڑے ہوتے  
تھے۔ ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے راشد نے شام کے  
وقت ایک کوچنگ سینٹر میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ بے  
چارہ صبح لکھا اور رات کو گھر آتا تھا۔ ڈرائیور رکھنے کی ہمت  
نہیں تھی لہذا وہ جب چاہتی ٹیکسی پکڑتی اور شاپنگ کے لیے  
چلی جاتی۔

خالہ کے گھر شرنیل کا آنا جانا بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ  
جب آتا، خالہ مریم کو بلا لیتیں۔ آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ وہ اس  
کے ساتھ باہر بھی جانے لگی۔ اس کی قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر بھی  
کبھی اسے پچھتاوا بھی ہوتا تھا کہ اس نے شرنیل سے شادی  
کیوں نہ کر لی۔ دو دو نوکریاں کرنے کے بعد بھی راشد کی  
اتنی آمدنی نہیں کہ وہ ایسی ایک گاڑی خرید سکے۔ بڑی مشکل  
سے سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدی ہے، وہ بھی ایسی کہ آئے دن  
خراب رہتی ہے۔ فرصت کا یہ عالم کہ اس کے ساتھ کہیں سیر  
کے لیے بھی نہیں جاسکتی۔

شرنیل بڑی خوب صورتی سے اسے شیشے میں اتار رہا  
تھا۔ اکثر ماضی کی باتیں پچھڑ دیتا تھا۔ باتوں باتوں میں کہہ  
جاتا کہ کاش! تم ضد نہ کرتیں اور تمہاری شادی مجھ سے  
ہو جاتی۔ پھر خود ہی اسے تسلی دیتا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب  
وہ راشد کے ساتھ وفاداری سے رہے۔ اس کی تسلیاں کام  
تو کر رہی تھیں لیکن مریم کو اپنے کیے پر اب پچھتاوا ہو رہا  
تھا۔ کبھی کبھی تو یہ زہریلا خیال بھی اس کے دل میں آ رہا تھا  
کہ وہ راشد سے طلاق لے لے اور شرنیل سے شادی  
کر لے لیکن پھر راشد کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے  
آ جاتا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شرنیل جیسا شریف لڑکا اسے  
یہ قدم نہیں اٹھانے دے گا۔ اس نے نقش سے بچنے کے  
لیے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ شرنیل سے ملنا جلنا چھوڑ دے لیکن  
یہ ہمت بھی نہ کر سکی۔

ایک دن اس کی مشکل خود بخود آسان ہو گئی۔  
”میں لندن جا رہا ہوں۔“ شرنیل نے خبر سنائی۔  
”میرے بینک کی ایک شاخ وہاں قائم ہوئی ہے۔ میرا  
ٹرانسفر وہاں ہو گیا ہے۔“

وہ چلا گیا۔ مریم اس بھونچال سے فحش مٹی جو رہ کر  
اس کے دل میں اٹھنے لگا تھا۔ زندگی پھر اپنی ڈگر پر آ گئی۔

اس روز راشد کی چھٹی تھی۔ بہت دن سے وہ دونوں  
کہیں گھومنے نہیں گئے تھے۔ وہ مریم کو لے کر شہر کی ایک  
سیر مارکیٹ چلا گیا۔ مریم نے کہا بھی تھا کہ شہر کے حالات

دیکھا۔ وہ صرف اس کا منگتے نہیں تھا، اس کے تاپا کا بیٹا  
بھی تھا۔ خالہ نے بھی کہا تو وہ جانے کے بجائے کچھ دیر  
کے لیے وہاں بیٹھ گئی لیکن یہ احساس اسے برابر ہورہا تھا  
کہ وہ اس کا منگیترا چکا ہے۔ اگر یہ خبر راشد تک پہنچ گئی تو  
نہ جانے وہ اپنے دل میں کیا سوچے۔ شرنیل کچھ دیر  
باتیں کرنے کے بعد چلا گیا اور وہ کچھ دیر خالہ کے پاس  
بیٹھنے کے بعد اپنے گھر چلی آئی۔ وہ چاہتی تو شرنیل سے  
ہونے والی ملاقات چھپا بھی سکتی تھی لیکن اس نے سوچا  
اگر راشد کو کہیں اور سے معلوم ہوگا تو بری بات ہو جائے  
گی۔ مجھے چاہیے کہ میں خود ہی اسے بتا دوں۔

”سنیے۔“

”میں آج خالہ کے گھر گئی تھی۔“

”یہ کون سی نئی بات ہے۔“

”وہاں شرنیل بھی آیا ہوا تھا۔“

”ہاں، یہ نئی بات ہے۔“

”آپ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں اس سے ملی  
یا نہیں؟“

”میں یہ کیوں پوچھوں۔ وہ تمہارا رشتے دار ہے، مل  
بھی سکتی ہو۔“

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ ناراض ہوں گے۔“

”تم بھی پاگل ہو۔ اس میں ناراض ہونے والی کون  
سی بات ہے۔“

”بھئی وہ تمہارا رشتے دار ہے، ہمیشہ کے لیے  
اسے چھوڑ تو نہیں سکتیں۔“

”شکر ہے آپ نے برا نہیں مانا۔“ مریم نے گہری  
سانس لیتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔“

”محبوبوں کا یہی جھولا جھولتے ہوئے اسے ایک اور خوش  
خبری مل گئی۔ راشد کو ایک انگریزی فرم میں ملازمت مل گئی  
اور اتنی آمدنی ہونے لگی کہ باعزت زندگی گزارا جاسکے۔  
مریم کا یہ احساس کتری بھی دور ہو گیا کہ وہ قدرے غربت کی  
زندگی گزار رہی ہے۔ پانچ چھ ماہ گزرے تھے کہ راشد نے  
سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی۔ مریم کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ  
شرنیل کی طرح شاندار گاڑی تو نہیں تھی مگر گاڑی تو تھی۔  
گاڑی آئی تو مریم کو پر لگ گئے۔ ہر شام شاپنگ کے بہانے  
کہیں نہ کہیں نکل جاتی۔

اب وہ دل ہی دل میں شرنیل کی دولت کا موازنہ  
راشد سے کر رہی تھی لہذا یہ سوچے بغیر کہ راشد کی آمدنی



ٹھیک نہیں ہیں پھر کی دن مجلس کے لیکن ہونے والی بات تھی کہ راشد ضد پر آگیا۔

وہ ایک کپڑے کی دکان تھی۔ کئی دکانیں دیکھنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ خریدنا ہے، یہیں سے خرید لے گی۔ وہ جم کر بیٹھ گئی اور بھاؤ تاؤ کرنے لگی۔ راشد کچھ اکتا سا گیا تھا۔ وہ سگریٹ لینے کے لیے مارکیٹ سے باہر نکل آیا۔ ابھی وہ سڑک پر آکر سگریٹ کی دکان تلاش ہی کر رہا تھا کہ ایک زوردار دھماکے سے اس کے کان بہرے ہو گئے۔ وہ ذرا ہوش میں آیا تو اسے مریم کا خیال آیا۔ اس نے دیکھا کہ مارکیٹ کی طرف سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ کئی لوگ چبچ رہے تھے کہ دھماکا مارکیٹ کے اندر ہوا ہے۔ وہ بے تحاشا مارکیٹ کی طرف بھاگا لیکن اس وقت تک پولیس نے مارکیٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ کسی نے اسے اندر نہیں جانے دیا۔ وہ چیخ رہا کہ اس کی بیوی اندر ہے لیکن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ امدادی ٹیمیں پہنچ گئی تھیں۔ زخمیوں کو باہر نکالا جا رہا تھا۔ وہ ایک ایک زخمی کو جھانک رہا تھا کہ کہیں اس کی مریم اسے نظر آجائے۔ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے گھر پر فون کیا۔ وہاں سے بھی معلوم ہوا کہ وہ گھر نہیں پہنچی ہے۔ اسے معلوم ہوا کہ زخمیوں کو قریبی اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شکر ہے گاڑی سلامت گھڑی تھی۔ اس نے گاڑی بھاگی اور اسپتال پہنچ گیا۔ یہاں بھی ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ کسی کو اندر نہیں جانے دیا جا رہا تھا البتہ اسے یہ ڈھارس بھی کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کی طرح اور بہت سے لوگ تھے جو اپنے پیاروں کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ کئی گھنٹوں کی پریشانی کے بعد یہ اعلان ہوا کہ زخمیوں کی فہرست آویزاں کی جا رہی ہے۔

فہرست لگا دی گئی۔ وہ دھکم پیل کرتا ہوا فہرست کے قریب پہنچا۔ دو چار ناموں کے بعد ہی اس کی نظر مریم کے نام پر پڑ گئی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ مریم زندہ ہے، صرف زخمی ہوئی ہے۔

فہرست کے آخر میں لکھا تھا کہ زخمیوں کے لواحقین کو آج کسی صورت نہیں ملنے دیا جائے گا۔ وہ کل آئیں۔ اگر ملاقات ممکن ہوئی تو کرا دی جائے گی۔ اسے ایک دن کے لیے اور سولی پر لٹکنا ہوگا۔

☆☆☆

مریم کا چہرہ اور ایک بازو ٹخوں سے جکڑا ہوا تھا۔

راشد اسے دیکھ کر دل میں "وہ بہن" پتھر میں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا چہرہ بکس گیا ہے۔

مریم کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے آہستہ سے آواز دی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"مریم! کیا ہوا ہے ہمیں..... کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹروں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش آنے پر ڈاکٹروں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ میرے بازو اور چہرے پر چوٹیں آئی ہیں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"ہاں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میں ابھی جا کر ڈاکٹر سے معلوم کرتا ہوں۔"

ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ مریم کا آدھا چہرہ اور بازو بری طرح جکس گئے ہیں۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا علاج ہو سکے۔

یہ سن کر راشد کو پریشان ہونا ہی تھا۔ معاملہ چہرے کا تھا۔ اگر چہرے پر کچھ نشان رہ گئے تو بہت بُرا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ امید بھی تھی کہ حکومت ایسے زخمیوں کے لیے کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھائے گی۔ اس نے مریم سے بھی یہی کہا تھا کہ معمولی سے زخم ہیں، بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔

مریم کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ زخم کس نوعیت کے ہیں۔ وہ اسپتال میں داخل تھی اور علاج جاری تھا۔ راشد بابتندی سے اسے دیکھنے آ رہا تھا۔ مریم پُر امید ضرور تھی لیکن یہ بھی سوچتی تھی کہ یہ کیسے زخم ہیں جو بھرنے ہی میں نہیں آرہے ہیں۔

تقریباً ایک ماہ بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا لیکن ڈریسنگ کے لیے ہر دوسرے دن اسپتال جانا پڑتا تھا۔ ایک مہینہ اور گزر گیا۔ ڈاکٹروں نے یہ خوش خبری سنائی کہ زخم بھر گئے ہیں۔

دو مہینے بعد اس نے اپنا چہرہ دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کا آدھا چہرہ سبک ہو گیا تھا۔ بازو تو کپڑوں کے نیچے چھپا رہا لیکن چہرہ تو سب کو نظر آ رہا تھا۔ عورت کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل نہ رہے۔

راشد نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور غیر ارادی طور پر منہ پھیر لیا۔

"راشد! میں بد شکل ہو گئی ہوں۔ تم نے اسی لیے منہ پھیر لیا۔"

"نہیں مریم! ایسی بات نہیں۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔"



تم مجھے آج بھی اتنی ہی مریں ہو۔“

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اسے دھچکا لگا ہے۔ اس وقت بھی وہ اس سے باتیں کر رہا تھا تو اس کا منہ کسی اور طرف تھا۔

اس کے بعد بھی وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ راشد اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ گھر میں بھی اس سے دور دور رہے۔ سونے کے لیے بیڈروم میں آتا تھا تو پہلے لائٹ آف کرتا تھا، اس کے بعد بستر پر قدم رکھتا تھا۔ مریم یہ سب کچھ دیکھ ضرور رہی تھی لیکن راشد پر غصہ نہیں تھا۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ بیوی کا چہرہ ہی مسخ ہو جائے تو کون اس کی طرف دیکھے گا۔ یہ بھی قیمت تھا کہ وہ اس سے بیزار نہیں ہوا تھا لیکن اس کی یہ غلط فہمی بھی بہت جلد دور ہو گئی، وہ آہستہ آہستہ چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر دو باتیں کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہے۔ ساس کا رویہ بھی ایسا ہو گیا تھا کہ اسے منہ نہیں لگا رہی تھی۔ وہ گھر میں اکیلی پڑی رہتی تھی۔ راشد بھی اس سے بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

کوئی ادارہ اتنی بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مریم ایسی مایوس ہوئی کہ اس نے راستہ سے صاف کہہ دیا۔

”میں بد صورت لگوں یا خوب صورت۔ اب میرے سامنے میرے علاج کا نام مت لینا۔“

”کوشش تو کرتے رہنا چاہیے۔“

”کوشش تو اس وقت کی جاتی ہے جب جیب میں پیسے ہوں۔ فقیروں کی آنکھیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ بادشاہت کے خواب دیکھیں۔“

”تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔“

”تمہارا نہیں، تمہاری غربت کا مذاق اڑا رہی ہوں۔“

”تم بہت زیادہ تلخ نہیں ہوتی جا رہی ہو؟“

”تو اور کیا کروں۔ میں تو اس وقت کو رو رہی ہوں جب میں نے تم سے شادی کی تھی۔“

”یہ میری محبت تھی جس نے تمہیں مجبور کر دیا تھا۔“

”یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ اب تمہاری محبت کہاں چلی گئی؟“

”میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”ایسے بھیا تک چہرے کے باوجود بھی؟“

”یہ چہرہ تم نے تو نہیں بگاڑا۔“

”لگتا تو یہی ہے ورنہ تم مجھ سے اس قدر بیزار نہ ہو گئے ہوتے۔“

”میں بیزار نہیں ہوا ہوں۔“

”اگر بیزار نہ ہوتے تو میرا حسن مجھے لوٹانے کے لیے آسمان سے تارے بھی تو ڈالتے۔“

”تمہاری بد صورتی بھی میرے لیے خوب صورتی ہے۔“

”جن کے پاس خرچ کرنے کو پیسے نہیں ہوتے، وہ صرف باتیں ہی بنا سکتے ہیں۔“

ایسی لڑائیاں روز ہوا کرتی تھیں۔ راشد اپنی کمزوری سمجھ رہا تھا۔ وہ کچھ اور تو کر نہیں سکتا تھا اس نے مسلسل چپ سا دھلی۔ یہ مریم کے لیے اور بھی بیزار کن صورت حال تھی۔ اس کی اس بد بھیبی میں ایک خوشگوار پہلو یہ نکل آیا تھا کہ اس کے والدین کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے تھے۔ حادثے کا سننے ہی اس کی ماں اس سے ملنے چلی آئی تھی۔ باپ کی محبت نے بھی جوش مارا تھا۔ انہوں نے اس کا قصور معاف کر دیا تھا۔ وہ بھی بھی ماں سے ملنے چلی جاتی تھی۔ ایک دن گئی تو شرجیل کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ شرجیل کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی، وہ اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”مریم! یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا۔ جی نے بتایا تو

یہ بیزاری اس وقت خوشگوار ی میں تبدیل ہو گئی جب راشد اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد یہ خوش خبری تو سنا دی کہ پلاسٹک سرجری کے بعد بد صورتی میں کچھ کمی آ سکتی ہے لیکن اس پر آنے والے خرچ کا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ راشد اگر تھوڑا بہت قرض بھی لے لیتا تو بھی علاج ممکن نہیں تھا۔ مریم کو ایک مرتبہ پھر راشد پر غصہ آنے لگا۔ اس شخص کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ میرا علاج کرا سکے۔ اگر میں نے شرجیل سے شادی کر لی ہوتی تو میرا چہرہ کب کا ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ میرے بڑے ٹھیک کہتے تھے کہ خوب صورتی اور قابلیت سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز دولت ہوتی ہے۔ اس وقت میں نے کسی کا کہنا نہیں مانا۔ اب بیٹھ کر رونے سے کیا فائدہ۔

راشد اس کی طرف سے بے فکر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک فلاحی ادارے سے رجوع کیا۔ اس ادارے نے انہیں ایک اسپیشلسٹ کے پاس بھیجا اور تمام اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری بھی لی۔ کچھ دنوں علاج ہوتا بھی رہا لیکن خاطر خواہ فائدہ نہ ہونے پر ڈاکٹر نے فیصلہ دے دیا کہ ان کا علاج پاکستان میں ممکن نہیں۔ ہاں امریکا میں علاج ہو سکتا ہے۔



”مجھے چھوڑ دو۔ یہ تار تم لہان سے کب لے گئے؟“

”بات بدلنے کی کوشش مت کرو۔ خدا کی پناہ، ایسا

بھیا تک چہرہ ہو گیا ہے تمہارا۔“

”تم بھی منہ پھیر لو جس طرح راشد منہ پھیر لیتا ہے۔“

”اس میں منہ پھیرنے کی کون سی بات ہے۔ تمہارا

حسن تمہیں اب بھی واپس مل سکتا ہے۔ تم راشد سے کبھی

کیوں نہیں۔“

”میرے علاج کے لیے جتنی رقم درکار ہے، وہ ان

کے پاس کہاں ہے۔“

”تمہارا علاج میں کراؤں گا۔“

”تم پر میرا کیا حق ہے؟“

”کیا تمہیں خوب صورت دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوگی؟

کیا میں اپنی خوشی کے لیے تھوڑی سی رقم خرچ نہیں کر سکتا؟“

”یہ جس کا کام ہے، اسی کو کرنے دیں۔“

”تم نہ سمجھو مگر تم میری محبت ہو۔ میں تمہیں خوش دیکھنا

چاہوں گا۔“

”میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہوں۔“

”تم اسی کے ساتھ رہو مگر میں تمہارا علاج ضرور

کراؤں گا۔“

”اس کے لیے مجھے راشد کی اجازت کی ضرورت

ہوگی۔“

”اجازت بھی لے لینا فی الحال تم میرے ساتھ چلو۔

ایک اسپیشلسٹ میرا دوست ہے، اس کے پاس چلتے ہیں۔

دیکھو وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔“

وہ زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ڈاکٹر کے پاس

جانے سے پہلے وہ ایک شاندار ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھے۔

مریم دل ہی دل میں خود پر فخر کر رہی تھی کہ وہ کتنی شاندار جگہ

بیٹھی ہے۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ راشد تو اپنے ساتھ لے

جانا گوارا نہیں کرتا، شرجیل اسے نہ صرف اپنے ساتھ لایا ہے

بلکہ اتنے شاندار ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھا ہوا بھی ہے۔

اس کے چہرے پر شرمندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مریم

دل ہی دل میں غدا مت محسوس کر رہی تھی کہ اس نے شرجیل

کی محبت کی قدر نہیں کی۔ میں نے اس سے مگنی توڑ لی اور وہ

میرے ساتھ یہ ملوک کر رہا ہے۔ اس کے دل میں میرے

لیے ذرا بھی نفرت نہیں۔

وہ جب تک اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا،

اس کے ہونٹوں پر اس کی تعریف کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”میں نے تمہاری قدر نہیں کی اور ایک تم ہو کہ تمہاری

زبان پر لگے تک نہیں۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے۔ غلطیاں انسانوں ہی سے

ہوتی ہیں۔“

”غلطیاں معاف کرنے والے بھی تو انسان ہی

ہوتے ہیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔“ مریم نے فرط

جذبات سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ وہ

کسی اور کی امانت ہے۔ اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔

”ہم تو ڈاکٹر کے پاس جا رہے تھے۔“

”تمہارے ساتھ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں بیٹھے

ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ کچھ پرانی یادیں تازہ کرنے

کے لیے تمہیں یہاں لے آیا۔ یاد ہے جب ہماری مگنی ہوئی

تھی تو سب سے پہلے میں تمہیں یہیں لے کر آیا تھا؟“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

”چلو چلتے ہیں۔ کہیں ڈاکٹر اٹھ نہ جائے۔“

ایک مرتبہ پھر وہ اس کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر

بیٹھی۔ وہ ایک شاندار بلڈنگ تھی جس کی چوٹی منزل پر

کلینک تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کلینک اتنے شاندار

بھی ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نے طویل معائنے کے بعد اسے بتایا کہ دو تین

آپریشنز کے بعد چہرے کی سسٹی ہوئی کھال اپنی جگہ آجائے

گی لیکن کچھ نہ کچھ کسر رہ جائے گی۔ اگر آپ قدرتی شادابی

دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں امریکا لے جانا ہوگا۔

علاج امریکا میں ہونا یا پاکستان میں، راشد کے علم

میں لائے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جب ماں کے گھر سے اپنے

گھر گئی تو اس نے راشد سے ذکر پھیرا۔ پہلے تو وہ یہ سنتے ہی

بھڑک اٹھا کہ اس کا علاج شرجیل کرائے گا لیکن مریم کے

سمجھانے بھانے پر وہ یہ کہہ کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

”میری بلا سے تم کسی کا بھی احسان اٹھاؤ۔“

”یہ احسان ضرور ہے لیکن شرجیل میرا کزن ہے، کوئی

غیر تو نہیں ہے۔“

”وہ تمہارا منگیتر بھی تو رہ چکا ہے۔“

”آپ نے یہ کیسی ہلکی بات کی ہے۔ اگر آپ کو مجھ

پر شک ہے تو آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

”مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔ جب تمہیں جانا ہوا

کرے تو اپنی ماں کے گھر چلی جایا کرو۔ وہیں شرجیل کو بھی



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





دوسرے دن ایک ٹیسٹ کرانا تھا لہذا وہ اس دن بھی اس کے ساتھ گئی۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک اچھے ہوٹل میں ایک ساتھ کھایا۔

چار ٹیسٹ تھے، وہ مسلسل چار دن تک اس کے ساتھ جاتی رہی۔ پانچویں دن ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے چند دوائیں لکھ دیں اور کہہ دیا کہ ایک ماہ بعد آپریشن ہوگا۔ اسے اصولاً ایک ماہ بعد شرجیل سے ملنا تھا لیکن اب وہ دو کشتیوں میں سوار ہو چکی تھی۔ اس یقین تک پہنچ چکی تھی کہ اس نے راشد سے شادی کر کے غلطی کی تھی۔

علاج کا بہانہ اسے مل ہی چکا تھا۔ وہ راشد سے ڈاکٹر کے پاس جانے کا بہانہ کر کے شرجیل کے ساتھ سیر سپاٹے کرتی رہی۔ پہلے وہ اس کی دولت کی قائل تھی، اب اس کی شرافت کی بھی قائل ہو گئی۔ شرجیل نے اس دوران کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اس کی شرافت کو داغ دار کرتی۔ ان سب باتوں نے مل کر راشد کو اس کی نظروں سے گرا دیا۔

اپنے آپ سے لڑتے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ اب اسے آپریشن کرانا تھا تا کہ مکمل علاج کے لیے باہر جاسکے لیکن شرجیل نے اس آپریشن کی مخالفت کر دی۔ ”کیا خبر اس آپریشن کے بعد مزید پیچیدگیاں بڑھ جائیں۔ جب امریکا جانا ہی ہے تو یہ آپریشن بھی وہیں کرالیں گے۔“ وہ تیار ہو گئی لیکن راشد نے مخالفت کر دی۔

”مریم! بس بہت ہو گیا۔ تم مجھے اسی چہرے کے ساتھ قبول ہو۔ میں تمہیں شرجیل کے ساتھ امریکا نہیں جانے دوں گا۔“

”بہت خوب! بڑی جلدی غیرت جاگ گئی۔ خود تو اس قائل ہو نہیں، کسی اور کے ساتھ بھی نہیں جانے دو گے۔“

”میں نے کہہ دیا کہ تم مجھے اسی چہرے کے ساتھ قبول ہو۔“

”مگر مجھے یہ چہرہ پسند نہیں۔ مجھے حسین بننا ہے۔ تم نے اگر اجازت نہیں دی تو میں تمہاری اجازت کے بغیر چلی جاؤں گی۔“

”اچھی طرح سوچ لو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔“

اس نے اس مخالفت کا ذکر شرجیل سے کیا۔ شرجیل نے کسی خوشی کے بجائے حیرت کا اظہار کیا۔

”عجیب آدمی ہے۔ خود اتنی استطاعت نہیں رکھتا اور

راشد کے تصور بتا رہے تھے کہ وہ شرجیل کا احسان اٹھانا نہیں چاہتا لیکن مریم اس کی ناراضگی کا خیال کر کے اپنے علاج سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتی تھی۔ دوسرے دن شرجیل سے فون پر بات ہوئی۔ مریم اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔ وہاں سے شرجیل نے اسے ”یک“ کر لیا۔

وہ پھر اسی کلینک میں بیٹھی تھی جہاں ایک دن پہلے آئی تھی۔

”ان کے کچھ ٹیسٹ ہوں گے۔ کچھ دوائیں تجویز کر دوں گا۔ پھر ایک ماہ بعد ایک آپریشن ہوگا۔“

”آپ تو کہہ رہے تھے انہیں باہر جانا ہوگا۔“

”جی ہاں، اس آپریشن کے بعد آپ انہیں باہر لے جاسکیں گے۔“

ڈاکٹر نے ٹیسٹ لکھ کر دے دیے اور ایک ہفتے بعد بلا لیا۔

شرجیل اسے لے کر کلینک سے نکلا اور ایک مقامی ہوٹل پہنچ گیا۔ ایسے شاندار ہوٹل میں وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

”یہ تم مجھے یہاں کیوں لے آئے؟ ہمیں تو لیبارٹری جانا تھا۔“

”بھئی خوشگوار ماحول صحت پر بہت اچھا اثر ڈالتا ہے۔ لیبارٹری تو کل بھی جایا جاسکتا ہے۔“

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر علاج کے معاملے کو طویل دینا چاہتا ہے تا کہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ ایک دن پہلے کے مقابلے میں زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا۔ اس نے باتوں کے دوران کئی مرتبہ مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مریم بھی ایک دن پہلے کی طرح کوئی اعتراض نہ کر گئی۔

”تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“

”جس لڑکی کو میں چاہتا تھا اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔“

”دنیا میں ایک ہی لڑکی تو نہیں ہوگی۔“

”میرے لیے تو ایک ہی تھی۔“

”شرجیل! خدا کے واسطے مجھے مزید احساس جرم میں مبتلا نہ کرو۔ میں نے تم سے منگنی توڑ کر تمہارا دل توڑا تھا۔ مجھے اپنے جرم کا احساس ہو گیا ہے۔ اب میں تم سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہی ہوں کہ مجھ بے وفا کی خاطر اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ شادی کر لو۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ احساس گناہ جاتا رہے گا۔ خدا کے واسطے شرجیل۔“

”جس لڑکی کو میں چاہتا تھا اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔“



میرے ساتھ بھیجے پر تیار نہیں۔ پھر تو ایک ہی صورت ہے کہ یا تو اسی چہرے کے ساتھ زندہ رہو یا پھر اس سے طلاق لے کر میرے ساتھ چلو۔“

”شرجیل! تم نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ دی۔“  
”میں تو یہ بات اس دن سے کہنے کو بے چہن تھا جس دن سے تمہاری شادی راشد سے ہوئی تھی، آج مجھے موقع مل گیا۔“

”اگر میں راشد سے طلاق لے لوں تو کون ہے جو مجھے سہارا دے گا؟“

”تم راشد سے طلاق لے لو، میں تمہارا ہاتھ تھامنے کو تیار ہوں۔ پہلے میں تمہارا علاج کراؤں گا پھر تم سے شادی کر لوں گا۔“

مریم نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر وہ مجھے حسین بنانے کے صلے میں مجھے مانگ رہا ہے تو یہ اس کا خلوص ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔

ایک دن اس نے جان بوجھ کر راشد سے جھگڑا کیا۔ اس پر آوارگی کا الزام لگایا۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ وہ اپنے گھر چلی گئی۔ راشد کے کسی لڑکی سے تعلقات کو بہانہ کر کے مطالبہ رکھ دیا کہ وہ راشد سے طلاق دلوانے میں اس کی مدد کریں۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ایک دن وہ تھا جب وہ منگنی توڑنے کے لیے گھر والوں کو مجبور کر رہی تھی، آج اس شخص سے طلاق لینے کا مطالبہ کر رہی تھی جس کے لیے منگنی توڑی تھی۔

”میری بچی! راشد کو موقع تو دے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس سے کہو مجھے طلاق دے ورنہ میں عدالت جاؤں گی۔“

”پاکل مت بن۔ وہ مرد ہے، اسے ہزار لڑکیاں مل جائیں گی۔ تجھے اس چہرے کے ساتھ کون قبول کرے گا؟“  
”میں اکیلے زندگی گزار لوں گی مگر راشد کے ساتھ نہیں رہوں گی۔“

خاندان کے بہت سے لوگوں کو درمیان میں ڈالا گیا لیکن اس کی ضد کے آگے سب نے ہار مان لی۔ راشد کو بھی سب نے سمجھایا کہ جب وہ رہنمائی نہیں چاہتی تو اسے رکھنے کا فائدہ کیا۔ راشد نے اسے طلاق دے دی۔

طلاق کے بعد وہ غم زدہ ہونے کے بجائے ایسی خوش تھی جیسے دو جہاں کی نعمتیں اسے مل گئی ہوں۔ اس نے فوراً یہ خبر سرنجیل تک پہنچائی۔ ”میں نے وہ کائنات نکال دیا ہے جو ہمارے باہر جانے میں حائل تھا۔“

”مریم! تم نے یہ ایسی خبر سنائی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ جب سے تمہاری شادی ہوئی تھی، میں یہ خبر سننے کے لیے دعا میں کر رہا تھا۔ آج مجھے سکون آ گیا۔“

”اب ہم کب باہر جا رہے ہیں؟“  
”بس تمہاری عدت کے دن پورے ہوتے ہی۔“

”کیسی دقیقہ نوسی باتیں کر رہے ہو۔ عدت کی مدت پاکستان سے باہر بھی پوری کی جاسکتی ہے۔“

”پاسپورٹ وغیرہ بننے اور ویزا کے مراحل میں بھی کچھ وقت لگ ہی جائے گا۔ اسی دوران عدت بھی پوری ہو جائے گی۔“

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ عدت کے دن پورے ہونے کے بعد وہ کس سے شادی کرے گی اور کیا منصوبے تیار ہو رہے ہیں۔

ایک دن سرنجیل نے اس سے کہا کہ وہ کسی کام سے لندن جا رہا ہے۔ جیسے ہی اس کی عدت پوری ہوگی، وہ واپس آجائے گا اور اسے لے کر امریکا چلا جائے گا۔ اس سے شادی کرے گا اور علاج کرائے گا۔

مریم نے امریکا جانے کے خواب دیکھتے ہوئے عدت کے دن کاٹ دیے۔ چار مہینے ہو گئے تھے۔ سرنجیل لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے گھر والوں سے معلوم ہوا، کسی وجہ سے اسے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ بس ایک مہینے بعد آجائے گا۔

چھ ماہ ہو چکے تھے کہ سرنجیل کا فون اس کے پاس آیا۔ سرنجیل نے اسے ایک ہوٹل میں بلایا تھا۔ وہ حیران تھی کہ خود ملنے کیوں نہیں آیا، ہوٹل میں کیوں بلایا ہے۔ اس کی یہ حیرت اس وقت دور ہو گئی جب اس نے سرنجیل کے ساتھ ایک لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

سرنجیل نے تعارف کرایا۔ ”یہ میری بیوی نگار ہیں اور نگار یہ میری سابق منگیتر ہیں جنہوں نے حال ہی میں اپنے شوہر سے طلاق لی ہے اور مجھ سے شادی کی خواہش مند تھیں کہ تم درمیان میں آ گئیں۔ ہماری شادی میں اتنے پیسے خرچ ہو گئے کہ ان کے علاج کے لیے پیسے ہی نہیں بچے۔ ویسے بھی میرا انتقام تو پورا ہو ہی گیا۔ منگنی توڑ کر انہوں نے میری توہین کی تھی، میں نے بدلہ لے لیا۔“



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





# سرکاری درباری

## ملک صندریات

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے... پڑھا ہے، سنا ہے اور... زیر نظر کرانی میں بھی سو فیصد درست ثابت ہو رہا ہے۔ اگر کسی چیز پر دل آجائے تو وہ اُسے حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے... یہ اور بات کہ وہ ہاتھوں کی سمت سیدھی اور نہ ہی پیروں تلے بچھے دستور کی کوئی منزل ہوتی ہے۔ ایسے میں کچھ حاصل ہو یا نہ ہو مگر تباہی اور رسوائی دل و جان سے فدا ہو جاتی ہے۔ وہ جو اپنی طاقت کے زعم میں بسنے والی رعایا کو چٹکیوں میں مسل دیتے تھے بالآخر قدرت کے زندان میں یوں قید ہوئے کہ تمام اونچی اڑائیں ذلت کی پستیوں میں کہیں دفن ہو گئیں کیونکہ... جہاں منک صندریات جیسے پولیس افسران اپنی ذیوٹی کو ایمانداری اور حب الوطنی کے جذبات سے ادا کریں وہاں انصاف ملنا ہرگز دشوار نہیں ہو سکتا۔

انکان کے تم رہا ہے والے ایک سرکاری درباری

انکان کے تم رہا ہے والے ایک سرکاری درباری

فضائیں موجود حدت کے باعث یونہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سورج ابھی سر پر ہی ٹھہرا ہوا ہے۔

جائے وقوعہ چودھری مبارک علی کا ڈیرا تھا۔ چودھری مبارک کا تعلق موضع شہزاد کوٹ سے تھا اور مذکورہ ڈیرا، گاؤں کے جنوب میں تاحہ نظر پھیلے ہوئے کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی فرید آباد کے تھانے میں تھی جو موضع شہزاد کوٹ سے نزدیک ہی واقع تھا۔ ہم ایک تانگے میں بیٹھ کر پہلے موضع شہزاد کوٹ پہنچے اور پھر چودھری مبارک کے ساتھ اس کے ڈیرے کا رخ کیا تھا۔

مذکورہ ڈیرا تین کمروں اور ایک کشادہ صحن پر مشتمل

اطلاع اتنی سنسنی خیز تھی کہ میں نے آنا قانا تیاری کی اور ایک کاشمیل کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ آج کی جدید دنیا میں اسے کرائم سین کا نام دیا جاتا ہے لیکن ہمارے زمانے میں یہ جائے وقوعہ یا جائے واردات یا مختصراً موقع کہلاتا تھا۔ وہ سادہ دور تھا اور ہماری تفتیش کا انداز بھی سادگی اور پرکاری لیے ہوتا تھا۔ آج کل تو جدید ٹیکنالوجی اور ماڈرن طور طریقوں کے طفیل تفتیش کا رنگ ڈھنگ ہی بدل کر رہ گیا ہے تاہم تھانوں کے ٹرائل روم میں اب بھی وہی ”روایتی جھلک“ نظر آتی ہے۔

وہ دہرے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات تھی۔ اس وقت شام کے پانچ کا وقت ہوگا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی لیکن







تھا۔ ایک کمرے میں ایک بستر اور ایک صوفہ تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف زرعی آلات اور کچھ ناکارہ سامان بھرا ہوا تھا جبکہ تیسرے کمرے کی ترتیب سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رہائش کے مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کمرے میں ایک چارپائی کے علاوہ ایک میز اور دو کرسیاں بھی موجود تھیں۔ دونوں متقو لین کی لاشیں مذکورہ چارپائی پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کو اجلی سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا جو ایک طرف سے خون آلود تھی۔ میں جیسے ہی چارپائی کی جانب بڑھا، چودھری مبارک نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

”ایک منٹ ملک صاحب.....“

میں رک گیا اور سوالیہ نظر سے چودھری کو دیکھ لگا۔ ڈیرے پر نصف درجن کے قریب افراد جمع ہو گئے تھے اور لوگوں کی آمد کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس سنسنی خیز واقعے نے گاؤں میں کھلبلی مچا دی تھی۔ میری سوالیہ نظر کے جواب میں چودھری نے وہاں موجود افراد کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ فوراً سے بیشتر اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور پلک بھینکتے میں وہ کرا خالی ہو گیا۔ صرف میں، چودھری مبارک اور میرے ساتھ آنے والا کاشمیل اس کمرے میں باقی رہ گئے۔

چودھری نے کاشمیل جاوید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گہری تنبیہ کی سے کہا۔ ”کا کا! تھوڑی دیر کے لیے تم بھی باہر چلے جاؤ۔“

جاوید کی عمر بیس بائیس سال تھی لیکن وہ اپنی صحت، قد کاٹھ اور چہرے کی مصوویت کے باعث پندرہ سولہ سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا جیسی چودھری نے اسے کا کا با معنی بچہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

جاوید نے چودھری کے حکم کی تعمیل سے پہلے حذبذب انداز میں میری جانب دیکھا تو میں نے گردن کے اشارے سے اسے باہر جانے کی ہدایت کر دی۔ وہ میرے اشارے کی تائید میں خاموشی کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکل گیا۔

چودھری نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر میری جانب مڑتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! ان دونوں لاشوں کی حالت ایسی نہیں ہے کہ سرعام تماشا لگایا جائے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چارپائی پر چادر کے نیچے ڈھکی لاشوں کی جانب بڑھ گیا۔ چودھری بھی میرے ساتھ تھا اور اس نے جب چادر کو ایک کونے سے پکڑ کر کھینچا تو

میری نگاہ ایک شرمناک منظر سے ٹکرائی۔ انتظار نہ تھا کہ وہ ایک مرد اور ایک عورت کی لاشیں تھیں جو ایک مخصوص انداز میں ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ ان کے جسم لباس سے بے نیاز تھے۔ کہتے ہیں، عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے تاہم فطری لباس میں وہ دونوں اپنی کہانی بے زبان خاموشی خود ہی سنارے تھے۔

”میں نے اسی لیے لوگوں کو کمرے سے باہر نکالا ہے۔“ چودھری کی دھیمی اور یو جھل آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”کون ہیں یہ دونوں؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

چودھری نے جواب دیا۔ ”نواز تو میرا ملازم ہے۔“ اس کا اشارہ برہنہ مرد کی سمت تھا۔ ”یہ ادھر ڈیرے پر ہی ہوتا تھا اور یہ بیٹو ہے..... پروین عرف بیٹو حنیف کی بیوی ہے۔“ ”آپ کے تعارف سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی آپ ہی بتائیں گے کہ ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“

”آپ خود ہی اندازہ لگالیں.....“ چودھری نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”ظاہر ہے، یہ کوئی جائز تعلق یا رشتہ تو ہو نہیں سکتا۔“ میں نے کبیر انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چودھری نے لوگوں کو کمرے سے باہر بھیج کر واقعہ عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ متقو لین کی حالت ایسی نہیں تھی کہ انہیں عام نمائش کے لیے پیش کیا جاتا۔ اس وقت میرا پورا بدن پسینا اگل رہا تھا۔ یہ موسم کی شدت نہیں بلکہ حالات کی حدت کا نتیجہ تھا۔ موقع کی کارروائی بہت ضروری تھی لہذا میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں نے پندرہ بیس منٹ کے جائزے کے بعد اس حقیقت کو پالیا کہ بیٹو اور نواز کو بے خبری میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق جب وہ دونوں اپنی غیر نصابی سرگرمی میں مشغول تھے تو کسی نے بھرا ہوا ریلوے ان کے جسموں میں خالی کر دیا تھا۔ دونوں کے جسموں کے بالائی حصے خون میں تر رہے تھے۔ یہ دہرے قتل کی سنگین واردات، بادی انکسٹر میں شدید اتفاقی کارروائی کا نتیجہ نظر آتی تھی۔

بیٹو اور نواز کی خون آلود لاشوں کو دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ اب چاہے وہ دونوں زندگی سے بہت دور



جائے تھے مگر کچھ عرصہ پہلے وہ بھی جیتے جاگتے اسان ہوا کرتے تھے۔ چوہو کے چہرے کے نقوش اسے ایک غیر معمولی حسین لڑکی ظاہر کرتے تھے۔ نواز بھی وجہہ و تھکیل دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ان دونوں کی لاشوں کو دوبارہ چادر سے ڈھانپ دیا۔ پھر چودھری مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے گھبریر لہجے میں سوال کیا۔

”یہ کس بد بخت کا کارنامہ ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو آپ کو پتا چلانا ہے ملک صاحب.....!“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا ذہن کیا کہتا ہے چودھری صاحب؟“

”میرا دھیان تو حنیف کی طرف جارہا ہے۔“

”یعنی بیٹو کے شوہر کی جانب؟“

”ایسی غیرت مندانہ کارروائی کوئی شوہر ہی کر سکتا ہے۔“ وہ اپنی ایک ٹانگ کو دباتے ہوئے بولا۔

”کیا آپ نے اس سلسلے میں حنیف سے کوئی پوچھ

تاچھ کی ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

وہ دوبارہ اپنی ٹانگ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں

نے اس کی طرف ایک بندہ دوڑا دیا تھا لیکن مجھے بتایا گیا

ہے کہ حنیف اس وقت گھر کے اندر موجود نہیں۔“

”وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔“ میں نے پرسوج انداز

میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، اسے ابھی تک اس واقعے کی

اطلاع نہیں ملی۔“

”اگر میرا اندازہ درست ہے تو.....“ چودھری ایک

ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر عین ممکن ہے،

حنیف خود ہی ادھر ادھر ہو گیا ہو۔“

چودھری کی معنی خیزی نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا

کہ وہ حنیف ہی کو بیٹو اور نواز کا قاتل سمجھ رہا ہے۔ میں نے

براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”چودھری صاحب! آپ دہرے قل کی اس

واردات کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“ وہ ایک بار پھر اپنی ٹانگ کو

دباتے ہوئے بولا۔

”کیا آپ کی ٹانگ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟“ میں

پوچھے بناندرہ سا۔

”ہاں.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور

بتانے لگا۔ ”کچھ عرصہ پہلے یہ مسئلہ شروع ہوا ہے۔ حکیم

اسے عرق النسا کہتا ہے۔“

”اوہ اچھا.....“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر

اسے واپس موضوع کی جانب لائے ہوئے اضافہ کیا۔

”جی ہاں۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”میں تو ادھر اپنی

حویلی میں آرام کر رہا تھا۔ وحید گھبرا یا ہوا میرے پاس آیا

اور بتایا کہ ڈیرے پر کسی نے بیٹو اور نواز کو قتل کر دیا ہے۔

میں فوراً حویلی سے ڈیرے پر پہنچا اور ان دونوں کی خون

میں لت پت پڑی لاشوں کو دیکھ کر ہلک جھپکتے میں سمجھ گیا کہ

اپنی موت سے پہلے وہ کس کھیل میں مصروف تھے۔ میں

نے وحید ہی کو حکم دیا کہ وہ ان کی لاشوں کو چادر سے

ڈھانپ دے.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر

ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد اپنی بات کو مکمل

کرتے ہوئے بولا۔

”اس کے بعد ہی میں نے اپنے ایک بندے کو حنیف

کی طرف دوڑایا تھا۔ جب وہ گھر میں تھیں ملا اور کھیتوں میں

بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تو میں حویلی آگیا اور ایک بندے کو

آپ کے پاس اس واقعے کی اطلاع دینے بھیج دیا تاکہ آپ

موقع پر پہنچ کر قانونی کارروائی کر سکیں۔“

”کیا نواز کی بیوی کو اس واقعے کی خبر ہے؟“

چودھری کے خاموش ہونے پر میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”نواز کی گھر والی کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ اس نے اپنے

گھر میں رونا پیٹنا ڈال رکھا ہے۔ وہ ایک مرتبہ ڈیرے کا

چکر بھی لگا کر گئی ہے لیکن میری ہدایت کے مطابق وحید نے

اسے کمرے کے اندر گھسنے نہیں دیا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس

نے مجھ سے سوال کیا۔

”ملک صاحب! آپ ہی بتائیں، ایک بیوی کا اپنے

شوہر کو ایسی حالت میں دیکھنا مناسب ہے کیا؟“

میں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”قطعی

مناسب نہیں۔“

”مریم، وحید سے بحث و تکرار کرتی رہی۔“ چودھری

نے مزید بتایا۔ ”لیکن وحید میری ہدایت کے مطابق ایک

ہی بات پر اڑا رہا کہ جب تک پولیس اپنی کارروائی مکمل

نہیں کر لیتی، کسی بھی بندے کو لاشوں تک جانے نہیں دیا

جاسکتا۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے سراہنے

والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ کا وہ بندہ، میرا

مطلب ہے آپ کا وہ ملازم وحید اس وقت ڈیرے پر

موجود ہے؟“







”کتنی عجیب بات ہے۔ چاہا آج کل کی اولاد ہے۔ جو ان لوگوں کے جان بھی لے لی لیکن انہی کوئی کام کی بات سانس نہ آسکی جو اس دہرے کی واردات پر روٹی ڈال سکے۔ ڈیرے سے موضع شہزاد کوٹ کی جانب جاتے ہوئے میں نے وزیر بخش سے بھی متعدد سوالات کیے جن کے اس نے سلی بخش جواب دیے۔ اس خوش بخت بڈھے سے حاصل ہونے والی معلومات میرے لیے گراں قدر اہمیت کی حامل تھیں لیکن سردست میں آپ کو ان انکشافات کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہانی کا تقاضا ہے۔“

☆☆☆

موضع شہزاد کوٹ پہنچنے کے بعد میرا رخ خود بخود حنیف کے گھر کی جانب ہو گیا حالانکہ چودھری مبارک نے مجھے اپنی حویلی آنے کی دعوت دی تھی لیکن میں حنیف کی خبر گیری زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ چودھری کی زبانی مجھے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ حنیف اس وقت اپنے گھر پر موجود نہیں اور نہ ہی وہ کھیتوں میں کھنسا دکھائی دیا ہے۔

حنیف کا گھر گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ اس کے دروازے پر پہنچنے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اندر بہت سے لوگ موجود ہیں۔ میں نے متعدد افراد کے آپس میں تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں سن لی تھیں۔ میری دستک کے جواب میں درمیانے قد کا ٹھہ کے ایک شخص نے دروازہ کھولا۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ شخص ایک دم گھبرا گیا۔ اس شخص کے رد عمل نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا اور پوچھا۔

”کیا حنیف تمہارا ہی نام ہے؟“

ان لحات میں اس شخص کے ڈرے ہوئے رد عمل سے میرا دھیان خود بخود حنیف کی طرف چلا گیا تھا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ گھر آ گیا ہے اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پریشان ہو گیا ہے۔ اس شخص نے بہت جلدی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”جی..... میں شوکت ہوں..... حنیف کا ساڑھو۔“

”حنیف کو باہر بھیجو۔“ میں نے حکمانہ انداز میں کہا۔

حنیف کے ہم زلف شوکت نے جواب دیا۔ ”وہ تو ابھی گھر نہیں پہنچا جناب۔ ہم لوگ بھی اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”کہاں چلا گیا وہ.....؟“ میں نے شوکت کے

چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ ادھر

”جی ضرور۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم میرے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم نے کن اصولوں کی بنیاد پر اپنی اولاد کی تربیت کی ہے؟“

”اصولوں و اصولوں کا تو مجھے پتا نہیں تھا نے دار صاحب۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”اس سلسلے میں، میں نے بزرگوں کے ایک ٹوٹکے پر عمل کیا ہے اور سو فیصد نتیجہ پایا ہے۔“

”ٹوٹکا.....؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کون سا ٹوٹکا چاہا؟“

”رزقِ حلال..... کا ٹوٹکا۔“ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”میرے بزرگوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنی بیوی اور بچوں کو ہمیشہ رزقِ حلال کھلانا۔ میں نے ساری زندگی اسی نصیحت پر عمل کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میرا بڑھا چا بہت آرام اور سکون سے گزر رہا ہے۔“

وزیر بخش نے ایک حقیقت، ایک آفاقی اصول بیان کیا تھا جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حصولِ رزقِ حلال عین عبادت ہے۔

میری تلاش اور جستجو دوسرے سے تیسرے کمرے میں پہنچی... آلہ قتل کے حصول کے سلسلے میں مجھے وہاں بھی کوئی کامیابی نہیں ملی۔ اس کمرے میں ٹیوب ویل کا انجن نصب تھا۔ اس کے علاوہ تیل کا ڈرم اور انجن کے مختلف مکینیکل پرزہ جات بھی نظر آرہے تھے۔ میں تھانے سے روانہ ہوتے وقت ایک تھیلا بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا جس میں ہتھکڑی اور تالا بھی موجود تھا۔ میں نے جائے وقوعہ والے کمرے کے دروازے پر سرکاری تالا ڈال دیا۔ اس سرکاری مہر کے بعد کوئی بھی شخص اس کمرے کو کھولنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے وہاں



کھیتوں میں بھی کہیں نہیں ہے۔“ وہ سر اسیمہ انداز میں دلائل  
 ”ہمیں کچھ خبر نہیں۔“ وہ سر اسیمہ انداز میں دلائل  
 بائیں گلی میں نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

”پھر کس کو خبر ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت  
 کیا۔ ”جس سے بھی پوچھو، وہ یہی جواب دیتا ہے۔ کیا  
 حنیف کو زمین نے نگل لیا ہے یا آسمان کھا گیا ہے؟“  
 ”آپ اندر آ جائیں سرکار۔“ وہ میری سنی ان سنی  
 کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ تھوڑی  
 دیر اور یہاں کھڑے رہے تو گلی میں ایک میلا سا لگ  
 جائے گا۔“

اس نے ایک معقول بات کی تھی تاہم میں نے طنزیہ  
 لہجے میں کہا۔ ”تمہارے ساڑھونے کارنامہ ہی ایسا انجام دیا  
 ہے کہ گلی کیا، پورے پنڈ میں بھی میلا لگ سکتا ہے۔“  
 بات ختم کرتے ہی میں شوکت کی معیت میں حنیف  
 کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ شوکت نے ابھمن زدہ انداز  
 میں کہا۔  
 ”مجھے یقین نہیں آرہا کہ حنیف ایسی حرکت بھی  
 کر سکتا ہے۔“  
 ”تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق  
 نہیں پڑتا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”جو ہونا تھا، وہ  
 تو ہو چکا۔“

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں  
 حنیف کی بیٹھک میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے  
 علاوہ شوکت اور اس کی بیوی سلٹی بھی وہاں موجود تھے۔  
 انہوں نے اپنے بچوں کو گھر کے اندر دنی صے تک محدود  
 کر دیا تھا۔ میری آمد سے قبل اس گھر کے اندر جو آس  
 پڑوس کے لوگ جمع تھے، میری ہدایت پر شوکت نے  
 انہیں رخصت کر دیا۔

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام  
 ملک صفدر حیات ہے اور میں فرید آباد تھانے کا انچارج  
 ہوں۔ آپ لوگوں کا گاؤں موضع شہزاد کوٹ میرے تھانے  
 کی حدود میں آتا ہے۔“

شوکت نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اپنے سر کو اٹھاتی  
 جنبش دی لیکن خاموش رہا مگر اس کی بیوی خاموش نہ رہ سکی  
 اور احتجاجی لہجے میں بولی۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے قانونی کارروائی  
 میں بہت جلدی سے کام لیا ہے۔ کم از کم حنیف کے واپس  
 آنے کا تو انتظار کر لیتے۔ لاشیں تو بعد میں بھی اسپتال بھجوائی

جاسکتی تھیں۔“ بولتے بولتے وہ روہا سی ہو گئی۔ ”میں تو.....  
 اپنی بہن کا منہ کی کھل گیا تھا۔“  
 ”کوئی شرم حیا ہے کہ نہیں۔“ شوکت نے اپنی بیوی کو  
 سرزنش کی۔ ”تمہیں پتا ہے نا، پیٹو کو کس حالت میں قتل کیا گیا  
 ہے۔ تم اس کا منہ دیکھ کر کیا کر لیتیں؟“  
 ان کی باہمی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے  
 میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ دونوں حالات کی  
 نزاکت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ میں سلٹی کے دکھ کو  
 اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ حالات چاہے کچھ بھی ہوں لیکن  
 پیٹو، سلٹی کی چھوٹی بہن تھی جواب اس دنیا میں باقی نہیں  
 رہی تھی۔

”اپنی بہن کا منہ تم بعد میں بھی دیکھ سکتی ہو سلٹی!“  
 میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”اصل میں، یہ  
 دہرے قتل کی ایسی واردات ہے کہ مقتولین کی لاشوں کو  
 زیادہ دیر تک جائے واردات پر رکھ کر تماشا نہیں بنایا  
 جاسکتا تھا۔ اوپر سے شدید گرمی کا موسم بھی کسی تاخیر کی  
 اجازت نہیں دیتا۔“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک  
 گہری سانس لی پھر سلٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نلی  
 بھرے لہجے میں کہا۔

”فکر نہ کرو۔ پوسٹ مارٹم کے بعد دونوں لاشیں ان  
 کے درمیان کے حوالے کر دی جائیں گی۔ پھر تدفین سے پہلے تم  
 اچھی طرح اپنی چھوٹی بہن کا منہ دیکھ لینا۔“

”ہم ادھر چودھریوں کے ڈیرے پر بھی گئے  
 تھے۔“ سلٹی نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”لیکن  
 چودھری کے ملازم وحید نے ہمیں کمرے کے اندر نہیں جانے  
 دیا۔ خدا کا غضب..... میری بہن قتل ہو گئی اور مجھے ہی اس  
 کی لاش تک جانے سے روک دیا گیا۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو سلٹی.....“ شوکت نے  
 تیز نظر سے بیوی کو گھورا۔ ”لگتا ہے، تمہارا دماغ خراب  
 ہو گیا ہے۔“

”شوکت! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ ضدی  
 لہجے میں بولی۔ ”واقعی، میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ان  
 حالات میں کسی کا دماغ کس طرح ٹھکانے پر رہ سکتا ہے۔“

”تم حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ قدرے سخت  
 لہجے میں بولا۔ ”پیٹو کی موت کا مجھے بھی بہت دکھ ہے لیکن  
 جذباتی ہونے سے بات نہیں بنے گی۔ پیٹو نے تو ہماری  
 ناک ہی کٹوا دی ہے۔ اوپر سے تم شور شرابا چا کر باقی کی کسر  
 پوری کرنا چاہتی ہو۔“



نے بھی مجھے بہت اگلا دیا تھا اور اب شوکت کے مقابلہ  
انداز نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی سالی کی ”حرکتوں“  
سے خوش نہیں تھا۔

”شوکت!“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے  
ہوئے کہا۔ ”بیوی کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ چوہے جیسا شوہر  
بھی غیرت کے جوش میں کنگ کا ٹنگ بن جاتا ہے۔ اگر  
حنیف کا اس دہرے قتل کی واردات میں کوئی ہاتھ نہیں تو پھر  
وہ کہاں غائب ہے؟“

”یہی بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی  
جناب۔“ شوکت نے حیرت اور الجھن کی ملی جلی کیفیت  
کے ساتھ کہا۔ ”میں نے خود بھی کھیتوں میں جا کر دیکھا  
ہے۔ وہ مجھے کہیں نہیں ملا اور اس کی تیل گاڑی بھی کہیں  
دکھائی نہیں دی۔“

”حنیف کی زمین کس طرف واقع ہے؟“ میں نے  
ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

اس نے مغرب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔  
”اس طرف کوئی پندرہ بیس منٹ کے پیدل فاصلے پر حنیف  
کی پانچ ایکڑ زرعی اراضی ہے۔ وہ آج اپنی تیل گاڑی کو بھی  
ساتھ لے گیا تھا۔ کہہ رہا تھا، وہ واپسی پر میرے اور اپنے  
جانوروں کے لیے سبز چارابھی لے کر آئے گا۔“

”ہم بھی حنیف کے انتظار میں اپنا گھر چھوڑ کر ادھر ہی  
بیٹھے ہوئے ہیں۔“ سلٹی نے غمزہ آواز میں بتایا۔ ”چھوٹے  
بچے کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔“

”بچہ.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
”کس کا بچہ؟“

”پونو کا بچہ جی۔“ سلٹی نے میرے سوال کے  
جواب میں بتایا۔ ”میں اسی منصوم کی بات کر رہی ہوں۔  
پونو کا ایک ہی بچہ ہے، احمد..... ہم احمد کو کس کے آسرے  
پر چھوڑ کر اپنے گھر جائیں۔ احمد دن میں بھی ہمارے گھر  
پر ہی تھا۔ شوکت کہتا ہے، ہم احمد کو اپنے ساتھ ہی لے  
جاتے ہیں۔“

”احمد آج دن میں آپ لوگوں کے گھر پر کیوں تھا؟“  
میں پوچھتے بنانہ رہ سکا۔

”آج دوپہر میں جب پونو، حنیف کے لیے کھانا لے  
کر کھیتوں کی طرف جانے لگی تو اس نے ننھے احمد کو میرے  
پاس چھوڑ دیا تھا۔“ سلٹی نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”احمد کی عمر کیا ہے؟“  
”وہ چار سال کا ہے جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے

شوکت علی مجھے غامض محسوس اور گھبراہٹ دار انسان لگا۔ وہ  
موجودہ حالات کی نزاکت کو بہت گہرائی تک سمجھ رہا تھا اور  
اسی کے مطابق اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔

”سلٹی!“ میں نے تشفی بھرے لہجے میں شوکت کی  
بیوی کو مخاطب کیا۔ ”میں تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں۔ وحید  
کو چودھری مبارک ہی نے وہ ڈیوٹی سونپی تھی۔ اس نے  
اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا۔ مقتول نواز کی بیوی مریم بھی  
اپنے شوہر کا منہ دیکھنے وہاں ڈیرے پر پہنچی تھی لیکن آپ  
لوگوں کی طرح وحید نے مریم کو بھی کمرے کے اندر قدم  
نہیں رکھنے دیا۔ تم جذباتی ہونے کے بجائے ٹھنڈے  
دماغ سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ جو کچھ ہوا ہے،  
اس میں سب سے زیادہ بدنامی آپ ہی لوگوں کی ہے۔“  
پتا نہیں، میری باتیں اس کی کھوپڑی میں بیٹھیں یا  
نہیں، بہر حال اس کے بعد اس نے واویلا نہیں مچایا اور  
غاموش ہو کر ہماری باتیں سننے لگی۔ شوکت نے مجھ سے  
مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ کی باتوں سے محسوس ہوتا  
ہے کہ اس دہرے قتل کی واردات کے سلسلے میں آپ کا شک  
میرے ساڑھو حنیف پر ہے؟“

”میں اگر ایسا سوچ رہا ہوں تو اس میں غلط کیا ہے؟“  
میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔ ”حالات و واقعات  
حنیف کی ہی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ کیا تم بھی اسی انداز  
میں نہیں سوچ رہے؟“

”نن..... نہیں۔“ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔  
”کیوں..... تمہارا ذہن اس انداز میں کیوں نہیں  
سوچتا؟ مجھے تو تم خاصے عقل مند انسان لگے ہو۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے  
بولا۔ ”میرا دھیان اگر حنیف کی طرف نہیں جا رہا تو اس کی  
ایک خاص وجہ ہے۔“

”اور وہ وجہ کیا ہے؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز  
میں پوچھا۔

”میں سمجھتا ہوں، حنیف اتنا بہادر نہیں ہے۔“ وہ معنی  
خیز انداز میں بولا۔

مجھے محسوس ہوا کہ شوکت نے ”بہادر“ کا لفظ ”غیرت  
مند“ کی جگہ استعمال کیا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی  
بیوی کی موجودگی میں اس کی مقتول بہن پونو کے حوالے سے  
کوئی ہلکی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پونو کے لاابالی مزاج کے بارے میں چاچا وزیر بخش



تین بچے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ خوش ہے کہ ہمارا ہوتا ہے۔  
 ”کیا تمہارا گھر بھی اسی طرح ہے؟“  
 ”جی، ہم بھی اسی گلی میں رہتے ہیں۔“ شوکت نے بتایا۔  
 ”دو مکان چھوڑ کر ہمارا مکان ہے۔“  
 ”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر سسلی سے سوال کیا۔  
 ”پچھو آج دن میں کتنے بچے احمد کو تمہارے گھر میں چھوڑ کر کھیتوں کی طرف گئی تھی؟“  
 ”میرا خیال ہے، اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔“

”کیا وہ روزانہ اسی وقت حنیف کو کھانا دینے کھیتوں کی طرف جایا کرتی تھی؟“ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”جی اسی وقت۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔  
 ”یا پانچ دس منٹ اوپر نیچے ہو سکتا ہے۔“  
 ”اس نے آج کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے تم سے کوئی خاص بات کی تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی۔ ”جی نہیں۔“  
 ”کیا وہ روزانہ کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے احمد کو آپ لوگوں کے پاس چھوڑ کر جاتی تھی؟“  
 ایک لمحے کو وہ مجھے حذب نظر آئی پھر بولی۔  
 ”جی..... بالکل۔“

”کیا بات ہے سسلی!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم مجھے کچھ ابھی ہوئی اور بے چین نظر آ رہی ہو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟“  
 ”وہ جی..... دراصل، میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گئی تھی۔“ وہ کھکش کی سی کیفیت میں بولی۔ ”جی نہیں، اس بات کی کوئی اہمیت بھی ہے یا نہیں.....“  
 ”بتاؤ، کیا بات ہے؟“ میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اہم اور غیر اہم کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔“

”پچھو نے کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ آج واپسی میں اسے تھوڑی دیر ہو جائے گی۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ اسے اتنی دیر ہو جائے گی کہ پھر وہ بھی لوٹ کر نہیں آ سکے گی۔“

بات کے اختتام پر اس کی آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔  
 ”سسلی!“ میں نے قدرے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”پچھو نے تمہیں دیر سے واپس آنے کی کوئی وجہ تو بتائی

”کی؟“  
 ”جی بتائی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فم ناک لہجے میں بولی۔ ”اس نے کہا تھا کہ حنیف کو کھانا کھلانے کے بعد وہ چودھریوں کی حویلی جائے گی۔“  
 ”سسلی کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور سوال کیا۔“ وہ چودھریوں کی حویلی کیوں جانا چاہتی تھی؟“  
 ”چودھری مبارک نے کسی کام کے لیے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔“ اس نے بتایا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”چودھری مبارک نے پچھو کو کس کام سے اپنے پاس بلایا تھا؟“

”یہ تو اس نے مجھے نہیں بتایا۔“ وہ جھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور یہی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس سے پوچھا بھی نہیں۔“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک پوچھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”چودھری مبارک اس پنڈ کے مالک و مختار ہیں۔ وہ کسی کو کسی بھی کام سے اپنی حویلی میں بلا سکتے ہیں۔“

میرے ذہن میں ایک عجیب سا کلکا آ بیٹھا۔ وہاں ڈیرے پر تھوڑی دیر پہلے چودھری مبارک سے میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے دونوں مقتولین کے بارے میں متعدد سوالات کیے تھے۔ اگر اس نے پچھو کو کسی کام سے اپنی حویلی میں بلایا تھا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتا اور اگر اس نے دانستہ اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے اور..... اس گڑبڑ سے چودھری اچھی طرح واقف ہے۔ چودھری کی طرف سے میرا ذہن ریڈ الارٹ ہو گیا۔ میں نے سسلی سے سوال کیا۔

”پچھو تک یہ اطلاع کس نے پہنچائی تھی کہ چودھری مبارک نے کسی ضروری کام سے اسے حویلی پر بلایا ہے؟“  
 ”عاشاں ماسی نے۔“ سسلی نے بتایا۔  
 ”یہ عاشاں ماسی کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور کہاں رہتی ہے؟“

”عاشاں کا اصل نام عاتشہ ہے۔ وہ چودھری صاحب کی نوکرانی ہے اور ادھر حویلی ہی میں رہتی ہے۔“  
 میں نے چودھری مبارک اور ماسی عاشاں کے ناموں پر دائرے لگا کر انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ ان کے علاوہ بھی دو نام دائروں میں بند میرے ذہن میں محفوظ تھے اور وہ دو نام تھے..... حنیف اور وحید۔ میرے خیال میں ان چاروں افراد سے پوچھتا چھاس دہرے کل کی



واردات پر روشنی ڈالنے کے لیے نئے نمبر ۲۸ بت ہو گئی تھی۔ اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لہذا اس کی تسلی کی خاطر میں نے کہہ دیا۔ میرا یہ جواب گول مول سا تھا۔

”بیٹا! ہم پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

شوکت علی نے بہلا پھسلا کر احمد کو گھر کے اندر جانے پر آمادہ کر لیا۔ احمد کا مصوم ذہن اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا تھا کہ حالات کی ایک سفاک کروٹ نے اس کے تازک اور گداز قدموں کے سامنے کون سی پُر خار راہ بچا دی تھی۔

شوکت علی، چودھری مبارک کی حویلی تک میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ میں نے رخصت کرتے وقت خاص طور پر اسے ہدایت کی۔

”شوکت! تم سیدھا یہاں سے اپنے ساڑھو حنیف کے گھر ہی جانا اور ہمہ وقت گھر کے اندر ہی موجود رہنا۔ میں ادھر حویلی ہی میں بیٹھا ہوں۔ اس دوران میں اگر حنیف واپس آجائے تو تم فوراً مجھے اطلاع دینا۔“

”ٹھیک ہے سرکار۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے جیسا کہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔“

”اور تم احمد کا بہت زیادہ خیال رکھو گے۔“ میں نے تاکید کی۔

”وہ بہت پیارا اور مصوم بچہ ہے۔“

”جی سرکار۔ وہ میرے لیے اپنے بچوں جیسا ہی ہے۔“

”فی الحال، بیٹو کے قتل کا ذکر پھیلانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس سلسلے میں تم تسلی کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”ادھر کے معاملات کو میں اچھی طرح سنبھال لوں گا۔ انشاء اللہ! آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

میں اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

چودھری مبارک کی حویلی بڑی عالیشان تھی۔ آج پہلی بار وہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جب چودھری کو پتا چلا کہ میں آیا ہوں تو اس نے حویلی کے گیٹ پر آکر بڑے تپاک کے ساتھ میرا استقبال کیا پھر میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ چودھری مبارک کی بیٹھک (ڈرائنگ روم) آرائش اور سجاوٹ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ اس شان و شوکت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ تسلی کے بقول چودھری مبارک موضع شہزاد کوٹ کا واقعی مالک و مقرر تھا۔

حنیف کے گھر سے نکلنے کے بعد میں نے آس پڑوس کے تین چار افراد سے بھی مختصر گفتگو کی تاہم دہرے محل کی اس ہولناک واردات پر وہ کوئی روشنی نہ ڈال سکے البتہ ان میں سے بعض نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بیٹو کی غیر نصابی سرگرمیوں کا جو نقشہ کھینچا، وہ چاچا وزیر بخش سے حاصل ہونے والی معلومات سے لگا کھاتا تھا۔

میں چودھری مبارک علی کی حویلی کی جانب بڑھنے لگا تو تسلی کا شوہر شوکت بھی میرے ہمراہ ہو گیا۔ اسی لمحے ایک گورا چٹا بچہ دروازے میں نمودار ہوا اور شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”خالو..... میری اماں اور بابا کب آئیں گے؟“

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ حنیف کا بیٹا احمد تھا۔ اس مصوم صورت کو دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ ماں باپ کے اعمال و افعال میں ننھے احمد کا کوئی حصہ نہیں تھا مگر اس کے نتائج سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نوعیت کے معاملات میں قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر ایمان میں کہیں کوئی کمزوری موجود ہو تو انسان کو گمراہ ہونے ایک لمحہ نہیں لگتا۔ میں بے اختیار آگے بڑھا اور احمد کے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔

”بیٹا! ہم تمہارے ابا اور اماں کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم اندر جا کر اپنی خالہ کے بچوں کے ساتھ کیلو۔“

ان حالات میں، میں اس بچے کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سرتاپا میرے سراپا پر ایک گہری نگاہ ڈالی پھر بڑی مصومیت سے متغیر ہوا۔

”آپ پولیس ہیں؟“

میں نے اس کے گال چھتھپاتے ہوئے کہا۔ ”جی بیٹا! میں پولیس ہوں۔“

احمد کے اس سوال سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ اس گھر میں میری آمد کے بعد پولیس کا تذکرہ ضرور ہوا تھا۔ اس نے ویران آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے اماں ابا کہاں کم ہو گئے ہیں؟“



کی میں نے ذرا دیر کے پڑائی لگا رکھی تھی۔ اور ان گھبراہٹ والے حالات میں اس لیے وہ رات کو اپنے گھر آ جایا کرتا تھا مگر وحید رات کو ادھر ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ وحید چمڑا چھانٹ ہے، کہیں بھی رہ جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج تو میں نے صدیق کو بھی اس کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ صدیق ابھی رات کو ڈیرے پر ہی رکے گا۔“

چودھری کی وضاحت سے میرا ذہن مطمئن نہیں ہو سکا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔ ”صدیق اور وحید سوئیں گے کہاں؟ رہائی کمرے کو تو میں نے سیل کر دیا ہے۔“

یہ صدیق نامی ملازم وہی شخص تھا جو اس دہرے قتل کی واردات کی اطلاع لے کر تھانے میرے پاس آیا تھا۔ ”جناب! مجھے خبر ہے کہ آپ نے اس کمرے پر سرکاری تالا لگا دیا ہے جہاں دہرے قتل کی یہ سنگین واردات ہوئی ہے۔“ چودھری نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ لیکن وہاں ڈیرے پر اس کے علاوہ بھی دو کمرے ہیں۔ ویسے آج کل موسم خاصا گرم ہے۔ یہ لوگ ڈیرے کے گھن میں بھی سو سکتے ہیں۔“

چودھری کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک بڑے برادر ملازم بیٹھک کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس بندے نے اپنے ہاتھوں میں جو کنگ سائز کی بڑے اٹھارکھی تھی، وہ سامان خورد و نوش سے لدی پھندی نظر آرہی تھی۔ چودھری کے اشارے پر اس ملازم نے وہ بڑے میرے سامنے میز پر رکھی اور تمام تر اشیائے خورد و نوش میرے سامنے بچانے کے بعد خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

”چودھری صاحب! یہ کیا ہے؟“ میں نے میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”اللہ کی قسم ہیں۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ”مگر اتنا کچھ.....“

”کسی تکلف کی ضرورت نہیں ملک صاحب۔“ چودھری نے اپنا تہ بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ ساری نعمتیں آپ کے لیے ہیں۔ آپ دل کھول کر ان کے ساتھ انصاف کریں گے تو آپ کی مصطفیٰ دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔“

میرے لاکھ انکار اور اس کے کروڑ اصرار کے نتیجے میں، میں اپنے ہاتھوں کو حرکت نامی زحمت دینے پر مجبور ہو گیا کیونکہ اگر میں اپنی ضد پر ڈٹا رہتا تو یہ سیدھا سیدھا کفرانِ نعمت ہوتا۔

”آپ ادھر حنیف کے گھر پر اچھا خاصا وقت گزار کر

رہی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ”چودھری صاحب! اب آپ کی ٹانگ کا کیا حال ہے؟“ ”تموڑا آرام ہے۔“ اس نے اپنی ٹانگ پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے میرے یاد دلانے پر اسے یاد آیا ہو کہ اس کی مذکورہ ٹانگ کسی مرض میں مبتلا ہے۔ پھر اس نے سرسری انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ”آپ بتائیں، بندہ گرفتار ہوا یا نہیں؟“

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”کون سا بندہ چودھری صاحب؟“

”ملک صاحب! میں حنیف کی بات کر رہا ہوں۔“ ”اوہ اچھا!“ میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک تو وہ واپس نہیں آیا لیکن آپ فکر نہ کریں، میں نے ایسا بندہ دست کر دیا ہے کہ وہ نامراد جیسے ہی گاؤں میں قدم رکھے گا، مجھے خبر ہو جائے گی۔“

چودھری پر سوچ انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا تاہم اس نے میرے ”بندوبست“ کے حوالے سے کوئی سوال کرنے کے بجائے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آپ کے ٹھکے میں بخیری کا نظام بڑی تیزی سے کام کرتا ہے۔“

میں نے بھی اس کے اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پوچھا۔ ”چودھری صاحب! آپ کا ملازم وحید کہاں ہے؟“ ”کیوں.....؟“ اس نے چونکنے انداز میں مجھے دیکھا۔ ”خیریت تو ہے نا؟“

”سب خیریت ہے چودھری صاحب۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں وحید سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تموڑی دیر پہلے ہی توحویلی سے گیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں گیا ہے؟“ ”ادھر ڈیرے پر.....“

”عجیب اتفاق ہے چودھری صاحب۔“ میں نے چودھری مبارک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب میں نے ادھر ڈیرے پر آپ سے وحید کے بارے میں استفسار کیا تو وہ ادھر حویلی میں تھا اور اب میں حویلی میں بیٹھ کر اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں تو وہ ادھر ڈیرے پر پہنچا ہوا ہے؟“

”بالکل درست فرما رہے ہیں آپ۔ آپ اسے ایک اتفاق ہی سمجھ لیں۔“ لمحائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر گہری سنجیدگی سے وضاحت کرنے لگا۔

”ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ وحید اور نواز



☆ اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا نہ ہو۔

☆ کسی سے بدلہ لینے میں جلدی نہ کرو اور کسی کے ساتھ نیکی کرنے میں دیر نہ کرو۔

☆ ہر سانس موت کی طرف ایک قدم ہے۔

☆ دوست ہزار بھی کم ہیں اور دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔

☆ جو دعا دوستوں کے لیے ان کی غیر موجودگی میں کی جاتی ہے، وہ رد نہیں ہوتی۔

☆ بے عقلی سب سے بڑی غریبی ہے۔

☆ دوست کی دوستی دیکھو، اس کے عیب نہ دیکھو۔

☆ کسی کا دل نہ دکھا کہ تیرے پہلو میں بھی دل ہے۔

☆ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

☆ لوگ تمہیں شکل سے کم اور عقل سے زیادہ دیکھتے ہیں۔

☆ آسمان کی طرف دیکھو ضرور مگر یہ نہ بھولو کہ تمہارے پاؤں زمین پر ہیں۔

☆ عقل مند بات کرنے سے پہلے اور بے وقوف بات کرنے کے بعد سوچتا ہے۔

☆ تمہاری مسکراہٹ دشمن کو تباہ کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

☆ نیکی کرنے کے لیے وقت کا انتظار نہ کریں بلکہ خلوص دل سے خود موقع تلاش کریں۔

☆ کتنے عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی خوشیاں قربان کر دیتے ہیں۔

مرسلہ۔ سعید عباسی، بہاول پور

### اجازت

☆ کیا تم نے اپنی بیوی کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ جیسے چاہے کرے؟

☆ نہیں، وہ میری اجازت کے بغیر جیسے چاہے کرتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

آئے ہیں بلکہ حنیف کا ملازم شوکت تو حویلی تک پہنچ گئے بھی آیا تھا۔ چودھری نے میری طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس دہرے قتل کی واردات کے حوالے سے کوئی اہم نکتہ آپ کے ہاتھ لگا؟“

اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”چودھری صاحب! ہمارے ڈیپارٹمنٹ سے زیادہ فعال تو آپ کا بخبری کا نظام ہے۔“ ”یہ سب کرنا پڑتا ہے ملک صاحب۔“ وہ بڑے فخر سے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ”گاؤں کا نظام چلانا کسی سلطنت کے نظام سے کم نہیں ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”موضع شہزاد کوٹ آپ کی سلطنت ہی ہے جہاں کے آپ مطلق العنان بادشاہ ہیں۔“ ”میرے سوال کا آپ نے جواب نہیں دیا۔“ وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے نکتے لگا۔

”ایک سرا ہاتھ لگا تو ہے.....“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”لیکن میں فی الحال وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں۔“

ایک دم چودھری کے کان (محاورتاً) کھڑے ہو گئے۔ سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”آپ کس سرے کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟“

”چودھری صاحب! میں نے جو سرا پکڑا ہے.....“ میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے دوسرے کنارے پر آپ کھڑے ہیں۔“

وہ اچھل پڑا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟“ ”میں نے حقیقت بیان کی ہے چودھری صاحب!“ وہ بے حد محتاط لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، کھل کر کہیں.....“

”مجھے پتا چلا ہے کہ پلو کو آج دوپہر میں آپ نے اپنے پاس حویلی میں بلایا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر اس کا چہرہ خنجر ہو گیا تاہم اگلے ہی لمحے اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ”آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟“ ”میں خبر کنندہ کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔“

میں نے چودھری کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”پہلے آپ اس بات کی تصدیق یا تردید کریں؟“ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”میں اس امر کی تردید کرتا ہوں۔“



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                    |                  |                  |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد   | صائمہ اکرام        | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد         | نبیلہ عزیز       | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر       | فائزہ افتخار     | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض        | نبیلہ ابرار      | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار       | آمنہ ریاض        | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل            | عنیزہ سید        | مُستنصر حُسین    |
| رضیہ بٹ       | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد  | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | اُمِ مریم          | نایاب جیلانی     | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



”آج دوپہر میں حسبِ معمول جب بیٹو اپنے سرور حنیف کے لیے کھانا لے کر کھیتوں کی طرف جانے لگی تو اس نے اپنے چار سالہ بیٹے احمد کو اپنی بڑی بہن سلمیٰ کے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا کہ واپسی میں اسے دیر ہو جائے گی۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ”جب سلمیٰ نے اس سے اس تاخیر کا سبب پوچھا تو بیٹو نے اسے بتایا تھا کہ آپ نے اسے حویلی بلایا ہے۔“

”بدبخت نے جھوٹ بولا ہے۔“ چودھری میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”آپ کا بلاوا بیٹو تک آپ کی حویلی کی ایک ملازمہ ماسی عاشاں نے پہنچایا تھا۔“

”بالکل غلط۔“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔ ”آپ کو میری بات پر یقین کرنا چاہیے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“

”لیکن.....“ میں نے حذبذب انداز میں کہا۔ ”بیٹو کو جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا؟“

”آپ بیٹو سے واقف نہیں ہیں ملک صاحب.....“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں واقعی بیٹو سے واقف نہیں ہوں۔“ میں نے سوالیہ نظر سے چودھری مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”بیٹو نے اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے.....“ اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔

”آپ رک کیوں گئے چودھری صاحب؟“

”مرنے والے کی برائی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ”ہر انسان کو اپنے اعمال کا خود حساب اور جواب دینا ہے۔“

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بیٹو کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا؟“

”آپ نے اس کی لاش کو جس حالت میں دیکھا ہے، اس کے بعد اس کے کردار پر کچھ کہنے کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے؟“ چودھری کی معنی خیز سوالیہ نگاہ مجھ پر جم گئی۔

”چودھری صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی بھی چیز کے بارے میں فوری طور پر کوئی رائے قائم نہیں کرتا۔“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جب تک حالات و واقعات کو اپنے انداز میں تحقیق اور تفتیش کے مراحل سے نہ گزاروں، میں مطمئن نہیں ہوتا۔ خیر، آپ یہ بتائیں کہ.....“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر دو ٹوک انداز میں استفسار کیا۔

”ماسی عاشاں اس وقت حویلی میں موجود ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے یہاں بلا کر ابھی آپ کا سامنا کراتا ہوں۔ آپ کو جو بھی پوچھنا ہو، پوچھ لیں اس سے۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

چودھری مبارک نے یہ دعویٰ اتنے اعتماد کے ساتھ کیا تھا کہ اگر یہ کوئی چھوٹا موٹا کیس ہوتا تو میں شاید کسی تصدیق کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا اور فوراً اس کی بات پر یقین کر لیتا لیکن یہ دہرے قل کی ایک سنگین واردات کا معاملہ تھا لہذا میں چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ چودھری مبارک نے ماسی عاشاں کو وہیں بیٹھک میں طلب کر لیا تھا۔ عائشہ عرف ماسی عاشاں کی عمر ساٹھ کے آس پاس رہی ہوگی۔ پست قامت، گندی رنگت اور فرہ بدن۔

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ وہ جوانی میں خاصی تیز و طرار رہی ہوگی۔ بہر حال، دس پندرہ منٹ کی پوچھ تاچھ کے نتیجے میں عاشاں نے

چودھری مبارک کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے تو پچھلے تین چار دن سے بیٹو کی شکل تک نہیں دیکھی۔“

مجھے عاشاں کی بات پر یقین کرنا پڑا۔ چودھری نے عاشاں کو واپس بھیج دیا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز سے ناگواری بھٹکتی تھی۔

”ملک صاحب! اب تو آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بیٹو کس قسم کی عورت تھی۔ جھوٹ اور جھل فریب تو اس کی نس نس میں رچا بسا تھا۔ جو عورت اپنے شوہر کی وقار نہ ہو، اس سے اور کوئی کیا توقع کر سکتا ہے۔ بس..... اللہ

معاف کرے جناب۔“

”ٹھیک ہے چودھری صاحب!“ اس کی بات کے اختتام پر میں نے کہا۔ ”یہ تو آپ نے ثابت کر دیا کہ بیٹو

www.paksociety.com



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                   |                 |                  |
|---------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد    | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو    | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ       | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



www.paksociety.com کو آپ نے حویلی میں نہیں بلایا تھا لیکن میرے پاس سے گزرتے ہیں یہ بھی آیا ہے کہ پیو گاہے بگاہے آپ کی حویلی کا چکر لگایا کرتی تھی۔“

## اسرار

1906ء میں غلیل جبران نے میں ڈالر ادھار لے کر اپنی تصویروں کی ایک نمائش منعقد کی۔ اس نمائش کو دیکھنے آنے والوں میں ایک خاتون مس میری ٹیسل بھی تھی جس سے بعد میں جبران کی دوستی ہو گئی۔ جب غلیل جبران آرٹ کی مزید تعلیم کے حصول کے لیے یورپ جانے لگا تو اس خاتون نے اس کا کرایہ ادا کیا۔ ایک سوانح نگار کا کہنا ہے کہ اس احسان کے عوض جبران نے اس سے کہا کہ وہ ہر مسودہ ناشر کے پاس جانے سے پہلے ایک نظر دیکھ لیا کرے۔

جبران کا ناول..... ”نوائے ہوئے پر“ ایم۔ ای۔ ایچ۔ ہاڈایور کے نام منسوب ہے جو اس کی جائیداد کا منتظم تھا۔ اس کا اصرار ہے کہ جس امیر خاتون نے جبران کی مالی مدد کی، اس کا نام میری خوری ہے۔ جائیداد کا وہی میری خوری کا ذاتی معالج تھا اور اس کے کمرے میں غلیل جبران کی بنائی ہوئی کئی تصویریں اور مجسمے دیکھ چکا تھا۔ ان پر جبران نے عربی میں لکھا تھا۔ ”کسی شخص کو شراب پینے کا طعنہ نہ دو..... کیا عجیب وہ شراب نوشی سے بھی کسی زیادہ بخ حقیقت کو فراموش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔“ ڈاکٹر آگے چل کے لکھتا ہے کہ میری خوری اپنے نام غلیل جبران کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط کی اشاعت پر رضامند تھی۔ اس کا دعویٰ ہے۔ یہ خطوط ایک دوست کے حوالے کر دیے گئے تھے کہ انہیں مناسب ترتیب دے اور ان میں ضروری رد و بدل کر دے لیکن اسی اثنا میں وہ دوست اور پھر میری خوری بھی چل بسی اور خطوط گناہ ہاتھوں میں چلے گئے۔ میری خوری کے کہنے کے مطابق جبران نے زندگی کے آخری ایام میں کئی شاہیں اس کے کمرے میں گزاریں۔

میری کے نام جبران کے خطوط کی موجودگی لبنان کے ایک اخبار نویس کے بیان سے بھی ثابت ہوئی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے ان میں سے چند خطوط کا مطالعہ بھی کیا ہے اور میری خوری نے انہیں اشاعت کے لیے دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ جب میں نے اخبار نویس سے پوچھا کہ ان خطوط کی نوعیت شخص کا رو باری تھی یا یہ محبت نامے تھے۔ تو اس نے جواب دیا کہ یہ خطوط کاروباری نہیں محبت نامے تھے اس بیان کے باوجود غلیل جبران کی اس محنت کا وجود ایک اسرار سے کم نہیں۔ کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام میری ویکلی تھا یا میری خوری..... یا یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت کے دو مختلف نام تھے؟ (غلیل جبران کے افکار پر مشتمل کتاب ”روح کے آئینے سے“ اقتباس)

آخری جملہ میں نے چودھری کا رد عمل جاننے کے لیے ادا کیا تھا کیونکہ حاشاں والی وضاحت سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دال میں کچھ کالا ہے۔

”ملک صاحب! میری حویلی میں تو پتا نہیں، کون کون چکر لگاتا رہتا ہے۔“ وہ بڑی رعونت سے بولا۔ ”ہاں، یہ سچ ہے کہ پیو بھی ہفتے میں ایک آدھ بار حویلی کا چکر لگایا کرتی تھی۔“

”اس کا کوئی خاص سبب؟“ میں نے پوچھا۔

”جی، سبب خاص ہی ہے۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ سے کیا پردہ

ملک صاحب! وہ دراصل بات یہ ہے کہ میری بیوی شکیلہ کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج ہے۔ حکیم جی نے شکیلہ کے لیے ایک خاص قسم کا تیل بنا کر دیا ہے اور ہدایت کر رہی ہے کہ ہفتے میں ایک مرتبہ شکیلہ کے بدن پر اس تیل کی مالش ضرور ہونا چاہیے.....“ لہجے بھر کے لیے وہ سانس لینے کو تھما پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے پتا چلا تھا کہ پیو کے ہاتھوں میں غضب کا جادو ہے۔ میں شکیلہ کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ جب مجھے پیو کی اس صلاحیت کا علم ہوا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی خداداد صلاحیت سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ یہ ہے سارا قصہ ملک صاحب!“

”ٹھیک ہے چودھری صاحب۔“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو اپنے پیٹے کے تقاضے نبھا رہا ہوں اسی لیے آپ سے ہر قسم کا سوال کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں آپ سے.....“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ملک صاحب!“ وہ جلدی سے قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی محکمہ جاتی ذمے دار یوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی کوئی بھی بات بری نہیں لگی۔ آپ کو میری حویلی کے دروازے ہمیشہ کھلے ملیں گے۔ آپ کا جب بھی دل چاہے، آپ کسی بھی قسم کی ہچکچہ پریت کے لیے یہاں تشریف لاسکتے ہیں۔“ میں نے تہ دل سے کہا۔ ”بہت شکریہ چودھری صاحب۔“



”آپ ماشاء اللہ، ایک تجربہ کار، ذہین اور جہاد پروردہ پولیس افسر ہیں۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا، ”میری بات کا تو آپ کو بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بچوں نے اپنے آشنا سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے حویلی کا چکر لگانے والا جھوٹ بولا ہوگا۔ میرا اشارہ مقتول نواز کی طرف ہے..... آپ نے دونوں لاشوں کی حالت تو دیکھ ہی رہی ہے۔“

میں نے اپنی گردن کو کچھ ایسے انداز میں حرکت دی جیسے اس کی وضاحت سے مجھے سو فیصد اتفاق ہو پھر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چودھری صاحب! آپ کو میرا ایک کام کرنا ہے اور وہ یہ کہ آپ کا ملازم وحید تھوڑی دیر کے لیے مجھے چاہیے۔ آپ کل کسی وقت وحید کو میرے پاس تھانے بھیج دیں۔ میں اس کا تفصیلی بیان لینا چاہتا ہوں۔ وہ مقتول نواز کے ساتھ ڈیرے پر رہتا تھا اس لیے وہ نواز کے حالات اور معاملات سے اچھی طرح آگاہ ہوگا۔“

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چودھری بھی میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

”جی ضرور..... میں کل وحید کو آپ کی طرف بھیجتا ہوں۔“

”بہت مہربانی آپ کی۔“ میں نے کہا۔

”کیوں شرمندہ کرتے ہیں ملک صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر قدم اٹھا دیے۔

”آپ صرف دو منٹ رک جائیں۔“ وہ کسی فوری خیال کے تحت بولا۔

میں رک گیا اور پوچھا۔ ”خیریت چودھری صاحب؟“

”سب خیریت ہے ملک صاحب۔“ وہ مجھے روکنے کا سبب بیان کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے اپنے تانگے میں تو مقتولین کی لاشوں کو سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا۔ میں آپ کے لیے کسی سواری کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ شام ہو رہی ہے۔ آپ کہاں پریشان ہوتے پھریں گے۔“

میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد چودھری مبارک کے مہیا کیے گئے تانگے میں بیٹھ کر اپنے تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

تھانے کی طرف جانے والا راستہ گاؤں کے بچوں بچ گزرتا تھا۔ جب میرا تانگا حنیف کے گھر سے چند گز کی

دوری پر تھا تو ایک عورت اچانک ایک گھر سے نکل کر میرے اٹنے کے لیے آگئی۔

کوچوان کو ہنگامی بنیادوں پر تانگا روکنا پڑا۔ وہ عورت اتنی تیزی سے تانگے کے سامنے آئی تھی کہ اگر کوچوان کو تانگے کو روکنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو گھوڑا مذکورہ عورت کو اپنے پاؤں تلے روند چکا ہوتا۔ اس عورت کا انداز خود کشی ایسا ہی تھا مگر ہوا میں اٹھے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ اس کی وہ حرکت تانگے کو روکنے کے لیے تھی۔

کوچوان نے برہمی سے کہا۔ ”اس کا قصم تو حرام موت مر گیا۔ پتا نہیں، یہ کیا چاہتی ہے؟“

کوچوان کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ ”کون ہے یہ بد بخت؟“

”یہ نواز کی بیوی مریم ہے تھانے دار صاحب۔“

کوچوان رفیق عرف بابا فیکا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

اتنی دیر میں مریم سنبھل کر میرے نزدیک آگئی تھی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں کیا چاہتی ہوں.....“

اس کے احتجاج میں غم کا عنصر شامل تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کوچوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”تمہیکانے بالکل ٹھیک سمجھا ہے۔ مجھے موت چاہیے۔ جب نواز زندہ نہیں رہا تو مجھے بھی جینے کا کوئی حق نہیں۔“ اس کی آواز رندہ گئی۔ ”ڈائن کھا گئی میرے خاوند کو.....“

ڈائن کا لفظ یقیناً اس نے بچوں کے لیے استعمال کیا تھا۔ مریم کو دیکھ کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے نواز کی لاش کا بغور معائنہ کیا تھا۔ وہ ایک وجہہ اور دراز قامت مرد تھا جبکہ مریم اس کا پانسٹک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ تیس پینتیس سال کی ایک پست قد اور سیاہ رو عورت تھی۔ اس کے جسمانی خطوط اور چہرے کے نقوش کے بیچ بھی کوئی توازن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ایک سوا ایک فیصد بے جوڑ مایاں بیوی تھی۔

اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ابھی اندھیرا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ مریم کے انداز گفتگو سے میں نے فوراً اخذ کر لیا کہ اگر میں چند منٹ اس سے بات چیت کروں تو مجھے مفید معلومات حاصل ہونے کے روشن امکانات ہیں۔ میں تانگے سے نیچے اتر آیا اور مریم سے پوچھا۔



”بی بی! تمہارا گھر کس طرف ہے؟“

”میں اسی گھر میں رہتی ہوں تمہارے دار صاحب۔“

اس نے اسی دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے تھوڑی

دیر پہلے وہ برآمد ہوئی تھی۔

”میں تم سے اس ڈائن کے بارے میں چند سوالات

کرنا چاہتا ہوں جو تمہارے خاوند کو نگل گئی ہے۔“ میں نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے گھر

کے اندر بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟“

میرے بھی منہ سے پوچھو کے لیے ”ڈائن“ کا لفظ سن کر

مریم نے ایک آسودہ سانس لی۔ میرے الفاظ نے اس پر

نفسیاتی اثر کیا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ آگئے تھانے دار صاحب۔“

ایک منٹ سے بیشتر میں مقول نواز کی بیٹھک میں

اس کی بیوہ مریم کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس بات

پر برہمی کا اظہار کرنے لگی کہ اسے نواز کی لاش تک جانے

سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے موقع محل کی نزاکت کو سامنے

رکھ کر جب مناسب الفاظ میں اسے سمجھایا تو وہ پرسکون

ہو گئی۔ میں نے نفسیاتی حربے آزماتے ہوئے کہا۔

”مریم! تم نے پوچھو کو ڈائن کہا ہے۔ واقعی، وہ کسی

ڈائن سے کم نہیں تھی۔ تم مجھے بتاؤ، ان دونوں کے بیچ یہ

معاملہ کب سے چل رہا تھا؟“

”میں بہت دیر عورت ہوں تھانے دار صاحب۔“

اس کے آنسو نکل آئے۔

”مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ میں ایک کالی گلوٹی عورت

ہوں۔“ وہ سسکی بھرتے ہوئے بولی۔ ”نواز کو ایک سے

بڑھ کر ایک گوری چٹی اور خوب صورت عورت مل سکتی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ نواز سے کہا کہ وہ کسی حسین و جمیل عورت

سے دوسری شادی کر لے۔ میں نوکرانی بن کر اس کے گھر

میں پڑی رہوں گی اور ان دونوں کی خدمت کروں گی لیکن

وہ بھی دوسری شادی پر تیار نہیں ہوا۔ مجھے کیا پتا تھا.....“ وہ

گلوگیر آواز میں بولی۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ وہ گھر سے باہر کیا

گل کھلاتا پھر رہا ہے۔“

ان لمحات میں مریم شدت جذبات سے بری طرح

مغلوب تھی۔ وہ رکی تو میں نے اپنا سوال دہرانے میں ایک

لمحے کی دیر نہیں کی۔

”مریم! مجھے بتاؤ، پوچھو اور نواز کے درمیان یہ کھڑی

کب سے پک رہی تھی؟“

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں اس معاملے کو جلد از جلد نمٹا دوں

تو تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔“ میں نے ایک ایک لفظ

پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ تم پوچھو کو نواز کا قاتل

سمجھتی ہو لیکن میں نے تم سے کچھ اور پوچھا تھا.....؟“

”جی.....“ وہ گھائل آواز میں بولی۔ ”مجھے کچھ ہی

عرصہ پہلے ان دونوں کے شیطانی تعلقات کے بارے میں

پتا چلا تھا۔“

”کتنا عرصہ پہلے؟“

”یہ ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ بات تمہیں کہاں سے پتا چلی تھی؟“

”مجھے وحید نے اس بارے میں بتایا تھا۔“ اس نے

بڑی سادگی سے جواب دیا۔

اس کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں

نے سوال کیا۔ ”تم اسی وحید کی بات کر رہی ہونا جو چودھری

مبارک کا ملازم ہے اور ادھر ڈیرے پر نواز کے ساتھ ہی

ہوتا تھا؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”وحید نے تمہیں کیا بتایا تھا؟“

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے خاوند پر نظر رکھا

کروں۔“ مریم نے بتایا۔ ”وحید کا خیال تھا کہ نواز اور پوچھو

کے بیچ کوئی چکر چل رہا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ پوچھو اکثر

نواز سے ملنے ڈیرے پر بھی جاتی رہتی ہے۔“

مریم نہایت ہی اہم انکشافات کر رہی تھی۔ میں نے

گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”تو کیا پھر تم نے نواز پر نگاہ

رکھنا شروع کر دی تھی؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”کیوں.....؟“

”سچی بات تو یہ ہے تھانے دار صاحب کہ مجھے وحید

کے کہنے کا یقین ہی نہیں آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”دراصل،

پوچھو کے پھمن ہی ایسے تھے کہ اس کے ساتھ کسی بھی مرد کا نام

جوڑ کر بڑی آسانی سے اسے بدنام کیا جاسکتا تھا لیکن.....“

اس کا لہجہ یک بیک کڑوا ہو گیا۔ ایک لمحے کا توقف کر کے

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے

ہوئے بولی۔

”آج والے شرمناک واقعے نے وحید کی بات کو سولہ

آنے جج کر کے دکھا دیا ہے..... میرے احما د کا جنازہ نکل گیا



ہے تھانے دار صاحب۔ اب میں بھی کر گیا کروں گی۔  
 ”جینا اور مرنا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے  
 مریم۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جب تک  
 مالک نے زندگی لکھی ہوئی ہے تو موت نہیں آسکتی اور جب  
 قدرت کی طرف سے واپسی کا وقت آ جاتا ہے تو کوئی کسی کو بچا  
 نہیں سکتا۔ انسان کو اپنے خالق کے پاس جانا ہی پڑتا ہے۔“  
 اس نے میرے اظہار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بس،  
 دیکھی نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے مزید کہا۔  
 ”تمہیں کم از کم وحید کے بیان کی تصدیق تو کرنا  
 چاہیے تھی۔“

میں نے اس گھر کے اندر طاری سناٹے کی روشنی میں  
 مریم سے پوچھ لیا۔ ”تم لوگوں کے بچے نہیں ہیں؟“  
 ”نہیں جی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔  
 ”ابھی تک ہم بے اولاد ہیں۔“

”تم لوگوں کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟“  
 ”لگ بھگ پانچ سال جی۔“  
 ”تمہیں کسی پر شک ہو تو مجھے بتاؤ۔“  
 ”کیسا شک؟“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔  
 ”مطلب یہ کہ.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں  
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال میں نواز اور پیو کو کس  
 نے قتل کیا ہوگا؟“

”تھانے دار جی.....“ وہ اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ  
 لگاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے۔۔۔ میں  
 خواہ مخواہ کسی کا نام لے کر اپنی مٹی گندی نہیں کرنا چاہتی۔“  
 ”تم تو اپنی تباہی اور نواز کی بربادی کا ذمے دار  
 صرف اور صرف پیو کو سمجھتی ہو۔“ میں نے ایک دوسرے  
 زاویے سے سوال کیا۔ ”لیکن پیو اب اس دنیا میں نہیں ہے  
 اس کا مطلب یہ ہوا کہ نواز کو پیو نے قتل نہیں کیا بلکہ ان  
 دونوں کا قاتل کوئی اور ہے اور..... میں اسی قاتل تک پہنچنا  
 چاہتا ہوں۔“

”ان دونوں کا قاتل چاہے کوئی بھی ہو.....“ وہ  
 ضدی لہجے میں بولی۔ ”لیکن میں تو صرف اتنی بات جانتی  
 ہوں کہ نواز کو پیو کی وجہ سے موت آئی ہے لہذا وہی چڑیل  
 میرے خاوند کی قاتل ہے۔“

مریم کے ذہن کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے  
 مزید جرح کرتا لہذا میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔

”مریم! میں تمہارے شوہر کے قاتل کو جلد از جلد  
 گرفتار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس دوران میں اگر تمہیں  
 قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا۔“

نواز اپنے کردار کے حوالے سے جیسا بھی تھا لیکن  
 مریم جیسی عورت کے لیے وہ کسی عظیم خزانے سے کم اہمیت کا  
 حامل نہیں تھا۔ نواز کی الناک موت نے اس کا سب کچھ

”میں اس حوالے سے نواز سے کچھ نہیں پوچھ سکتی  
 تھی۔“ اس نے بے ٹکا سا جواب دیا تو میں چونک اٹھا اور  
 میں نے سوال کیا۔

”کیوں..... نواز سے بات کرنے میں تمہیں کیا  
 دشواری تھی؟ تم دونوں میاں بیوی تھے۔ ایک چھت کے  
 نیچے رہتے تھے۔ جہاں تم میں درجنوں دوسری باتیں ہوتی  
 تھیں، وہاں ایک یہ بات کیوں نہیں.....؟“

”وہ جی.....“ وہ جڑبڑھوتے ہوئے بولی۔ ”میں  
 نے نواز سے اس لیے اس موضوع پر بات نہیں کی کہ وحید  
 نے مجھے قسم دے رکھی تھی۔“  
 ”کیسی قسم؟“ میں نے استفسار کیا۔

”وحید نے واضح الفاظ میں مجھے کہا تھا کہ اس سلسلے  
 میں اس کا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔“ وہ وضاحت کرتے  
 ہوئے بولی۔ ”وحید اور نواز کی دوستی بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا  
 کہ ان کی دوستی میں کوئی کشمکش پڑے اسی لیے اس نے مجھے  
 سختی سے منع کر دیا تھا۔“

مریم کی بے وقوفی نما سادگی پر میں ایک افسوس ناک  
 سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی  
 وفاداری، فرماں برداری اور نواز کی خیانت پر دکھ بھی محسوس  
 ہوا۔ دراصل مریم اور نواز کی جوڑی میں زمینی حقائق کے  
 باعث اتنی زیادہ دوری تھی کہ مریم شوہر پرستی میں حد سے  
 آگے بڑھ چکی تھی۔ اسے یہ خدشہ ہوگا کہ کہیں اس کی ذرا سی  
 بات پر نواز اس سے روٹھ بھی سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اس  
 کی زندگی سے بھی رخصت ہو سکتا ہے لہذا وہ اس کی ناراضی  
 کے ڈر سے زبان بند رکھنے پر مجبور تھی۔

انسانوں کو انسانوں سے نمٹنے کے لیے آنکھیں کھلی  
 رکھتے ہوئے عقل کا استعمال کرنا چاہیے۔ ہر شے اعتدال  
 کے دائرے ہی میں اچھی لگتی ہے۔ حد سے تجاوز شوہر پرستی



چھین کر اسے تھی دست و پاں لڑا تھا۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا پھر پوچھا۔ ”نواز کی لاش مجھے کب تک مل جائے گی؟“

”ہسپتال سے جیسے ہی مقتولین کی لاشیں تھانے پہنچیں گی، میں تمہیں خبر کر دوں گا۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”پھر تم میرے پاس آ جانا۔ میں ضروری کاغذی کارروائی کے بعد نواز کی لاش تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی تاہم منہ سے کچھ نہیں بولی۔ میں مریم کے گھر سے لکھا اور تانگے میں بیٹھ کر حنیف کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر شوکت کی زبانی مجھے بتا چلا کہ حنیف ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ مریم سے پوچھتا چھ کے درمیان مجھے ایک بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس اللہ کی بندی نے اپنے شوہر کے قتل کے حوالے سے ایک بار بھی حنیف کا نام نہیں لیا تھا حالانکہ..... بادی النظر میں قاتل کی حیثیت سے پھنوس کے شوہر حنیف ہی کی طرف دھیان جاتا تھا۔ مریم کا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

میں نے شوکت سے پوچھا۔ ”حنیف عموماً کتنے بچے تک گھر آ جایا کرتا تھا؟“

”ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ رات ہو جائے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ دن کی روشنی ہی میں واپس آ جاتا تھا۔“

خلاف معمول حنیف کی غیر حاضری نما روپوشی اس کی ذات کے حوالے سے ان گنت شکوک و شبہات کو جنم دے رہی تھی۔ میں نے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں واپس تھانے جا رہا ہوں اور تمہارے ذمے ایک اہم کام لگا کر جا رہا ہوں۔“

وہ ہر تن گوش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”جیسے ہی تمہارا ساڑھو حنیف واپس آئے، تم مجھے فوراً اطلاع دو گے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں تھانے دار صاحب۔ اس تالائق کو واپس تو آنے دیں۔ میں خود اسے کان سے پکڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا لیکن.....“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

”مجھے یقین ہے کہ دہرے قتل کی اس واردات میں حنیف کا کوئی ہاتھ نہیں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

”یہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت بہت جلد اس بات کا فیصلہ کر دے گا کہ کون قصور وار ہے اور کون بے گناہ!“ وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں تانگے میں بیٹھ کر تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد میں نے عشا کی نماز ادا کی اور پھر جیسے ہی سونے کے لیے لیٹا تو میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کانشیل نسیب کی شکل نظر آئی۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”ملک صاحب! حنیف آ گیا ہے۔“

”کیا وہ اکیلا ہی آیا ہے؟“

”اس کا ساڑھو شوکت بھی ساتھ ہے جناب۔“ کانشیل نے بتایا۔ ”وہ لوگ چارے سے لدی ہوئی تیل گاڑی پر سوار ہو کر تھانے پہنچے ہیں۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، انہیں بٹھاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔“

”جی ملک صاحب!“ کانشیل یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جب میں عوامی لباس میں اپنے کمرے میں پہنچا تو حنیف اور شوکت کو میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں نے باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر شوکت سے پوچھا۔

”کیا تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ میرا اشارہ حنیف کی جانب تھا۔

”باتیں تو بہت ہوئی ہیں تھانے دار صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن یہ تو قسمیں کھا رہا ہے کہ پھنوس اور نواز کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔“



میں نے تیز نظر سے صنف کی طرف دیکھا اور کہا۔  
 ”اس کا مطلب ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں  
 آ سکے گی۔ مجھے تمہارے ساتھ کوئی غیر شریفانہ انداز ہی  
 اختیار کرنا پڑے گا۔“

بات ختم کرتے ہی میں نے وردازے کی جانب  
 دیکھتے ہوئے آواز لگائی۔ ”بہادر علی! ذرا میرے کمرے  
 میں آؤ۔“

بہادر علی میرے تھانے کے ایک سخت گیر حوالدار کا  
 نام تھا۔ وہ اپنے مزاج میں ایسا تھا کہ اس کی ”کارروائی“  
 کے نتیجے میں پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔  
 میرے لہجے کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے حنیف منت ریز لہجے  
 میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”سب پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی  
 تمہاری زبان شیپ ریکارڈر کی طرح چلنے لگے گی۔“

”جناب! ایک تو میری بیوی کل ہوئی، اوپر سے آپ  
 مجھے ہی پریشان کر رہے ہیں۔“ وہ خوف سے لرزتی ہوئی  
 آواز میں بولا۔ ”یہ کیسا قانون ہے؟“

”سارے قانون قاعدے تمہیں ابھی پڑھا دیے  
 جائیں گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے  
 سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم آسانی سے چھوٹنے والے  
 نہیں ہو۔“

وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ جب بہادر علی میرے  
 کمرے میں داخل ہوا تو میں نے شوکت کو وہاں سے  
 رخصت کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”تم ادھر باہر جا کر برآمدے  
 میں بیٹھو۔ اگر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں اندر  
 بلا لوں گا۔“

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔

میں نے حنیف کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے  
 جارحانہ انداز میں کہا۔ ”ہاں بھئی، میں مارخان! تم نے کیا  
 فیصلہ کیا ہے۔ تم شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی سچ بتا  
 دو گے یا حقیقت کو تمہارے اندر سے برآمد کرنے کے لیے  
 مجھے کوئی خاص محنت کرنا پڑے گی؟“

”جناب! میں بالکل بے قصور ہوں۔“ وہ فریادی  
 لہجے میں بولا۔ ”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

”مگر مجھے تو تم پر ہی شک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ  
 دوپہر میں تمہیں کھانا دینے گئی تھی اور پھر گھر نہیں پہنچی۔“

”جناب! یہ ٹھیک ہے کہ وہ دوپہر میں میرے لیے

کھانا لے کر آئی تھی اور بالکل سچ سلامت واپس گئی تھی۔“  
 اس نے بتایا۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ وہ.....“

وہ بولتے بولتے رکا اور ندامت سے گردن جھکالی۔  
 گردن کا یہ جھکاؤ ذلت اور رسوائی کے اس بوجھ کا نتیجہ تھا جو  
 اس کی بیوی پر دین عرف بیٹو نے اس پر ڈال دیا تھا۔ ان  
 لمحات میں حنیف مجھے ایک مجبور اور بے بس شخص نظر آیا لیکن  
 میں اپنے فرض سے مجبور تھا لہذا میں نے سوالات کا سلسلہ  
 جاری رکھا۔

”کیا تمہیں بیٹو اور نواز کے معاملات کی خبر تھی؟“  
 ”نہیں..... بالکل نہیں۔“

”دیکھو، اگر تم سچ بولو گے تو میں تمہارے لیے آسانی  
 پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”ورنہ تم مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔“

”جناب! میں نے آپ سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں  
 کہا۔ آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے  
 پوچھا۔ ”آج دوپہر میں بیٹو کھانا لے کر کتنے بجے تمہارے  
 پاس پہنچی تھی؟“

”اس وقت دوپہر کا ایک بجتے والا تھا۔“ اس نے  
 جواب دیا۔

”وہ کتنی دیر تک تمہارے پاس رکی تھی؟“  
 ”کوئی بیس پچیس منٹ۔“

”اس کا مطلب ہے، وہ سوا اور ڈیڑھ کے درمیان  
 کسی وقت تمہارے پاس سے رخصت ہوئی ہوگی۔“ میں  
 نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس وقت دوپہر کا  
 ڈیڑھ ہی بجا ہوگا۔“

”کیا تم نے آج بیٹو کے رویے میں کوئی خاص بات  
 نوٹ کی تھی؟“

”نہیں جناب! میں نے تو ایسا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔“  
 ”بیٹو کے جانے کے بعد تم کھیتوں میں کیا کرتے  
 رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنے اور شوکت کے جانوروں کے لیے چارا  
 کاٹتا رہا تھا۔“

”تم عموماً سورج غروب ہونے سے پہلے گھر واپس  
 آ جاتے ہو۔“ میں نے چھیٹتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔  
 ”آج کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں نظام آباد چلا گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”نظام آباد



پیشکش کریں اور خوب صورت سلسلوں سے جاکر ستمبر 2016 کا مہینہ پُر کریں

کراچی

# پاکینہ

ماہنامہ

انجم انصار اور رفعت سراج..... کے قسط وار ناولوں کی دلفریب اقساط

در ثمن بلال کا سلسلے وار ناول..... اے عشق ترے ہیں کھیل عجب کا خوب صورت اختتام

خوب صورت عنوان اور پراثر بیان لیے سحر ساجد کا دلنشین ناول..... من جانبازم

سیما رضا ردا کی دلکش تحریر..... ہم کو عبث بد نام کیا منی ناول کی صورت

محرم الحرام کی مناسبت سے فلسفہ شہادت پر اختر شجاعت کا پر فکر مضمون

نزہت اصغر.....

وہ آنے بزم میں..... ملاقات کرائیں گی معروف

رائٹر ثمینہ عظمت علی سے

اس کی علامت

شگفتہ شاہ، نیلم احمد بشیر کی خصوصی تحریروں کے ساتھ، سات پڑھے اُم ایمان،  
عقیلہ حق، عنیزہ سید، ہاجرہ ریحان، فرحین اظفر، نادیہ احمد،  
صدف آصف، ودیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین کاوشیں

دلچسپ معلوماتی اور تفریحی مستقل سلسلوں کا مجموعہ صرف آپ کے لیے



میں عارف سے مجھے کچھ رقم لینا تھی۔ یہ بات میں نے دن میں پونہ کو بھی بتادی تھی کہ آج رات کو دیر سے گھر آؤں گا۔

”پونہ تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی جو تمہارے بیان کی تصدیق کر سکے۔“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ ”لیکن میں تمہاری بات کی صداقت جانچنے کے لیے نظام آباد جاسکتا ہوں۔“

”ضرور تمہانے دار صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”عارف جب میرے بیان کی تصدیق کرے گا تو آپ کو میری بات پر یقین آجائے گا۔“

میری تجربہ کار نگاہ نے بتایا کہ حنیف دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے جھوٹ کی بو نہیں آتی تھی۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے میں نے حوالدار بہادر علی کو کمرے سے رخصت کر دیا تاکہ حنیف آزادی اور بے خوفی سے بات کر سکے۔ بہادر علی کی موجودگی میں وہ خاصا ڈرا سہا کھڑا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تھکسانہ انداز میں کہا۔

اس نے ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد میرے حکم کی تعمیل کی پھر حیرت اور بے یقینی کے طے چلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ”آپ تو بہت اچھے ہیں تمہانے دار صاحب۔“

”میں اچھوں کے لیے اچھا اور بدوں کے لیے برا ہوں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نے بندے دے پتر کی طرح میرے سوالوں کے بالکل سچے جواب دیے تو میں تمہیں زندہ سلامت واپس جانے کی اجازت دے دوں گا لیکن اگر مجھے محسوس ہوا کہ تم کوئی چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو تو میں پھر تمہیں بہادر علی کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں میں لگا لے گا۔“

بہادر علی ایک تنومند، کرخت صورت اور چاق و چوبند حوالدار تھا۔ اس کی کمرے میں موجودگی نے حنیف کو خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”نہیں تمہانے دار صاحب! کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے، میں اس کا جواب دوں گا۔“

”سچا اور کھرا جواب؟“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی جی۔۔۔۔۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”میں نے رات کی قسم!۔۔۔“ حنیف نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”بتاؤ، تم آج جس کام سے نظام آباد گئے تھے وہ ہوا کہ نہیں؟“

”نہیں ہوا جی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”عارف نے ٹال دیا ہے۔ دس پندرہ دن کے بعد دوبارہ ادھر جاؤں گا۔“

”تم نظام آباد جانے کے لیے اپنے کھیتوں سے کتنے بچے روانہ ہوئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”لگ بھگ چار بچے جناب۔“

”حنیف!“ میں نے ایک مرتبہ پھر تھوڑی دیر پہلے پوچھے گئے سوال کو دہرا دیا۔ ”کیا تمہیں پونہ اور نواز کے غیر اخلاقی تعلقات کا علم تھا؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے چونک کر اپنے عقب میں کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا پھر بتایا۔

”نہیں جناب! مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

اسی قسم کا جواب وہ پہلے بھی دے چکا تھا۔ میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے دوستانہ انداز میں کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ ہمارے درمیان ہونے والی باتیں ہم دونوں ہی کے بیچ رہیں گی۔“

میں نے اس کے اچانک چونک کر پیچھے دیکھنے سے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ کوئی اور سن نہ لے۔

”تمہانے دار جی!“ وہ جبربز ہوتے ہوئے بولا۔

”میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے، یہ سچ ہے کہ مجھے پونہ اور نواز کے تعلقات کا علم نہیں تھا۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”پونہ سے تمہاری شادی کتنا عرصہ پہلے ہوئی تھی؟“

”کوئی سات، ساڑھے سات سال ہو گئے ہیں۔“

”پھر تو تم اپنی بیوی کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہو گے؟“ میں نے پوچھا۔

یہ سوال میں نے بڑے معنی خیز انداز میں کیا تھا۔ وہ الجھ کر رہ گیا اور اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ ”جی۔۔۔۔۔“

”دیکھو، میری بات کا برا نہیں منانا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے اب تک پونہ کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، وہ اطمینان بخش نہیں



ہیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اس نے لفظ ”کوشش“ پر اصرار کر دیا تھا کہ میں سنائے میں آگیا۔ اس نے ایک تلخ حقیقت بیان کر دی تھی۔ اس سلسلے میں اب حنیف سے مزید کسی سوال کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

بات ختم کرتے ہی اس نے گردن جھکالی۔ ایک منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے اپنا تہ بھرے انداز میں کہا۔ ”حنیف! ان حالات میں تمہارا یہ فرض بنتا تھا کہ پیو کو سمجھاتے۔ تم اس کے خاوند تھے؟“ یہ سچ ہے کہ ہر شخص کو آنسو بہانے کے لیے ایک کندھے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ہمدردی بھرے انداز نے اسے دل کا حال بتانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں..... اسے کیا..... سمجھاتا..... پیو پر تو..... کبھی میرا بس..... نہیں چل سکا۔“

”تم اس کے مجازی خدا تھے۔“ میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایک کاری چوٹ لگائی۔ ”تمہیں اس پر قانونی، شرعی، اخلاقی..... ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔ تم زبردستی سے بھی کام لے سکتے تھے۔“

”کاش میں ایسا کر سکتا۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”ساری دنیا یہی سمجھتی ہے کہ میں پیو کا مجازی خدا تھا۔“ وہ روہانسا ہو گیا۔

”تو کیا ایسا نہیں تھا؟“ میں نے نرم لہجے میں کرید جاری رکھی۔ ”مجھے اپنا دوست سمجھو اور سب سچ بتا دو۔“ وہ پھٹ پڑا۔ ”آج تک پیو نے تمہائی میں مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیا۔“

میں چونک اٹھا۔ ”حنیف! کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ”آپ سیاتے ہیں۔“ وہ نظر جھکاتے ہوئے بولا۔

”بہت آسانی سے میرا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔“ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے اور اس ”سمجھ“ سے میرا دماغ سنسناتا اٹھا تھا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”تم تو ایک چار سالہ بچے کے باپ ہو..... تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا جو اس قسم کی اوٹ پٹانگ بات کر رہے ہو؟“

”ملک صاحب.....!“ وہ نگاہ جھکائے جھکائے دکھی لہجے میں بولا۔ ”اگر اولاد قسمت میں لکھی ہو تو وہ مل ہی جاتی ہے۔ کبھی باپ کے طفیل اور کبھی ماں کی کوشش سے.....“

جب حنیف معتدل ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں صاف کر لیں تو میں نے اس کے ساڑھو شوکت کو بھی اندر کمرے میں بلا لیا۔ اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دہرے قتل کی اس سنگین واردات میں کسی بھی طور حنیف ملوث نہیں تھا۔ میں نے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”حنیف کو یہ رات تو میرے تھانے کی حوالات ہی میں گزارنا ہوگی۔ کل میں کسی پولیس اہلکار کو نظام آباد بھیج کر اس کے بیان کی تصدیق کراؤں گا۔ اگر اس کی بات درست ثابت ہوئی تو میں اسے گھر جانے کی اجازت دے دوں گا۔“

حنیف نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”تھانے دار صاحب! مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے۔“

حنیف کی تائید کے بعد شوکت کے پاس کسی حیل و حجت کی گنجائش نہیں بچی تھی۔ وہ اپنے ساڑھو کو میرے پاس چھوڑ کر واپس شہزاد کوٹ چلا گیا۔

جب میں سونے کے لیے لیٹا تو میرا ذہن اسی کیس کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا۔ دو چیتے جاگتے انسان موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ اگر یہ قتل حنیف نے نہیں کیے تھے تو پھر پیو اور نواز کا قاتل کون تھا؟ مجھے جلد از جلد اس خطرناک سوال کا جواب تلاش کرنا تھا۔

میں نے پیو اور نواز کی باہم بیوست لاشوں کا بغور جائزہ لیا تھا اور میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انہیں ایک خاص ”مصروفیت“ میں مشغول، بے خبری کی کیفیت میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وہ جس ”حالت“ میں تھے، اس کا تقاضا تھا کہ کمرے کے دروازے اور کھڑکی کو بند رکھا جائے۔ اگر قاتل باہر سے آکر ان پر قاتلنگ کرتا تو وہ ”بے



خبری کی حالت میں موجود رہا۔ پھر سے آنے والے کوکھڑی یاد روزہ کھولنا پڑتا اور ایسا ہوتے ہی پھو اور نواز کا چونک جانا لازمی تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ پہلے سے اس کمرے میں کہیں چھپا بیٹھا اس موقع کا انتظار کر رہا تھا۔

حنیف کی ذات اس لیے بھی شک کے دائرے سے باہر نکل آئی تھی کہ پھو اسے کھانا کھلانے کے بعد ڈیرے کی طرف آئی تھی لہذا حنیف کا پہلے سے اس کمرے کے اندر چھپا ہونا ممکنات میں سے نہیں تھا۔

میں انہی خیالات کے ساتھ فٹ بال کھیلے ہوئے نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز تھانے آتے ہی میں نے ایک پولیس اہلکار کو حنیف کے بیان کی تصدیق کے لیے نظام آباد روانہ کر دیا۔ دوپہر کے وقت حوالدار بہادر علی میرے کمرے میں آیا اور انکشاف انگیز لہجے میں اس نے بتایا۔

”ملک صاحب! آؤ کل برآمد ہو گیا ہے۔“

”اوہ.....!“ میں اچھل پڑا۔ ”تم اس پستول کی بات کر رہے ہو جس سے کل پھو اور نواز کو چودھری مبارک کے ڈیرے پر قتل کیا گیا تھا؟“

”جی جی..... میں اسی ریوالور کی بات کر رہا ہوں۔“

”کہاں ہے وہ ریوالور؟“

”آلہ قتل کی دریافت کا سہرا شوکت کے سر بندھا ہے ملک صاحب۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔

”آج صبح ہی صبح اس نے تھانے آکر بتایا ہے کہ جب اس نے جانوروں کو چار اڈالنے کے لیے تیل گاڑی کا رخ کیا تو مذکورہ ریوالور اس کی نگاہ میں آگیا۔ رات گھر پہنچنے کے بعد اس نے بیلوں کو کھول کر گاڑی کو اپنے گھر میں محسن کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا لیکن چار اگاڑی کے اوپر ہی رہا تھا۔ آج صبح جب اس نے چارے کو گاڑی سے اتار کر ایک ڈھیر لگایا تو اس کے اندر سے ریوالور نکل آیا۔“

بات کے اختتام پر بہادر علی نے کپڑے میں لپٹے ہوئے آلہ قتل، اس ریوالور کو میرے سامنے پیش کر دیا۔

میں نے بغور ریوالور کا معائنہ کرنے کے بعد بہادر علی سے پوچھا۔ ”کیا یہ ریوالور اسی طرح کپڑے میں لپٹا ہوا ملا ہے؟“

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب! کپڑے میں تو اسے میں نے لپٹا ہے۔ شوکت تو اسے ایسے

سوال نہیں کیا۔“ حوالدار نے جواب دیا۔

آج صبح جب میں نے ایک پولیس اہلکار کو حنیف کے بیان کی تصدیق کے لیے نظام آباد روانہ کیا تو اس کے فوراً بعد ہی ایک اہم امور کی انجام دہی کے لیے مجھے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر جانا پڑ گیا تھا۔ اسی دوران میں شوکت نے وہ ریوالور تھانے پہنچایا تھا۔

”ٹھیک ہے، تم حنیف کو میرے پاس بھیج دو۔“ میں نے حوالدار سے کہا۔ ”میں خود اس سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔“

بہادر علی میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

یہ جس زمانے کا ذکر ہے، ان دنوں جدید ترین تفتیشی ٹیکنالوجی کے بغیر صرف ہاتھ پاؤں اور دماغ کا استعمال کر کے ہی پیچیدہ کیس کو حل کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں فکر پرش وغیرہ اٹھانے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عدالت انگلیوں کے نشانات کے ثبوت کو کوئی اہمیت دیتی تھی لیکن یہ ریوالور چونکہ حنیف کی چارے والی تیل گاڑی میں سے برآمد ہوا تھا لہذا اس سے اس معاملے پر پوچھ گچھ ضروری ہو گئی تھی۔

جب وہ میرے کمرے میں پہنچا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”حنیف! آلہ قتل برآمد ہو گیا ہے۔“

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ”کہاں سے؟“

”تمہاری تیل گاڑی پر لدے ہوئے چارے کے ڈھیر میں سے۔“

”وہاں..... کس نے رکھا؟“ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”وہ تیل گاڑی کس کی ملکیت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری جناب.....!“

”پھر اس سوال کا جواب بھی تم ہی دو گے۔“ میں نے کہا پھر مذکورہ ریوالور کی جھلک اسے دکھانے کے بعد اضافہ



”فائرنگ کی آواز.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم بالکل نئی بات بتا رہے ہو۔“

”جی..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”فائرنگ کی آواز کس طرف سے آئی تھی؟“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”ڈیرے کی طرف سے جناب!“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر تصدیق طلب نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”فائرنگ کی یہ آواز تم نے وحید کے آنے سے پہلے سنی تھی یا اس کے جانے کے بعد؟“

”میں نے یہ آواز وحید کے آنے سے پہلے سنی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”کتنی دیر پہلے؟“ میرے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

”کوئی لگ بھگ ایک گھنٹہ پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ میرا اندازہ ہے۔ اس میں دس پندرہ منٹ کا فرق ہو سکتا ہے۔ ہاں، یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فائرنگ کی وہ آواز پھونکنے کے جانے اور وحید کے آنے کے درمیان کسی وقت سنائی دی تھی۔“

”تو کیا تم نے وحید سے اس فائرنگ کے حوالے سے پوچھا تھا؟“

”جی، پوچھا تھا مگر اس نے بتایا کہ وہ بڑی نہر کی طرف سے آرہا ہے اور یہ کہ اس نے فائرنگ کی کوئی آواز نہیں سنی۔“

حنیف کے پہلے بیان کے مطابق، پیٹیو کم و بیش ڈیڑھ بجے دوپہر اس کے پاس سے رخصت ہوئی تھی اور وحید لگ بھگ ساڑھے تین بجے حنیف کے پاس پہنچا تھا۔ اس حساب سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پیٹیو کوئی پونے دو بجے ڈیرے پر پہنچی ہوگی اور ڈھائی، پونے تین بجے کے اریب قریب اسے نواز کی معیت میں موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ وقت کے حوالے سے یہ میرا محاط اندازہ تھا۔ موت کا درست وقت پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی سے پتا چل سکتا تھا۔

حنیف سے سننی خیر پوچھنا چھ کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اس کا ساڑھو شوکت بھی تھانے پہنچ گیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ہمارے بیچ مزید دس منٹ تک اسی موضوع پر بات ہوتی رہی پھر میں نے حنیف کو شوکت کے ساتھ موضع شہزاد کوٹ جانے کی اجازت دے

کیا۔ ”یہ ریوالتور تھا ہمارے ساڑھو شوکت کو چار بجے کے اندر سے ملا ہے۔ یا تو یہ ریوالتور تم نے چار بجے میں چھپایا تھا یا پھر یہ تمہارے ساڑھو کا کیا دھرا ہے۔“

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا تھا نے دار صاحب۔“

”پھر یہ شوکت کی کارستانی ہوگی؟“

”نہیں.....“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”شوکت مجھے کسی چکر میں پھنسانے کے لیے ایسی نیچ حرکت نہیں کر سکتا۔ میں شوکت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں مگر.....“

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھنے بتانہ رہ سکا۔ ”مگر کیا؟“

”مجھے لگتا ہے.....“ وہ بیجانی انداز میں بولا۔ ”یہ وحید کی شیطانی ہو سکتی ہے۔“

وحید کے نام پر میرا چونک جانا لازمی تھا۔ میں نے حنیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

”پتا نہیں، میری مت ماری گئی ہے۔“ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات مجھے کل رات کیوں نہیں یاد آئی۔“

”رات گئی، بات گئی۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اگر اب کوئی اہم بات تمہیں یاد آئی گئی ہے تو فوراً مجھے بتاؤ۔“

”جناب! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ وہ جذبات سے معمور لہجے میں بتانے لگا۔ ”کل جب میں کئی ہوئی گھاس کو اپنی تیل گاڑی پر رکھ رہا تھا تو وحید میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھ سے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کیں پھر وہ چارے کو گاڑی پر رکھنے میں میری مدد کرنے لگا۔ مجھے لگتا ہے، وحید نے میری نظر بچا کر یہ ریوالتور گھاس والے انبار میں کہیں چھپا دیا ہوگا۔“

حنیف کے انکشاف نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ وحید سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی حالانکہ میں اس کا تفصیلی انٹرویو کرنے کے موڈ میں تھا۔ وہ محتول نواز کے ساتھ ڈیرے پر ہی رہتا تھا پندرہ دہرے قبل کی اس سنگین واردات پر بہتر انداز میں روشنی ڈال سکتا تھا۔

”وحید تمہارے پاس کتنے بجے آیا تھا؟“

حنیف نے جواب دیا۔ ”اس وقت ساڑھے تین یا چار بجے ہوں گے۔ میں اس کے بعد ہی نظام آباد کی طرف گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے میں نے فائرنگ کی



دی۔ ان دونوں کی طرف سے ہر ذہن صاف ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ان دونوں کا جینو اور نواز کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

گزشتہ روز چودھری مبارک نے اپنی حویلی میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ وحید کو میرے پاس تھانے بھیج دے گا۔ میں چونکہ دن کے ابتدائی حصے میں، تھانے میں موجود نہیں تھا لہذا وحید کے بارے میں، میں نے حوالدار بہادر علی سے استفسار کیا۔

”نہیں ملک صاحب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”چودھری کا نوکر وحید تو ادھر پھٹکا بھی نہیں۔“ ”اگر وہ ادھر نہیں پھٹکا تو اب اس کے ادھر چلنے کا وقت آ گیا ہے۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”آپ حکم کریں ملک صاحب؟“ بہادر علی یکا یک ریڈارٹ ہو گیا۔

”حکم تو میں تمہیں بعد میں دوں گا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”پہلے تم اس شیطان کی اولاد کو یہاں تو حاضر کرو۔“

وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔“

”تمہیں سیدھا چودھری مبارک کے ڈیرے پر پہنچنا ہے۔“ میں نے تاکید لہجے میں کہا۔ ”وحید کو اس وقت ڈیرے پر ہی موجود ہونا چاہیے۔ تم اپنے ساتھ دو کانشیلو کو بھی لے جاؤ اور وحید کو گرفتار کر کے تھانے لے آؤ۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا بہادر علی۔ وحید چاہے جتنی بھی کوشش کر لے مگر کسی بھی صورت اسے چودھری مبارک سے ملنے نہیں دینا۔“

وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ”اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب۔“

موجودہ حالات کی ہل ہل بدلتی صورت میں وحید کی ذات انتہائی مشکوک ہو گئی تھی اور حنیف کے تازہ ترین انکشافات کے بعد تو وحید کو ٹرائل روم کی سیر کرانا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شام سے چند منٹ پہلے حوالدار بہادر علی، وحید کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ وحید اپنی گرفتاری پر اگرچہ کافی پریشان نظر آتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ حوالدار کو

عمر نامک تھانے کی دھمکیاں دینے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنے حوالدار سے پوچھا۔ ”اس سرکاری سائڈ کو گرفتار کرنے میں تمہیں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟“

”جناب! اس کبخت کی زبان درازی نے بڑی کھپ ڈال رکھی ہے۔“ بہادر علی نے ناپسندیدہ نظر سے وحید کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”یہ ایس پی اور آئی جی تک اپنی پہنچ کی باتیں کر رہا ہے۔“

”کیا تم نے اس کی زبان بندی کے لیے کوئی وظیفہ نہیں پڑھا؟“ میں نے معنی خیز انداز میں بہادر علی سے دریافت کیا۔

”ابھی تک تو میں نے اسے بس، دو چار جھانپڑ ہی رسید کیے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے اسے میری حویلی میں دے دیں تو اگلی پچھلی ساری کسر نکال دوں گا۔“

”فکر نہ کرو بہادر علی۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس بندے کے حور تو یہی بتا رہے ہیں کہ ایک دو گھنٹے کے لیے تمہیں اس کی مہمان داری کا موقع ضرور ملنا چاہیے لیکن فی الحال اسے تم تھوڑی دیر کے لیے میرے کمرے میں چھوڑ دو۔ پہلے میں اس کی خیر خیریت پوچھوں گا۔ تمہاری ”باری“ بعد میں آئے گی۔“

بہادر علی میری بات کو سمجھ گیا۔ اس کے کمرے سے رخصت ہونے کے بعد میں وحید کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وحید کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک ہٹا کٹا انسان تھا۔ وہ عام سی شکل و صورت کا مالک ایک تیز طرار بندہ نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی لومڑی ایسی مکاری اور کسی سانپ جیسی چمک پائی جاتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ تو وہ لب و لہجہ اختیار نہیں کیا جس میں وہ بہادر علی سے گفتگو کر چکا تھا تاہم خاصی برہمی سے مستفسر ہوا۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے مجھے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

”تمہارا جرم بہت سنگین ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اگر شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تم اپنا جرم قبول کر لو گے تو تمہارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی ورنہ میں تمہیں جلاؤ کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”جلاؤ..... کون جلاؤ؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”میں حوالدار بہادر علی کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جو تمہیں گرفتار کر کے



## جوار بھاتا ف دی جوک

بیوی۔ ”میں بازار جارہی ہوں، ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے۔“  
شوہر (غصے سے)۔ ”تمہیں روپوں سے زیادہ عقل کی ضرورت ہے۔“  
بیوی۔ ”مگر آپ سے وہی چیز مانگی جاسکتی ہے، جو آپ کے پاس ہو۔“

☆☆☆

استاد (شاگرد سے)۔ ”بتاؤ اکبر اعظم کی کھل کتنی بیویاں تھیں؟“  
شاگرد۔ ”سرا مجھے کیا معلوم، میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔“

☆☆☆

ایک لڑکا۔ ”کیا تمہیں وہ لڑکی یاد ہے ابھی تک جس سے تم نے پہلی مرتبہ محبت کی تھی؟“  
دوسرا لڑکا۔ ”نہیں! میری یادداشت بہت کمزور ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی بھی یاد نہیں، جس نے آج صبح مجھ سے اظہار محبت کیا تھا۔“

مرسلہ۔ سردار ظفر اقبال وڈا رنج،  
جو وہ پور کبیر والا خلیج خانہ وال

## لطیفہ

سردار اپنے دوست سے۔ ”یارا اپنی گرل فرینڈ کو متحد دینا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کیا دوں؟“  
دوست۔ ”سونے کی انگوٹھی.....“  
سردار۔ ”یارا کوئی بڑی چیز بتاؤ.....“  
دوست۔ ”ٹریکٹر دا پچھلا ٹائر دے دے۔“

## مسکرائیے

دو دوست ہوئیں کھانے کا گھر ہے تھے۔  
ایک نے کہا۔ ”یارا تم میری ماں بن جاؤ اور اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں کھانا ڈالتے جاؤ۔“  
کھانے کے بعد دوسرے نے کہا۔  
”اب تم میرے باپ بن جاؤ اور مل ادا کرو۔“  
مرسلہ۔ عہدِ لہجہ رومی انصاری، لاہور

یہاں لایا ہے اور اہل کے دل میں تمہاری خاطر داری کی خواہش کروائیں لے رہی ہے۔“

بہادر علی کے ذکر پر اس نے برا سامنہ بنایا پھر کمال ڈھٹائی سے بولا۔ ”جب میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تو پھر اقبال جرم کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“  
”جواب اور سوال پیدا کرنے کا کام مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے اور یہ پیداوار میں تمہارے اندر سے حاصل کروں گا۔“

وہ ابھی ہوئی نظر سے مجھے نکلنے لگا۔ میں نے اپنی میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا پھر کپڑے میں لپٹا ہوا ریو الور نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور پوچھا۔ ”جانتے ہو، یہ کیا ہے؟“  
”کیا ہے؟“ وہ مکاری سے بولا۔

”یہ بیس بور کا ریو الور ہے۔“ میں نے کپڑے کی تہوں کو کھولتے ہوئے کہا۔ ”اور اسی ریو الور کی مدد سے نواز اور پیٹو کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے..... میری بات آئی سمجھ میں؟“

ریو الور کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شامرانہ چمک پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میری تجربہ کار نگاہ کو یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ وحید اس ریو الور کو اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ اپنی تصدیق کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”اس ریو الور کو پہچانتے ہو.....؟“  
”یہ ایک ہتھیار ہے جناب!“ وہ نے تے الفاظ میں بولا۔  
”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ ایک ہتھیار ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے اس کی شناخت کے بارے میں تم سے سوال کیا تھا؟“

”میں اس ہتھیار کو کیوں پہچانوں۔“ اس کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ”اس ریو الور کا مجھ سے کیا لینا دینا تھا نے دار صاحب؟“

”اس کا مطلب ہے کہ تم شرافت سے اس بات کا اقرار نہیں کرو گے کہ اس ریو الور کو تم نے حنیف کی چارے والی تیل گاڑی میں چارے کے اندر چھپایا تھا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ بجا کر سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔  
”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ جھج سے مشابہ آواز میں بولا۔  
”آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”یہ تمہانہ ہے، تمہاری خالہ کے گھر کا صحن نہیں۔“ میں نے اسے ایک زوردار دھکا مارا۔ ”اگر اب تم نے اوپنی آواز میں بات کی تو میں تمہاری زبان کو گدی سے منہج کر باہر نکال



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

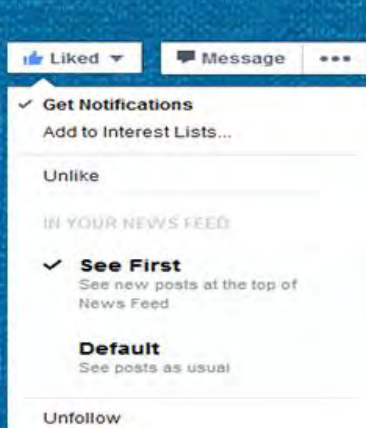
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**





لوں گا۔ پھر زندگی بھر بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔“  
میرے اچانک بدلتے ہوئے تیور کو دیکھ کر اس کے  
جارحانہ انداز میں خاصی کمی واقع ہوئی پھر وہ معتدل لہجے  
میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! میں اس ریوالور کے  
بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”گویا تم اس بات سے انکاری ہو کہ تم نے اس  
ریوالور کی مدد سے بیٹو اور نواز کا خون کیا ہے؟“ میں نے  
ایک خاص چال چلتے ہوئے کہا۔  
”میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔“ وہ قدرے گھبرائے  
ہوئے انداز میں بولا۔ ”آپ اتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں تو  
اس کا کوئی ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟“

”ہاں، ہے ثبوت..... بہت ٹھوس ثبوت!“ میں نے  
اپنے ذہن میں موجود منصوبے کے تحت کہا۔  
”کیا ثبوت ہے؟“ اس نے حذب لب لہجے میں پوچھا۔  
”فنگر پرنٹس کی ریکورڈ ہے میرے پاس۔“  
میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔  
”میں نے اس ریوالور کا لیبارٹری ٹیسٹ کرایا ہے اور اس پر  
تمہاری انگلیوں کے واضح نشانات پائے گئے ہیں۔“

وہ میری چال میں آگیا اور جلدی سے بولا۔ ”یہ نہیں  
ہو سکتا..... میں نے تو.....“ بات ادھوری چھوڑ کر وہ وحشت  
زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے میری چال  
میں پاؤں رکھ کر میرا کام آسان کر دیا تھا۔ میں نے سخت  
لہجے میں کہا۔  
”کیوں نہیں ہو سکتا یہ..... اس لیے ناکہ تم نے  
ریوالور کو چارے کے ڈبیر میں چھپاتے وقت اس پر سے  
اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے تھے..... ہیں نا؟“

”میں نے کسی کو قتل و قتل نہیں کیا۔“ اس کی ڈھٹائی  
میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ ”آپ کو میرے بارے  
میں کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“  
”غلط فہمی کی اولاد.....“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ کل دن میں لگ بھگ ساڑھے تین،  
چار بجے تم ادھر کھیتوں میں حنیف سے ملے تھے اور تم نے  
گاڑی پر چارالادنے میں حنیف کی مدد بھی کی تھی؟“

”جناں! میں نے تو کل کا پورا دن حنیف کی شکل ہی  
نہیں دیکھی۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔  
اس کی دروغ گوئی نے مجھے سلا کر رکھ دیا تاہم میں  
نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”یہ بات بھی بالکل جھوٹ ہے۔“ وہ نفی میں گردن  
ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں، حنیف کو مجھ سے کیا دشمنی ہے  
جو اس نے میرے خلاف ایسی بکواس کی ہے؟“

”کیا جھوٹ ہے؟“ میں نے بال کی کھال نکالنا  
ضروری سمجھا۔ ”فائرنگ کا ہونا..... یا..... حنیف کا تم  
سے پوچھنا؟“

”میں حنیف کی بات کر رہا ہوں تھانے دار  
صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں حنیف  
سے ملا، نہ اس نے مجھ سے فائرنگ کے بارے میں پوچھا  
اور نہ ہی میں نے اسے اس حوالے سے کوئی جواب دیا۔“

”اس کا مطلب ہے، پہلی بات درست ہے۔“ میں  
نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔  
”یعنی فائرنگ ہوئی تھی؟“

”جی بالکل، فائرنگ ہوئی تھی۔“ وہ اثبات میں  
گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت بڑی نہر کی  
دوسری جانب تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر میں نے ڈیرے کی  
سمت دوڑ لگا دی تھی۔“

وہ دھیرے دھیرے میرے پیلائے ہوئے دام  
میں پھنسا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”جب تم نے ڈیرے  
کی طرف فائرنگ کی آواز سنی، اس وقت تم ادھر نہر کی دوسری  
جانب کیا کر رہے تھے؟“

حنیف کے بیان کی یکسر تردید کر کے وہ اپنے جرم پر  
مہر تصدیق تو مثبت کر ہی چکا تھا۔ اب زبانی اقرار کے لیے  
میں اس کے ساتھ محنت کر رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب  
میں اس نے بتایا۔  
”تھانے دار صاحب! کل دوپہر میں، میں نے اور  
نواز نے ایک ساتھ کھانا کھایا تھا۔ جب لگ بھگ ایک بجے  
ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو نواز نے مجھ سے کہا کہ میں نہر  
کی دوسری جانب واقع چودھری صاحب کی زمینوں میں  
چلا جاؤں، ان زمینوں میں کچھ کام تھا۔ میں دو بجے وہاں  
پہنچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔“ لمبے بھر کے لیے وہ  
رکا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے  
بڑھاتے ہوئے بولا۔



”کس شخص نے آپ کو یہ سب بتایا ہے؟“ وہ چونکے

ہوئے لہجے میں بولا۔

”مریم نے.....!“ میں نے انکشاف انگیز انداز

میں کہا۔

”وہ..... جھوٹ بولتی ہے.....“ وہ لڑکھاتی ہوئی

آواز میں بولا۔ ”میں نے تو بھی اس سے ایسی کوئی بات

نہیں کی۔ یہ سب کچھ اس نے اپنے طور پر ہی سوچ لیا

ہوگا۔ وہ بھی کیا کرے بے چاری.....“ لہجائی توقف

کر کے اس نے گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل

کرتے ہوئے بولا۔

”آپ نے مریم کو دیکھا ہے نا..... نہ منہ، نہ متھا۔

تے جن پہاڑوں تھا۔ نواز اور مریم کا کوئی جوڑ ہی نہیں

جناب۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ مریم پاگل ہو گئی ہے۔“

میں مریم سے تفصیلی ملاقات کر چکا تھا۔ کسی انسان

کی شکل صورت پر کوئی منفی تبصرہ کرنا بد اخلاقی کے زمرے

میں آتا ہے۔ احترام آدمیت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی

باتوں سے اجتناب برتا جائے البتہ وحید کی اس بات

سے مجھے مکمل اتفاق تھا کہ مریم اور نواز کی جوڑی نگاہ میں

چھپی نہیں تھی۔

”حنیف جھوٹا ہے اور مریم نے بھی تمہارے حوالے

سے دروغ گوئی کی ہے۔“ میں نے جیٹھی نظر سے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صرف ایک تم ہی اس دنیا

میں سچے اور کھرے انسان ہو لیکن میری ایک بات اچھی

طرح اپنے دماغ میں بٹھالو.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑا تو وہ مجھس انداز

میں مجھے ٹکنے لگا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے

ہوئے کہا۔

”وحید! تم میرے ہاتھ لگے ہو تو میں تمہیں تھانے کی

حوالات سے سیدھا جیل بھی پہنچاؤں گا اور اس سلسلے میں

استقاضہ کے دو گواہوں کا بیان میرے کام کو بہت آسان

کر دے گا۔“

وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”کون سے

دو گواہ.....؟“

”مقتول نواز کی بیوی مریم.....“ میں نے ایک ایک

لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور مقتول لہو کا شوہر حنیف!“

میری یہ بات سن کر وہ بہت زیادہ گھبرا گیا اور

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے آئیں ہائیں شائیں

”مجھے کام میں لگے ابھی آدھا گھنٹا ہی ہوا تھا کہ

ڈیرے کی طرف سے ”ڈشواں، ڈشواں“ فائرنگ کی آواز

سنائی دی۔ میں نے کام چھوڑ کر ڈیرے کی جانب دوڑ لگا

دی۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے پیٹو اور نواز کو بڑی شرم

ناک حالت میں دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس

نہیں ہوئی کہ نواز نے اپنے اسی ”پروگرام“ کے لیے مجھے

ڈیرے سے ہٹا کر کام کے بہانے نہر کی دوسری سمت والے

کھیتوں میں بھیجا تھا۔“

”وحید.....“ وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو

میں نے اسے مخاطب کر لیا۔ ”تمہاری بات سے تو یہی ظاہر

ہوتا ہے کہ تم نواز اور پیٹو کے باہمی تعلقات کے بارے میں

کافی کچھ جانتے تھے؟“

”جی ہاں، یہ بات درست ہے۔“ وہ اثبات میں

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ان کے ربط ضبط کا کچھ کچھ

اندازہ تو تھا لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دونوں

بے حیائی کی آخری حدود کو بھی پھلانگ ڈالیں گے۔ انہوں

نے تو بے غیرتی کی انتہا کر دی تھانے دار صاحب.....!“

”اسی لیے تم نے انہیں موت کی گہری نیند سلا

دیا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی

خیز لہجے میں کہا۔

”آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں جناب۔“ وہ

گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری بھلا ان دونوں

سے کیا دشمنی..... میں ایسا کیوں کروں گا؟“

”اگر تمہارا ان دونوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا تو

پھر تم نواز کی گھر والی مریم کو الٹی سیدھی پٹیاں کیوں پڑھاتے

رہتے تھے؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”تم نے مریم سے کہا تھا نا کہ وہ نواز پر نظر رکھے کیونکہ نواز

کے ساتھ پیٹو کا کوئی چکر چل رہا ہے۔ تم نے مریم کو یہ بھی بتایا

تھا کہ پیٹو، نواز سے ملنے ڈیرے پر بھی آتی رہتی ہے۔

تمہاری یہ چال نواز سے تمہاری دشمنی کو ظاہر کرتی ہے.....

بتاؤ، کرتی ہے یا نہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن

ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نواز تو میرا بہت اچھا دوست تھا۔ مجھے

اس کی موت کا سخت دکھ ہے۔ میں اس کے خلاف ایسی گھٹیا

بات کیوں کروں گا۔ آپ کو یہ کس نے بتایا ہے؟“

”اگر کسی اور نے بتایا ہوتا تو شاید میں اس کی بات کا

یقین نہ کرتا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن

یہ بات ایک ایسے شخص کی زبانی مجھ تک پہنچی ہے کہ میں اسے



www.paksociety.com کرنے لگا۔ میں نے اسے حوالدار بہادر علی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے مہمان کا کیا حال ہے بہادر علی؟“  
میرا اشارہ وحید کی جانب تھا۔ گزشتہ رات میں نے وحید کو حوالدار کے سپرد کیا تھا۔ بہادر علی نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے جواب دیا۔

”ملک صاحب! میں نے کبھی آپ کو مایوس کیا ہے۔“  
”تمہارا مطلب ہے، وحید نے اقبال جرم کر لیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ متنی خیز انداز میں بولا۔ ”اس نے نہ صرف اقبال جرم کیا ہے بلکہ اس دہرے نکل کے پس منظر کی بڑی سنگین کہانی بھی سنا ڈالی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ڈراڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کا چکر لگا آؤں پھر یہ سنگین کہانی بھی سنوں گا اور مجرم کا اقبالی بیان بھی نوٹ کروں گا۔ کل میں نے وحید کو حوالہ عدالت کرنا ہے۔ تم حوالاتی پر کڑی نگاہ رکھنا۔ میں شہر سے جلدی لوٹ آؤں گا۔“

”آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں یہاں کے معاملات سنبھال لوں گا۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر جانے کے لیے تھانے سے نکل ہی رہا تھا کہ چودھری مبارک وہاں پہنچ گیا۔ وحید کی گرفتاری اس کے علم میں آچکی تھی۔ وہ اس وقت خاصا برہم نظر آتا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

”ملک صاحب! آپ نے یہ کیا بد معاشی لگا رکھی ہے؟“  
میں بالکل انجان بن گیا اور پوچھا۔ ”کیا ہو گیا چودھری صاحب! اتنی گرمی کیوں دکھا رہے ہیں؟“

”میں گرمی نہ دکھاؤں تو کیا دھنیا پی کر سو جاؤں۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ نے قاتل کو کھلا چھوڑ رکھا ہے اور ایک بے گناہ انسان کو پچھلی رات سے حوالات میں ڈال رکھا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

”یہ وہاں کا انصاف ہے جس دنیا میں آپ اور میں سانس لے رہے ہیں۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”آپ اپنے جس لاڈلے کو بے گناہ گردان رہے ہیں نا..... اس نے اقبال جرم کر لیا ہے۔“

”ہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔  
”کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ کو وحید کے قاتل ہونے

بہادر علی! آج کی رات کے لیے یہ تمہارا مہمان ہے۔ تم اس کی ”خاطر داری“ کے سلسلے میں اپنا ہر ”ارمان“ پورا کر سکتے ہو۔“  
بہادر علی کی باجھیں کھل گئیں۔

☆☆☆

آنے والا دن بڑا سنسنی خیز اور مختلف زاویوں سے مصروف ثابت ہوا۔ میں نے جس پولیس اہلکار کو حنیف کے بیان کی تصدیق کے لیے نظام آباد روانہ کیا تھا، وہ واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ حنیف واقعی عارف سے اپنی رقم لینے نظام آباد گیا تھا مگر عارف نے اسے آئندہ وعدے پر ٹال دیا تھا۔ کانسٹیبل کی اس تصدیق کے بعد حنیف کا نام مکمل طور پر شک کے دائرے سے باہر نکل گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پھینچو اور نواز کے دہرے نکل میں ملوث نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں سرکاری اسپتال سے نواز اور پھینچو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں بھی آگئیں اور اس کے ساتھ ہی ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر سے میرا بلاوا بھی۔ میں جس کام کے لیے گزشتہ روز ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر گیا تھا، وہ ابھی پوری طرح نمٹا نہیں تھا لہذا وہاں دوبارہ میری ضرورت پیش آگئی تھی۔ میں نے بلاوالانے والے سرکاری اہلکار کو تھانے میں بٹھایا اور سرکاری اسپتال سے آنے والی لاشوں کے معاملے کو نمٹانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ کام سب سے زیادہ ضروری تھا۔

پوسٹ مارٹم شدہ لاشوں کے ساتھ پوسٹ مارٹم شدہ رپورٹ بھی آئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق دونوں افراد یعنی پھینچو اور نواز کی موت وقوعہ کے روز سہ پہر دو سے تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ انہیں بے خبری میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ قاتل تک اتنی اچانک تھی کہ وہ ”سنبھل“ بھی نہیں پائے تھے اور جہاں تھے، جس حال میں تھے، جوں کے توں اٹا لٹھ ہو گئے تھے۔ چار گولیاں نواز کے بدن میں اور دو گولیاں پھینچو کے جسم میں بیوست ہوئی تھیں۔ بتیس بور کی ان چھ گولیوں نے ان کے اعمال کے زندہ ثبوت کے ساتھ انہیں لقمہ اجل بنا دیا تھا۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد مقتولین نواز اور پھینچو کے لواحقین کو تھانے بلا کر لاشیں ان کے حوالے کر دیں۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد میں نے حوالدار بہادر علی کو اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا۔



www.paksociety.com  
 تمہاری امانت داری کوئی نہیں۔  
 میں نے بہادر علی کو اپنے پاس بلا کر ضروری ہدایات  
 دیں پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر روانہ  
 ہو گیا۔

☆☆☆

میری واپسی شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی تھی اور  
 جب میں نے تھانے میں قدم رکھا تو وہاں کا نقشہ بدل چکا  
 تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک گھنٹا پہلے چودھری مبارک کا بیٹا  
 چودھری تبارک تھانے آیا تھا اور اس نے حوالاتی سے ملنے کی  
 خواہش ظاہر کی تھی۔ چودھری تبارک کا انداز اپنے باپ کے  
 برعکس بہت ہی معقول اور نرم تھا، لہذا حوالدار نے اسے وحید  
 سے چند باتیں کرنے کی اجازت دے دی اور بہادر علی کا یہ  
 اجازت دینا ہی قیامت خیز ثابت ہوا تھا۔

وحید اور تبارک میں کسی بات پر ٹھکرار ہوئی اور  
 چودھری تبارک نے میشر، میں آکر اپنا پستول نکال لیا تھا پھر  
 وحید کا سینہ چھلی کر کے وہ وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ میں نے  
 حوالدار سے کہا۔

”بہادر علی! یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا تم نے وہ کام کر ڈالا  
 تھا جس کی میں نے جاتے ہوئے تمہیں ہدایت کی تھی؟“  
 ”آپ کا شاگرد ہوں ملک صاحب!“ وہ فخریہ لہجے  
 میں بولا۔ ”آپ کے حکم کی تعمیل میں کوئی کوتاہی کیسے کر سکتا  
 ہوں۔ چودھری تبارک نے وحید کو قتل کر کے ہمارا کام اور بھی  
 آسان کر دیا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی  
 طرف دیکھا۔

”آپ نے مجھے اپنی غیر موجودگی میں وحید کا  
 حلقہ بیان قلم بند کرنے کا فریضہ سونپا تھا نا۔“ وہ گہری  
 سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے یہ کام بڑے تسلی بخش انداز  
 میں کر دیا ہے اور وحید کے اقبال جرم کے نیچے اس کا انگوٹھا  
 بھی لگوا لیا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کچھ نہ سمجھنے والے  
 انداز میں کہا۔ ”مگر تم تو کہہ رہے ہو کہ چودھری تبارک  
 نے وحید کو قتل کر کے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ یہ کیا معما  
 ہے بہادر علی؟“

”آپ وحید کا بیان پڑھیں گے تو ساری بات آپ  
 کی سمجھ میں آ جائے گی۔“ وہ تحریری بیان والا کاغذ میری  
 جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”وحید نے چودھری تبارک  
 کے ایما پر ہی نواز اور بیو کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ویسے

پر حیرانی ہے یا اس کے اقبال جرم کرنے کوئی بری شائی؟“  
 ”نہیں..... نہیں.....“ وہ تیزی سے سسکتے ہوئے بولا۔  
 ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیسی بات ہے چودھری صاحب؟“  
 ”وہ..... میں..... یہ کہہ رہا تھا کہ..... مجھے یقین ہے  
 کہ وحید بے گناہ ہے۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”آپ  
 اسے چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔“

”کیا اچھا ہے اور کیا برا، یہ تو آنے والا وقت ہی  
 بتائے گا۔“ میں نے سگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو کسی  
 بھی قیمت پر وحید کو چھوڑنے والا نہیں۔ میں صبح اسے عدالت  
 کے حوالے کر رہا ہوں۔ آپ نے اپنے بندے کو چھڑانے  
 کے لیے جو بھی زور لگانا ہے، وہ عدالت میں لگا لیجیے گا۔ فی  
 الحال تو میں ایک ضروری کام سے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر جا رہا  
 ہوں۔ میں آپ کو مزید ایک منٹ بھی نہیں دے سکتا۔“

”ملک صاحب!“ وہ بڑی رعونت سے بولا۔ ”آپ  
 کو میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ میری پہنچ اوپر تک ہے۔  
 آپ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر جا کر جن افسران کے دفاتر کے  
 سامنے انٹین شین کھڑے ہوتے ہیں اور جنہیں سیلیوٹ مارنا  
 آپ پر لازم ہے، وہ لوگ میرے دوستوں میں شمار ہوتے  
 ہیں۔ مجھ سے اڑنا آپ کو بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔“

”چودھری مبارک! کان کھول کر میری بات سن لو اور  
 اگر توفیق ہو تو اسے اپنے لیے بھی باندھ لو۔“ میں نے اس کی  
 آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔  
 ”تمہاری پہنچ اوپر تک ہوگی مگر میری پہنچ اوپر والے تک  
 ہے۔ جہاں تک آپ کو اپنی طاقت پر غرور ہے تو اب ہاتھوں  
 میں ہاتھ تو ڈل ہی گئے ہیں۔ کس کے بازوؤں میں کتنا دم  
 ہے، اس بات کا فیصلہ جلد ہی ہو جائے گا اور.....“ لہجائی  
 توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی  
 بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے اپنے جن دوستوں کا ذکر کیا ہے، وہ میرے  
 افسر ضرور ہیں اور میں احتراماً انہیں سیلیوٹ بھی کرتا ہوں  
 لیکن آج تک میں نے کسی بھی افسر کے کسی بھی غلط حکم کی  
 تعمیل نہیں کی کیونکہ میری گردن صرف اس ذات کے سامنے  
 جھکتی ہے جو افسروں کا افسر اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔  
 وہی میرا مالک ہے، میرا خالق ہے اور میرا رازق ہے۔ میں  
 صرف اسی کے حکم کا غلام ہوں۔“

وہ چند لمحات تک معاندانہ نظر سے مجھے گھورتا رہا پھر  
 دمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا اور



تو چودھری تبارک کو فٹ کرنے کے لیے وحید کا اقبال چاہی  
 کافی تھا لیکن چودھری تبارک نے غرور و غضب میں آکر جو قدم  
 اٹھایا ہے، وہ خود کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف  
 ہے۔ آپ وحید کا بیان پڑھیں گے تو ساری صورت حال  
 واضح ہو جائے گی۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور وحید کا حلیہ  
 بیان پڑھنے لگا۔ اس بیان میں وحید نے پیو اور نواز کے قتل  
 کا اقرار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے یہ مذموم کام  
 چودھری مبارک کے فرزند ارجمند چودھری تبارک کے حکم پر  
 کیا تھا۔

واقعات کے مطابق چودھری تبارک کی پیو پر بڑی  
 گہری نظر تھی۔ اس نظر میں اس وقت اور بھی گہرائی پیدا ہو گئی  
 جب پیو نے تبارک کی مفلوج ماں کی مالش کے لیے حویلی  
 آنا جانا شروع کیا۔ چودھری مبارک موضع شہزاد کوٹ کا  
 مطلق العنان بادشاہ تھا اور تبارک اس کا اکلوتا بیٹا لیکن پیو،  
 تبارک کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا دل نواز میں اٹکا ہوا  
 تھا۔ تبارک نے پیو کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے ہر  
 حربہ آزما کر دیکھ لیا لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اسی  
 شکست نما ذلت نے اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا  
 اور اس نے وحید کی مدد سے نواز اور پیو کو ٹھکانے لگوا دیا۔

وحید نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ وہ پیو اور نواز کی  
 غیر نصابی سرگرمیوں سے بخوبی آگاہ تھا لہذا جب وقوعہ کے  
 روز کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نواز نے اسے نہر کی  
 دوسری جانب والی زمین پر کام کی غرض سے بھیجا تو وہ نواز کو  
 دکھانے کے لیے ڈیرے سے نکل گیا تھا لیکن پھر وہ نواز کی  
 نظر بچا کر اس کمرے میں ایک جگہ چھپ گیا تھا جہاں نواز  
 اور پیو نے اپنے عزائم کی ”تعمیل“ کرنا سنی۔ بیس بور کا  
 بھرا ہوا ریوالور وحید کے پاس تھا۔ اپنے چھپنے کا بندوبست  
 اس نے ایک دن پہلے کر لیا تھا۔

جب پیو ڈیرے پر پہنچی تو نواز نے اسے کمرے میں  
 بلالیا۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ اور کھڑکی بند کر لی اور  
 بڑی دیدہ دلیری سے اپنے ”کام“ میں مشغول ہو گئے۔ نواز  
 کو اس بات کا اطمینان تھا کہ وحید چار بجے سے پہلے واپس  
 نہیں آئے گا۔ اس اطمینان اور بے فکری نے ان دونوں کو  
 اور بھی غیر محتاط کر دیا اور جبلی خواہشات کی تکمیل میں وہ اس  
 قدر اندھے ہو گئے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی کوئی پروا ہی نہ  
 رہی۔ وحید نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے  
 دریغ فائرنگ کر کے انہیں موت کی شرمناک خیمہ سلا دیا تھا۔

وحید نے اپنے منصوبے کا ایک مرحلہ طے کر لیا تھا۔  
 دوسرے مرحلے میں اسے آواز مل کر حنیف کے سامان میں  
 چھپانا تھا تا کہ قاتل کی حیثیت سے شک حنیف پر جائے۔  
 جب ریوالور حنیف کے سامان سے برآمد ہو تو پولیس کا  
 دھیان حنیف کی غیرت مندی کی طرف چلا جائے اور ایسا  
 ہی ہوا بھی تھا لیکن پہلے حنیف کے بیان پھر چودھری  
 مبارک کا وحید کو تھانے میں پیش کرنے سے احتراز اور آخر  
 میں وحید کا میرے سوالات کے سامنے ڈھے جانا..... ان  
 تمام کڑیوں نے مل کر حالات کا پانسا پلٹ دیا تھا اور.....  
 وحید کے حلیہ بیان نے اس کے پروانہ موت پر مہر تصدیق  
 ثبت کر دی تھی۔

جب حوالات میں وحید سے ملاقات کے بعد  
 چودھری تبارک کو یہ پتا چلا کہ وحید نے اپنے بیان میں  
 حقیقت اگل دی ہے تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ غصے کو اسی  
 لیے حرام کہا جاتا ہے کہ اس کیفیت میں کیا گیا فیصلہ ہمیشہ  
 نقصان ہی دیتا ہے۔ چودھری تبارک نے بھی جوش جذبات  
 میں آکر ایک انتہائی سنگین قدم اٹھالیا تھا۔ بہر حال، اس نے  
 جو کچھ بھی کیا تھا، اس سے میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ اسے  
 بھانسی کے پسندے تک لے جانے کے لیے مجھے کسی خاص  
 کوشش کی ضرورت نہیں تھی۔

دل میں خواہشات کی موجودگی بہت اچھی بات ہے  
 کیونکہ اس سے انسان کی زندگی کو تحرک ملتا ہے لیکن یہ  
 خواہشات اندھی اور بے لگام نہیں ہونا چاہئیں ورنہ ان کے  
 حصول کی خاطر انسان کو تاریک راہوں کی مسافرت اختیار  
 کرنا پڑتی ہے جس کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ  
 نہیں ہوتا۔

پروین عرف پیو اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود  
 بھی ایک نادان عورت ثابت ہوئی تھی۔ اپنی خواہشات کی  
 تکمیل میں وہ اندھی ہو گئی تھی۔ اس کے حسن اور دل کشی نے  
 دو ہتے بستے بلکہ..... تین ہتے بستے گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیا  
 تھا۔ حنیف کا گھر، مریم کا گھر اور چودھری مبارک کا گھر۔

چودھری مبارک اور چودھری تبارک جیسے لوگ ہر اچھا  
 برا کام اپنے چچوں سے کرانے کے عادی ہوتے ہیں اور اپنے  
 مقصد کے حصول کے لیے جائز اور ناجائز کی پہچان بھی کھو بیٹھتے  
 ہیں۔ ایسے چچے گیر افراد زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتے ہیں۔  
 بس انسان کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہونا چاہیے اور ایسے لوگوں  
 کے انجام سے نصیحت پکڑنے والا ذہن!.....!

(تحریر: حسام بٹ)



www.paksociety.com

دو تلوں دوست، ہر طرف سے بعد اے تھے اور خوب  
پُر جوش ہو کر اُدچی اُدچی آواز میں بیٹے دلوں کی کہانی  
سنار ہے تھے۔ ایوب اور یعقوب جوانی میں ہی گنجے ہو گئے  
تھے۔ اپنے پرانے، سب انہیں منجھوں کی جوڑی کہا کرتے  
تھے۔ ”آج کل کیا ہو رہا ہے؟“  
ایوب نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”پانچ وقت نماز اور اللہ

## اللہ معافی

### محمد الیاس

جہاں بہت سے لوگ بڑے بے تکان بولنے کے عادی ہوتے ہیں اور کبھی  
کبھی کوئی عمل غلط بھی سرزد ہو جاتا ہے بس ایسے ہی بلا ارادہ  
مگر... اس کے باوجود ایک بات بہت زبردست ہوتی ہے ایسے  
لوگوں میں کہ فوراً ایک رٹا رٹایا جملہ زبان سے پھسل جاتا ہے ”اللہ  
معافی... اللہ معاف کرے“ بس یوں سمجھیے گویا حق اور فرض  
دونوں ہی ادا ہو گئے۔

اپنے مقام اور مطالب کا دائرہ نکال کر کے اللہ سے معافی طلب کرنے کی امید اور



Downloaded From  
Paksociety.com

سپنس ڈائجسٹ 153 اکتوبر 2016ء



اللہ۔ بڑے بیٹے نے کچل کے سونج سا کٹ وغیرہ بنانے کی فیکٹری لگا رکھی ہے۔ وہاں آٹھ گھنٹے فکری ڈیوٹی دیتا ہوں۔ چھوٹا بیٹا چین سے جزیئر لا کر بیچتا ہے۔ ملک میں بجلی ہے نہیں۔ بڑا اللہ کا فضل ہے۔ بیٹوں کو کاروبار کے لیے سرمایہ دیا۔ تین ملازمتیں کیں۔ دوسرکاری، ایک کمپنی کی۔ شکر ہے اللہ کا، اٹھارہ ہزار روپے گورنمنٹ سے ہر ماہ گھر بیٹھے پنشن مل رہی ہے۔ شکر ہے اللہ پاک کا۔ اپنے سگریٹ اور دوائیوں کا خرچہ نکال کر باقی اتنے پیسے بچ رہے ہیں کہ پوتے پوتیوں اور نو اسے نو اسیوں کو جب اور جتنا چاہوں، دیتا ہوں۔ دن بھر میں کم از کم آٹھ دس بار بیٹوں اور گھر والوں کو یاد کر دیتا ہوں کہ ان پر بوجھ نہیں، بلکہ یونس ہوں یونس.....

”مگر یہ ڈاڑھی اتنی کیوں بڑھالی.....“ یعقوب نے دوست کی بات قطع کرتے ہوئے سوال کر دیا۔ ”اور ہر روز اولاد کو یاد کیوں کرانا پڑتا ہے کہ یونس ہو؟“ ایوب نے جواب دیا۔

”بھئی! حج کیا ہے، پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں.....“ اچانک قہقہہ اُگل دیا اور دوبارہ بولا۔ ”میں اور تم دونوں یاد ہے نا جلدی گئے ہو گئے تھے۔ جب آخر میں سگریٹ کمپنی کی ملازمت سے بھی ریٹائر ہو گیا تو دیکھا کہ ڈاڑھی کے بال دنوں میں خوب گھنے ہو جاتے ہیں۔ سو جا، شاید سر میں بال اگانے والی طاقت بھی چہرے پر ڈھلک آئی ہے..... پھر فیصلہ کر لیا، چلو ٹھیک ہے، سر پر نہیں اُگتے نہ اُٹتیں، ڈاڑھی کے بڑھالو..... اور ہاں! گھر والوں کو بتانا ضروری ہوتا ہے کہ وہ میری فینشن نہ لیں۔ پنشن لیتا ہوں۔ دونوں بیٹوں کا کاروبار ایک ہی بلڈنگ میں ہے۔ آج کل اُن پڑھ مزدور بھی دس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ سے کم پر نہیں ملتا۔ میں تو مفت میں ڈیوٹی دیتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے پاکستان کی سب سے بڑی سگریٹ فیکٹری میں سپروائزری کی، مشینوں کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ میرے جیسا تجربہ کار سپروائزرفٹ میں ملا ہو، اور وہ اپنی پنشن سے ذاتی خرچہ پورا کرے، تو فینشن کے بجائے یونس ہی ہونا! ذاتی خرچے کے علاوہ چھوٹی موٹی گھر کی چیزیں بھی تپے سے خرید دیتا ہوں۔ پھر اولاد کی اولاد کے لاڈ دیکھنے کی بھی سکت ہے..... تم ہی بتاؤ، پھر یونس ہی ہونا۔! پنشن والے بزرگ کی فینشن نہیں لینی چاہیے۔“

اشیات میں سر ہلاتے ہوئے یعقوب ہنسنے لگا اور بولا۔ ”ستاقا کہ فیکٹری سے ریٹائرمنٹ کے ایک دو مہینے بعد کچھ لوگ تجھے انخوا کر کے لے گئے تھے۔ پورا ایک سال اور

دو مہینے تجھے جبر میں رکھا۔ وہ یونس میں مجھے یہ خبریں کر رہی تھیں کہ وہی اور بہت بڑپا۔ کیسے ان کی قید سے فرار ہوئے؟“ آٹھ دس سالہ شوخ و شنگ کھلنڈرے لڑکے کے مانند ایوب کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔ ”اوہ یارا بڑا مزہ آیا تھا۔ سگریٹ فیکٹری سے میری ریٹائرمنٹ ہوئے ابھی چھ ہفتے ہی ہوئے تھے، ڈاڑھی خوب بڑھ گئی اور میں پکا نمازی ہو گیا..... ایک دن عصر کے وقت مسجد میں میرے دائیں بائیں دو اجنبی آن کھڑے ہوئے، شکل سے پورے خالص مومن مسلمان، بڑی شاندار ڈاڑھیاں اور صاف سحرے لباس، سر پر چنی سفید نماز والی ٹوپیاں۔ میں نے سمجھا، محلے میں کسی کے مہمان آئے ہوں گے۔ جماعت ختم ہوئی، میں نے باری باری ان پر نگاہ ڈالی۔ انہوں نے مسکرا کر دوستانہ نظروں سے دیکھا۔ میرے ساتھ ہی مسجد سے باہر نکلے۔ میں نے پوچھا، کس کے مہمان ہیں؟..... دونوں نے مجھ سے یوں مصافحہ کیا، جیسے بڑے پرانے یار بنی ہوں۔ ایک بولا۔

”حاتی صاحب! ہم آپ کے مہمان ہیں۔“ میں نے ان کے ”حاتی صاحب“ کہنے پر دو مرتبہ ”آمین“ کہا اور پھر ”بسم اللہ، جی آیا توں“ کہہ کر گھر لے آیا۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کون لوگ ہیں۔ یہ خیال بھی آیا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔ بغیر جانے بوجھے غیر لوگوں کو گھر لے آیا ہوں، اللہ خیر کرے۔“

سگے سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں بجھا کر ایوب نے فوراً ہی دوسرا سگریٹ سلا لیا۔ یعقوب نے کہا۔ ”یار! بس کرو، اتنی ہونک، اپنا ستیاناس کر رہے ہو.....“

ایوب نے کھکاری ماری اور بولا۔ ”تجھ سے اب بھی میری محبت بہت اچھی ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یاد کر، چچن چچن سال پہلے فوج میں بھرتی ہوئے۔ وہاں راشن میں سگریٹ بھی آتے تھے۔ سپاہی کو ڈائمنڈ سگریٹ ملا کرتے تھے۔ ہم دونوں پہلے سے بھی زیادہ جواں اور ہٹے کٹے ہو کر فوج سے فارغ ہوئے۔ صرف سر کے بال ہی فوج کو دیے، باقی سب کچھ فٹ قاٹ..... واپس لے آئے.....“

دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ بلند کیا۔ ایوب بول پڑا۔ ”آخر میں، سگریٹ فیکٹری کی سپروائزری۔ اسی سگریٹ کا فکری کوٹا بھی ملنے لگا۔ چل سو چل، وہ دن اور یہ آج کا دن، کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ گھر میں بیٹے بیویں اسی طرح ڈرائی ہیں۔ میں نہیں ڈرتا۔ انہیں کہتا ہوں، میری فینشن نہ لو.....“

یعقوب نے ٹوک دیا۔ ”اُوئے جھٹی بابے! کدھر پڑی سے اُترتے جا رہے ہو؟ وہ بات پوری کرو.....“



ایوب کا چہرہ بدستور نہ تھا۔ رہا تھا اور آنکھوں میں چمک، لیوں پر مسکراہٹ۔ منہ ہونے دوست کو دیکھنے لگا، استغہامیہ لگا ہیں ڈال کر بھوس اچکا میں۔ یعقوب جس پڑا اور بولا۔  
 ”بونس بابا! بات بھول گیا..... وہ مسجد سے دو اجنبیوں کو جو گھر لے گئے تھے..... جب انہو ہوائے تھے.....“

”ہاں ہاں..... اوہ اچھا۔ میں نے دل سے کہا، مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ جس طرح بارش کو اللہ کی رحمت کہا جاتا ہے۔ لیکن کبھی بھی تہائی پھیر کر رکھ دیتی ہے۔ اسی طرح اگر مہمان بھی رحمت کے بجائے زحمت بن جائے۔ تو اللہ کی رضا سمجھ کر بندہ صبر اور حوصلے سے کام لے..... میں نے پکڑے ہوئے، گرم گرم۔ ایک رس اور چائے۔ سردی کا موسم تھا..... چائے پیتے ہوئے انہوں نے مطلب کی بات شروع کی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ انہوں نے قبائلی علاقے میں سگریٹ پلانٹ لگایا ہے۔ مگر اچھی کوائٹی کی سطح نقل نہیں بن رہی۔ میری سابقہ فیکٹری کے عملے میں سے کسی نے میرا اتنا پتا دیا تھا..... وہ مجھے لینے آئے تھے۔ دل میں یہی سوچا کہ مہمان سے رُو کی بات نہ کی جائے۔ شرط ایسی رکھو کہ وہ خود ہی چلے جائیں۔ اُن سے کہا۔ پانچ لاکھ روپیہ ایڈوانس اور پچیس ہزار روپے تنخواہ.....“

آنکھیں پوری کی پوری کھول کر ایوب نے اپنے دوست کو دیکھا اور جس پڑا۔ قدرے توقف کر کے بولا۔  
 ”میں نے سمجھا اب ان کی بولتی بند ہو جائے گی لیکن حاجی نجیب اللہ، جو اصل مالک تھا، کہنے لگا۔ حاجی صاحب! ایڈوانس اتنا لو، جتنا ڈیڑھ سال میں پورا ہو جائے۔ تنخواہ منظور ہے۔ کھانا پینا ہمارے ذمے، کپڑوں کی دھلائی، رہائش ہر خدمت..... تم مشین چلاؤ، نماز پڑھو۔ حج ہم کروائے گا۔ اچھے مسلمان ہو، اصلی اسلامی وعدہ کرو، کام بیچ میں چھوڑ کر نہیں بھاگو گے.....“

”پھنس گیا میرا یار، پورا پھنس گیا.....“ یعقوب نے سرد ہنسنے ہوئے کہا۔

ایوب چمک کر بولا۔ ”کیسے بھاگتا، میں نے کہا چلو بھر۔ میرا وہاں کیا بگاڑ لیں گے لوگ۔ تین لاکھ روپے ایڈوانس ملے ہو گیا۔ ظالموں نے تھیلے سے نکال کر اسی وقت میز پر گڈیاں گن کے رکھ دیں.....“ ایوب نے ہلکا سا کھوکھلا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”کو بے یار بڑی طاقت تھی اُس وقت پاکستانی روپے میں۔ تین لاکھ آج کاتیس ہی سمجھ لو۔ رقم گھر میں تمہاری بھابی کے حوالے کی اور انہوں نے کہا بس ایک دو جوڑے کپڑے لو، ادھر سے بنا کر دے گا۔ اور چلو۔ یہی

## چٹکے

ایک سردار اپنے دوست سے۔ ”کل میری شادی ہے، لڑکی والوں نے کم لوگوں کو بلایا ہے۔“  
 ”تو پر اہم کیا ہے؟“ دوست بولا۔  
 سردار۔ ”پتا نہیں ابا جان مجھے لے جائیں گے یا نہیں۔“

☆☆☆

انسپکٹر سردار سے۔ ”کیا پر اہم ہے؟“  
 سردار۔ ”میری گرل فرینڈ نہیں مل رہی۔“  
 انسپکٹر۔ ”کب سے.....“  
 سردار۔ ”پچھن سے۔“

☆☆☆

ایک سردار (دوسرے سے)۔ ”پولیس کا چھاپا پڑ گیا ہے فوراً کھڑکی سے چھلانگ لگا دو۔“  
 ”لیکن ہم اس وقت حیر حویں منزل پر ہیں۔“  
 سردار۔ ”جلدی کرو۔ یہاں جان پر مبنی ہوئی ہے اور جہیں تو ہمارے کی پڑی ہوئی ہے۔“  
 مرسلہ۔ ”مرحاکل، درابن کلاں

اور بیٹوں نے بھی زیادہ تر ڈ نہیں کیا۔ میں سمجھ گیا، سارے اوپر اوپر سے بہ ظاہر لگ کر رہے ہیں، ان کے اندر سے خوشی پھوٹی صاف نظر آرہی تھی۔ کہتے ہوں گے، بیکار پڑی پرچی کی لاشی نکل آئی۔ ہر وقت پڑا سگریٹ پھونکتا ہے۔ پہلے چلو، فیکٹری سے مفت کوٹا ملتا تھا، اب بھی وہی اسٹینڈرڈ رکھا ہوا ہے۔ بندہ پوچھے، پنشن بال بچے کے کام آنے دو۔ اتنی زیادہ اسموکنگ، ہوسکتا ہے، کل ہی دم نکل جائے اور پھنسن بھی ختم ہو جائے۔ بھاگتے آئے کی لنگوٹی سہی.....“

دونوں بڑھے کل کر ہنسنے لگے۔ یعقوب نے کہا۔ ”لنگوٹی نہیں، لنگوٹ..... اور وہ بھی سونے کا۔ چل آگے بول۔“ ایوب اپنے دوست کی تائید میں سر مارنے لگا اور بولا۔  
 ”لو جی! باہر سڑک پر گاڑی کھڑی تھی، ہم چل پڑے۔ رات کو پنڈی میں کھانا کھایا، پھر مجھے نہیں پتا، کب اور کہاں پہنچے۔ صبح ہوش ہی نہ رہا۔ پچھلے پہر پلانٹ دیکھا۔ کبار خانے کی خرید کسی چھوٹی فیکٹری کی بنی ہوئی مشینری تھی جسے وہاں پہلے سے موجود ایک گجراتی کارگر نے فٹ



کر کے آزمائشی طور پر چلا رکھا تھا۔ مشہور برائوں کی اس طرح  
اصلی جیسی بے شمار پیننگ موجود تھی۔ تمباکو ہر قسم کا مٹس، دیسی  
ولایتی ملا جلا ڈھیروں اسٹاک۔“

یعقوب نے لقمہ دیا۔ ”حقے میں پیئے والا پنجاب کا  
بھی.....“

ایوب نے فوراً تائید کی۔ ”ہاں ہاں، کہاں اور جینیا،  
کہاں مردان کا رجسٹرڈ مال اور پنجاب کا دیسی۔ پہلے مرحلے  
پر چار اکتارنے والی مشین سے چھوٹا کر لیتے اور پھر ایک دیسی  
سی مشین میں ڈال کر باریک کوٹ پھٹک کر چھان لیا جاتا۔  
اصل میں میری سابقہ فیکٹری میں سارا کام آٹو میک پلانٹ  
میں ہوتا تھا۔ اب اصل فارمولے کے مطابق سارا اور جینیا اس  
میں بھی استعمال نہ ہوتا لیکن پھر بھی جو مقامی ساتھ شامل کیا  
جاتا، خوب چیکنگ کر کے کہ کیزا نہ لگا ہو، کسی غلط دوائی کا  
اسپرے نہ کرتے رہے ہوں۔ ایک ایک پتا دیکھنا۔ خالص  
اور جینیا کے ساتھ فارمولے کے مطابق مٹس کر کے جدید پلانٹ  
میں باریک پینٹا اور اوپر قیمتی کیمیکل کا اسپرے کرنا.....“  
”وہاں کیا سسٹم چلایا؟“ یعقوب کے پوچھنے پر  
ایوب بولا۔

”وہاں میں نے کیمیکل کی بات کی۔ حاتی نجیب نے کہا۔  
وہ بہت مہنگا ہے۔ ہم نے بہت تجربے کیے۔ تمباکو کی تیزی  
مارنے کی خاطر چینی کا شربت چھڑکتے سے کام بن گیا۔  
مزدور دستی کام کرتے تھے۔ مشین بڑا پرانا ماڈل تھی۔ ایک  
منٹ میں ڈیڑھ سو ڈبی نکالتی۔ تیار مال کے بنڈل بنا کر  
مزدور کندھوں پر رکھتے اور فیکٹری کے سیدھے پہلو پر مغرب  
کی طرف پہاڑ پر چڑھ کر نیچے اتر جاتے.....“  
ایوب نے لمبا سانس لیا اور مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”مجھے  
ان لوگوں نے بہت آرام دیا۔ بیس پچیس سال کی گولی مٹول  
سرخ و سفید لڑکی دکھا کر حاتی نجیب نے کہا۔

”ماجی صاحب! اس سے تمہارا نکاح پڑھائے گا۔  
ڈیڑھ سال بعد ہمارے ساتھ حج کرنے بھی چلو..... جب  
بڑا مشین ہم لے آئے اور تم پر وڈکشن شروع کر دو، پھر بے  
شک چلے جاؤ۔ ابھی صحیح اسلامی وعدہ کرو، حج میں کام چھوڑ کر  
نہیں بھاگے گا۔ میں نے کہا۔

”مسلمان کے ایک بار کیے وعدے پر اعتبار ہونا  
چاہیے۔ تم لوگ ہر ہفتے قسم لیتے ہو..... سو سال گزر گیا۔  
مغربی کارنیکر بشیر احمد اپنے گھروالوں سے ناراض ہو کر آیا  
ہوا تھا۔ اُس نے پہلے ہی وہاں لڑکی سے شادی کی ہوئی تھی۔  
وہ خود بھی ابھی پینتالیس پچاس سال کا ہی تھا۔ میں نے

شادی نہ کی۔ گھر یاد آتا۔ بڑی کے بارے میں سوچتا کہ  
جب تنخواہ نہ ہونے کے برابر تھی..... سو روپے مہینہ بہت  
عرصے بعد تنخواہ ہوئی، تب بھی وہ کرباں والی ساتھ رہی۔  
اب بڑھاپے میں بے وفا کی زیب نہیں دیتی۔ بشیر نے بتایا  
کہ جس پہاڑ سے مزدور مال لے کر اترتے ہیں، اس پر بنا  
پیدل والا راستہ سیدھا پشاور جاتا ہے۔ ٹانگوں میں جان ہے  
تو کسی دن موقع پا کر نکل جاؤ۔ جب مالک موجود نہ ہو۔ اب  
تمہاری رکھوالی بھی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا۔

”فوجی ہوں۔ ٹانگوں میں بڑی جان ہے..... فوجی  
یار کو با صاحب! میں ایک روز مزدور پارٹی کے پیچھے فاصلہ  
رکھ کر نکل پڑا۔ میلا لباس پہن رکھا تھا اور خالی کارٹن کندھوں  
پر۔ بالکل مزدوروں والا حلیہ۔ اللہ کے فضل سے ٹھیک  
ٹھاک پشاور اور وہاں سے گھر۔“

یعقوب کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔  
کہنے لگا۔ ”بھابی اور بھتیجیوں نے یہ تو نہیں کہا کہ بڑھا پھر فینشن  
دینے آ گیا؟“..... ایوب نے انکار میں سر ہلایا اور کہا۔  
”نہیں یار! ان کے چہروں سے اصلی خوشی جھلکتی  
محسوس ہوئی..... ویسے بھی فینشن کے ساتھ پنشن ہے یار!  
ذرا سوچو۔ اور پھر یہ کہ تمہاری بھابی نے ساری رقم بینک  
اکاؤنٹ میں محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے حج کیا مگر  
الحمد للہ۔ اپنے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ جھلی بننے دیکھ کر بڑا  
دکھ ہوتا تھا۔ بڑے بیٹے کا مال بچلے ہی ٹھیک بن رہا تھا۔  
میری غیر موجودگی میں خوب ترقی کر لی اور کراچی کی ایک  
فیکٹری کا مالک لگانے سے سب کچھ گنا بڑھ گئی۔ ہاتھوں ہاتھ  
نقد مال بک جاتا.....“

”وہ لوگ تو پیچھے نہیں آئے؟“ یعقوب نے سوال کیا۔  
ایوب نے کہا۔ ”نہیں، دراصل اُن کا کام بالکل روٹین  
میں چل پڑا تھا..... اور پھر بشیر بڑا سمجھدار ثابت ہوا۔ آج بھی  
جاتے تو کیا کر لیتے؟ حساب برابر کر کے ہی آیا تھا۔ میں نے  
چھوٹے بیٹے کو سرمایہ دیا۔ اُس نے چائنا کا چکر لگایا۔ اب  
ماشاء اللہ ہر تیسرے چوتھے مہینے چین جاتا ہے۔ جزیئر لا کر  
ان کے اسٹیکر تبدیل کر کے کوئی اور مار کے لگاتا ہے۔ بڑا تیز  
ہے۔ کہتا ہے، اباجی! مار کا بدلنے سے قیمت دگنی ہو جاتی  
ہے۔ بجلی اس ملک میں تب ہی ٹھیک ہوگی، جب کوئی  
ایماندار حکمران آئے گا۔ اللہ کا بڑا فضل ہے۔ ہمیں کیا  
ضرورت پڑی ہے ان لوگوں کے فراڈ میں شامل ہونے کی،  
اللہ معافی۔“



موت ایک اٹل حقیقت ہے، نہ ایک دن کم... نہ ایک دن زیادہ... وہ جو اپنی دانست میں دھیرے دھیرے موت کے چنگل سے دور نکلتا جا رہا تھا... کیا خبر تھی کہ سفر کی سمت الٹی ہو چکی ہے اور اب وہ آہستہ آہستہ موت کے شکنجے کی جانب ہی محو سفر ہے اور شاید... اسے ہی قسمت کہتے ہیں۔ کیسے گھیر کر اپنے شکار کو اس ایک جگہ لا کر قید کرتی ہے جہاں اس کے لمحات کا اختتام ہونا لکھا ہوتا ہے اور... وہ بھی اس مقام پر قیام پذیر ہو چکا تھا۔

شکست ورنہ نجات کے ان گمراہ لہجوں کا احوال جو اس کی زندگی کا حاصل تھے

میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ ایک شیخ کے قریب آ کر خاموشی سے اس پر بیٹھ گئے۔ لڑکی جانتی تھی کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں اور وہ ہر کتے دل کے ساتھ نوجوان کے منہ سے وہ بات سننے کی منتظر تھی جو ایک لڑکی کے لیے نئی زندگی کا نقطہ آغاز

یہ رات بھی دیگر راتوں کی طرح ایک عام سی رات تھی۔ آسمان پر تارے بکھرے ہوئے تھے لیکن چاند کے نہ ہونے کی وجہ سے تاریکی بدستور پھیلی ہوئی تھی۔ اس تاریکی میں ایک نوجوان ایک لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پارک



Downloaded From  
Paksociety.com



ہوتی ہے۔ یہ بات سننے سے پہلے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی "ہاں" چل رہی تھی۔

لڑکی کا نام فرانس تھا۔ فرانس کی ماں نے اس کے جوان ہونے کے بعد بارہا اسے سمجھایا تھا کہ مرد سے محبت کرنا دراصل ایک پرخطر راستے پر سفر کرنے کے مترادف ہے لیکن فرانس کی ملاقات جب چل نامی اس نو جوان سے ہوئی تو وہ ماں کی ساری نصیحتیں بھول گئی۔ اس کی ماں نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔ "کوئی بھی فیصلہ کر دو تو اس کے بارے میں بڑی احتیاط اور باریک بینی سے کام لو۔"

لیکن اس نے ماں کی اس نصیحت پر بھی عمل نہیں کیا اور اس وقت جبکہ اسے چل سے ملے ہوئے صرف تین ہفتے دو دن اور بارہ گھنٹے کزرے تھے، وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔

"فرانس!" نو جوان نے بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔

"ہاں چل!" اس نے سرشاری سے کہا۔ فیصلے کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔

"میں تم سے پیار کرتا ہوں فرانس۔ کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟ مجھ سے شادی کرو گی تم؟" وہ بے تابی سے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

"ہاں چل!" اس نے گویا نیند کی سی کیفیت میں جواب دیا اور اس کے بازوؤں میں یوں سمٹ گئی گویا اپنا وجود اس کی ذات میں سمودنا چاہتی ہو۔ اچانک چل نے اپنے بازو سمیٹنے کے لیے گویا ان کے درمیان کوئی ان دیکھی خلیج حائل ہو گئی ہو۔

"مجھے..... مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہاری زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کروں....." چل خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"کیوں چل.....؟ کیا ہوا تمہیں؟ ابھی تو تم کہہ رہے تھے، تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" فرانس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں لیکن عمر بھر کے لیے رفاقت کے بندھن میں بندھنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں تمہیں ایک بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔" چل نے آہستگی سے کہا۔

فرانس نے سوچا کہ وہ شاید اسے اپنے ماضی کی کسی ناکام محبت کے بارے میں بتانا چاہتا ہے۔ اس نے بدستور خوابوں کی دنیا میں ہلکورے لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے

کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا چل۔ میں تمہارے بارے میں جو کچھ جانتی ہوں، اس سے زیادہ کچھ جانتا نہیں چاہتی۔"

"لیکن میں جو کچھ بتانا چاہتا ہوں وہ تمہیں ضرور سن لینا چاہیے یہ ایک بہت اہم بات ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"محبت سے اہم بات کون سی ہے؟" وہ بیچ پر اس کے اور قریب کھسک آئی اور غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"فرانس..... میں نے ایک مرتبہ ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔" اس نے گویا اپنے سینے پر رکھی ہوئی بھاری سل ہٹا دی۔

ایک لمحے کے لیے فرانس کو اس انکشاف کی یقینی کا احساس نہیں ہوا اور جب ہوا تو اس نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اس کے ماضی کا فعل ہے جس کا ان کی مستقبل کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ ماضی کا ایک جرم اس کی ازدواجی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

"غالباً کوئی حادثہ پیش آیا ہوگا؟" فرانس نے اسے راہ فرار مہیا کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں! میرے ہاتھوں سے حادثاتی قتل نہیں ہوا تھا۔" اس نے راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے دیانتداری سے کہا۔ "میں نے عمداً اسے قتل کیا تھا۔ میں اس کی تلاش میں تھا اور جب وہ مجھے ملا تو میں نے اسے قتل کر دیا۔"

فرانس کے خواب اس جواب سے بھی متزلزل نہ ہوئے۔ وہ جاہت کے اس موڑ پر آچکی تھی جہاں سے واپسی کا سفر تقریباً ناممکن تھا۔

"کتنی سزا ہوئی تھی تمہیں؟" اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"کسی کو آج تک معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ قتل میں نے کیا تھا۔" وہ بولا "ویسے وہ شخص موت ہی کا مستحق تھا۔ اس نے مجھے زخمی کر دیا تھا اور میں نے اسے معاف نہیں کیا۔"

جب مجھے انتقام کا موقع ملا، میں نے حساب چکا دیا۔ غالباً میری فطرت ہے کہ میں اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کو فراموش نہیں کر سکتا۔" اس..... کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا تھا گویا ماضی کی نفرت ایک بار پھر ابھر آئی ہو۔ "اس واقعے کو دس برس گزر چکے ہیں اور یہ سینٹ لوئیس میں پیش آیا تھا۔"

اس شخص کا نام جوزف نیلی تھا اور وہ.....



فرانس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس! میں اس سے آگے کچھ سنا نہیں چاہتی۔“

کچھ دیر وہ اسی طرح گم سم بیٹھے رہے۔ آخر فرانس نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹالیا اور زیر لب بولی۔ ”اس سے ہمارے سپنوں کے محل مسار نہیں ہونے چاہئیں۔ میں سمجھ لوں گی کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔“

”جمل نے ستاروں کی مدھم روشنی میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک مشکل کام ہے۔ شاید زندگی کے کسی موڑ پر میرے جرم کی حلش تمہارے ذہن میں ابھر آئے۔ وعدہ کرو تم مجھے بھی اس بات کا طعنہ نہیں دو گی۔“

”میں اس تذکرے کو ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں دفن کر دوں گی جمل۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ یہ بات کبھی میرے ہونٹوں پر بھولے سے بھی نہیں آئے گی۔“

فرانس نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”جمل نے اپنے سینے میں تشکر کی طغیانی سی اندلی محسوس کی اور اپنائیت سے اس نے فرانس کو بانہوں میں سیٹ لیا۔ اب ان کی راہ میں کوئی خلیج، کوئی بدگمانی حائل نہ تھی۔“

☆ ☆ ☆

ازدواجی زندگی کے تین سال گویا خواب کی طرح بیت گئے۔ وہ دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ان کا رہن سہن غریبانہ ہی سا تھا لیکن غربت نے ان کی محبت کو متاثر نہیں کیا تھا۔ جمل کام سے واپس آتا تو سردی سے ٹھٹھرتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔ اگرچہ فرانس کے پاس ڈھنگ کا ایک بھی لباس نہ تھا لیکن اسے کبھی اچھے لباس کی کمی محسوس نہ ہوتی۔ وہ قلم دیکھنے جاتے تو فرانس یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتی کہ اندھیرے ہال میں کون دیکھ رہا ہے کہ اس کے جسم پر پانچ ڈالر والا لباس ہے یا پچاس ڈالر والا۔ قناعت پسندی کے اس نے ہزاروں راستے نکالے ہوئے تھے۔

ایک بار جمل کی طبیعت خراب ہو گئی تو وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ ڈاکٹر نے باتوں باتوں میں کہا تھا۔ ”یقیناً تم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو۔ تم نے بتایا کہ تمہاری شادی کو تین سال گزر چکے ہیں لیکن تمہاری گرجوٹی دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کل ہی تمہاری شادی ہوئی ہے۔“

فرانس کا دل روشنی سے بھر گیا۔ ایک غیر نے ان کی محبت کی گواہی دی تھی۔ اسے شادی سے پہلے ہی معلوم تھا کہ اس کی محبت چٹانوں کی طرح اٹل ہے۔ زندگی کی چھوٹی

”اس نے کہا کہ گودہ میری تنخواہ میں اضافہ نہیں کر سکتا لیکن اس کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ میں موجودہ ملازمت نہ چھوڑ دوں، ایک جگہ پڑے پڑے تو پتھر بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ نئی جگہ جا کر مجھے اپنی قدر و منزلت بنانے میں نئے سرے سے محنت کرنا ہوگی جبکہ یہاں میری ایک ساکھ ہے، سب لوگ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کی ساری گفتگوں کر میں نے وہ پیش کش مسترد کر دی۔ میں ہیلٹ کے ساتھ ہی کام کرتا رہوں گا۔“

فرانس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ شوہر کی رضا میں ہی اس کی رضا تھی۔ وہ بس اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر ایک عجیب حادثہ ہو گیا۔ ہیلٹ وہ کمپنی چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی جگہ جمل کا جو نیا لباس آیا، اس کا نام پارک تھا۔ پارک کی ماتحتی میں پہلا ہی دن گزار کر جمل گھر واپس آیا تو اس کا چہرہ اترا اتر سا تھا۔

”تمہارا نیا لباس کیسا ہے جمل؟ تمہارے ساتھ اس کا رویہ کیسا رہا؟“ فرانس نے پوچھا۔

”ابھی میں اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔ پہلا ہی دن تھا۔“ اس نے کھانے کی میز پر بیٹھے بیٹھے کانٹے کو بے مقصد انداز میں میز پر کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔



”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“ فرانسس نے سادگی سے کہا۔ ”بہر حال رفتہ رفتہ تم اس سے مانوس ہو جاؤ گے۔“ لیکن فرانسس کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ چند ہفتے بعد ایک رات کھانے کی میز پر وہ بول اٹھا۔ ”پارکر مجھے پسند نہیں کرتا۔“ فرانسس کو حیرت سی ہوئی کہ کیا دنیا میں کوئی شخص مجھ جیسے انسان کو بھی ناپسند کر سکتا ہے!

”دراصل وہ مجھے ہیملٹ کے پرانے آدمیوں میں شمار کرتا ہے اور جس انداز سے میرے ساتھ پیش آتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے میرے خلاف دل میں کینہ اور بغض رکھتا ہے۔“ چل نے بتایا۔ ”بہر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے شکایت کا موقع ہی نہ دو کہ وہ کینہ پروری کا اظہار کر سکے۔“ فرانسس نے اسے حوصلہ دیا۔

”مجھے اس کے باطن سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ میرا شروع سے یہی اصول رہا ہے۔“ چل نے کہا لیکن اس رات اس نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا۔

☆☆☆

ایک روز چل گھر آیا تو اس کے کندھے گویا کسی بھاری بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ اس نے جھکی آٹکھوں سے فرانسس کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”پارکر نے میری تنخواہ آدمی کر دی ہے۔ جواز یہ گھڑا گیا ہے کہ کمپنی کے مالی حالات اچھے نہیں ہیں۔“ پھر اس کے لہجے میں تندی سی آگئی۔ ”حالانکہ میں نے اپنے سے جو نیز دو آدمیوں سے پوچھا۔ انہوں نے کوئی واضح جواب تو نہیں دیا لیکن ان کے تاثرات دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ان کی تنخواہوں میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔“

”یہ تو سراسر نا انصافی ہے۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“ فرانسس نے آزر دہ ہو کر پوچھا۔

”وہ مجھے ملازمت سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی معقول جواز نہیں۔“ چل نے بھڑک کر کہا۔ ”وہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا ہے کہ تنگ آکر میں خود ہی ملازمت چھوڑ دوں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آج جب میں آدمی تنخواہ لے کر کشمیر کے پاس سے واپس آیا تو پارکر کتنی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خواہش کی تسکین کر رہا تھا۔“

”لیکن کیوں چل؟ تم نے تو اس کے ساتھ کبھی کوئی

جائی نہیں کی۔“ فرانسس نے آبدیدہ ہو گئی۔ ”بعض لوگ پیدا ہی کینہ پرور ہوتے ہیں۔ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کے اندر چھپے ہوئے احساس کتری کی تسکین ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ آج کل میرے کام کی نوعیت کے مطابق مجھے ملازمت ملنا مشکل ہے۔“ چل نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ فرانسس نے محسوس کیا کہ چل کے اعصاب میں وہی تناؤ پیدا ہو رہا ہے جیسا اس رات محسوس ہو رہا تھا۔ جب انہوں نے شادی کا عہد و پیمان کیا تھا۔ اس بات کو ایک مدت گزر چکی تھی لیکن فرانسس کو آج بھی ان لمحوں کی ساری کیفیات یاد تھیں۔

”میں چھوٹی موٹی وجہ پر سی سے متاثر نہیں ہوتا فرانسس۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”لیکن اگر میرے ساتھ زیادتی کی انتہا کر دی جائے تو میرے دل میں نفرت جاگ اٹھتی ہے اور پھر میں اسے آسانی سے نہیں بھلا سکتا۔“

فرانسس نے پلکیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں بار بار اسی رات کا تصور ابھر رہا تھا جس رات ان کی زندگی ایک اہم موڑ پر آئی تھی۔

تم ذہن پر بوجھ نہ ڈالو چل۔ تھوڑا سا آرام کولو۔“ اس نے چل کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ پھیرا، اس کی پیشانی تپ رہی تھی۔

☆☆☆

آج کی رات بھی باضی کی اس ناقابل فراموش رات کی طرح دھندلائی ہوئی تھی۔ چل کو آج گھر آنے میں بڑی تاخیر ہو چکی تھی۔ فرانسس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے کھڑکی میں کھڑی اس کی راہ تک رہی تھی پھر اس نے چل کو آتے دیکھا لیکن وہ اس طرح قدم اٹھا رہا تھا جیسے عالم خواب میں ہو۔ اسے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ بے خبری کے عالم میں اپنے گھر سے بھی کچھ آگے نکل گیا۔ فرانسس نے اسے پکارا تو وہ چونک کر پلٹا فرانسس کھڑکی سے ہٹ کر دروازے پر آگئی۔ اسے شدید اضطراب سا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کا سبب اسے فی الحال معلوم نہ تھا۔ چل آہستہ آہستہ سینر حیاں چڑھتا ہوا فرانسس کے سامنے آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ٹیٹھیں کا کار پھٹا ہوا تھا۔ اس کے کوٹ کے بٹن بھی غائب تھے اور چہرہ بدلا، بدلا سا تھا۔ وہ خاموشی سے فرانسس کے قریب سے گزر کر اندر آگیا اور اپنا ہیٹ اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ فرانسس نے دیکھا کہ اس کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ اس کی



مردن کے قریب ایک چابی نکل کر اس کی نظر بھی اتر رہی تھی جس پر کھرنڈ سا آگیا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے ایک طویل سانس لی۔

فرانسس نے باورچی خانے سے ایک کرسی کھینچی اور میز کے دوسری طرف اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ غالباً وہ خود گفتگو میں پہل نہیں کر پار ہا تھا اور فرانسس بھی فوری طور پر کچھ پوچھنے کی جرات نہیں کر پار رہی تھی۔ اس نے چل کی ٹائی کھولی۔ ”وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے مجھے گھر آنے میں دیر ہو گئی۔“ بالآخر چل نے لرزنی آواز سے کمرے کا سکوت توڑا۔ فرانسس جو اس کے بال بنانے کے لیے کنگھا اٹھلائی تھی، خاموشی سے اس کے دھڑانوں پر انگلی پھیرتی رہی۔

”پار کرنے آج ضرورت سے زیادہ بکواس کی تھی۔“ چل نے اب قدرے ہموار لہجے میں کہا۔ ”میں نے بہت ضبط کیا پھر وہ بولا۔“ تم کیا اپنے آپ کو ہر کوئیس سمجھتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں میں تم جیسے کئی آدمیوں کے جڑے توڑ سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ بالکل اسی طرح جیسے ہم فلموں میں دیکھتے ہیں، وہ اچھل کر میز پر جا کر اور میز سمیت الٹ گیا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور مزید دو تین گھونے رسید کیے۔ اگر دوسرے ملازمین مجھے پکڑ نہ لیتے تو نہ جانے میں کیا کر بیٹھتا۔ بہر حال میں نے اس کی اب تک کی کمینگی کا حساب چکا دیا ہے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی اور پولیس والے آکر مجھے پکڑ کے لے گئے لیکن پھر اس نے خود ہی پولیس اسٹیشن فون کیا کہ وہ میرے خلاف کوئی شکایت درج کرانا نہیں چاہتا۔ پتا نہیں ”وسیع القلی“ کے اس مظاہرے سے اس کا کیا مقصد تھا۔“

”چلو اچھا ہی ہوا۔“ فرانسس نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”کہ معاملہ زیادہ نہیں بڑھا۔ روز روز کی کشمکش تو ختم ہوئی۔“

”میں اب کہیں اور نوکری کر لوں گا۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن چل..... کیا دوسری نوکری آسانی سے مل جائے گی؟ ہر جگہ سابقہ تجربے کا حوالہ دیتا پڑے گا اور جب وہ تمہاری کمپنی سے تمہارے کردار کی تصدیق کرنا چاہیں گے تو پار کر تمہاری راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دے گا۔ وہ تمہارے خلاف بڑھ چڑھ کر باتیں بنائے گا۔“ فرانسس نے اندیشوں کا اظہار کیا۔

”بولا۔“ اگر مجھے پار کر کی وجہ سے ہر جگہ ناکامی ہوئی تو میں اس کا قصہ ہی ختم کر دوں گا۔“

چل کو کہیں ملازمت نہ ملی۔ انتخابات کا زمانہ تھا۔ ہر کاروبار غیر یقینی حالت کا شکار تھا۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ اپنی آخر پونجی بھی نکلوانے کے لیے انہیں بینک جانا پڑا۔ اکاؤنٹ حالانکہ چل ہی کے نام پر تھا مگر وہ دونوں بالکل اسی طرح اکٹھے بینک گئے تھے جیسے کوئی جوڑا کسی قریب میں شرکت کرنے جا رہا ہو۔

اکاؤنٹ میں صرف چار ڈالر پچاس سینٹ باقی تھے۔ کیشیر نے وہ ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا کھاتہ ختم ہو گیا ہے۔“ ساتھ ہی اس نے ان کی پاس بک پر سرخ روشنائی سے ”کھاتہ ختم“ کے الفاظ لکھ کر بک انہیں تھما دی۔

فرانسس کو یک لخت اپنے سامنے لاتنا ہی اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔ ناامیدی اور مایوسی کی دلدل نے اب گویا ان کی آنکھیں بھی ڈھانپ لی تھیں۔ وہ بینک سے باہر آئے تو چل فٹ ہاتھ پر چلتے ہوئے بھی پاس بک کے اوراق شروع سے آخر تک پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت بالکل خالی الذہنی سے دوچار تھا۔ فرانسس نے اس کا بازو تھاما ہوا تھا۔ ایک دورا ہے پر پہنچ کر وہ رک گیا گویا جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کدھر جانا ہے۔

”میں چاہتا ہوں کہ ہمیں اس حال تک پہنچانے پر پار کر کا شکر یہ ادا کر دوں۔“ وہ گویا خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا۔

”نہیں چل.....“ فرانسس نے جھرجھری لے کر اس کا بازو زیادہ سختی سے تھام لیا اور اس کے ہاتھ سے پاس بک لے کر ایک کوڑے دان میں پھینک دی۔

”آؤ گھر چلیں۔“ وہ اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ دو بیٹے جوں توں گزارنے کے بعد چل کو ایک کام مل گیا لیکن یہ کوئی باقاعدہ نوکری نہیں تھی۔ اسے بمبیس سینٹ فی ٹھنٹا کے حساب سے اجرت ملتی تھی۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ دواؤں کی ایک دکان کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر دواؤں کی تشہیر کرے لیکن تشہیر کا طریق کار کیا تھا اور دکان کہاں واقع تھی، اس سلسلے میں اس نے فرانسس کو کچھ نہیں بتایا۔

ایک دن بازار سے آتے وقت فرانسس غلطی سے ایک ایسی بس میں بیٹھ گئی جس کا روٹ دوسرا تھا اور وہ اس کے گھر کی طرف نہیں جاتی تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا



<http://paksociety.com>





## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





تو وہ راستے میں ایک اسٹاپ پر اتر گئی۔ کچھ لمبے لمبے کے لیے وہ دوسرے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک جگہ فٹ پاتھ پر اسے چھوٹا سا ہجوم نظر آیا۔ لوگوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ ایک دکان کے چوڑے پر کسی دوا کا بڑا سا نشیور بورڈ تھا اور اس کے قریب محل۔ اس کا محبوب، اس کا شوہر تن سازوں کی طرح بنیان اور نیکر پہنے، چوڑا چمکا سینہ پھلائے اور بازوؤں کی مچھلیاں ابھارے کھڑا تھا۔ اس کے کسرتی جسم کی نمائش سے یقیناً دوا کی بڑی موثر نشیور ہو رہی تھی۔ یہی وہ مضبوط بازو تھے جن کی پناہ میں فرانسس کا ہر خوف مٹ جاتا تھا۔ یہی وہ کشادہ سینہ تھا جس پر سر رکھ کر فرانسس دنیا کا ہر دکھ بھول جاتی تھی۔ آج اسے پتا چلا کہ پچیس سینٹ فی گھنٹہ کی نوکری میں محل کو کیا کرنا پڑتا ہے۔

”میں سب کچھ دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہیں گئی۔“ فرانسس نے پلگوں پر مچھلنے والے آنسو ضبط کرتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔ محل اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ بھٹکوں میں چھپا لیے تھے جیسے اسے بھرے بازار میں برہنہ کر دیا گیا ہو اور وہ اپنی برہنہ چھپانے کی مقدور بھرکوش کر رہی ہو۔ وہ آنسو جو آنکھوں سے بہہ نہیں سکتے تھے ان کی کڑواہٹ اس کے حلق میں پھیل گئی تھی۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتی تھی جہاں اس کا دیوتا دنیا کے سامنے تماشا بنا ہوا تھا۔

جب وہ گھر واپس آیا تو فرانسس نے اس سے کچھ نہ کہا۔ اس نے خاموشی سے میز کے کونے پر دو ڈالر رکھ دیے اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”میں شرمندہ ہوں فرانسس۔!“ طویل سکوت کے بعد اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”میں بہت شرمندہ ہوں۔“ ”دوبارہ وہاں مت جانا محل..... میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر رو پڑی۔

”کاش میں تم سے نہ ملا ہوتا فرانسس۔ میں اس قابل بھی نہیں کہ تمہیں دو وقت کی روٹی دے سکوں۔“ الفاظ اس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ وہ اس کے گھٹنے پر رخسار گڑتے ہوئے بولی۔ ”تم جو بھی ہو، جیسے بھی ہو مجھے اب بھی دنیا میں سب سے پیارے ہو۔“

محل نے دیکھ کر ہلکا سا ہنسا۔ اس کے حلق سے ایسی گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ اپنی جینیں روک رہا ہو۔ پھر اس نے سراٹھا کر، جال میں پھنسے ہوئے شیر کی سی نظروں سے فضا میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”ایک شخص صرف ایک شخص کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔“

دفعاً جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی کرن جھلکائی۔ ”میں آج اپنے سابق باس ہیلٹ کے پاس گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ..... کیا وہ تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہے؟“ فرانسس نے آنسوؤں سے بھیجا چہرہ اوپر کر کے اس کی طرف دیکھا۔ ”جب میں نے اسے اپنے حالات بتائے تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے کچھ کرے گا۔ وہ خود تو اب کاروبار کے میدان میں نہیں ہے، بہر حال کئی لوگوں سے اس کی شناسائی تو باقی ہے اور ہاں۔“ اچانک محل نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جب میں اس کے پاس کھڑا تھا تو میں نے اپنی جیب میں کچھ سرسراہٹ سی محسوس کی تھی۔ وہاں سے رخصت ہونے کے بعد میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں میں ڈالر کا ایک نوٹ موجود تھا۔ میں اس کا نوٹ لوٹانے واپس گیا تو اس نے تسلیم ہی نہیں کیا کہ وہ اس نے میری جیب میں ڈالا تھا۔“

”شاید وہ تمہارے لیے واقعی ملازمت کی سفارش بھی کرے۔“ فرانسس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ رات کو محل آنکھیں بند کیے، بستر پر ساکت لیٹا رہا مگر فرانسس کو معلوم تھا کہ وہ سو نہیں رہا۔ وہ خود بھی ساری رات نہیں سو سکی تھی۔ صبح کو دونوں کی آنکھیں شب بیداری سے سرخ ہو رہی تھیں۔

وہ جب جانے کے لیے گھر سے نکلا تو فرانسس بھی اس کے ساتھ ہوئی اور گلی کے موڑ تک اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اسے رخصت کرنے گئی۔ محل دور نکل گیا تب بھی وہ کھڑی اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

لیکن اس شام جب وہ واپس آیا تو اس کا چہرہ بھجا بھجا سا تھا۔ فرانسس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی اچھی خبر نہیں لایا، پھر بھی اس نے تفصیل جاننے کے لیے پوچھا..... ”کیا ہوا محل.....؟“ ہیلٹ نے تمہاری سفارش نہیں کی؟ ”ہر کہنی حوالے مانتی ہے اور صرف ہیلٹ کی



## بین الاقوامی تنظیمیں

- س: ”ایکو“ سے کیا مراد ہے؟  
ج: تنظیم برائے اقتصادی تعاون۔
- س: یہ بتائیے کہ تنظیم برائے اقتصادی تعاون کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟  
ج: 1985ء
- س: یہ بتائیے کہ اقتصادی تعاون کی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟  
ج: تہران (ایران)
- س: ”سارک“ سے کیا مراد ہے؟  
ج: ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ريجنل کوآپریشن۔
- س: ”سارک“ تنظیم کا قیام کب اور کہاں پر عمل میں آیا تھا؟  
ج: دسمبر 1985ء کو ڈھاکہ میں۔
- س: سارک کا ہیڈ کوارٹر کہاں پر ہے؟  
ج: بکھٹنڈو (نیپال)
- س: ”کولمبو پلان“ کیا ہے؟  
ج: ایک عالمی تنظیم کا نام ہے۔
- س: ”کولمبو پلان“ تنظیم کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟  
ج: 1950ء
- س: ”کولمبو پلان“ تنظیم کے مستقل ممبران کی تعداد بتائیں؟  
ج: 25۔
- س: کیا آپ جانتے ہیں کہ ”سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ“ تنظیم کے ممبر ممالک کی تعداد کتنی ہے؟  
ج: چھ۔
- س: ”CACM“ سے کون سی عالمی تنظیم مراد ہے؟  
ج: سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ۔
- س: ”سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ“ کا صدر دفتر کہاں ہے؟  
ج: گوئے مالا۔
- س: ”سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ“ تنظیم کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟  
ج: دسمبر 1960ء
- فرو عروج کی معلومات کراچی سے

سفارش سے بات نہیں بنتی۔ اصل سابقہ پاس تو پارک تھا اور تم سوچ سکتی ہو کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے دے گا۔“ اس نے اچانک خود کو کرسی پر گراتے ہوئے کہا۔

”مایوس مت ہو مچل۔ پارک اتنا حیوان نہیں ہو سکتا۔“ فرانسس نے اسے دلاسا دیا۔ ”اگر وہ ذرا بھی باضمیر ہو گا تو تمہاری صلاحیتوں کی نفی تو نہیں کر سکے گا۔ تم سے اسے زیادہ سے زیادہ یہی شکایت ہو سکتی ہے کہ ایک دفعہ تم آپے سے باہر ہو گئے تھے۔“

ان باتوں سے مچل خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ رات کو کھڑکی کے قریب اپنے بستر پر لیٹا جاگتا رہا۔ تمام رات فرانسس اس کے ہونٹوں میں سلگتا ہوا سگریٹ دیکھتی رہی۔ ایک سگریٹ ختم ہوتا تو دوسرا سلگ اٹھتا۔ ایسا لگتا تھا کہ کھڑکی کے قریب ایک انگارا ہوا میں معلق ہے۔

دوسرے دن جب مچل جانے لگا تو فرانسس بولی۔ ”جسمیں زحمت تو ہوگی لیکن اگر تمہیں نوکری مل جائے تو مجھے فون پر اطلاع دے دینا۔ میں نیچے جنرل اسٹور پر دس بجے کے بعد سے تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔“

مچل نے کوئی جواب دینے کے بجائے اسے الوداعی پیار کیا اور چلا گیا۔

کام کاج سے فارغ ہو کر فرانسس جنرل اسٹور پر جا کر ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اسٹور کی مالکن کام کے دوران اس سے باتیں بھی کرتی رہی اور وہ بدولی سے جواب دیتی رہی۔ تین بجے مالکن کی جگہ اس کی بیٹی اسکول سے آ کر اسٹور پر کھڑی ہو گئی اور اس سے نئے سرے سے فرانسس کی بات چیت شروع ہو گئی۔ پانچ بجے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے فرانسس کا جسم اکڑ گیا مگر مچل کا فون نہ آیا۔ اسٹور بند ہونے کا وقت بھی قریب تھا۔ آخر فرانسس نے خود اس فرم کے دفتر فون کرنے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں مچل نے بتایا تھا کہ وہ وہاں انٹرویو دینے جائے گا۔

دوسری طرف سے کوئی لڑکی بولی رہی تھی۔ فرانسس نے اس سے پوچھا۔ ”کیا آج یہاں کسی نئے آدمی کو ملازم رکھا گیا ہے؟“

لڑکی نے بتایا۔ ”ہاں۔ ایک آدمی رکھا تو گیا ہے۔“

”کیا آپ براہ کرم اس کا نام مجھے بتا سکیں گی۔“ فرانسس کا دل خوشی سے بیلوں اچھلنے لگا تھا۔

”لڑکی نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا۔

”ہاورڈ ایلن ہے اس کا نام۔“

فرانسس کا دل ڈوب گیا۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ریسیور رکھا اور فون کال کے عوض دو سکے بھی کاؤنٹر



پر رکھ کر تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر نکل آئی۔ وہ سڑھیاں چڑھ کر فلیٹ میں داخل ہوئی تو چل وہاں موجود تھا۔ اس نے بتی بھی نہیں جلائی تھی۔ اندھیرے ہی میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شاید وہ کافی دیر کا آیا ہوا تھا۔ فرانسس اس سے کچھ فاصلے پر ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ روز کی طرح اس کے قریب نہیں گئی اور نہ ہی اس سے کچھ پوچھا۔ محل کا انداز ہی سب کچھ بتا رہا تھا۔

”مجھے ملازمت ملنے کا یہ آخری موقع تھا۔“ بالآخر ایک طویل وقفے کے سکوت کے بعد محل بولا۔ ”اور پارکر کی بدولت یہ بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔“ اس نے ایک گہری اور تھکی تھکی سانس لی۔ ”میں اس خبیث کو قتل کر دوں گا۔“ ”نہیں..... نہیں محل۔“ فرانسس خوفزدہ ہو کر چلا اٹھی۔ ”اس طرح مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔“

”لیکن میرے مسائل کا ذمہ دار صرف وہی ایک شخص ہے جو خود بڑے مزے سے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہا ہے۔“ محل مٹھیاں بھینچ کر غراتے ہوئے بولا۔ ”وہ میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا اور اس کے احساس کمتری کی تسکین ہو رہی ہوگی کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔“

”ایسی باتیں نہ کرو محل..... میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ اس نے سختی سے اس کا بازو تھام لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسے کھانے کے لیے کچن میں لے گئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کچن میں ہی بیٹھا رہا۔ فرانسس کھانے کے برتن دھونے لگی۔ اس کا ذہن ان گنت اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ آخری برتن سے فارغ ہو کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا، محل کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ بھاگ کر کھڑکی کی طرف گئی اور کھلی میں جھانک کر دیکھا۔ محل کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ انتظار کی سولی پر لٹکنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔

کئی گھنٹوں کے قیامت خیز انتظار کے بعد فرانسس اضطراب کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھلی میں آکھڑی ہوئی۔ کافی دیر بعد وہ آتا دکھائی دیا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے، قدم الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ فرانسس دوڑ کر اس کے قریب گئی اور اس کے بازو پکڑ کر اپنے کندھوں کا سہارا دیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔

”تم اس طرح خاموشی سے کیوں چلے گئے تھے محل۔“ تمہیں پتا ہے، میں کتنا ڈر رہی تھی۔ عجیب عجیب خیالات آرہے تھے میرے دل میں۔“ فرانسس نے شکوہ کیا۔ ”بس مجھے بیٹھے بیٹھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔“ محل نے

”کھڑکی آواز سے کہا: مجھے حافط کردو میں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔“ پھر اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔ ”اب تم مجھ سے پیار نہیں کرو گی نا..... میں بہت برا ہوں۔“ ”نہیں..... نہیں جان! میں ہمیشہ تم سے پیار کرتی رہوں گی۔“ فرانسس نے کہا۔ محل کے جسم کے بوجھ سے وہ بھی لڑکھڑاہی تھی اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ دونوں نے پی رکھی ہے۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

”میں تمہارے جوتے اتار دوں۔“ فرانسس نے اس کے پیروں پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”میں اتنا زیادہ نشے میں تو نہیں۔“ محل نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنا چہرہ دیکھنے دو۔“

”یہاں دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔“ فرانسس نے دوبارہ سر جھکا لیا۔ وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن شام کے کھانے سے تھوڑی دیر قبل کوئی ایسی بات ہوئی جس نے اس کا موڈ یکسر بدل دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ باہر سے آیا تھا اور اس کی بغل میں شام کا اخبار دبا ہوا تھا۔ کپڑے بدل کر وہ اخبار پڑھنے لگا۔ جب وہ کھانے کی میز پر آیا تو اس کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ کھانے کے دوران وہ عجیب عجیب سی نظروں سے فرانسس کی طرف دیکھتا رہا پھر دفعتاً اس نے پوچھا۔ ”فرانسس! تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“ ”نہیں۔ کوئی خاص خبر ہے کیا؟“ فرانسس نے پوچھا۔ ”پارکر اپنے گھر کے قریب ایک سڑک پر مردہ پایا گیا ہے۔“ محل نے بتایا۔ فرانسس ایک لمحے کے لیے سکتے کی سی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے جھپٹ کر اخبار لیا۔ تفصیلات میں کوئی خاص بات نہ تھی سوائے اس کے کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور قاتل نامعلوم تھا۔

”تم نے اسی وقت مجھے اس خبر کے متعلق کیوں نہیں بتایا تھا، جب تم نے یہ پڑھی تھی؟“ فرانسس نے پوچھا۔ ”میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا..... دراصل میں تم سے اس قسم کی باتیں کر رہا تھا نا۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کی آواز کمزور اور سچائی سے خالی تھی۔

کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے پھر فرانسس بڑبڑائی۔ ”کتنی اذیت ناک بات ہے۔ اس کی بیوی نے رات بھر اس کا انتظار کیا ہوگا اور صبح کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھا کر اسے اس کے شوہر کی موت کی اطلاع دی ہوگی تو اس پر کیا گزری ہوگی!“



دو دن بعد محل نے تمام کو اخبار پڑھنے پر مجبور کیا۔ بتایا: "پارکر کا قاتل پکڑا گیا ہے۔"

ایک رات اس نے محل سے پوچھا: "پارکر کے قتل کے سلسلے میں گرفتار ہونے والے شخص کا کیا بنا؟ کیا وہ ابھی تک جیل میں ہی ہے؟"

"اسے جیل میں ہی ہونا چاہیے۔ میں نے ابھی تک اس کی رہائی کی خبر نہیں پڑھی۔" محل نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس پر مقدمہ شروع ہو گیا ہے۔"

فرانسس بہت دیر تک سوچتی رہی کہ جیل میں اس کی زندگی کیسی گزر رہی ہوگی اور وہ کیا کیا سوچتا ہوگا؟

ایک دن محل خلاف معمول ایک دوسرا اخبار خرید کر لیتا آیا۔ اس میں تصویریں زیادہ تھیں اور مواد کم..... کھانے کی میز پر فرانسس یہ اخبار لٹ پٹ کر دیکھ رہی تھی کہ ایک جگہ اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔

"کیا بات ہے؟" محل نے اس کی محویت کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی بیوی بھی ہے....." وہ یوں خوفزدہ نظر آرہی تھی، جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ "مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔"

"کون.....؟" وہ..... کا دل کی بات کر رہی ہو..... تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کی بیوی نہیں ہونی چاہیے تھی.....؟ قاتلوں کی بھی بیویاں ہوتی ہیں۔" محل نے جواب دیا۔

"ہاں....." فرانسس نے دل ہی دل میں کہا۔ "تم سچ کہتے ہو، قاتلوں کی بھی بیویاں ہوتی ہیں....."

اس رات اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے..... اخبار میں اس نے جس عورت کی تصویر دیکھی تھی، وہ آنسوؤں بھری آنکھیں اور سوگوار چہرہ لیے اس کے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ وہ بار بار فرانسس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتی..... "تم اپنے شوہر کے پہلو میں سو رہی ہو، مگر میرا شوہر کہاں ہے.....؟" فرانسس اس سے نظریں چرانے کے لیے منہ دوسری طرف پھر لیتی تو وہ ادھر بھی

آمو جود ہوتی اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہتی..... قاتل کی بیوی تم ہو! لیکن عذاب میں مبتلا رہی ہوں..... سزا میرا شوہر کاٹ رہا ہے۔ پارکر کو قتل تمہارے شوہر نے کیا ہے اور تم نے خاموش رہ کر اس جرم میں اس کا ساتھ دیا ہے، تم بھی قاتلہ ہو....." سینے میں سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا اور سردی کے باوجود اس کا جسم لپٹنے..... میں ڈوبا ہوا تھا..... وہ

اٹھ کر بیٹھ گئی۔

فرانسس ایک کر قریب آئی اور اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھنے لگی۔ پولیس نے کارل نامی ایک شخص کو گرفتار کیا تھا جو ان کی گفتیش کے مطابق پارکر کا قاتل تھا۔ وہ چند ہفتے قبل ہی پارکر کے ہاں ملازم ہوا تھا اور اسے بھی محل ہی کی طرح غیر منصفانہ طور پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ وہ یہ وضاحت نہیں کر سکا تھا کہ وقوعے کی رات وہ

دس اور ساڑھے دس بجے کے درمیان کہاں تھا، اس کا کہنا تھا کہ وہ گھر سے نکلا تھا، چند پیگ پیے تھے اور اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کہاں رہا اور کس طرح گھر واپس آیا۔

محل سے اس شخص کے حالات کی مماثلت حیران کن تھی۔ اخبار میں اس کی گرفتاری کی خبر آخری صفحے پر مختصر سی جگہ میں شائع ہوئی تھی لیکن اس خبر کے عقب میں دراصل

ایک آدمی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

"لیکن وہ تو اس سے انکار کر رہا ہے کہ یہ قتل اس نے کیا ہے۔" فرانسس نے خبر پڑھ کر مدھم سے لہجے میں کہا۔

"آسانی سے کوئی مجرم اقبال جرم نہیں کرتا....." محل نے اطمینان سے کہا۔ "پولیس سب معلوم کر لے گی....." پھر

اس نے فرانسس کے ہاتھ سے اخبار لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "آج کیوں نہ ہم فلم دیکھنے چلیں۔ آج میں خود کو بہت تازہ دم محسوس کر رہا ہوں۔"

فرانسس اس تفریح کے لیے ہامی نہ بھر سکی بلکہ وہ رات کو صبح طور پر سو بھی نہ سکی۔ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ کارل! یہ نام اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح

برستار ہا۔ کوئی غیر مرئی ہاتھ اس کے دل کو مسلے دے رہا تھا۔

☆☆☆

محل کو دوبارہ اسی فرم میں ملازمت مل گئی جہاں وہ پہلے کام کرتا تھا کیونکہ اب پارکر اس کی راہ میں حائل نہ دبا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی پہلے سے زیادہ مقرر ہوئی تھی لیکن اب

ان دونوں مہیاں بیوی کے درمیان ایک عجیب غیر مرئی سی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ وہ تنخواہ کا لفافہ لے کر گھر آتا اور

فرانسس کے ہاتھ میں تھا دیتا تو اس کے چہرے پر وہ تمنا ہٹ، وہ خوشی اور وہ طمانیت نظر نہ آتی جو پہلے ایسے

موقعوں پر دکھائی دیتی تھی۔

"تم اب کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔ میں نے ایک عرصے سے تمہیں جتنے نہیں دیکھا۔"

"اچھا میں جس کر دکھا دیتی ہوں....." وہ زور سے



دوسرے دن سنا تھا کہ کارل اور اجڑا اجڑا بیوی کا  
ہی ہو سکتا تھا..... وہ مجسم ایک کھنڈر نظر آرہی تھی۔

”میں اندر آ سکتی ہوں.....؟“ فرانسس کا گلا خشک  
ہو رہا تھا۔ عورت نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا  
راستہ دیا۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں..... اور نمی اب بھی اس  
کی پلکوں پر چل رہی تھی۔  
”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں تمہیں کافی عرصے سے  
جانتی ہوں۔“ کارل کی بیوی نے کہا۔

”ہاں، تمہارے اور میرے درمیان ایک عجیب  
سارشتہ موجود ہے۔“ فرانسس نے آہستگی سے کہا۔  
عورت کی آنکھوں سے آنسو اٹھ کر رخساروں پر بہنے  
لگے۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ پوری دنیا سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا  
ہے..... آج رات میری بہن مجھے اور بچوں کو اپنے گھر لے  
جانے کے لیے آرہی ہے۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ اس کے  
گھر جاؤں لیکن..... لیکن بہت سی مجبوریوں ہیں۔“ دفعتاً ایک  
چھوٹا سا بچہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور ان کی باتیں سننے  
لگا۔ کارل کی بیوی نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگا کر کہا۔  
”تم اندر ہی رہو اور ننھے بھائی کے ساتھ کھیلو، چلو..... چلو.....“  
بچہ اندر چلا گیا تو وہ دوبارہ فرانسس کی طرف متوجہ  
ہو کر بولی..... ”یہ معصوم اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں  
جانتا اور ہر وقت پوچھتا رہتا ہے کہ ڈیڈی کہاں گئے ہیں،  
کب آئیں گے..... میں اسے کیا جواب دوں.....“

فرانسس اضطراری انداز میں اپنا پرس کھولتی اور  
بند کرتی رہی..... عورت کہہ رہی تھی..... ”مجھے اپنی اتنی فکر  
نہیں لیکن ان بچوں کو باپ کے سائے سے محروم کر دینا کہاں  
کا انصاف ہے.....؟ کارل تو سزا بھگت کر اس دنیا سے  
رخصت ہو جائے گا لیکن یہ بچے زندگی بھر عذاب سہنے کے  
لیے زندہ رہ جائیں گے.....“

عورت کی آواز فرانسس کے احساس پر تازیانی کی  
طرح برس رہی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر کانوں پر ہاتھ  
رکھ لیے۔ عورت کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اس نے دونوں  
بازو دھوپ میں پھیلا کر بین کرنے کے سے انداز میں  
کہا..... ”آج سورج بھی کتنی تیزی سے ڈھل رہا ہے  
..... کاش کوئی اس کو یہیں روک دے..... یہ اس کی زندگی  
کا آخری سورج ہے..... وہ اس سے روشنی چھین رہے ہیں“  
..... اس کا لہجہ ہسٹریائی ہو چلا تھا۔ فرانسس نے نرمی سے  
اس کے کندھے تمام کرا سے کھڑکی سے ہٹایا اور ایک کرسی پر  
بٹھایا، اس کے بکھرے ہوئے بال اس کے چہرے سے

فرانسس فٹ ہاتھ پر کھڑی تھی اور سڑک کے پار،  
اپنے سامنے والی عمارت کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یہاں  
کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور وہ ابھی  
تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ جا کر کارل کی بیوی سے ملے یا گھر  
واپس لوٹ جائے..... آج کارل کی زندگی کی آخری رات  
تھی۔ کل علی الصباح اسے گیس چیمبر میں پہنچانے کا فیصلہ  
دے دیا گیا تھا۔

”صرف میں ایک ایسی ہستی ہوں“ فرانسس سوچ  
رہی تھی ”جو اس عورت کا سہاگ بچا سکتی ہے..... اگر میں  
نے اس وقت اپنے ضمیر کی آواز پر کان نہ دھرا تو ساری  
زندگی خلش کے کانٹوں پر گھسٹتے گھسٹتے گزر جائے گی۔ اس  
عورت کی بددعا میں مجھے بھی چین سے زندگی نہ گزارنے  
دیں گی۔“

فرانسس نے تنویری سی کیفیت میں سڑک پار کی اور  
اس عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہو گئی..... یہ ایک  
معمولی درجے کی عمارت تھی..... وہ لابی میں لگے ہوئے  
لیٹر بکس پر کرائے داروں کے نام پڑھنے لگی۔ دربان اپنے  
کمرے سے نکل کر اس کے قریب آ کر بولا۔ ”آپ کو کس  
سے ملنا ہے محترمہ.....؟“

”مسز کارل سے..... کیا وہ ابھی تک یہیں رہتی  
ہیں.....؟“ فرانسس نے پوچھا۔

”وہ اوپر تیسری منزل پر رہتی ہیں..... کیا آپ انہیں  
..... جانتی ہیں.....؟“

”نہیں.....“ فرانسس نے آہستگی سے کہا۔ ”میں  
دراصل ایسے انسانوں سے ضرور ملتی ہوں جو کسی مشکل میں  
گرفتار ہوں.....“

”جی ہاں..... وہ بے چاری اس وقت ایک نہیں  
بیموں مشکلات میں گرفتار ہے.....“ دربان نے گہری  
سانس لے کر کہا۔ ”اس واقعے سے پہلے میاں بیوی کی  
زندگی بڑی خوشگوار گزر رہی تھی۔ کارل کے جیل جانے سے  
پہلے ان کے ہاں دوسرے بچے کی ولادت ہوئی تھی وہ بے  
چارہ کمسنی میں ہی باپ کے سائے سے محروم ہو جائے گا۔“  
فرانسس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ تیزی  
سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

فرانسس کی دسک کے جواب میں کارل کی بیوی  
دروازے پر آئی، تو فرانسس نے پہلی نظر میں اسے پہچان  
لیا۔ ایک تو فرانسس نے اس کی تصویر دیکھی ہوئی تھی،



ہٹائے اور ایک گلاس میں اس کے لیے پانی لے آئی۔ پانی کے دو چار گھونٹ پی کر عورت کی حالت ذرا سنبھلی تو وہ پڑمردہ لہجے میں بولی..... ”میں آج اسے دیکھنے گئی تھی..... اسے الوداع کہہ کر میں نہ جانے یہاں تک واپس کس طرح پہنچی..... سفر کے دوران بھی کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ ٹرین سے چھلانگ لگا دوں لیکن مجھے ان ننھے بچوں کا خیال آگیا جو میرا انتظار کر رہے تھے، جن کا اس دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں پہلے انہیں صرف باپ کا انتظار تھا پھر یہ ماں کا بھی انتظار کرتے کرتے تھک جاتے..... ماما مجھے واپس گھر تک لے آئی.....“

فرانسس نے اس کی طرف قدرے جھک کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا..... ”کیا اس نے واقعی قتل کیا تھا.....؟“

”نہیں.....“ عورت نے دہشت زدہ سے لہجے میں کہا..... ”وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا..... اس نے مجھے قسم کھا کر بتایا تھا کہ اس نے پارکروئل نہیں کیا۔ وہ اس رات باہر ضرور گیا تھا لیکن صرف چند پیک پی کرواپس آگیا تھا۔“

”جب وہ باہر سے واپس آیا تو تم نے اس میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی تھی.....؟“ فرانسس نے پوچھا۔

”نہیں..... میں نے اسے باہر جانے سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ اپنے دوست تک سے ملنے چلا گیا۔ تک اسے نہیں ملا تو وہ پارک میں بیٹھ کر پینے لگا۔ اگر تک اسے مل گیا ہوتا تو پھر اس پر قتل کا الزام نہیں لگ سکتا تھا لیکن اب کون اس کی سنے، کون میری مدد کرے.....؟“

”میں تمہاری مدد کروں گی.....“ فرانسس نے دل میں سوچا۔ ”صرف میں ہی تمہاری مدد کر سکتی ہوں.....“ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا ذہن یوں صاف ہو گیا گویا گورا اندھیری رات ڈھل گئی ہو اور فیصلے کا سورج طلوع ہو گیا ہو۔

کارل کی بیوی چند لمحوں تک خاموش بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔ پھر فرانسس کی طرف مڑتے ہوئے بولی..... ”تم..... تم.....“ جملہ اس کے ہونٹوں پر ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ فرانسس وہاں سے جا چکی تھی۔

فرانسس اس وقت ایک ٹیلی فون بوتھ میں کھڑی تھی۔ اسے گویا کوئی غیبی طاقت یہاں پہنچ لائی تھی اور اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں..... ٹیلی فون کر رہی ہے۔ ہاں ایک احساس ضرور تھا کہ اس ٹیلی فون کال کے بعد اس کی جنت اجڑ جائے گی اور وہ دنیا کے جہنم کدہ میں زندہ جلنے کے لیے تنہا رہ جائے گی۔

”شام بخیر..... پولیس ڈیپارٹمنٹ.....“ اس کے

کانوں میں ایک آواز آئی۔

”میں پارک کے مقدمہ کے سلسلے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں.....“ اس کے پتھرے ہوئے ہونٹوں سے بشکل آواز نکلی..... ”جسے کل علی الصباح پھانسی دی جا رہی ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کس طرح آپ کو اپنا مقصد سمجھاؤں.....“

”ایک منٹ ٹھہریے محترمہ.....“ دوسری طرف سے بالکل غیر جذباتی اور پیشہ ورانہ لہجے میں کہا گیا پھر چند لمحے بعد دوسری آواز سنائی دی..... ”ہاں محترمہ..... کیا کہنا چاہتی ہیں آپ.....؟“

”میں..... میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ پارک کے قتل کے سلسلے میں آپ نے کارل نامی جس شخص کو گرفتار کیا ہوا ہے وہ بے گناہ ہے..... قتل اس نے نہیں کیا..... میری بات پر یقین کیجئے.....“

دوسری طرف خاموشی سے اس کی بات سنی جا رہی تھی اور جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو اس شخص نے پوچھا.....

”سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟ اور کہاں سے بول رہی ہیں.....؟ پولیس سے بات کرتے وقت یہ بتانا ضروری ہوتا ہے اور قانون پسند شہری اپنا نام و پتا بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔“

”میں مسز بچل کی تھ بول رہی ہوں.....“ فرانسس کے منہ سے بے اختیار نکلا.....

”اور آپ کا پتا کیا ہے.....؟“ دوسری طرف سے بولنے والے کے لہجے میں اب کسی قدر دلچسپی کی آمیزش تھی۔

”جو الیسوس شاہراہ..... پری بلڈنگ.....“

”ہاں تو مسز بچل..... آپ کیا بتانا چاہ رہی ہیں.....؟“

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ کارل مجرم نہیں ہے..... مجھے سب کچھ معلوم ہے..... اگر مجھے کارل کی بے گناہی کا یقین نہ ہوتا تو میں بھی آپ کو فون نہ کرتی.....“ الفاظ اس کے ہونٹوں سے خود بخود پھسلتے جا رہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں اس کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہیں۔ اسے شاید اپنے آپ پر اختیار نہ رہا تھا۔

”لیکن آپ کے پاس اس ٹھوس یقین کی کوئی وجہ تو ہوگی مسز بچل..... وہ کیا وجہ ہے.....؟“

”چند لمحوں کے لیے فرانسس نے خود کو ایک دورا ہے پر کھڑے محسوس کیا۔ واپسی کے دروازے اب بھی اس کے لیے کھلے تھے لیکن اس کا ضمیر اسے انصاف اور انسانیت کے راستے کی طرف کھینچے لیے جا رہا تھا..... اس کے تصور میں



”اس پہلے قتل کو کتنا عرصہ گزر رہا ہوگا؟“  
 ”ہماری شادی سے پہلے..... دس سال پہلے، سینٹ  
 لوئیس میں اس نے یہ قتل کیا تھا..... اس وقت اس بات کو  
 تقریباً تیرہ برس گزر چکے ہیں“  
 ”آپ نے کیسے یقین کر لیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے  
 درست کہہ رہا ہے؟“

”میں سچ اور جھوٹ میں امتیاز کر سکتی ہوں..... پھر یہ  
 کہ اس نے مقتول کا نام بھی بتایا تھا جو میں کبھی نہیں بھول سکتی  
 جوزف بلی نام تھا اس کا.....“

”اچھا محترمہ! میں کوشش کروں گا کہ اس شخص کی  
 سزائے موت کچھ دیر کے لیے ملتوی کر اسوں جو آپ کے  
 خیال میں بے گناہ ہے..... آپ نے بھی اسے دیکھا ہے؟“  
 ”نہیں..... میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا لیکن اس کی  
 بے گناہی کا علم ہو جانے کے بعد سے مجھے اس کے بارے  
 میں اتنی تشویش ہے کہ میں کئی راتوں سے سو نہیں سکی۔“

”میں سمجھ گیا ہوں سزجمل.....“ دوسری جانب سے  
 اسی سپاٹ لہجے میں کہا گیا..... ”لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ  
 آپ یہاں آکر تفصیل سے اپنا بیان ریکارڈ کروادیں.....“  
 یہ جملہ سنتے ہی جیسے اس کا خواب ٹوٹ گیا اور وہ  
 حقیقت کی دنیا میں پلٹ آئی، بے پناہ خوف نے اسے گھیر  
 لیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی..... ”نہیں..... نہیں..... میں  
 یہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے کانپتے ہاتھ سے ریسپورہک پر  
 لٹکا دیا۔

”مجھے گھر جانا چاہیے..... کل میرا انتظار کر رہا  
 ہوگا.....“ اس نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ہاتھ سے  
 نکل کر وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ اس کے عقب سے ٹیلی فون  
 کی گھنٹی بجنے لگی۔ گویا کوئی اسے واپس بلا رہا ہو۔ اسے اس  
 ٹیلی فون سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ چلنے کے بجائے  
 دوڑنے لگی۔ اس کا ہیٹ بھی راستے میں گر گیا لیکن اسے کوئی  
 ہوش نہ تھا وہ بڑبڑاتی جا رہی تھی..... ”میرا مطلب یہ نہیں  
 تھا..... آہ..... یہ میں نے کیا کر دیا.....“

وہ دوڑتی رہی..... شام کا ملگجا اندھیرا اس کے گرد  
 پھیل رہا تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ وہ کس راستے پر  
 جا رہی ہے..... ایک جگہ پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی  
 فٹ پاتھ پر رک کر وہ گہری سانس لینے لگی۔ تب اس نے  
 دیکھا کہ سامنے ہی اس کا گھر تھا..... وہ دوڑ کر اپنے قلیٹ کی  
 سیڑھیاں چڑھی۔ کچل دوڑا زے ہی میں کھڑا تھا۔ وہ اس

کارل کی بیوی اچھے بال بچھی آکھیں، چاک گر کیا ہے  
 کھڑی تھی اور اس کا دامن پکڑ کر پوچھ رہی تھی۔

”بتاؤ..... یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک ناکردہ جرم  
 کی پاداش میں میرے بچوں کو باپ کے سائے سے محروم  
 کر دیا جائے..... بولو..... جواب دو.....“

اب فرانسس کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا  
 تھا۔ اس نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا..... ”کیونکہ..... کیونکہ یہ  
 قتل میرے شوہر نے کیا تھا.....“

اس کی بات سننے والے شخص کو غالباً کوئی حیرت نہیں  
 ہوئی تھی۔ یا شاید کوئی رد عمل ظاہر نہ کرنے میں ان کی کوئی  
 مصلحت تھی..... اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا.....  
 ”آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، اس پر آپ کو پورا یقین ہے  
 سزجمل.....؟“

”ہاں، مجھے بڑی اچھی طرح احساس ہے کہ میں کیا  
 کہہ رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں.....؟“ اس نے  
 زور دے کر کہا..... ”وہ بار کر کے ہاں کام کرتا تھا۔ پارکر  
 نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا جس کی وجہ سے ہم  
 نے ایک طویل عرصہ مصائب میں گزارا..... اس نے کہا تھا  
 کہ وہ بار کر کوئل کر دے گا اور میں جانتی ہوں کہ وہ جو کچھ کہتا  
 ہے، کر گزرتا ہے لیکن..... آہ..... میں اسے اس اقدام سے  
 باز نہیں رکھ سکی..... جس رات پارکر قتل ہوا اسی تاریخ کا ٹرائی  
 کار کا ایک ٹکٹ میرے شوہر کی جیب سے برآمد ہوا تھا جو اسی  
 علاقے کا تھا جہاں پارکر کی لاش پائی گئی تھی۔“

”آپ نے وہ ٹکٹ محفوظ رکھا ہے؟.....؟“  
 ”نہیں..... میں نے وہ ضائع کر دیا تھا.....“ وہ  
 بدستور تنویری کیفیت میں بول رہی تھی.....

”اس سلسلے میں آپ کچھ اور کہنا چاہتی ہیں.....؟“  
 ”نہیں..... لیکن میں ایک بار پھر یہی کہنا چاہتی ہوں  
 کہ قتل کارل نے نہیں کیا۔ آپ اسے بے گناہی کی موت  
 مرنے سے بچالیں.....“ اس کی آواز کانپنے لگی..... دوسری  
 جانب پھر وہی خاموشی چھا گئی.....

”آخر آپ اتنی پُر یقین کیوں ہیں کہ قتل آپ کے  
 شوہر ہی نے کیا ہے.....؟“ قدرے توقف کے بعد سپاٹ لہجے  
 میں پوچھا گیا۔

”کیونکہ وہ پہلے بھی ایک قتل کر چکا ہے..... اسی  
 رات ہماری مگنٹی ہوئی تھی جس رات اس نے یہ بات مجھے  
 بتائی۔ اس نے بتایا تھا کہ پولیس اس قتل کا سراغ نہیں لگا سکی  
 تھی..... اسی بناء پر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ قتل بھی



کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سرگوشی کی اور اس ایک لفظ کی شنیم سے گویا اس کی ساری بدگمانیاں، ساری غلط فہمیاں دھل گئیں۔ اسے محسوس ہوا کہ ٹچل سے زیادہ سچا کوئی نہیں اور وہ خود ٹیلی فون پر بہت بڑا جھوٹ بول آئی ہے۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا ٹچل..... میں یہ کرنا نہیں چاہتی تھی.....“ وہ بے ربط باتیں کر رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے فرانسس! تم اتنی دیر کہا رہی ہو.....؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا اور فرانسس ندامت اور پچھتاوے کے سمندر میں غرق ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سانسیں الجھ رہی تھیں وہ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا، جس نے اسے ہیکراں محبت دی تھی اور جس نے اپنا ہر راز، اپنی ہر متاع اس کے ہاتھوں میں سونپ رکھی تھی۔

”وہ تمہیں یہاں سے نہیں لے جاسکتے ٹچل..... وہ تمہیں نہیں لے جاسکتے.....“ وہ دیوانوں کی طرح تکرار کیے جا رہی تھی۔

فرانسس لڑکھڑاتے ہوئے انہی اور گرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا وہ کسی کے بازوؤں میں جھول گئی لیکن یہ بازو ٹچل کے نہیں تھے۔ ٹچل کے بازوؤں کا لمس وہ قبر میں بھی پہچان سکتی ہے۔ پھر اسے اپنے قریب ہی ٹچل کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بہت دور کہیں تاریک اور اجڑے مزاروں سے آرہی تھی..... فرانسس نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سرمئی سوٹ والے ایک دروازہ آدھی نے اسے اپنے بازو سے سہارا دے رکھا تھا۔

”کون نہیں لے جاسکتے.....؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے فرانسس.....؟“ اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ٹیپر پچر دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی اور اس کی گردن نیچے کو ڈھکنے لگی۔ ”میں نے بڑا بھیا تک خواب دیکھا ہے ٹچل.....“ وہ گویا غیند میں بڑبڑا رہی تھی..... ٹچل نے اسے صوفے پر لٹایا اور اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھیں کھلیں..... ”ٹچل.....“ اس نے سسکاری بھری۔

”کیا کارل بچ گیا۔ جس کے بچوں کے لیے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے.....؟“ اس نے ٹوٹی آواز میں سرمئی سوٹ والے سے پوچھا.....

”دشش..... خاموش لیٹی رہو..... ڈاکٹر آنے ہی والا ہوگا۔ میں نے اسے فون کر دیا ہے۔“ ٹچل نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”کارل کو آدھ گھنٹا قبل سزائے موت دے دی گئی ہے..... گیس چیمبر میں جانے سے پہلے اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔“ سرمئی سوٹ والے نے جواب دیا۔ فرانسس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس میں آنکھیں کھلی رکھنے کی بالکل سکت نہ تھی۔ وہ تاریک اور ہیبت ناک کھنڈر اسے بھی اپنی طرف بلا رہے تھے جہاں اس کی اولین محبت، اس کے محبوب، اس کے دکھ سکھ کے ساتھی، اس کے رفیق حیات کو دفن کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔

”ٹچل..... وہ آنے والے ہیں..... خدا کے لیے اپنا سامان باندھو۔“ وہ اب اس طرح کانپ رہی تھی گویا اسے شدید سردی لگ رہی ہو، اور اسی کپکپاہٹ میں وہ صوفے سے نیچے گر گئی۔ ٹچل نے اسے اٹھایا تو وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور لگانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ ہڈیانی انداز میں کہے جا رہی تھی..... ”جلدی کرو ٹچل..... وقت بہت کم ہے سامان باندھو، ہم دونوں بھاگ چلیں..... وہ ہماری جنت کو لوٹنے آرہے ہیں۔“

”ٹچل.....“ اس نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان بدقت کہا۔ ”تمہارے بغیر..... میں..... بھی..... زندہ نہیں رہ سکتی۔“ اور پھر وہ سرمئی سوٹ والے کے بازو میں جھول گئی۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹچل دروازے کی





❖ داؤد اشفاق.....اوکاڑہ

تفحیک و التفات میں رہنے دے امتیاز  
یوں مسکرا نہ دیکھ کے، ہاں مسکرا کے دیکھ

❖ محمد زاہد.....سرگودھا

مجھ کو ڈر ہے، تری آواز ہے بھرائی ہوئی  
حریت کا یہ ترانہ ہے تو مدغم کیوں ہو  
جس کو تہذیب و تمدن کا افق چھونا ہے  
چند فرسنگ کی پرواز سے بے دم کیوں ہو

❖ ریاض بٹ.....حسن ابدال

زمین پہ ڈھونڈنے سے اب نہیں ملتی  
وفا بھی شاید اب آسمان پہ رہتی ہے



❖ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی

بھولی بھری یادیں ہم سے ملنے آتی ہیں  
شام ڈھلے اس سونے گھر میں میلا لگتا ہے

❖ مرزا طاہر الدین بیگ.....میرپور خاص

حسن فطرت کو ڈھونڈنے والے  
کیا کبھی تو نے صبح دیکھی ہے

❖ رانا بشیر احمد ایاز.....ناظم آباد، کراچی

اک اور بات پتے کی میں بتاؤں تجھ کو  
آخرت بنتی چلی جائے گی دنیا نہ بنا  
یہ خدا بن کے رعایت نہیں کرتے وہی  
ان حسن والوں کو بھی قبلہ و کعبہ نہ بنا

❖ جاوید اختر رانا.....پاکپتن شریف

زیست سے تنگ ہواے داغ تو جیتے کیوں ہو  
جان پیاری بھی نہیں جان سے جاتے بھی نہیں

❖ سید عبادت کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان

یہ اندھیرا روشنی کیا ہے  
آؤ سوچیں یہ زندگی کیا ہے  
ہر قدم پر فریب دیتے ہو  
بندہ پرور یہ دوستی کیا ہے

❖ سیدہ ثانیہ کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان

اک وہی شخص بس مجھے یاد رہا  
جس کو سوچا تھا بھول جاؤں گا

❖ محمد شہباز ناز.....سرگودھا

سوکھے پتوں کی طرح بکھر گئے تھے ہم  
کسی نے اکٹھا بھی کیا تو صرف جلانے کے لیے

❖ مرزا گل، رمن گل.....دراہن کلاں

ہم سے کہیے درد کے قصے، ہم سے کیجیے رنج کی بات  
ہم پر بیتے کیا کیا موسم، تنہا دل لاکھوں آفات  
آج ہی دل کچھ ٹھہرا تھا، آج ہی آنکھیں خشک سی تھیں  
آج ہی ظالم ٹوٹ کے برسی موسم کی پہلی برسات

❖ ظفر اقبال ظفر.....کامرہ شرقی

بہت دنوں سے ہے اس کی مٹھی میں بند میرا وجود  
اب میرے سحر سے کہو مجھے آزاد کر دے



✽ عبدالجبار رومی انصاری..... چاہے کب لادو  
 شکوہ سنجی ہر مقصود نہیں رب کریم!  
 خود بڑا حکم ہے، اخفائے حقیقت نہ کروں  
 تو تجلی کو جو آلودہ پستی نہ کرے  
 ایک مٹی کے دیے سے بھی محبت نہ کروں؟  
 ✽ مہوش..... لاہور

سناتے ہیں اندھیرے تو لرزتے کیوں ہو؟  
 بر نئی صبح کی تخلیق یونہی ہوتی ہے  
 رات کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا تاباں آنسو  
 درحقیقت مرے جھومر کا گراں موتی ہے

✽ وقار حسن..... راولپنڈی

میں اگر بھوک کی شدت کا گلہ کرتا ہوں  
 تم عقیدوں کے غبارے مجھے لادیتے ہو  
 میرے ملبوس کے پُرہول شکافوں کے عوض  
 کتنی تقدیس سے فرمانِ حیا دیتے ہو

✽ محمد احسان شاکر..... چودھوان

اُن کے آنے پہ یوں ہوش اڑ گئے ساقی کے  
 شرابِ سخن پر ڈالی کہلب ششے میں

✽ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ

جلا رہا ہوں اسی سے نفس نفس میں چراغ  
 بڑی نظر نے جو بخشی تھی آج اہلی سی

✽ مہتاب احمد..... حیدرآباد

یہی عنوانِ کرم ہے تو زبے لطف و کرم  
 سانس چلتی ہے تو چلتے رہیں شتر تیرے  
 میں ترا عذرتسم مانا تو لوں گا لیکن  
 اس طرح اور بھی کھل جائیں گے جو ہر تیرے

✽ ملائکہ حریم..... اوکاڑہ

وہ جس نے درد بھی بخشا ہے لا دوا مجھ کو  
 یہ دل اسی کے لیے بے قرار رہتا ہے

✽ اشفاق شاہین..... لاہور

وقت کا مرہم بھی کچھ مدت میں ہوگا کارگر  
 ہے ترے بخشے ہوئے زخموں کی گہرائی بہت

✽ ثمنہ وقار..... راولپنڈی

خزین کی زد میں ہوں لیکن اجاڑ دل میں میرے  
 کسی کی یاد کے اب بھی گلاب کھلتے ہیں

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... چاہے کب لادو  
 شام ہاتھوں میں شعاعوں کے لیے اٹکارے  
 دور پر بت کے جھروکے میں نظر آتی ہے  
 ابنِ آدم کو اگر سمت کا احساس نہ ہو  
 ایک پل کو تو یہ سمجھے کہ سحر آتی ہے  
 ✽ محمد اسماعیل..... کوئٹہ

اومچتی راہ پہ شیشم کی خمیدہ شاخیں  
 جانے کس سوچ میں مہبوت، جھگی آتی ہیں  
 موج در موج، پراسرار کھنی تیرگیاں  
 سنسنی بن کے خلاؤں میں رچی جانی ہیں

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

میں سوچتا ہوں، کہ اے کاش تیرا ہیکر ناز  
 بس ایک پل کے لیے صرف میرا ہو جاتا  
 بری نظر میں ستارے کچھ ایسے ٹل جاتے  
 کہ آسمان و زمیں پر اندھیرا ہو جاتا

✽ شازیہ..... کراچی

کہیں سے ڈھونڈ کے لادو وفا جو مل جائے  
 ترس گیا ہے جہاں رسم دوستی کے لیے

✽ احمد حسن عرضی خان..... قولہ شریف بائی پاس

ایسے زخموں کو کیا کرے کوئی  
 جن کو مرہم سے آگ لگ جائے

✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

پس دیوار ہے اک اور بھی دیوار بلند  
 ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں  
 یہ احاطوں میں احاطے، یہ فصیلیں، یہ حصار  
 وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

✽ اور لیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

مبا نے پھر دہندوں پہ آکے دیکھ دستک  
 سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گہرائے

✽ زرین آفریدی..... حیدرآباد

میں کیا دکھاؤں، میرے تار تار دامن میں  
 نہ کچھ یہاں کے لیے نہ کچھ وہاں کے لیے

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

ڈرتا ہوں کہیں ہاتھ سے گر کے ٹوٹ نہ جائے  
 مٹی کے کھلونے سے مجھے پیار بہت ہے



\* بنیش صدیقی..... حیدر آباد  
 وہی تو فیصلہ کرتا ہے پتھر کے مقدر کا  
 کے ٹھوکر میں رکھنا ہے کے اسود بنانا ہے  
 \* محمد حسان گل سیال..... روہڑی، ضلع سکھر  
 تسکینِ محبت کے فقط دو ہی طریقے تھے  
 یا دل نہ بنا ہوتا یا تم نہ بنے ہوتے  
 \* مسٹر اینڈ مسٹر محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال  
 ذرا سی طبیعت کیا ناساز ہوئی میری  
 بچے وکیل کو بلا لائے طبیب سے پہلے  
 \* وزیر محمد خان..... بل ہزارہ  
 تم جو ہر بات میں دیتے ہو پرندوں کی مثال  
 اس کا مطلب ہے کہ ہم شہر سے ہجرت کر لیں  
 \* شاہ زیب..... سرگودھا  
 آتا ہے قیامت کو تو کیوں نہیں جاتی  
 آثار ہویدا ہیں دروہام پہ کب سے  
 \* مدحت..... کراچی  
 یہ صبح کون سا خورشید لے کے اتری ہے  
 جو آج روشنی میرے مکاں تک آئی ہے  
 \* انجم وارثی..... ملتان  
 گھر کی دلیز پہ روشن تھے جہاں اپنے چراغ  
 کیا خبر تھی کہ وہیں کھائیں گے ٹھوکر اے دوست  
 \* شمشاد علی..... راولپنڈی  
 جو دکھ ہے ہیں قدم راس آئیں گے کہ نہیں  
 کسی فقیر سے اب بچ سوال پوچھنا ہے  
 \* جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی  
 جیتے دن جب یاد آئے ہیں لمبی تنہا راتوں میں  
 دیواروں کو ٹکٹے ٹکٹے بھول گئے ہیں سونا بھی  
 \* احمد خان..... پشاور  
 پرتوں جیسا حوصلہ بخشا  
 اے محبت ترا جواب نہیں

\* شرمین اعجاز..... فیصل آباد  
 پھر کوئی حیلہ بہانہ مل گیا ہوگا اے  
 کچھ تو ہوگا بے سبب یوں روٹھ جانے کا سبب  
 \* افتخار حسن..... کوٹری  
 سائے دھواں دھواں ہیں بدن گرد گرد ہیں  
 وہ اتلا پڑی ہے کہ آئینے زرد ہیں  
 \* ناصر علی..... کوئٹہ  
 بے نام سا وہ ایک تعلق وفا پرست  
 گر پوچھتے ہی ہو تو چلو تھا کسی سے تھا  
 \* سکندر علی..... منڈی بہاؤ الدین  
 کھا کر کھست تم کو بچایا ہے ہار سے  
 دل کھول کر تو آج دعا دیجئے مجھے  
 \* افضل خان..... لاہور  
 کیسی ہوا چلی ہے کہ اب بستیوں میں لوگ  
 سرگوشیوں میں کرتے ہیں دیوار و در کی بات  
 \* ورداء محمد آریز ملک..... کراچی  
 اس آسمان کی بلندی سے دسترس سے دور  
 قدم ہم اپنی زمیں پر جھاکے رکھتے ہیں  
 \* ثمینہ ناز..... سیالکوٹ  
 یوں تو قدم قدم پر تھی گردشِ زیانہ  
 اک بے زباں محبت بھی اپنے درمیاں تھی  
 \* صباحر..... اوکاڑہ  
 ٹوٹ کر چاہنے کی بات کرو  
 ورنہ کہہ دو کہ واسطہ ہی نہیں  
 \* وسیم اکرم..... مہر شاہ، خانیوال  
 قافلوں کے قافلے گزر گئے  
 اک میرا ہی درو تھا جو ہجرت نہ کر سکا  
 \* محمد فراز..... سکھر  
 اک تیری خاموشی جلا دیتی ہے میرے دل کو  
 باقی سب انداز اچھے ہیں تیری تصویر میں

## محفل شعرو سخن

نام: \_\_\_\_\_  
 پتا: \_\_\_\_\_





# Downloaded From Paksociety.com

## لگدم

### منظرِ امام

کسی کی عمر کی نقدی اتنی کم ہوتی ہے اور ذمہ داریاں اتنی کہ اسے اگر کہیں سے یہ نقدی ادھار مل جاتی تو پہلی فرصت میں لے لیتا مگر افسوس... افسانیت تو وہاں بھی رو رہی ہے جہاں زندگی کے خوب صورت دن نوجوان نسل منشیات کے سہارے پر دریغ لٹا رہے ہیں... کتنا فرق ہے ان دونوں جگہوں پر... کاش انہوں نے اس زہر میں اپنی پناہ نہ ڈھونڈی ہوتی۔

ہم گھٹنے والے ماحول میں زندگی کی تاقدری کا قصہ

ہم دونوں ہی عجیب ٹھکے میں تھے۔  
جویریہ کے والدین نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ  
اس کے بی اے پاس ہوتے ہی اس کی شادی اس کے  
پھوپھی زاد... سے کر دی جائے گی۔ جو کم بخت دیکھنے میں  
پھوپھی زاد کم اور پھوپھی زیادہ لگتا تھا۔ یعنی اس میں تھوڑا  
تھوڑا زمانہ پن تھا۔ جانے کیوں جویریہ کے والدین اس پر  
لٹو ہو گئے تھے۔

میں ایک دن محبت کے جوش میں جویریہ کے ابو



سے جا بھڑا۔ وہ کچھ ابو اس قسم کے انسان تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”جناب! آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں پچھلے پانچ برسوں سے جویریہ سے محبت کرتا چلا آ رہا ہوں۔“

”تو اب کیا ریٹائرمنٹ لینا چاہتے ہو؟“

”نہیں جناب! پرمانٹ ہونا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ، کس ماڈل کی گاڑی ہے تمہارے پاس؟“

”فی الحال تو کسی ماڈل کی نہیں ہے لیکن ایک محبت کرنے والا دل ضرور ہے۔“

”لیکن شہناز کے پاس تو بالکل نئے ماڈل کی گاڑی ہے۔“

”اور یہ شہناز کون خاتون ہیں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بے وقوف، وہ خاتون نہیں، جویریہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔“

”خود سوچیں جناب۔ جس شخص کا نام ہی اتنا زنا نہ ہو وہ خود کیسا ہوگا؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیا تم ہاکی کے مشہور کھلاڑی کو نہیں جانتے؟ اس کا بھی نام شہناز تھا بلکہ میرے ایک دوست کا نام بانو تھا اور خود میرے فرسٹ کزن کا نام سنگھی بیگم ہے۔“

”اب آپ کا سارا خاندان ہی ایسا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے میرے پاس ایک محبت کرنے والا دل ہے۔“

”اپنا مکان ہے تمہارے پاس؟“

”میں نے کہا تھا کہ محبت کرنے والا دل ہے۔ پھر بار بار ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

”جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کیا تمہاری محبت کو لے کر وہ چائے گی؟ یہ سن لو کہ اس کے بی اے پاس ہوتے ہی شہناز سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔“

”آپ مجھے دوسرے مثل اعظم معلوم ہو رہے ہیں جناب۔ آپ کو کیا معلوم کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے جج صاحب؟“

”یہ جج میں جج کہاں سے آ گیا؟“

”آئی نہیں، میں لایا ہوں کیونکہ میں نے کل ہی محمد علی کی ایک پرانی فلم دیکھی ہے۔ اس کے پاس بھی ایک محبت بھر ادا تھا۔“

”تم یہاں سے جا رہے ہو یا میں اپنے نوکروں کو بلواؤں؟“

”نوکری بھی یہاں آ کر کیا کریں گے؟ زیادہ سے

زیادہ مجھے باہر ہی نکال دیں گے۔ تو میں خود ہی باہر جا رہا ہوں۔“

اور میں باہر آ گیا۔ میرے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ اکثر لگی رہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ میرے عشق کی آگ ہے جبکہ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ تیزابیت ہے اور مجھے لگ کر اس کا علاج کرانا ہوگا۔

میں نے فوری طور پر جویریہ سے میٹنگ کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے اپنے موبائل سے کیج کیا۔ ”شام پانچ بجے ہانڈ پارک میں آ جاؤ۔“

لندن میں ایک ہانڈ پارک ہے جہاں لوگ کھڑے ہو کر پوری دنیا، حکومت، سیاست وغیرہ کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ یہ والا ہانڈ پارک ہمارے بھی شہر میں تھا اور ہم اسے ہانڈ پارک اس لیے کہتے کہ ہم یہاں بیٹھ کر اپنے خاندان کو گالیاں دیا کرتے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ میں نے اسے آج بلایا تو ہے لیکن وہ کل آئے گی۔ اس کی وجہ اس کی بے پروائی نہیں تھی بلکہ اس کا موبائل سیٹ ہی ایسا تھا۔ پیغامات ایک دن کے بعد ملا کرتے تھے۔

دستور کے مطابق وہ دوسری شام کو ہانڈ پارک پہنچ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”جویریہ! بہتر یہی ہے کہ تم اپنا یہ موبائل سیٹ کہیں پھینک دو۔ اس سے تو ابیرجنسی میں کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

”کیوں پھینک دوں؟ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ یہ میرے خالو کی یادگار ہے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے خالو تھے جو اتنا پھینچر موبائل دے کر دنیا سے گزرے ہیں۔“

”خیر کام کی بات کرو۔ کن لیے بلایا تھا؟“

میں نے اسے اپنے اور اس کے ابو کے درمیان برپا ہونے والے عظیم الشان مناظرے کے بارے میں بتاتے ہوئے پوچھا۔ ”اب بتاؤ، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”یہ سچ ہے تفلن۔“ اس نے اداس ہو کر کہا۔ ”ابو نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور جوہ کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔“ پھر ذرا ناراض ہو کر بولی۔ ”خدا کے لیے اپنا یہ نام بدلو۔ تفلن۔ کم بخت گلے میں انگ جاتا ہے۔“

”میرے نام کو چھوڑو، مستقبل کی بات کرو۔“ میں نے کہا۔ ”سنو، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم بی اے میں فیل ہو جاؤ۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                    |                  |                  |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد   | صائمہ اکرام        | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد         | نبیلہ عزیز       | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر       | فائزہ افتخار     | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض        | نبیلہ ابرار      | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار       | آمنہ ریاض        | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل            | عنیزہ سید        | مُستنصر حُسین    |
| رضیہ بٹ       | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد  | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | اُمِ مریم          | نایاب جیلانی     | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



”تمہاری شاہی لپٹ ہو جائے گی۔ اس دوران میں کوئی جا بجا تلاش کر لوں گا۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں امتحان تو دے چکی ہوں۔ اب کیسے قتل ہو جاؤں؟“

”تم فکر مت کرو۔ میں تمہیں قتل کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میرے ایک دوست کے ابو کالج میں پروفیسر تھے اور یہ سننے میں آیا تھا کہ وہ کاپیاں چیک کرتے ہیں۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”انکل! میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس بی اے کی کاپیاں آتی ہیں؟“

”ہاں۔ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ وہ مسکرا دیے۔

”کس کے نمبر بڑھوانے ہیں؟ ویسے تو میں بہت اصول کا آدمی ہوں۔ اس قسم کے چکروں میں نہیں پڑتا لیکن تم چونکہ میرے بیٹے کے دوست ہو اس لیے تمہارے ساتھ یہ رعایت تو کرنی ہوگی لیکن زندگی بھر شرمندہ رہوں گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ تم نہیں جانتے بیٹے کہ یہ ضمیر کا بوجھ کیسا ہوتا ہے۔ انسان کو چین نہیں لینے دیتا۔ ایک دفعہ سکندر اعظم نے.....“

”انکل! مجھے کسی کے نمبر نہیں بڑھوانے۔“ میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ شروع ہو گئے تو پھر انہیں چپ کروانا مشکل ہو جائے گا۔

”کیا، نمبر نہیں بڑھوانے ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی انکل! نمبر کم کروانے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”میاں، پہلی بار میں ایسا سن رہا ہوں کہ کوئی نمبر کم کروانے آیا ہے۔ لوگ تو نمبر بڑھوانے کے چکر میں رہتے ہیں۔“

”بس انکل! یہ معاملہ ہی ایسا ہے۔“

”اچھا بتاؤ، رول نمبر کیا ہے؟“

میں نے انہیں رول نمبر بتا دیا۔ ”پلیز انکل! ایسا نہ ہو کہ آپ غلطی سے نمبر زیادہ دے دیں۔ یاد رکھیں۔ نمبر کم سے کم دینے ہیں۔“

”چلو بیٹا! یہ تو ہو جائے گا لیکن اب ایک کام کی بات بھی سن لو اور وہ یہ ہے کہ میں صرف پانچ یا دس نمبر کم کر سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کروں گا تو میرے ضمیر پر بوجھ ہوگا کیونکہ ایک دفعہ سکندر اعظم.....“

”چھوڑیں انکل سکندر اعظم کو..... جو آپ سے ہو سکتا ہے وہ کر دیں۔“

”جی انکل! مجھے کسی کے نمبر نہیں بڑھوانے۔“ میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ شروع ہو گئے تو پھر انہیں چپ کروانا مشکل ہو جائے گا۔

”کیا، نمبر نہیں بڑھوانے ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی انکل! نمبر کم کروانے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”میاں، پہلی بار میں ایسا سن رہا ہوں کہ کوئی نمبر کم کروانے آیا ہے۔ لوگ تو نمبر بڑھوانے کے چکر میں رہتے ہیں۔“

”بس انکل! یہ معاملہ ہی ایسا ہے۔“

”اچھا بتاؤ، رول نمبر کیا ہے؟“

میں نے انہیں رول نمبر بتا دیا۔ ”پلیز انکل! ایسا نہ ہو کہ آپ غلطی سے نمبر زیادہ دے دیں۔ یاد رکھیں۔ نمبر کم سے کم دینے ہیں۔“

”چلو بیٹا! یہ تو ہو جائے گا لیکن اب ایک کام کی بات بھی سن لو اور وہ یہ ہے کہ میں صرف پانچ یا دس نمبر کم کر سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کروں گا تو میرے ضمیر پر بوجھ ہوگا کیونکہ ایک دفعہ سکندر اعظم.....“

”چھوڑیں انکل سکندر اعظم کو..... جو آپ سے ہو سکتا ہے وہ کر دیں۔“

”جی انکل! مجھے کسی کے نمبر نہیں بڑھوانے۔“ میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ شروع ہو گئے تو پھر انہیں چپ کروانا مشکل ہو جائے گا۔

”کیا، نمبر نہیں بڑھوانے ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی انکل! مجھے کسی کے نمبر نہیں بڑھوانے۔“ میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ شروع ہو گئے تو پھر انہیں چپ کروانا مشکل ہو جائے گا۔

”کیا، نمبر نہیں بڑھوانے ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|              |                   |                 |                  |
|--------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد   | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد    | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق  | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما    | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبداللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ      | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج    | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



اور اس نے ایک گھونسا مجھے رسید کر دیا۔۔۔ میرے تو سارے طبق ہی روشن ہو گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جس طرح اس کا سارا بدن چلیلا ہے اسی طرح اس کا گھونسا بھی ہوگا لیکن وہ کیا گھونسا تھا جیسے میرے شانے پر کسی نے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ہڈی چنچتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ تکلیف سے میرا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

”ہاں، اب بتاؤ اب کیا کہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں۔“ میں نہ جانے کسے خود پر ضبط کر رہا تھا۔  
 یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ ”تمہارے گھونے میں تو جان ہی نہیں ہے۔“

”کمال ہے۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”دوسرے تو بیٹھ جاتے ہیں۔ چلو اب دوسرا بیچ مارتا ہوں۔“

”رہنے دو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اس تماشے کے لیے تمہارے پاس نہیں آیا ہوں۔ بس یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ تم آئندہ سے جویریہ کو پریشان مت کرنا۔“  
 ”یہ میری ماموں زاد بہن ہے۔“

”یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ ماموں زاد بہن کو پریشان کرو؟ جب یہ تمہیں پسند نہیں کرتی تو پھر تم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔“

اس پر چونکہ۔۔۔ میری طاقت کا رعب بڑچکا تھا اس لیے اس نے کچھ نہیں کہا پھر میں اور جویریہ اس گھر سے باہر آ گئے تھے۔

”تغلق۔۔۔۔۔“ جویریہ میرے زخمی شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو کمال کر دیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے طاقتور انسان ہو۔“

میں تڑپنا چاہتا تھا لیکن تڑپ نہیں پارہا تھا۔ اس دن میں نے کسی نہ کسی طرح جویریہ سے اپنی جان چھڑائی اور سیدھے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ میری ہڈی ٹوٹنے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ بس ایک ہاتھ اور پڑ جاتا تو میرا کام ہو گیا تھا۔

اس نے مجھے درد سے نجات دی۔ کئی طرح کے مرہم دیے اور تاکید کی کہ کم از کم ایک ہفتہ آرام کروں۔ میں نے اس کے مشورے پر پوری طرح عمل کیا تھا۔ ایک ہفتے کے دوران جویریہ نے کئی بار مجھ سے رابطہ کیا لیکن میں اس سے مل نہیں سکا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد میں پروفیسر طور کی تلاش میں نکل پڑا۔

جویریہ مجھے اپنے پھوپا کے گھر لے آئی۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم بیٹھو۔ میں شہناز کو لے کر آئی ہوں۔“

کچھ دیر بعد وہ شہناز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ شہناز کمر لچکاتا ہوا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ عجیب نو جوان تھا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی تھی۔

”ہائے ہائے۔“ وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔  
 ”میں نے سنا ہے کہ تم جویریہ کو لانگ کرتے ہو۔“  
 ”ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

”تو پھر میرا کیا ہوگا۔ میں تو اس سے شادی بنانے کی سوچ رہا ہوں۔“

”تم شادی نہ بناؤ۔ اپنے آپ کو بناؤ۔“ میں نے کہا۔  
 ”اوہ یو نانی بوائے!“ اس نے اپنی ایک انگلی میرے گال پر ماری۔ ”میں اپنے آپ کو کس طرح بناؤں۔“  
 ”آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ!“

”تم مرد بننے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ لچک لچک کر مر جاؤ گے۔“

”جویریہ! تمہارا یہ فریڈ کیا بولتا ہے؟“  
 ”وہی بولتا ہے جو تم سنتا ہے۔“ جویریہ جل کر بولی۔  
 ”دیکھو مین! میں نے جویریہ سے محبت کیا ہے۔“  
 اس نے کہا۔ ”ہم دونوں کی ایجنٹ ہونے جارہی ہے۔ تم ہمارے راستے کی رکاوٹ نہ بنو۔ ڈونٹ بی سلی!“

”اگر میں تم سے اس کی شادی نہ ہونے دوں تو پھر تم کیا کرو گے؟“  
 ”میں تمہیں ماروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں بہت پاورفل انسان ہوں۔“

”اچھا تو چلو مارو۔“  
 ”بچے نہ بنو۔ میرا بیچ بہت خطرناک ہوتا ہے۔“ وہ چمک کر بولا۔



وہ منکھو پیر کی پہاڑیوں کے غار میں بستے ہیں۔  
نے پہاڑ پر بھٹکنے والے ایک بندے سے پوچھا۔ ”بھائی!  
پروفیسر طور کہاں ملیں گے۔“

”یہ کون بندہ ہے؟“ اس آدمی نے پوچھا۔  
”وہ ادھر کی کسی پہاڑی میں رہتے ہیں۔“ میں نے  
بتایا۔ پھر مجھے یاد آ گیا تھا۔ ”وہ بہت پہنچا ہوا درویش ہے۔“

”اوہ ایسے بولونا پیر صاحب۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ پیر صاحب۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا۔

وہ مجھے پہاڑی در پہاڑی نہ جانے کتنی دور لے گیا پھر  
ایک غار کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ”پیر صاحب وہ  
سامنے والے غار میں رہتا ہے۔ اس کو میرا سلام بولنا۔۔۔ کہنا  
شیرا نے سلام کہا ہے۔“

میں شیرا کا سلام لے کر غار کی طرف آ گیا۔ پروفیسر  
طور تو بہت ہی وحشت ناک قسم کا بندہ ثابت ہوا۔ یہ لائی  
ڈاڑھی، وحشت ناک آنکھیں۔۔۔ وہ جس غار میں مقیم تھا  
اس میں فرش بچھا ہوا تھا۔ دو تین تھرماس تھے۔ بسکٹوں کے  
ڈبے تھے۔ پانی کی بوتلیں تھیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی  
کہ پورے غار میں چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

وہ اس وقت بھی گہرے گہرے کش لگا رہا تھا۔ مجھے  
دیکھ کر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے آواز لگائی۔  
”پروفیسر صاحب! میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو  
آپ کے دیدار کو آیا ہوں۔“

”ہو۔۔۔۔۔ ہو۔“ وہ بے ڈھنگے طریقے سے ہنسا۔ ”آؤ  
آؤ۔۔۔۔۔ یہاں دیدار ہے، سرکار ہے، دشوار ہے۔“

میں نے قریب پہنچ کر بڑی عاجزی سے کہا۔ ”سرا!  
میں آپ کے پاس ایک کام سے حاضر ہوا ہوں۔“

”پہلے یہ سگریٹ سلگاؤ پھر کام بتاؤ پھر وقت بچاؤ، آؤ  
قریب آؤ۔“

”نہیں جناب! میں چرس نہیں پیتا۔“ میں جلدی سے بولا۔  
”تو پھر تم کیسے ہدم، کیسا مرہم، کیسا موسم ہر طرف ماتم  
ماتم، کہاں ہونیکم۔“

میں حیرت سے اس بے نیکی شخص کی بے نیکی باتیں سن  
رہا تھا۔ یہ کیسا اردو کا پروفیسر تھا جو صرف قافیے ملائے چلا جا  
رہا تھا اور وہ بھی بے ڈھنگے۔

”جناب!“ میں نے کہا۔ ”میں آپ کی بہت تعریف سن  
کر آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا کام کر دیں گے۔“

”جب تک چرس نہیں تب تک کام فرض نہیں اور کوئی

## ایکے رات

کھاٹ، کٹا، کٹیا، کٹولہ، اڑن کٹولہ، کٹولی، کھٹ،  
چمپر کھٹ، کھرا، کھری، جھلگا، پٹنگ، پٹنگڑی، ماسج، ماسجی، ماسجا،  
چارپائی، بھاری، مسہری، منجی۔۔۔۔۔ یہ مکمل سی فہرست صرف اردو کی  
وسعت ہی نہیں بلکہ چارپائی کی ہمہ گیری پر دال ہے اور ہمارے  
تمہان میں اس کا مقام مرتبہ متعین کرتی ہے۔ لیکن چارپائی کی  
سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے بچے اور نونے  
ادھر سے ہانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوت ایمان  
کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے تھکے کو بچے بطور معمول  
اور بڑے بوڑھے آگے ترکیہ قس کی طرح استعمال کرتے  
ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیاں کو غریب رشتے  
داروں کی طرح کولوں کھدوں میں آڑے وقت کے لیے چھپا کر  
رکھا جاتا ہے۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیک کے ہاں ایک رات  
ایسی ہی چارپائی پر گزارنے کا اتفاق ہوا جس پر لیٹتے ہی اچھا  
بھلا آدمی نون فضا (ن) بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی  
رہا تھا کہ یکا یک اندھیرا ہو گیا، جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ایک  
دوسرا ملازم اوپر ایک دی اور بچھا گیا۔ اس خوف سے کہ دوسری  
منزل پر کوئی اور سواری نہ آجائے، میں نے سر سے دی پھینک کر  
اٹھنے کی کوشش کی تو کھٹنے بڑھ کے پیشانی کی بلائیں لینے لگے۔  
کمزور بن کر مرزا خود آئے اور جھج کر پوچھنے لگے کہ بھائی آپ  
ہیں کہاں؟ میں نے مختصر اپنے محل وقوع کا گاہ کیا تو انہوں نے  
ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ انہیں کافی زور لگانا پڑا اس لیے کہ میرا سر اور  
پاؤں بانوں میں بری طرح الجھے ہوئے تھے اور بان سر سے زیادہ  
مضبوط ثابت ہوئے۔ یہ مشکل تمام انہوں نے مجھے کھڑا کیا۔  
اور میرے ساتھ ہی، بلکہ مجھ سے کچھ پہلے، چارپائی بھی  
کھڑی ہو گئی!

کہنے لگے۔ ”کیا بات ہے؟ آپ کچھ بے قرار سے ہیں۔  
معدے کا فعل درست نہیں معلوم ہوتا۔“

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چوہن  
لے آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالا۔ پچھلی منہ میں بھر کر  
شکر یہ کہ دو چار لفظ ہی کہنے پایا ہوں گا کہ معاظران کے مظلوم  
منہ پر پڑ گئی جو حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ میں بہت نام ہوا۔ لیکن قبل  
اس کے کہ کچھ اور کہوں انہوں نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر کھدیا۔ پھر  
مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے منہ دھونے چلے گئے۔

مشاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس



www.PAKSOCIETY.COM عرض نہیں اور مجھے کوئی مرض نہیں۔“  
”مرض آپ کو ہو یا نہ ہو، مجھے ہو جائے گا۔“

”تمہاری یہ بات پسند آئی۔ ارجمند آئی، کس منہ آئی۔  
لو جس بچہ اور برسوں جیو۔“ اس نے پھر سگریٹ بڑھا دیا۔  
عجیب بے ٹکا آدمی تھا۔ پتا چل گیا تھا کہ کم بخت  
جس پلائے بغیر میری بات بھی نہیں سنے گا۔ مجبوراً میں نے  
پہلا کش لگا یا اور پہلا ہی کش مجھے اپنی زندگی کا آخری کش  
معلوم ہونے لگا۔

سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔ پھیپھڑے تک دہائی  
دینے لگے تھے۔ زندگی میں پہلی بار جس پی تھی۔ یہ عشق  
کم بخت اس قسم کے تماشے دکھایا کرتا ہے۔

”سگریٹ بالکل پوری ہوگی ورنہ بات ادھوری ہو  
گی۔“ پروفیسر نے یہ بات یہ دیکھ کر کہی کہ میں سگریٹ سے  
جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ”دو چار کش اور لو، اس  
کے بعد سوال کر دو۔“

مجبوراً مجھے پورا سگریٹ ختم کرنا پڑا۔ اس کے بعد  
پروفیسر سے بات کرنے کا ہوش کہاں تھا؟ میں چکرا کر وہیں  
گر پڑا نہ جانے کتنی دیر بعد پانی کے ٹھنڈے چھینٹے مجھے  
ہوش میں لائے۔ پروفیسر میرے چہرے پر چھینٹے مار رہا  
تھا۔ ”نادان، ہوش میں آؤ، نظریں کھماؤ دیکھو اور دکھاؤ، دنیا  
کو بتاؤ۔“

میں پروفیسر پر لعنت بھیجتا ہوا بیدار ہو گیا۔ غار میں  
لائین کی روشنی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔  
”پروفیسر صاحب! یہ تو رات ہو گئی۔“ میں پریشان ہو کر بولا  
پھر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر اٹھنے لگا۔ سر میں بے پناہ  
درد ہو رہا تھا۔

”سر کا ہے برا حال۔“ پروفیسر مسکراتے ہوئے بولا۔  
”یہ شروع کا ہے احوال اور جب ہو جاؤ بد فعال..... پھر خود  
کر و کمال پھر ڈالیں گے دھال۔“  
”خدا کی پناہ..... کیا تم کوئی بات انسانوں کی طرح  
نہیں کر سکتے۔“ میں غصے سے بولا۔

”غصہ بھی ضروری ہے، یہ جس کی مجبوری ہے۔“ پھر  
اس نے ایک اور سگریٹ میری طرف بڑھا دیا۔ ”اب اس  
کے لگاؤ کش پھر کرنے لگو! اش۔ درد ہو جائے کافور۔ یہ  
ہے جس کا دستور۔“

کم بخت نے درد کی دوا بھی جس ہی بتائی تھی۔ مرتا  
کیا نہ کرتا۔ میں نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اب اس کا  
حال بیان کرنا فضول ہی ہے۔ پروفیسر نے میرے لیے

کھانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے کھانا لے  
کر آیا تھا لیکن بہت ہی لذیذ کھانا تھا۔ کھانا کھانے اور جس  
پینے کے بعد سرور ہی آ گیا تھا۔

پھر پروفیسر نے کہا۔ ”اب ہو گئی رات۔ ڈاکو لگائے  
گھات۔ تم مانو میری بات۔ سو جاؤ یہیں ساتھ۔“  
”وہ تو ٹھیک ہے پروفیسر صاحب..... لیکن میں جس  
کام کے لیے آیا ہوں وہ تو سن لیں۔“

”کام کا نہ لو نام۔ دینے پڑیں گے دام۔ ہو جائے  
کل کی شام تو پھر بتانا کام۔“

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس دوران میں  
اس نے دو سگریٹ اور سلگا لیے تھے۔ خدا جھوٹ نہ  
بلوائے۔ رات بھر میں اس کم بخت نے مجھے ایک درجن  
بھرے ہوئے سگریٹ پلوادیے۔

دوسرے دن تک میں اچھا خاصا چڑی بن چکا تھا بلکہ  
شام ہونے تک میں نے خود اس سے فرمائش کر کے دو  
سگریٹ پھونک ڈالے اور وہ میری اس پروگریس سے بہت  
خوش نظر آ رہا تھا۔

مختصر یہ کہ مجھے وہ رات بھی اسی غار میں گزارنا پڑی  
تھی اور ہم دونوں رات بھر بھرے ہوئے سگریٹ پیٹے  
رہے تھے۔ اس نے مجھے عادی بنا دیا تھا۔

تیسری صبح کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں  
سن کر میں جاگ اٹھا۔ ایک معقول صورت ادھیڑ عمر شخص  
پروفیسر پر بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔ ”یہ سب کیا لگا رکھا  
ہے تم نے؟ پورے غار میں جس کی بو پھیلی ہوئی ہے۔“ پھر  
اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”اور تم کون ہو؟“

”جناب! میں ایک مظلوم ٹائپ انسان ہوں۔  
پروفیسر کے پاس ایک کام سے آیا تھا۔ انہوں نے مجھے  
جس کے دھندے پر لگا دیا۔“

”یہ کم بخت اسی قسم کی حرکتیں کرتا ہے۔ یہ ملازم ہے  
میرا۔ پروفیسر تو میں ہوں۔ میں دو دنوں کے لیے شہر کی  
طرف گیا ہوا تھا۔“

”او خدا..... اور میں آپ کے چکر میں چڑی بن  
گیا ہوں۔“

”یہ تمہارا قصور ہے میاں۔ تم بتاؤ تم کس کام سے  
آئے تھے؟“

میں نے جلدی جلدی پروفیسر کو ساری بات سنا دی۔  
میری بات سن لینے کے بعد انہوں نے کہا۔ ”میاں، تم غلط  
جگہ آئے ہو۔“



"ہاں ہاں جاؤ۔ اب تم چاہے شہناز سے شادی کر دیا  
سلطانہ بیگم سے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔"  
اور وہ چلی گئی۔ میں نے یہ ساری باتیں سنی ہی نہیں  
کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں اس سے کبھی شادی نہیں کر سکوں  
گا۔ ایک تو وہ بی بی اے پاس ہو جاتی پھر اس کے باپ نے  
مجھے پہلی نظر میں ناپسند کر دیا تھا۔ اور تیسری اور سب سے اہم  
بات یہ تھی کہ میں ایک مفلس انسان تھا، میرے پاس کچھ بھی  
نہیں تھا۔

اور وہ شہناز چکیلا سہمی، اس میں زنانہ پن سیکی لیکن  
میسے والا تھا۔ اس کے پاس اپنا مکان تھا، اپنی گاڑی تھی۔ وہ  
جویریہ کو خوشیاں دے سکتا تھا جبکہ اس کو آرام سے رکھتا  
میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی لیے میں نے انٹی سیدی  
باتیں کی تھیں تاکہ وہ ناراض ہو کر چلی جائے۔

اور وہ چلی گئی تھی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مجھے اس کے  
جانے کا دکھ نہیں ہوا تھا؟ بہت دکھ ہوا تھا لیکن میں زندگی کا  
ساتھ نبھاتا چلا گیا۔ ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا۔ میں  
نے اس دکھ کو دھوئیں میں اڑا دیا۔ چرس کے دھوئیں میں۔  
ملنگ بابا زندہ باد۔ لگے دم تو مٹے غم۔

اور اب میں دنیا کی ہر فکر سے آزاد ہو چکا ہوں۔ مجھے  
کسی کی پروا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کہانی بیان  
کرتے ہوئے کئی بار میری آنکھوں میں آنسو  
آگئے۔ جویریہ کو یاد کر کے اور اپنے اچھے دنوں کو یاد کر  
کے۔ جب میں صاف ستھرا اور نہیں انسان ہوا کرتا تھا اور  
اب..... اب تو میرے بدن پر غلاظتیں چڑھی ہوتی ہیں اور  
میں نیم بے ہوشی کے عالم میں بولتا رہتا ہوں۔ لگے دم تو مٹے  
غم۔ لگے دم تو مٹے غم۔

اگرچہ جانتا ہوں کہ غم کو مٹانے کے لیے غلط راستے کا  
انتخاب کیا مگر..... جویریہ کو کھو کر بھی تو زندہ رہنا مشکل  
تھا میرے لیے کیونکہ..... میں نے اس سے سچی محبت کی تھی  
لیکن بد قسمتی سے ایک مفلس اور بے روزگار تھا..... بہت  
کوشش کی مفلسی تو بے روزگاری سے جیسے چٹی ہوئی تھی اور  
میرے ملک میں..... یہ تو چھوٹا سا واقعہ ہے اسی بے  
روزگاری کے ہاتھوں میرے ملک میں تو جانے کتنے بڑے  
بڑے سانحات گزرتے جا رہے ہیں مگر حکمرانوں کو کوئی ہوش  
نہیں ہے۔



"وہ اس لیے کہ میں بی بی اے کی اردو نہیں بلکہ بی  
کام کی اردو کی کاپیاں چیک کرتا ہوں۔" پروفیسر نے  
بتایا۔ "بی بی اے کی اردو کے لیے تمہیں پروفیسر منصوری کے  
پاس جانا ہوگا۔ ان دنوں وہ ٹھٹھہ کے ایک مزار پر چلے  
میں مصروف ہیں۔"

"لغت بھیجیں..... میں اب کہیں نہیں جا رہا۔" میں  
نے کہا۔ "وہ کم بخت چاہے پاس ہو یا نکل..... مجھے تو اب  
چرس کا نسخہ مل گیا ہے۔ لگے دم تو مٹے غم۔"

میں نعرہ مستانہ بلند کرتا ہوا غار سے باہر آ گیا۔ جاتے  
جاتے ملک نما ملازم نے مجھے چرس کی اچھی خاصی بڑی ٹکیہ تحفے  
میں دے دی تھی۔ "جاؤ آباد رہو، شاد رہو اور استاد رہو۔"  
میں اس کا شکر یہ ادا کر کے لڑکھڑاتا ہوا پہاڑی سے  
نیچے آ گیا۔ میں گیا تھا کس کام سے اور کیا بن کر واپس آیا  
تھا، چرسی۔

جویریہ نے یہ سب سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ میں اس  
وقت بھی سگریٹ میں چرس ہی بھر رہا تھا۔ یہ تکنیک ملنگ  
بادشاہ نے سکھلا دی تھی۔

"لگتا ہے اس شہناز سے میری شادی ہو ہی جائے  
گی۔" جویریہ نے کہا۔ "کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں بی  
اے میں پاس ہو جاؤں گی۔"

"جویریہ اتم ہی بتاؤ۔ میں تمہیں کس طرح فیل  
کر داؤں؟ میرے پاس تو اب کوئی طریقہ بھی نہیں رہا۔"  
"کچھ بھی کرو۔ ورنہ تمہاری جویریہ کسی اور کی ہو  
جائے گی۔"

اس وقت میں نے چرس کا ایک گہرا کش لگایا۔ میری  
آنکھوں میں خمار بھر آیا۔ اسی لیے مجھے پوری دنیا بہت حقیر  
دکھائی دینے لگی تھی۔

"بتاؤ غفلت تم میرے لیے کیا کرو گے؟" جویریہ  
نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کروں گا۔" میں جھومتے ہوئے بولا۔  
"مجھے اب کسی کی پروا نہیں رہی۔ اس چرس کے آگے میں  
پوری دنیا قربان کر سکتا ہوں، تم کیا چیز ہو۔ لگے دم تو مٹے غم۔  
واہ ملنگ بابا کیا نسخہ بتایا ہے۔ اب میں بادشاہ ہوں، اپنے  
وقت کا بادشاہ، مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بھی  
دفع ہو جاؤ یہاں سے اور ہاں اگر کبھی میری کسی ضرورت کا  
خیال آئے تو میرے لیے چرس بھجوا دیا کرنا..... لگے دم تو  
مٹے غم۔"





محی الدین نواب

پینتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کو سمجھنے کی سزا دے تو سب سے پہلے اس کو شش، کرئی چاہیے۔ خاموش صحرائی ویرانی ہو یا پرجوش ابروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کی سیات پردے... ٹھنڈی پواٹوں کے چھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجیب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں خبرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک در سے مل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تخیل اور لطیف جذبوں میں سموتی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تخیل خیز سنگم۔

کتاب: محی الدین نواب، "خاموش صحرائی ویرانی" (کتاب نمبر 100) (کتاب نمبر 100) (کتاب نمبر 100)

Downloaded From  
Paksociety.com



Downloaded From  
paksociety.com



یہ داستان ہے دو برجید کی ماری اور اس کے عاشق مراد علی مکی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماری، چاچا جمبر اور چاہی جتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا ڈیرہ اشیت ہلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماری کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماری مراد کی سنگ مٹی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گھوڑا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، ڈیرہ اشیت کی فٹنی گیری کرتا تھا۔ ڈیرہ اشیت ہلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے ہانکاد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے سین گودھ آگئے جہاں ماری اپنے چاچا، چاہی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڑیو سے ہوئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم محل تھا۔ محبوب چانڑیو اپنے ہم محل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ شیت ہلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ تاکائی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برہادر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیراب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گودھ کشین ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف بنگلی تھے جس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سیراکوٹیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماری کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے یہ طور ماڈل ماری کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جہم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد کل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڑیو ماری کی خاطر اس کے مقدمے کی دہرو کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرہ اشیت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماری کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے آخر کار کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی نکلی کی شادی میں شرکت کے لیے گودھ کشی، تاہم محبوب چانڑیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کور ہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرید، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرید مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرید جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرید کی نیت بھانپ کر اسے جہاننا دیتے ہوئے اس کے قہقہے سے فرار ہو گیا۔ ماری چاہی اور چاچا مرید کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماری کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماری کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرید اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرید مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرید کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماری کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مرید دوبارہ TMET فیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینیسن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ ادھر مرید انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجینینر لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر کیلر جزل کو اپنے مرید ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماری کو لے کر لندن آ گیا مگر مرید سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماری اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا۔ مرید اور مراد میں پھر ان بن ہو گئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرید شدید زخمی ہوئے تاہم مرید اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرید سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماری سب کچھ چھوڑ چھا کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماری نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماری کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیل جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشری اور مرید کی لڑائی میں مرید سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب السماء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگار کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اعزازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرید مراد کے فم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگار سے نکاح پڑھوایا اور بشری اور بے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماری کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگار ان میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِ اقتدار آ گیا۔ بابا جمبر کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے۔ یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چھوئے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور مکی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت فم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جہم دیا اور خود جہان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ



جو یہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو تیرا کرنا شروع کر دیا۔ بچی کی لاش کو چھاننے کے ذریعے وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ عیسیٰ نے بچے (عابدی بیٹی) کو اس کی لاش پر لٹا دیا۔ وہ اس کے منہ پر چھلکا۔ وقت گزرتا گیا اور سالوں میں برس کا موسم کے ہادیو وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابدی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابدی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابدی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ دو اغواکاروں کو عابدی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ عابدی رو مایہ آ گیا۔ وہ مایہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عابدی کی طرح جو بچہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بچی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کر گئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہو گئی تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بوبو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کر لیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالے۔ حماد کے پیچھے شامہ شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرا دیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ان پورٹ پر شامہ پر حملہ ہوا عابدی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابدی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابدی سیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمہ داری عابدی کے سپرد کر دی۔ عابدی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابدی اپنے دوست پولیس آفیسر کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ماریہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ادھر عابدی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کون ہے۔ دشمن خوش تھے کہ سیر پر سوا سیر آ گیا ہے۔ مگر وہ انجان دشمن عابدی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا اور بے درپے ناکامی کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ارض اسلام میں بشری کے دماغ پر قابو پایا تاہم وہ اسے ایک ذرا نقصان پہنچا پایا۔ بشری اس کے چنگل سے نکل گئی۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابدی کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ جو بھی ہوا تھا، مشیتِ ایزدی سے ہوا تھا۔ ان نون نے یہ جھوٹا بیان دیا کہ ماریہ کو اس نے ہلاک کیا ہے۔ عابدی اور ان نون منظر عام سے غائب ہو گئے تھے۔ زیب النساء کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی جو حیرت انگیز صلاحیتوں کی حامل تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلسا دین اسلام کی طرف مائل ہو کر عابدی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرینٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلسا نے عابدی کی مدد کر کے ان نون کو پکڑوا دیا تاہم نیلسا کا باپ بارودا سے عابدی کے قتل سے نکال کر لے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارانا نامی عورت مراد کے پیچھے پڑ گئی اور اسے اپنے جال میں پھنسا لیا۔ لارا شیطان کی مناجات کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ مراد سے اپنا لے۔

### اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

پہنچ گئی۔ شادی خانہ آبادی کا جشن نہیں منایا گیا۔ مراد نے نکاح پڑھوانے کے بعد ہم زاد زیب النساء عابدی بچے اور بشری کو خوش خبری سنائی اور کہا کہ وہ دوسرے دن کی فلائٹ سے وطن کو لے کر اپنی ریاست میں آ رہا ہے۔

کاہن نے فون کے ذریعے لارا سے کہا۔ ”ریاست ارض اسلام کی طرف نہ جاؤ۔ میرا علم کہتا ہے۔ مجھے آنکھی ملی ہے۔ آبنوس کی طرح تم بھی وہاں جا کر نقصان اٹھاؤ گی۔“

وہ بولی۔ ”سینٹیں کفر میں ہیں۔ وہاں جانے سے انکار نہیں کر سکیں گی۔ پھر یہ کہ خود ہی ریاست میں جا کر وہاں کی ملکہ بننے کی پلاننگ کرتی رہی ہوں۔ میں نے مراد سے کہا تھا کہ ہم ہنرمون منانے سے پہلے اپنی ریاست میں جا کر جشن منائیں گے۔ اب میں انکار کیسے کروں؟ باقی داوے تمہارا پر اسرار علم کہتا کیا ہے؟ وہاں کیا ہو سکتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”پر اسرار علوم سے اچھے بُرے حالات کے اشارے ملتے ہیں۔ وضاحت سے کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ آبنوس کے وہاں جانے سے پہلے جو اشارے مل رہے تھے وہی اب مل رہے ہیں۔ لارا..... اپنی کامیابی کو قائم رکھو۔ وہاں نہ جاؤ۔“

شیطان نے یہ کیا کہ نیلسا کو ان سے دور کر دیا۔ اگر وہ موجود ہوتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کے محبوب عابدی کے باپ کو لارا دھوکا دے رہی ہے۔ وہ مراد کو اس کی حقیقت بتاتی پھر تمام طاغوتی منصوبے خاک میں مل جاتے اور شیطان کو یہ منظور نہیں تھا۔

شیطان یوں بھی اس سے ناراض تھا۔ وہ پوچھا پاٹ چھوڑ کر عابدی کے دین کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ بہر حال طاغوتی قوت نے اسے گہری نیند سلا دیا تھا۔ وہ ایک دن اور دو راتوں تک اس طرح سوئی رہی کہ کبھی کھانے پینے کی ضرورت ہوتی تو جاگ جاتی، ورنہ پھر سو جاتی تھی۔

بارودا نے پوچھا۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیوں اتنا سو رہی ہو؟“

”پتا نہیں پایا! مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں اور سونا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے سونے دیں۔“

باپ نے اسے سونے دیا۔ یہ سوچا کہ جب وہ نیند پوری کر کے نہاد ہو کر فریش ہو کر آئے گی تو اسے لارا کی پلاننگ کے متعلق بتائے گا۔ اس اثنا میں لارا نے جھوٹے منہ اسلام قبول کیا پھر نہ لیخاز وجہ مراد بن کر آرزوؤں کی بجائے



وہ فکر میں مبتلا ہوئی کہ کیا کرے؟ کاہن کی پیش گوئیاں درست ہوا کرتی تھیں۔ آبنوس کے ساتھ جو ہوا اس سے دہشت طاری ہو گئی تھی۔ عقل بھی کہہ رہی تھی کہ نہ جاؤ۔ طاغوتی قوتیں وہاں جا کر پانی ہو جائیں گی۔

اس نے مراد سے کہا۔ ”میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں ایک لمبا فضائی سفر نہیں کر سکوں گی۔ پلیز، شیئس کینسل کروادو۔“

”تعب ہے۔ اچانک دل کیوں گھبرا رہا ہے؟ کوئی تکلیف کوئی بیماری ہے تو ابھی ڈاکٹر آجائے گا۔“

”میرا دل بہت کمزور ہے۔ بعض اوقات دھڑکنیں ڈوبنے لگتی ہیں۔ مجھے انرپورٹ نہیں ہاسپٹل لے چلو۔“

”چار گھنٹے کے بعد فلائٹ روانہ ہوگی۔ ہم ابھی ہاسپٹل جاؤں گے۔ تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی تو وہیں سے انرپورٹ چلے جائیں گے۔“

”پلیز نہیں۔ ہم کل یا پرسوں کسی دن جائیں گے، آج نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں شیئس کینسل کرواتا ہوں۔“ اس نے قریب رکھے ہوئے فون کو اٹھایا۔ اس کی ایک کال پر شیئس کینسل ہو جاتیں۔ فی الحال سفر ملتوی ہو جاتا لیکن اسی وقت فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔

”ہم پریشان ہیں۔ ماروی اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ تم آرہے ہونا؟“

”میں ابھی بیٹی بیمار ہو گئی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی شیئس کینسل کروانے والا ہوں۔ یہاں زلچکا (لارا) بیمار ہو گئی ہے۔“

”مراد! جہیں یہاں آنا چاہیے۔ ہماری ننھی سی بیٹی نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جہیں یاد کیا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ تو ابھی بولنے کے قابل بھی نہیں ہے، مجھے کیسے یاد کیا ہے؟“

”ہم سب حیران ہیں، اچانک ہی یہ بخار میں مبتلا ہوئی ہے۔ میں نے، زبیب النساء نے اور عابی نے صاف طور سے سنا ہے۔ اس کے منہ سے ٹھہر ٹھہر کر بابا جانی کے الفاظ نکلے تھے۔“

مراد نے تڑپ کر کہا۔ ”میری بیٹی مجھے بلارہی ہے۔ میں آرہا ہوں۔ شیئس کینسل نہیں ہوں گی انتظار کرو۔ میری بیٹی کا خیال رکھو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ لار نے پریشان ہو کر اسے

”لار! ابھی کس شہر میں مراد کے ساتھ ہے؟“

”وہ ابھی عیس میں ہے۔ مراد کے ساتھ ریاست ارض اسلام میں جانے والی ہے لیکن ہمارے کاہن نے اسے وہاں جانے سے منع کیا ہے۔ وہ ریاست ہمارے لیے کانٹوں کا گھر ہے۔ آبنوس ایک بار وہاں جا کر پھنس گیا تھا۔ میں اسے نکال کر لے آیا تھا۔ کاہن کو اچانک معلوم ہوا

”لار! ابھی کس شہر میں مراد کے ساتھ ہے؟ آبنوس کے ساتھ جو ہوا اس سے دہشت طاری ہو گئی تھی۔ عقل بھی کہہ رہی تھی کہ نہ جاؤ۔ طاغوتی قوتیں وہاں جا کر پانی ہو جائیں گی۔“

اس نے مراد سے کہا۔ ”میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں ایک لمبا فضائی سفر نہیں کر سکوں گی۔ پلیز، شیئس کینسل کروادو۔“

”تعب ہے۔ اچانک دل کیوں گھبرا رہا ہے؟ کوئی تکلیف کوئی بیماری ہے تو ابھی ڈاکٹر آجائے گا۔“

”میرا دل بہت کمزور ہے۔ بعض اوقات دھڑکنیں ڈوبنے لگتی ہیں۔ مجھے انرپورٹ نہیں ہاسپٹل لے چلو۔“

”چار گھنٹے کے بعد فلائٹ روانہ ہوگی۔ ہم ابھی ہاسپٹل جاؤں گے۔ تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی تو وہیں سے انرپورٹ چلے جائیں گے۔“

”پلیز نہیں۔ ہم کل یا پرسوں کسی دن جائیں گے، آج نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں شیئس کینسل کرواتا ہوں۔“ اس نے قریب رکھے ہوئے فون کو اٹھایا۔ اس کی ایک کال پر شیئس کینسل ہو جاتیں۔ فی الحال سفر ملتوی ہو جاتا لیکن اسی وقت فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔

”ہم پریشان ہیں۔ ماروی اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ تم آرہے ہونا؟“

”میں ابھی بیٹی بیمار ہو گئی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی شیئس کینسل کروانے والا ہوں۔ یہاں زلچکا (لارا) بیمار ہو گئی ہے۔“

”مراد! جہیں یہاں آنا چاہیے۔ ہماری ننھی سی بیٹی نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جہیں یاد کیا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ تو ابھی بولنے کے قابل بھی نہیں ہے، مجھے کیسے یاد کیا ہے؟“

”ہم سب حیران ہیں، اچانک ہی یہ بخار میں مبتلا ہوئی ہے۔ میں نے، زبیب النساء نے اور عابی نے صاف طور سے سنا ہے۔ اس کے منہ سے ٹھہر ٹھہر کر بابا جانی کے الفاظ نکلے تھے۔“

مراد نے تڑپ کر کہا۔ ”میری بیٹی مجھے بلارہی ہے۔ میں آرہا ہوں۔ شیئس کینسل نہیں ہوں گی انتظار کرو۔ میری بیٹی کا خیال رکھو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ لار نے پریشان ہو کر اسے

”لار! ابھی کس شہر میں مراد کے ساتھ ہے؟“

”وہ ابھی عیس میں ہے۔ مراد کے ساتھ ریاست ارض اسلام میں جانے والی ہے لیکن ہمارے کاہن نے اسے وہاں جانے سے منع کیا ہے۔ وہ ریاست ہمارے لیے کانٹوں کا گھر ہے۔ آبنوس ایک بار وہاں جا کر پھنس گیا تھا۔ میں اسے نکال کر لے آیا تھا۔ کاہن کو اچانک معلوم ہوا



ہے کہ لارا بھی وہاں جائے گی تو کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی۔

نیلماں نے کہا۔ ”وہ تو ریاست کی ملکہ بن گئی ہے۔“

کیا وہاں جانے سے باز آجائے گی؟

”جہاں خطرہ ہو، ادھر وہ بھی نہیں جاتی۔ میں جا کر دیکھتا ہوں وہ کیا کرنے والی ہے، تم بھی چلو۔“

”مجھے اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ویسے میں بھی تاریکی سے نکل رہی ہوں۔ روشنی میں اچھا خاصا وقت گزار کر آؤں گی۔“

وہ باپ بیٹی جہاں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے گم ہو گئے۔ ایک لارا کی طرف گیا، دوسری عالی کے پاس آگئی۔ وہ محل کے بیڈروم میں ماروی کے پاس تھا۔ زیب النساء اور ہم زاد بھی اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے ہی مراد نے فون پر کہا تھا کہ وہ عیس سے روانہ ہو چکا ہے۔ تین گھنٹے کے اندر ریاست میں آجائے گا۔ جب تک اس کا فون بند رہے گا۔

وہ وہاں آ کر ٹرانسپیرنٹ ہو گئی تھی۔ کالج کے مجسمے کی طرح کہیں کہیں سے جھلک رہی تھی۔ ایک جگہ چھپی ہوئی عالی کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن ماروی کو آگئی تھی۔

وہ اپنی بہن کی پیشانی کو چھو کر کہہ رہا تھا۔ ”بابا! حرارت نہیں ہے۔ بخار اتر گیا ہے۔“

ماروی نے دونوں ہاتھ اس کی طرف اٹھائے۔ وہ مسکرا کر یولا۔ ”یہ دیکھیں، یہ میرے پاس آنا چاہتی ہے۔“

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا پھر بیڈ سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل میں بات آرہی تھی کہ بہن کو کمرے سے باہر لے جائے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکا کہ کیوں وہاں سے جانا چاہتا ہے؟ وہ بے اختیار اسے سینے سے لگائے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ کوریڈور میں کوئی نہیں تھا اس لیے نیلماں حاضر ہو گئی۔

وہ مسکرا کر یولا۔ ”یا خدا..... اب سمجھ میں آیا کہ میری بہن کیوں میری گود میں آئی ہے؟ یہ مجھے یہاں لائی ہے۔“

نیلماں نے کہا۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ کس طرح تمہیں مخاطب کروں۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اپنے بیڈروم میں چلو۔“

وہ بیڈروم میں آگئے۔ اس نے کہا۔ ”تمہارے بابا جانی نے جس سے شادی کی ہے، وہ ہماری تاریک دنیا کی بہت ہی چال باز عورت ہے۔“

اس نے کہا۔ ”میں جاری ہوں۔ ابھی تم بابا جانی کو ریسو کرنے انٹرپورٹ جاؤ گے۔ میں ایک گھنٹے بعد آؤں گی۔ چھپ کر تم لوگوں کی باتیں سنتی رہوں گی۔ تمہیں کچھ کہنا ہوگا تو اپنے بیڈروم میں آؤ گے۔ میں وہاں انتظار کرتی رہوں گی۔“

ریاست کا حکمران آرہا تھا۔ انٹرپورٹ سے محل تک مسلح آرمی، پولیس اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اس کے استقبال کے لیے الٹ تھے۔

عالی نے ہم زاد کے ساتھ انٹرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے لارا کے متعلق بتایا۔ یہ بہت ہی پریشان کرنی والی معلومات تھیں۔ جب مراد وہاں پہنچا اور ان کے ساتھ

”ایک گھنٹے میں پہنچنے والے ہیں۔ فون پر تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکے گی۔ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ میں ابھی بابا کو اور ماما کو اس کی حقیقت بتاؤں گا۔ نیلماں! تمہیں اب میرے بزرگوں کے سامنے آنا چاہیے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔“

”میں خود ان کے سامنے آنا اور ان سے ملنا چاہتی ہوں لیکن یہ اندیشہ ہے کہ آبنوس لارا یا کاہن کے جاسوس یہاں چھپ کر آتے ہوں گے۔ دور سے تم سب کی مصروفیات گود دیکھتے ہوں گے۔ ایسے وقت میں بھی ان کی نظروں میں آ جاؤں گی پھر سارا بھید کھل جائے گا کہ میں نے ہی آبنوس کو تمہارے سامنے بے نقاب کیا ہے اور اب لارا کی اصلیت بتائی ہے۔“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ ابھی بارود اور کاہن وغیرہ کو معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایک مسلمان کو دل دے چکی ہے اور اس کی تجربہ بن گئی ہے۔

اس نے کہا۔ ”میں جاری ہوں۔ ابھی تم بابا جانی کو ریسو کرنے انٹرپورٹ جاؤ گے۔ میں ایک گھنٹے بعد آؤں گی۔ چھپ کر تم لوگوں کی باتیں سنتی رہوں گی۔ تمہیں کچھ کہنا ہوگا تو اپنے بیڈروم میں آؤ گے۔ میں وہاں انتظار کرتی رہوں گی۔“

ریاست کا حکمران آرہا تھا۔ انٹرپورٹ سے محل تک مسلح آرمی، پولیس اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اس کے استقبال کے لیے الٹ تھے۔

عالی نے ہم زاد کے ساتھ انٹرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے لارا کے متعلق بتایا۔ یہ بہت ہی پریشان کرنی والی معلومات تھیں۔ جب مراد وہاں پہنچا اور ان کے ساتھ



کار میں بیٹھ کر محل کی طرف جانے لگا تو وہ بھی لارا کی منگاری سے آگاہ ہو کر حیران ہوا اور یہ سوچ کر تکلیف بھی ہوئی کہ ایک عورت نے اسے بڑی آسانی سے دھوکا دیا ہے۔

مراد نے محل میں آ کر پہلی بار ماروی کو دیکھا پھر اسے اٹھا کر چومتے ہوئے پوچھا۔ ”چاچی! کیا آپ کی ماروی بچپن میں ایسی ہی تھی؟ آپ نے تو اسے دودھ پلایا تھا، گود میں کھلایا تھا۔“

وہ بولی۔ ”بیٹے! ایک مدت گزر گئی ہے۔ بچپن کی صورت یاد نہیں رہی ہے مگر ہاں، کچھ ویسی ہی لگتی ہے۔ تم نے اس کا نام ماروی رکھا ہے تو دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔“

مراد نے بڑی محبت سے ماروی کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ دیکھنے کے انداز میں بڑی سنجیدگی اور اپنائیت تھی۔ اس کی آنکھیں کبہ رہی تھیں۔ ماروی ایک نام ہے۔ ایک علامت ایک مثال ہے، سچائی اور پارسائی کی۔ ماروی وہ ہے جسے آگ بھی نہیں جلاتی۔ کسی کا بھی نام ماروی رکھنے سے وہ اپنی پتھلی پر انگارے نہیں رکھ سکے گی۔ خوف سے منہ چرائے گی۔

”بابا جانی! میں اس ماروی کا روحانی سلسلہ ہوں جو حیا پرور تھی۔ جس نے محل کی دولت کو اور ہر طرح کے لالچ کو ٹھکرا دیا تھا۔ میں طاغوت کے اندھیروں میں جاری رہنے والی ہوں پرستی کو اور گناہ گاروں کو ٹھوکریں مارنے آئی ہوں۔ آپ سے پہلی ملاقات میں واضح کر رہی ہوں کہ میں ایک روحانی سلسلہ ہوں۔ دنیاوی رشتے سے آپ کی بیٹی ہوں۔“

اس بچی کی آنکھیں جیسے بے زبانی سے بول رہی تھیں اور مراد واضح طور پر نہ سننے ہوئے بھی سمجھ رہا تھا۔ روحانیت کے پیچھے کچھ میں نہیں آتے اور بہت کچھ سمجھا بھی دیتے ہیں۔

تھی ماروی نے آنکھیں بند کر لیں۔ مراد نے اسے چوم کر زیب النساء کی گود میں دے دیا۔ عالی نے کہا۔ ”میرے کمرے میں چلیں۔ وہاں باتیں کریں گے۔“

وہ وہاں سے چلتا ہوا باتیں کرتا ہوا بیٹے کے کمرے میں آیا تو دروازہ کھولتے ہی نیلماں نظر آئی۔ وہ سر جھکا کر پیشانی تک ہاتھ لاکر بولی۔ ”میرے بابا جانی! السلام علیکم۔“

مراد نے کہا۔ ”ولیکم السلام۔۔۔۔۔۔ تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں لیکن پہچان رہا ہوں۔ میرے بیٹے کے کمرے میں صرف نیلماں ہی ہو سکتی ہے۔“

اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ ”سلامت رہو۔ تم راستہ بدل کر صراطِ مستقیم پر آئی ہو۔ شاد و آباد رہو۔“

وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کیے اپنے رب کو یاد کرنے لگا پھر بولا۔ ”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ ہم نقصان اٹھانے سے پہلے شیطانی چالوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ لارا واقعی چال باز ہے۔ مجھے ایک ذرا شبہ نہیں ہوا۔ اس نے چار آیتیں یاد کی ہیں۔ میری موجودگی میں نمازیں پڑھتی ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”وہ دکھاوے کی نمازیں پڑھتی ہے اور سجدہ شیطان کو کرتی ہے۔ اب آپ کیا کرنا چاہیں گے؟“

وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔ ”اس کی گردن دیوچنے اور سانس چھین لینے میں ایک ذرا وقت نہیں لگے گا۔ وہ مرجائے گی تو شیطان کے چیلے دوسرے بہرہ دہ میں دوسرے راستوں سے آئیں گے۔ میرا خیال ہے لارا کو ابھی زندہ رہنے دیا جائے۔ وہ ہمیں دھوکا دے رہی ہے۔ ہم بھی اسے فریب میں خوش نہیں میں جتلا رکھیں گے۔ اللہ کا شکر ہے اس مجبوروں نے نیلماں کو معلومات کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ اپنی تاریک دنیا میں رہ کر جو منصوبے بنائے گی اور اپنی پراسرار صلاحیتوں سے جو کرنا چاہے گی، نیلماں ہمیں بتا دیا کرے گی۔“

”بابا جانی! بہت سی باتیں نیلماں سے بھی چھی رہ سکتی ہیں۔ آپ اچانک دھوکے میں نقصان اٹھا سکتے ہیں۔“

”اللہ بڑا کارساز ہے۔ میرا مہجود مجھے مشکلات سے نکال آیا ہے۔ ہم کچھ عرصے تک انجان بن کر اس کے ساتھ ڈراما کرتے رہیں گے۔ نقصان ہوگا تو پھر اسے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔“

”بابا جانی! نیلماں کبہ رہی تھی کہ وہ پراسرار غیر معمولی علوم کی حامل ہے۔ ٹیلی پتھی بھی جانتی ہے۔ پلک جھپکتے ہی اپنی صورت اور شخصیت کو بدل دیتی ہے۔ تاریک دنیا کے تمام باشندوں کی طرح ایک ہل میں ایک جگہ سے گم ہو کر دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا تھا۔ میں نے آبنوس کی گردن دیوچ لی تھی۔ وہ اسی لیے وہاں سے غائب ہو کر فرار نہ ہو سکا پھر جیسے ہی گردن میری گرفت سے نکل، وہ جان بچا کر کل گیا۔ آپ کو لارا سے محتاط رہنا ہوگا۔ کبھی اسے سزا دیے بغیر اپنی گرفت ڈھیلی کریں گے تو وہ کل بھاگے گی اور پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گی۔“

”درست کہتے ہو۔ مجھے یہ سمجھنا ہوگا کہ وہ پراسرار علوم کو کس طرح کام میں لاتی ہے۔ ویسے وہ بہت مکار



نیلماں نے کہا: ”باباجانی! میں آپ کو کچھ سنانا چاہتی ہوں، پلیز فرش پر بیٹھ جائیں۔“

## تنقید نگار

بہت سے لوگ دوسروں کے نیچے ادھیڑنے میں دن رات دیہاڑی سے لگے ہوئے ہیں۔ آنکھوں پر محذب شیشے لگائے، خوردبین ہاتھوں میں لیے قدیم وجدید ادب میں کیزے نکالنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک کہتا ہے۔

”اس میں سماجی شعور نہیں!“

دوسرا کہتا ہے۔

”اس سے جدلی مادیت کی نفی ہوتی ہے!“

تیسرا گرہ لگاتا ہے۔

”داخلیت اور خارجیت کا پہلو نظر انداز نہیں

ہونا چاہیے۔“

چوتھا پکارتا ہے۔

”اس سے شعور و لاشعور کا پتا نہیں چلتا!“

ایک اور اضافہ کرتا ہے۔

”اس میں فکر کی گہرائی بھی نہیں ہے!“

اور اس طرح سب کے سب اپنے اپنے

اکھاڑے بنائے پالیاں جنائے اور دکائیں سجائے

بیٹھے ہیں۔

جونہی کوئی نیا لکھنے والا میدان میں آتا ہے،

یہ ہلا بول کر اس پر پل پڑتے ہیں۔

”جانے نہ پائے!“

”لیجیو بچو!“

”پکڑ پولک کر!“

”دے پٹی!“

”دیکھنا۔ مٹنے نہ پائے!“

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیا لکھنے والا اپنی

عزت کے ساتھ ساتھ جان بچا کر بھاگ لھکتا ہے اور

یہ خوش ہو جاتے ہیں کہ

”میدان مار لیا!“

اقباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفع عقل

وہ تینوں قالمیں پر ایک دوسرے کے روبرو دوڑاؤ ہو گئے۔ نیلماں نے سر پر رکھے ہوئے اسکارف کو درست کیا پھر احوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد کلام پاک کی ایک آیت پڑھی تو مراد حیرانی سے سننے لگا۔ وہ کئی چھوٹی چھوٹی آیتیں یاد کر چکی تھی اور صحیح تلفظ کی ادائیگی کے ساتھ پڑھ رہی تھی۔ عابی نے کہا: ”اس نے میرے سامنے کلمہ پڑھ کے دین اسلام قبول کیا ہے۔ میں اسے روز کلام پاک پڑھاتا ہوں۔ یہ اپنی تاریک دنیا میں جا کر وہاں بھی چھپ کر نمازیں پڑھتی ہے۔“

مراد نے کہا: ”سبحان اللہ، میری دلی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں! اللہ تمہیں اور ایمان دے لیکن نیلماں..... میری بیٹی! عابی میرے بیٹے! تم دونوں نامحرم ہو۔ دینی احکامات کے مطابق تمہیں نکاح پڑھوا لیتا چاہیے۔“

عابی نے کہا: ”یہ روشنی اور تاریکی، خیر و شر کے درمیان تقسیم ہو گئی ہے۔ نیلماں کا وہاں رہنا اور ہمارے خلاف ہونے والی سازشوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔“

”صرف اپنے مقاصد اور نیلماں سے بخبری کروانے کے لیے اپنے دین کے ایک اہم حکم کو نظر انداز نہ کرو۔ مرد اور عورت کو نکاح کے بغیر ایک دوسرے کے روبرو نہیں آنا چاہیے۔ تم اسے کلام پاک پڑھاتے ہو۔ اس کے لیے بھی محرم ہونا لازمی ہے۔“

”باباجانی! اگر ہم آج کل میں نکاح پڑھوائیں گے تو دشمنوں کو معلوم ہو جائے گا کہ نیلماں ہی ان کی گھر کی بھیدی تھی۔ ہمارے مقابلے میں انہیں نقصان پہنچا رہی تھی۔ ویسے یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری منکوحہ بننے کے بعد وہاں ایک پل بھی گزارے۔“

نیلماں نے کہا: ”وہاں کہیں چھپ کر آیتیں یاد کرتی ہوں، کبھی نماز پڑھتی ہوں۔ میں جلد سے جلد یہاں آنا چاہتی ہوں لیکن اب لا رہی آپ کی زندگی میں آکر ایک مسئلہ بن گئی ہے۔“

”ہم دینی احکامات کو نظر انداز کر کے کسی بھی مسئلے کو اہمیت دیں گے تو وہ سر کا پھوڑا بن جائے گا اور ناقابل حل دکھائی دے گا۔ میں ابھی مسائل کو حل کرتا ہوں۔ ہم دونوں کے بعد نیلماں کو اپنے گھر لے آئیں گے اور میں لا رہا سے نمٹ لوں گا۔ نیلماں! تم ابھی جاؤ اور اڑتا لیس گھنٹوں تک عابی سے پردہ کرو۔ پھر اس کی منکوحہ بن کر



یہاں رہ سکوگی۔“

وہ مراد کا حکم سننے ہی اسے سلام کر کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہاں باپ بیٹے رہ گئے۔ انہیں دونوں کے اندر کوئی پیچیدہ معاملات سے نمٹنا تھا۔

☆☆☆

یہودی اپنی سازشوں میں مصروف تھے۔ جن دنوں عابی اور ان نون روپوش تھے، ان دنوں کریگ ہوسٹن نے چاہا تھا کہ عابی کو بے نقاب کر دے۔ اس نے فون پر آنکس سے باتیں کی تھیں۔ اسے یہ کہا تھا کہ عابی اپنے محل میں چھپا ہوا ہے۔ اگر آنکس ریاست ارض اسلام میں محل و غارت گری کی دھمکیاں دے گا تو عابی روپوشی ترک کر کے سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گا۔

وہ عابی کو اپنے دجال معظم کا نمائندہ ماننے والے اس کے سامنے سر جھکانے والے اب جانی دشمن بن گئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ عابی اپنی ریاست میں بے نقاب ہو جائے گا اور آنکس کے ہاتھوں مارا جائے گا لیکن بازی اچانک پلٹ گئی تھی۔ آنکس کی گردن عابی کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگا تھا۔ کریگ ہوسٹن اور دیگر اکابرین نے عابی کے لیے جو گڑھا کھودا تھا، وہ گڑھا الٹ کر بلند مینار بن گیا تھا۔ اس کی شہ زوری اور شہرت کو مزید عروج حاصل ہو رہا تھا۔ یہ دوستوں اور دشمنوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ پرنس عابد علی متقی لوہے کا چنپا ہے۔ آنکس سے چپایا نہ جائے گا۔

شیطان کی عداوت رکھنے والے شکست کھاتے ہیں لیکن ہار نہیں مانتے۔ بار بار پلٹ کر نت نئی چالوں سے زندگی حرام کرتے رہتے ہیں۔ تاریک دنیا کی طاغوتی قوتیں عابی کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں اور نہ ہی یہودی اپنی نحو سے باز آنے والے تھے۔

تل ابیب کے ایک اہم خفیہ اجلاس میں کریگ ہوسٹن کو طلب کیا گیا۔ اس سے پوچھا گیا۔ ”عابد علی متقی کو ایک طویل عرصے سے گھیرتے چلے آ رہے ہو پھر وہ تمہارے ہاتھ سے کیسے نکل گیا ہے؟“

ہوسٹن نے کہا۔ ”وہ اپنے دین کی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے۔ ان زنجیروں کو دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکے گی۔ وہ ٹوٹ جائے گا، مر جائے گا لیکن ہمارا مذہب اپنی ماں جینی کا مذہب کبھی قبول نہیں کرے گا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے پیشوائے اعظم اور ربیوں کی یہ پیش گوئی غلط ہو رہی ہے کہ جو دجال معظم کا نمائندہ ہماری

فلاح و بہبود کے لیے دنیا میں آنے والا تھا، وہ ایک یہودی غارت جینی کے نظروں سے پیدا ہو چکا ہے۔ ہم نہیں مانتے کہ پرنس عابی وہی نمائندہ، وہی مسیحا ہے۔ وہ مسیحا نہیں ہے۔ یہودیت کا کٹر دشمن ہے۔ اگر اسے صفحہ ہستی سے مٹایا نہیں گیا تو وہ ہمیں مٹا ڈالے گا۔“

اسے مٹانے کے لیے ہی وہ خفیہ اجلاس طلب کیا گیا تھا۔ وہاں صیہونیت کی وسیع و عریض تنظیم کی کئی شاخیں تھیں۔ ہر شاخ مختلف معاملات میں مختلف ہتھکنڈوں سے سرگرم عمل رہتی تھی۔ اس اجلاس میں صیہونیت کی کئی خطرناک معنی تنظیموں کے سربراہ موجود تھے۔

ان میں ایک تنظیم کا نام The wise and warrior (ذہین اور جنگجو) تھا اس تنظیم کا ہر فرد انتہائی ذہین اور چال باز تھا۔ بڑی ذہانت اور مکاری سے لڑتا تھا۔ ان کے گن فائزر بھی بلا کے نشانے باز تھے۔ انہیں جھپٹے پلٹے پھر پلٹ کر جھپٹے میں مہارت حاصل تھی۔

دی وائز اینڈ واریر کے سربراہ نے کہا۔ ”مسٹر ہوسٹن! آپ نے پرنس سے نمٹنے کے لیے ایک عرصہ گزار دیا ہے۔ آپ کی تحریری رپورٹ ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ مالدو سے ہیرس تک پرنس کے ساتھ ایسے کئی مواقع آئے جب اسے آسانی سے موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا لیکن اس کی موت کو اس لیے ٹال دیا گیا کہ اسے یہودیت کی طرف لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اور پیشوائے اعظم نے کہا تھا کہ مسلمان باپ کے بیٹے سے مایوس نہ ہونا، وہ یہودی ماں کا بیٹا ہے۔ ہمارا ہے، ہمارا ہی رہے گا۔“

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ”بے شک ہم اب تک یہی دھوکا کھاتے آ رہے ہیں۔ ہماری ناکامی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ایک بارہ برس کے بچے سے کمزور ہیں۔ ہم نے کامیابی کے بہترین مواقع خود گنوائے ہیں۔ اب ہماری کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ پہلے کی طرح ہمارے سامنے میں رہتا تو ہمارا ہاتھ اس کی شہ رگ تک آسانی سے پہنچتا رہتا۔ اب دشواریوں کا سامنا ہے۔“

وائز اینڈ واریر کے سربراہ نے کہا۔ ”بے شک وہ ہاتھ سے نکلنے کے بعد اور خطرناک اور ناقابل تسخیر ہو گیا ہے۔ اس نے ان نون کو بے نقاب کرنے کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ ان نون وہ آنکس اب ہم سے بھی چھپ نہیں سکے گا۔ وہ ٹیلی ویژن پر جانے والا اگرچہ میدان چھوڑ کر بھاگا ہوا لگ رہا ہے تاہم اس کے واپس آنے کی



توقع ہے۔ اس کا وہ ساتھی اور مددگار جو اس کے لیے چھڑا کر لے گیا تھا، وہ بھی زبردست ہوگا۔ یہی اس کے معلوم ہوا ہے تاریخ دنیا کے باشندے پر اسرار علوم کے حامل ہوتے ہیں۔ آبنوس کے دوسرے ساتھی بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہوں گے، ہم ان سے دوستی کریں گے اور ان کا اعتبار حاصل کریں گے پھر موقع کی مناسبت سے اپنی پلاننگ کے مطابق انہیں استعمال کریں گے۔ مسٹر ہوشن! تم اس سے فون پر باتیں کر چکے ہو پھر اس سے رابطہ کرو۔ اس سے ہمارا تعارف کرواؤ۔ ہم اسے یقین دلائیں گے کہ وہ ہماری دنیا میں آکر ہمارے بھرپور تعاون سے ہی کامیابیاں حاصل کر سکے گا۔“

کریگ ہوشن نے اپنے فون کی سم تبدیل کی پھر آبنوس کے فون نمبر شیخ کیے۔ دوسری طرف سے ریکارڈنگ سنائی دی کہ فی الحال رابطہ ممکن نہیں ہے، تھوڑی دیر بعد رابطہ کریں۔

پھر تھوڑی دیر بعد ریکارڈنگ سنائی دی کہ وہ فون بڑی ہے۔ ہوشن نے کہا۔ ”میں نے پہلے بھی رابطہ کیا تھا۔ جواب میں ایسی ہی بے ٹکی ریکارڈنگ سنائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ دنیا میں فون کے بوسٹر نہیں ہوں گے۔ سگنل وہاں تک پہنچے نہیں ہوں گے۔ آبنوس تاریکی سے نکل کر ہماری دنیا میں آکر فون پر بولتا ہوگا۔“

”ہم اسپیشل چینل کے ذریعے آبنوس کو اور تاریخ دنیا کی اہم شخصیات کو مخاطب کریں گے۔ انہیں خیر سگالی کا پیغام دیں گے۔ وہ بھی مسلسل ناکامیوں کے بعد سمجھ گئے ہوں گے کہ انہیں تنہا ناکامی ہو رہی ہے۔ وہ یہاں آکر ہم سے اتحاد کر کے ہی عالمی کے مقابلے میں بھاری پڑیں گے۔“

ایسے وقت تاریخ دنیا میں آبنوس لارا بارودا اور کاہن سر جوڑے بیٹھے تھے۔ لارا نے مراد کو ٹریپ کر کے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی لیکن وہ کامیابی اسے کھٹک رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”جب مراد مجھ سے رخصت ہو کر گیا تو دل و جان سے میرا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میرے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ دوسرے ہی دن ریاست سے واپس آجائے گا۔ وہ ادھر گیا ہے، میں ادھر آئی ہوں۔ چھ گھنٹے گزرنے کے بعد بھی اس نے فون پر رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ہی فون پر شکایت کی تو اس نے کہا کہ وہاں پہنچے ہی ریاست کے پیچیدہ معاملات میں الجھ گیا ہے۔ بعد میں مجھ سے باتیں کرے گا لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کا لہجہ، اس کا رویہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ میں چھپ کر وہاں جاسکتی ہوں۔ میں دیکھ سکتی ہوں

## سنہری باتیں

☆ تالائق اولاد اپنے والدین کے لیے بوجھ ثابت ہوتی ہے۔

☆ صورت کے بجائے سیرت پرست بننا دانائی ہے۔

☆ محبت کے گھر میں ساگ پات، عداوت والے گھر میں پکے ہوئے گوشت سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔

☆ جو شخص نیکی کا جواب بدی سے دے، شیطان اسی گھر میں بسیرا کرتا ہے۔

☆ احق جب تک خاموش رہے گا، دانائوں میں گنا جاتا رہے گا۔

☆ کاہلی اور سستی انسان کو غفلت کی نیند میں غرق کر دیتی ہے۔

☆ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی اولاد کو دینی اور دنیاوی تعلیم کے گوہر سے آراستہ کیا جائے۔

☆ سب سے بری عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کا حکم نہ مانے۔

☆ اپنے پڑوسی کو ستانے والا دوزخ کا ایندھن ہوتا ہے۔

☆ انتخاب۔ ریاضت، حسن ابدال

## شمع خروازاں

☆ حقیقی خوب صورتی کا سرچشمہ دل ہے۔ اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

☆ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچو اور سوچنے کے بعد کوئی فیصلہ کر لو پھر اس پر پوری طرح ڈٹ جاؤ۔

☆ اگر تم کسی کی خوبیاں نہیں دیکھ سکتے تو اس کی خامیاں بھی مت گنواؤ۔

☆ اللہ کو راضی کرو، وہ تمہیں راضی کرے گا۔

مرسلہ۔ محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اذکارہ



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ  
ایڈفرس لنکس  
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ  
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

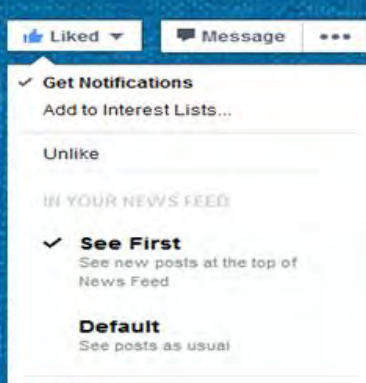
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پردی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**





کہ اس میں تبدیلی کیوں آئی لیکن کاہن کی اس بات نے خوف زدہ کر دیا ہے کہ آبنوس کی طرح اچانک پکڑی جاسکتی ہوں۔ وہاں میری اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے۔“

بارودا نے کہا۔ ”بے شک تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ ابھی تم یہاں ہو اور وہ تمہیں کال کرے گا تو یہاں سنگٹل نہیں ملیں گے۔“

”وہ پوچھے گا تو کہہ دوں گی کہ فون کو آف کر کے سو رہی تھی۔ ابھی جلد ہی چلی جاؤں گی۔“

کاہن نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا تھا کہ مراد کے ساتھ ریاست میں جاؤ گی تو مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گی۔ اگر مراد ریاست میں پہنچ کر کچھ بدل گیا ہے تو پھر میری پیش گوئی درست ہو رہی ہے۔ کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ”میں پھر اپنے علوم کی پوتھی کھول کر پڑھتا ہوں۔ اگر ہمارے خلاف تبدیلی ہو رہی ہے تو خطرے کا سنگٹل مل جائے گا۔“

بارودا نے کہا۔ ”لارا!.....! تمہیں ابھی اسی دنیا میں رہنا چاہیے۔ وہاں جاؤ اور اپنا فون آن کرو۔ مراد کو کال کرو۔ اس سے باتوں ہی باتوں میں یہ بھیہ معلوم کرو کہ وہ تم سے کیوں کتر رہا ہے؟“

وہ اسی وقت کئی پھر آدمے گھنٹے بعد آکر بولی۔ ”مراد سو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس سے باتیں ہوں گی۔ ابھی اسپیشل چینل سے کوئی آبنوس کو بار بار مخاطب کر رہا ہے۔ کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

بارودا نے کہا۔ ”آبنوس! چلو اس دنیا میں اور ان سے رابطہ کرو، معلوم تو ہو کہ وہ ہم سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

لارا کے ساتھ وہ دونوں بھی پیرس کے اس علاقے میں آگئے جہاں ان کی ایک رہائش گاہ تھی۔ انہوں نے نیوی کو آن کیا۔ اسپیشل چینل سے تحریر کی صورت میں بریکنگ نیوز جاری تھی۔ کوئی آبنوس کو مخاطب کر رہا تھا اور اپنا ایک فون نمبر پیش کر رہا تھا۔

بارودا نے اپنے فون پر وہ نمبر شیخ کیے پھر اسے آبنوس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فون کو لے کر کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف سے کریگ ہوشن نے پوچھا۔ ”ہیلو کون؟“

آبنوس نے کہا۔ ”وہی ہوں جس سے بات کرنا چاہتے ہو۔“

ہوشن نے کہا۔ ”ہاں تم وہی ہو۔ ایک بار تم سے فون پر باتیں ہو چکی ہیں۔ میری آواز پہچان رہے ہو؟“

”پہچان رہا ہوں۔ تمہاری باتوں میں آکر ریاست

میں جا کر پھنس گیا تھا۔ میرے استاد محترم آکر مجھے رہائی نہ دلائے تو وہ دشمن مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔“

”اپنی غلطی کو سمجھو، میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ خود ریاست میں جاؤ اور اپنی گردن پھنسالو۔ تمہاری اس غلطی سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس ٹیلی پیٹھی کی طاقت ہے لیکن ایسے خطرناک علم کو استعمال کرنے کی ذہانت نہیں ہے۔ ایک بار ہماری ذہانت، ہمارے منصوبے پر عمل کرو۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ تم عالی کوزیر کر سکو گے۔“

”میں نہیں جانتا تم کون ہو؟ تاریک دنیا سے آنے والے سے دوستی کیوں کر رہے ہو اور میرے دوست بن کر اپنی دنیا کے رہنے والے عالی سے دشمنی کیوں کر رہے ہو؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ عالی ہمارا دشمن ہے۔ یہ تم دیکھ رہے ہو کہ وہ کس قدر طاقت ور ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس ٹیلی پیٹھی کی طاقت ہوتی تو اب تک اسے فنا کر چکے ہوتے۔ آزمائش شرط ہے۔ ایک بار ہمارے ایک منصوبے کے مطابق ٹیلی پیٹھی کو کام میں لاؤ۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم اسے نقصان پہنچا سکو گے، اس کے بعد آنکھیں بند کر کے ہم پر بھروسہ کرنے لگو گے۔“

”تمہاری پلاننگ کیا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”ابھی سوچا نہیں ہے، پہلے تمہیں راضی کرنا تھا۔ تم راضی ہو جاؤ تو ہم ٹیلی پیٹھی کے پہلے دشمن کے موجودہ حالات کا جائزہ لیں گے۔ اس کی صحیح پوزیشن معلوم کریں گے پھر ٹریگر دبائیں گے تو گولی نشانے پر بیٹھے گی۔“

بارودا نے آبنوس سے کہا۔ ”فون مجھے دو۔“

وہ فون پر بولا۔ ”یہ لو، میرے استاد محترم سے بات کرو۔“

اس نے فون لے کر کہا۔ ”ہیلو..... میرا نام بارودا ہے۔ میں ابھی تمہاری باتیں سن رہا تھا۔“

کریگ ہوشن نے کہا۔ ”ہم آبنوس کے استاد محترم کو سلام کرتے ہیں۔ یقیناً آپ بھی ٹیلی پیٹھی جانتے ہوں گے؟“

اس نے کہا۔ ”ہمارے پاس تین ٹیلی پیٹھی جانتے والے ہیں اور بھی ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس دماغوں میں گھسنے والے ہتھیاروں کی کمی نہیں ہے۔ ویسے میں تمہاری یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ ہم ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار کو ذہانت اور صحیح پلاننگ کے مطابق استعمال نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آبنوس عالی کے مقابلے میں ناکام ہوتا آرہا ہے۔ ہم ایک بار تم پر بھروسہ کریں گے۔ تمہارے ساتھ مل بیٹھ کر ایک فحش منصوبہ بنائیں گے اور ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار صحیح طور سے آزمائیں گے لیکن یہ سن لو کہ مل بیٹھنے کے لیے تمہارے



کھل کر رہا ہے۔ وہ اس کی اصلیت جان چکا ہے۔  
پھر وہ بیدار ہوئے ہی چند منوں میں غائب ہو جاتی۔ اگر  
وہ اس کی گردن دبوچ کر اپنی گرفت میں رکھتا تو وہ نظروں  
سے اوجھل نہ ہوتی لیکن خیال خوانی کے ذریعے ایک آواز  
دیتی تو بارود اور آبنوس پلک جھپکتے ہی چلے آتے۔ اس کی  
رہائی کے لیے مراد پر قاتلانہ حملے کرتے۔ وہ اپنا بچاؤ کرتا تو  
گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ فرار ہو جاتی۔ بارود اور آبنوس  
اس کے ہاتھ نہ آتے۔ ہر پہلو سے سوچنا تھا کہ کیا کیا جائے؟  
لارا بھی ٹیلی فنی جانتی تھی۔ رہائی پانے کے بعد وہ  
بارود اور آبنوس کے ساتھ چھپ چھپ کر مراد کے پاس آتی  
رہتی اور اس پر حملے کرتی رہتی..... یا تو دور سے ہی گولی مار دیتی  
یا اس کا جینا حرام کرتی رہتی۔ ایک بلا بن کر گلے پڑ جاتی۔

اگر وہ لارا کو ہلاک کر دیتا تو بارود اور آبنوس انتقامی  
کارروائی جاری رکھتے۔ اب تو ان کا اتحاد یہودیوں سے  
ہو رہا تھا۔ وہ بڑی کامیابی سے مراد کو گھیرتے رہتے یا اسے  
روپوش رہنے پر مجبور کرتے رہتے۔  
وہ طاغوتی قوت والے دیرینک غائب تو نہیں رہ سکتے  
تھے لیکن چند ساعتوں کے لیے نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں  
سے کہیں پہنچ جاتے تھے۔ وہ جگہ بدل بدل کر مراد کے حملوں  
سے خود کو بچاتے رہتے لیکن مراد ان سے بچ نہ پاتا۔

صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور بابا صلاح الدین اجیری  
کی روحانی سرپرستی مراد کی پوری فیملی کو طاغوتی حملوں سے  
بچا رہی تھی۔ یہ تحفظ غنیمت تھا۔ وہ دشمن عداوت سے ان کے  
قریب نہیں آ سکتے تھے لیکن دور سے حملے کر سکتے تھے۔  
ایک عالمی ایسا تھا جسے گولیاں نہیں لگتی تھیں۔ کوئی ہتھیار  
اسے زخمی نہیں کر سکتا تھا۔ باقی مراد ہم زاد اور زیب النساء کو  
دشمنوں سے محتاط رہنا تھا اور محتاط رہنے کے لیے لازمی ہو گیا  
تھا کہ خوب سوچ سمجھ کر لارا کے خلاف قدم اٹھایا جائے۔

اب مقابلے پر صرف آبنوس نہیں تھا۔ اس کے ساتھ  
بارود، لارا اور کاہن تھے۔ وہ سب پر اسرار قوتوں اور  
صلاحیتوں کے مالک تھے۔ تاریکی سے باہر یہودی اکابرین  
کی سازشیں تھیں۔ ان کی خطرناک تنظیم دائرہ وائرنگ کے  
ذہن چال باز اور جنگجو ماہرین تھے۔ لارا اکیلی نہیں تھی۔  
مراد اسے ایک چنگی میں مسل نہیں سکتا تھا۔

وہ بڑی دیرینک سوچتا رہا پھر اس نے ماسٹر کو بلوے  
فون پر کہا۔ ”ماسٹر! میں بہت پریشان ہوں۔“  
”تم اور پریشان؟ تعجب ہے فوراً بلوکیا مسئلہ ہے؟“  
”یہ جو آپ کی نئی بیوی آئی ہے یہ فراڈ ہے۔ تاریک

روبرو کبھی نہیں آئیں گے۔“  
ہوشن نے کہا۔ ”جس وقت عالی نے آبنوس کو گرفت  
میں لیا تھا، اس وقت ہم آپیشل چینل کی اسکرین پر آبنوس کو اور  
شاید تمہیں دیکھ چکے ہیں۔ پھر بھی روبرو نہیں آنا چاہتے تو نہ  
آؤ۔ تم ہمیں بھی نہیں دیکھ سکو گے۔ ہمارا طریقہ کار یہ ہوگا کہ تم  
تمام ٹیلی فنی جاننے والے، ہمارے ایک آلہ کار کے دماغ  
میں آکر بولو گے۔ ہم اس آلہ کار کے پاس بیٹھ کر تم سے  
بولتے رہیں گے۔ تم میں سے کوئی خیال خوانی کے ذریعے یہ  
معلوم نہیں کر سکے گا کہ وہ آلہ کار کہاں ہے؟ تم اس کے  
ذریعے ہم تک اس لیے نہیں پہنچ سکو گے کہ وہ اندھا ہوگا۔

”وہ آلہ کار نہ تمہیں دیکھ سکے گا، نہ ہمیں دیکھ سکے گا۔ ہم  
سب اندھے دوست، اندھے اتحادی ہوں گے اور ایک  
دوسرے پر اندھا اعتماد کرنے پر مجبور ہوں گے۔“

بارود نے کہا۔ ”ہم ٹیلی فنی جاننے والوں سے  
محفوظ رہنے کی یہ بہت ہی عمدہ تدبیر ہے۔ اس تدبیر سے  
تمہاری ذہانت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ ہم تمہارے ساتھ رہ کر  
اپنی ٹیلی فنی کی صلاحیتوں کو واقعی ذہانت سے کام میں  
لا سکیں گے۔“

ہوشن نے پوچھا۔ ”تو پھر بولو، ہم اس اندھے آلہ  
کار کو اپنے درمیان کب لا سکیں؟“

”ہم دو چار گھنٹے بعد رابطہ کریں گے پھر اس اندھے  
کی آواز سن کر اس کے اندر جا کر تم سے گفتگو کریں گے۔“  
رابطہ ختم ہو گیا۔ یہودیوں کے خفیہ اجلاس میں کریک  
ہوشن ٹیلی فنی جاننے والوں سے بول رہا تھا۔ عارضی طور  
پر ان کا اعتماد حاصل کر کے دوستی کی ابتدا کر چکا تھا۔ تمام  
یہودی اکابرین خوش تھے۔ کریک ہوشن کو کامیابی کی  
مبارک باد دے رہے تھے۔

بارود، لارا اور آبنوس بھی اندھی دوستی اور اندھے  
معادے سے اس لیے مطمئن ہو گئے تھے کہ ان کی کسی  
پلاننگ پر عمل کر کے نقصان اٹھانے والے نہیں تھے۔ لارا  
نے مراد کو ٹریپ کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔ دوسری  
کامیابی یہ تھی کہ تاریک دنیا سے باہر انہیں بہت ہی ذہین  
اتحادی مل گئے تھے۔ وہ جلد ہی عالمی کو ٹریپ کرنے اور  
ذلت آمیز شکست دینے والے تھے۔

☆☆☆

مراد ذہنی طور پر ایک ڈراما سا الجھ گیا تھا۔ وہ لارا کو آسانی  
سے سزائے موت نہیں دے سکتا تھا۔ سزا دینے سے پہلے اسے  
بتانا ضروری تھا کہ جھوٹ اور فریب چھپتا نہیں ہے۔ اس کا فراڈ



دنیا کی پروردہ ہے۔ شیطان کی پرستار ہے۔ ٹیلی ویشن پر ہوتی ہے۔ طاغوتی قوتیں رکھتی ہے۔ آنکھوں اور ایک ٹیلی ویشن جاننے والا استاد بارودا اس کے ساتھی ہیں۔ یہ سب ہی شیطانی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ میں لارا کو ہلاک کرنا یا اسے اپنی زندگی سے نکالنا چاہوں گا تو تمام طاغوتی قوتیں میرے پیچھے پڑ جائیں گی۔ میں ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا گا۔ وہ لوگ ہلک جھپکتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا گا۔ میں پہلی بار خود کو بے بس اور قوتوں سے خالی محسوس کر رہا ہوں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”تم پر خدا مہربان ہے۔ یہ بتاؤ روحانی صلاحیتوں سے کس حد تک تحفظ حاصل کر سکو گے؟“

”بے شک..... اللہ تعالیٰ ہی ہماری حفاظت فرماتا ہے۔ طاغوتی قوتیں رکھنے والے میرے قریب نہیں آسکیں گے لیکن دور سے گولیاں چلا کر ہلاک کر سکتے ہیں اور زخمی اپنا ج بھی بنا سکتے ہیں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”میرے بیٹے اتم اپنا ج بن جاؤ یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ مگر نہ کرو، میں لارا کو تم سے دور کر دوں گا۔“

”کیسے کریں گے؟“

”میرے خاص ماتحت انجانے دشمن بن کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے پہلے ہی حملے میں اسے اوپر پہنچا دیں یا پھر اس کا جینا حرام کر دیں۔“

”ماسٹر! وہ شیطان کی پرستار ہے۔ اب وہ میری مشکوٰۃ نہیں رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ تنہائی میں وقت نہیں گزاروں گا۔ اسے کل تک مجھ سے دور کر دو۔“

”ایزی ہو جاؤ۔ جو چاہتے ہو وہی ہوگا۔“

ماسٹر سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اسی وقت پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ لارا کال کر رہی تھی۔ اس نے جین کو دبا کر کان سے لگایا۔ وہ بولی۔ ”ہیلو مراد! کیا مجھے بھول گئے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”تم بھلانے والی چیز نہیں ہو۔ میرے ذہن سے چپک گئی ہو۔ میں نے کہا تھا کہ ریاست کے جدیدہ معاملات میں الجھ گیا ہوں۔ ذرا صبر کرو۔ کل یا پرسوں تک آ جاؤں گا۔“

”کیا فون پر دو باتیں کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہے؟“

”کھانے پینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ آج میں نے لچ نہیں کیا ہے۔ صرف شام کی چائے پی ہے۔“

”میں سوچ رہی ہوں اس فون کا قاعدہ کیا ہے جو تمہاری آواز نہیں سنا تا۔ میں اسے بند کر رہی ہوں۔ جب تم آؤ گے تو اسے آن کر دوں گی۔“

”تم میری الجھنوں کو نہیں سمجھ رہی ہو۔ بارودا اس فون بند کرنا چاہتی ہو۔ تمہاری سرکشی ہے۔ میں اصولاً اہم معاملات کو پہلے اہمیت دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ شیطان زادی سے بولنا تو کیا اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجبوراً اور مصلحتاً بول رہا تھا۔ لارا اس کی بے رحمی کو، اس کی بے زاری کو خوب سمجھ رہی تھی۔

وہ گوگل فون کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی توہین کے احساس سے تلملارہی تھی۔ یہ سوال اس کے ذہن میں چھو رہا تھا کہ وہ اچانک کیوں بدل گیا ہے؟ کیا اسے میری اصلیت معلوم ہو گئی ہے؟ کیسے معلوم ہو گئی ہے؟ وہ مجھ سے دور ہو کر وہاں کیا کر رہا ہے؟ وہ مجھے نقصان پہنچانے کی، مجھے مار ڈالنے کی تدبیر کر رہا ہوگا مجھے دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا کر رہا ہے؟

اسے چھپ کر دیکھنے کے لیے ریاست میں جانا ضروری تھا اور وہاں جانے کے خیال سے ہی خوف طاری ہو جاتا تھا۔ آنکھوں ارضی اسلام کی زمین پر قدم رکھتے ہی موت کے گھنٹے میں چلا گیا تھا۔ اس کے نصیب میں زندگی تھی۔ بارودا نے اسے بچا لیا تھا لیکن موت سے کوئی ہمیشہ نہیں بچتا۔ یہ وارننگ مل چکی تھی یا یہ خوف خود بخود طاری ہو گیا تھا کہ شیطانی قلاعت رکھنے والے ریاست کی پاک زمین پر قدم نہیں رکھ سکیں گے۔ یقین نہ ہو تو پھر ایک بار آزمائیں۔

یہ بے چینی اسے بے چمن کر رہی تھی کہ مراد وہاں جا کر اس کے خلاف کیا کر رہا ہے؟ وہ سوچ رہی تھی کہ دشمنی سے مراد کو نقصان پہنچانے نہیں جائے گی تو اس سے دشمنی نہیں ہوگی۔ وہ بڑی رازداری سے جائے گی۔ چھپ کر اسے دیکھے گی، اس کی باتیں سنے گی پھر چلی آئے گی۔

اس نے کاہن کے پاس آ کر کہا۔ ”میں چند منٹ کے لیے چھپ کر مراد کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ بس جاؤں گی اور اپنی تسلی کر کے چلی آؤں گی۔ وہ میرے خلاف کچھ کر رہا ہوگا تو میں خطرے سے آگاہ ہو جاؤں گی۔ تم کیا کہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”نہ جاؤ۔ وہ ریاست ہمارے لیے منحوس ہے۔ آنکھوں کی طرح تم پر بھی کوئی مصیبت آ سکتی ہے۔“

”اگر بارودا اور آنکھوں خیال خوانی کے ذریعے میرے اندر موجود رہیں گے تو میں وہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ جیسے ہی کوئی مصیبت مجھ پر آئے گی، وہ میرے لیے ڈھال بن جائیں گے۔ مجھے حفاظت سے لے آئیں گے۔“

بارودا نے کہا۔ ”یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مراد اپنی



وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ”بیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے وہاں سے فرار ہوتے وقت دیکھا تھا۔ کمرے میں صرف مراد تھا۔ اس کی کسی روحانی قوت نے حملہ کیا تھا۔“

کاہن نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی منع کیا تھا۔ اب سنبھل جاؤ۔ آئندہ وہاں قدم نہ رکھنا۔“

”کان پکڑتی ہوں۔ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گی۔“ آئینوس نے کہا۔ ”ہم وہاں کبھی جانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ریاست ان لوگوں کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔ ہم کبھی وہاں جا کر ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔“

بارودا نے کہا۔ ”پلڑا برابر ہے۔ وہ بھی ہماری تاریک دنیا میں کبھی نہیں آسکیں گے۔ ہم یہاں ان سے محفوظ ہیں۔“

لارا نے کہا۔ ”وہاں جانا مجھے مہنگا پڑ رہا ہے۔ مراد نے مجھے حاضر ہوتے اور غائب ہوتے دیکھ لیا ہے۔ پہلے تو نہ جانے کیوں مجھ سے بدظن تھا۔ اب یقین ہو گیا ہوگا کہ میں بھی آئینوس کی طرح تاریک دنیا سے تعلق رکھتی ہوں۔“

”آئندہ تم آزادی سے ان کی دنیا میں نہیں رہ سکو گی۔ مراد علی متنگی بہت ہی جلداد ہے۔ اپنے دشمنوں کو زندہ نہیں چھوڑتا ہے۔ جرائم کی دنیا میں اس کے وسیع ذرائع ہیں۔ تم جہاں بھی نظر آؤ گی، لارا کے اس چہرے کے ساتھ ماری جاؤ گی۔“

”میں پلک جھپکتے ہی روپ بدل لیتی ہوں۔ دشمنوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بٹھا سکتی ہوں۔ مراد مجھ سے نہیں بچے گا۔ جب بھی ریاست سے باہر آئے گا تو میرے حملوں کی زد میں رہے گا۔ میں دور سے گولیاں چلا کر اسے اپانچ بنا کر سڑک کے کنارے بھیج دینگے بٹھا دوں گی۔“

کاہن نے کہا۔ ”جانتی آنکھوں سے خواب نہ دیکھو۔ وہ ریاست سے باہر کبھی نظر نہیں آئے گا۔ وہ چہرے اور شخصیت بدل کر رہنے کا عادی ہو گیا ہے۔ دشمنوں سے آنکھ بھولی کیلئے کاما رہے۔ تم اسے ڈھونڈتی رہ جاؤ گی۔“

بارودا نے کہا۔ ”فی الحال اپنی سلامتی کی فکر کرو۔ آج اس نے تمہارا اصلی روپ دیکھ لیا ہے۔ تمہیں اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ آئندہ بھی تم چھپ کر حملے کرنے جاؤ گی۔ اسے تمہاری طرف سے خطرہ رہے گا۔ وہ تمہیں کسی طرح ختم کر دینا چاہے گا۔“

کاہن نے کہا۔ ”آج تم میری بات نہ مان کرو ہاں

ریاست میں پہنچے ہی لارا سے بے زاریوں ہو گیا ہے۔ اسے لارا کی اصلیت معلوم ہو گئی ہے تو کیسے معلوم ہوئی ہے؟ آئندہ بھی ہمارے راز کس طرح اسے معلوم ہوں گے؟ اس کے خفیہ ذرائع کیا ہیں؟ ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔“

وہ احتیاطی تدبیر کے مطابق لارا کے دماغ میں آگئے۔ کاہن نے کہا۔ ”جاؤ، میں تمہاری سلامتی کے لیے شیطان معظم کی پناہ مانگتا رہوں گا۔“

ایسے وقت نیلماں محل میں پہنچی ہوئی تھی۔ مراد نے اسے نصیحت کی تھی کہ جب تک نکاح نہ پڑھایا جائے اسے عابی سے پردہ کرنا چاہیے۔ وہ نصیحت کے مطابق اس کے سامنے نہیں گئی تھی۔ ماروی کے پاس آگئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کے دماغ میں ہے اور اسے اپنے پاس بلارہی ہے۔

اور وہ بے اختیار اس کے پاس محل میں آگئی تھی۔ ماروی کو پیار سے دیکھ کر اسے بستر سے اٹھا کر سینے سے لگانا چاہتی تھی۔ اسی لمحے میں اس نے طاغوتی لوبان کی مہک محسوس کی۔ وہ لوبان شیطان کی پوجا کرتے وقت جلا یا جاتا تھا۔

نیلماں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ دماغ نے چیخ کر کہا کوئی شیطان کا چیلہ محل میں آیا ہے۔ وہ فوراً ہی ماروی کے پاس سے گم ہو کر عابی کے پاس پہنچی۔ وہ کمپوٹر کے سامنے بیٹھا مصروف تھا۔ وہاں لوبان کی مہک نہیں تھی۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

وہ پلک جھپکتے ہی مراد کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنا فون اٹھا کر کسی سے رابطہ کرنے کے لیے نمبر شیخ کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے لارا صوفے سے یوں لگی بیٹھی تھی کہ وہ سرگھماتا تو فوراً صوفے کے پیچھے چھپ جاتی یا وہاں سے غائب ہو جاتی۔

نیلماں اس کے پیچھے تھی۔ اس سے پہلے کہ لارا مراد کی ٹیلی فون کال سنتی، نیلماں نے اچھل کر ایک لات اس کی کمر پر ماری۔ وہ لات کھاتے ہی اچانک صوفے کی طرف مراد کے پاس جھکی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم..... لارا تم یہاں؟“

وہ دوسرے ہی لمحے میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ نیلماں نے کاہن کے پاس پہنچ کر دیکھا۔ وہاں چند لمحوں کے بعد لارا بارودا اور آئینوس حاضر ہو گئے تھے۔ لارا اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

بارودا نے کہا۔ ”تم پر کس نے حملہ کیا تھا؟ اگر تم پلٹ



مکئی تھیں۔ قسمت سے بچ کر آگئیں۔ آئندہ کے لیے ایک مشورہ دیتا ہوں کہ کچھ عرصے تک اس سے دور رہو۔ ہماری یہ تاریک دنیا بہترین پناہ گاہ ہے۔ یہاں سے کبھی نکلو تو باہر اسے لارا نظر نہ آئے۔ اس سے جتنی دور رہو گی، اتنی ہی لمبی زندگی گزارتی رہو گی۔“

”میں یہی کروں گی۔ کبھی اصلی چہرے کے ساتھ باہر نہیں جاؤں گی اور کچھ عرصے تک اس دشمن سے دور رہوں گی۔“

نیلماں مراد کے پاس آئی۔ وہ ہم زاد اور عالی کے ساتھ بیٹھا لارا کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ نیلماں نے ٹرانسپیرنٹ ہو کر ایک پردے کے پیچھے سے کہا۔ ”بابا جانی! میں آئی ہوں، یہاں عالی کو رہنے دیں۔ میں پردے میں رہوں گی۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا تم جانتی ہو کہ لارا یہاں آئی تھی؟“

”جی ہاں۔ میں نے ہی اسے لات ماری تو وہ آپ کے پاس جا کر گری تھی۔“

”میں نے دیر کر دی۔ اسے پکڑ لیتا تو ابھی میری گرفت میں رہتی اور اپنے برے انجام کو پہنچتی۔“

”یہ اچھا ہوا کہ آپ نے اسے اپنی گرفت میں نہیں لیا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ آنکس اور میرے پاپا اس کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ وہ انجانے میں آپ کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”لارا نے یہاں آ کر خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ وہ آئندہ بھی حملہ کرنے آتی رہے گی۔“

”نہیں آئے گی۔ آنکس کے بعد وہ یہاں سے جان بچا کر بھاگی ہے۔ ان سب کے دل و دماغ میں یہ دہشت سا مکئی ہے کہ یہاں روحانی قوتیں آپ سب کی محافظ ہیں۔ وہ جب بھی یہاں قدم رکھیں گے مارے جائیں گے۔“

عالی نے کہا۔ ”اگر ایسی دہشت طاری ہوگئی ہے تو یہ ہمارے لیے بہت ہی اچھا ہے۔ وہ کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔“

”وہ کہتے ہیں کہ جس طرح وہ تاریک دنیا کے طاغوتی سائے میں محفوظ ہیں، اسی طرح روحانی قوتیں آپ لوگوں کو ریاست میں تحفظ فراہم کر رہی ہیں۔ وہ جب بھی ادھر آئیں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہمارے لیے بہتری ہو رہی ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”بیٹی!.....! جسہیں کیسے معلوم ہوا کہ لارا میرے پاس آئی ہے؟“

”میں نہیں جانتی تھی کہ لارا کے عزائم کیا ہیں؟ مجھے ماروی نے بلایا تھا۔“

”ماروی نے؟.....! سب نے چونک کر پردے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے نیلماں تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ میں نے محسوس کیا تھا جیسے ماروی میرے دماغ میں سوچ کی لہروں کی طرح آئی ہے اور مجھے بلارہی ہے۔ میں یہاں آئی تو مجھے اس لوہان کی مہک محسوس ہوئی جسے شیطان کی پوجا کرتے وقت جلایا جاتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ یہاں کوئی دشمن آیا ہے۔ حقیقتاً ماروی نے آپ کو لارا کے ناپاک عزائم سے بچایا ہے۔ میں نے اس کی پیدائش سے لے کر اب تک یہی دیکھا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک نامعلوم سارو روحانی رابطہ رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں جیسے بولتی ہیں۔ میں وہ چہرے کے تاثرات سے اور ہاتھ پاؤں کی حرکتوں سے سمجھ لیتی ہوں۔“

عالی نے کہا۔ ”یہ میری بہنا میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرتی ہے اور میں بھی سمجھ لیتا ہوں۔“

مراد اور ہم زاد نے بھی کہا کہ وہ ننھی سی جان اپنی زبان بے زبانی سے بہت کچھ بولتی رہتی ہے اور وہ جیسے آسانی سے پہیلی بوجھ لیتے ہیں۔

پھر مراد نے کہا۔ ”میں نے اڑتالیس گھنٹے کے اندر عالی اور نیلماں کا نکاح پڑھوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے لارا سے نمٹنا چاہتا تھا۔ ابھی جو بیس گھنٹے بھی نہیں گزرے ہیں اور لارا ایک کنارے لگ گئی ہے۔ اس سے تو پتا نہیں کب تک نشستے رہنا ہوگا۔ بیٹی نیلماں! میں چاہتا ہوں، ابھی اسی وقت تاریک دنیا کو چھوڑ دو۔ اپنے پاپا کو الوداع کہہ کر چلی آؤ۔ آج ہی تم دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔“

سب نے اس فیصلے کی تائید کی۔ اس نے کہا۔ ”نکاح سے پہلے ہم ایک اہم مسئلے پر اطمینان حاصل کرنا چاہیں گے۔ میں اس مسئلے پر عالی سے بات کرتا ہوں۔ نیلماں! تم زیب النساء کے پاس جاؤ اور ان سے باتیں کرو۔“

وہ چلی گئی۔ کمرے میں ایک بیٹا اور دو باپ رہ گئے۔ بظاہر یہ بات مضحکہ خیز تھی کہ اس کے دو باپ تھے۔ حقیقتاً وہ ایک ہی تھے۔ ہر انسان کے ساتھ اس کا ایک ہم زاد پیدا ہوتا ہے جو اس کے اندر رہتا ہے۔ اس کا ایک الگ جسم نہیں ہوتا۔ جس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس کا منہ خیال بھی ہوتا ہے۔ مثبت خیال بھی ہوتا ہے۔

مراد کا ہم زاد بابا اجیری کی دعاؤں سے مجسم ہو کر دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مجسم ہو کر اس کے وجود کا دوسرا حصہ دکھائی دے رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM



## فقیری نسخہ

میں نے ایک فقیر سے کہا۔

”مجھے گناہ کی بیماری ہے۔ کوئی علاج

فرمائیں۔“

فقیر نے فرمایا۔ ”درج ذیل نسخہ استعمال کرو۔

توبہ کی مصری، صبر کا پیالہ، توحید کے پتے، ذکر کی ہڑ ہڑ،

شریعت کی اوکھلی میں ڈال کر طریقت کے ڈنڈے سے

خوب باریک کرلو۔ جب پس کر باریک ہو جائے تو

حقیقت کی چھنی میں چھانو پھر معرفت کی ہنڈیا میں ڈال

کر عشق کے چولہے پر چڑھاؤ۔ جب تیار ہو جائے تو

گناہ کے حلق میں انڈیل دو لیکن تین چیزوں سے پرہیز

کرو۔ تکبر کی مولیٰ، شرک کا پیاز، دغا کا چاول۔“

انتخاب۔ ریاضِ بٹ، حسن ابدال

## انمول موتی

☆ رشتوں کی رسی کمزور تب ہوتی ہے جب

انسان غلط فہمی میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب

خود ہی بتا لیتا ہے۔

☆ زندگی مسکرا کر بسر کرو، دنیا رونے والے کے

ساتھ نہیں روتی۔

☆ سب سے بڑا راز موت ہے اور سب سے

بڑی دولت اچھا دوست ہے۔

☆ رشتے خون کے نہیں ہوتے، احساس کے

ہوتے ہیں اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے، یہ نہ ہوتو

اپنے بھی اجنبی ہوتے ہیں۔

مرسلہ۔ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی، نور پور قنول

## دولت اور دنیا

☆ جب دولت بولتی ہے تو سچائی بھی بعض مرتبہ

خاموش ہو جاتی ہے (روسی کہاوت)

☆ دولت چند دوست اور بہت سے دشمن پیدا

کرتی ہے (ویز)

☆ دولت کی زبان کو دنیا کے تمام لوگ سمجھتے ہیں (تھیلو)

☆ اگر ہم اپنی دولت پر حکومت کر سکتے ہیں تو ہم

امیر اور آزاد ہیں اور اگر ہم پر ہماری دولت حکومت

کرتی ہے تو ہم غریب اور غلام ہیں (برک)

مرسلہ۔ محمد انور ندیم، حویلی لکھنا، اوکاڑہ

سب ہی سے کہا گیا تھا کہ وہ سزا کا ہم شکل ہے۔ دونوں کا وجود ایک ہی تھا۔ دونوں ہی مراد تھے اور کوئی ہم زاد کی حقیقت جاننے والا تھا اور نہ ہی اس موضوع پر بھی بحث ہونے والی تھی۔

بہر حال مراد نے عابی سے کہا۔ ”بیٹے! تمہاری شادی خانہ آبادی کا ایک افسوس ناک انجام ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ ہمیں ماریہ کی وفات کا یا ہلاکت کا صدمہ ہمیشہ رہے گا۔ تم سے یہ سوال ہے کیا ہم پھر ایسا ہی صدمہ اٹھانے کی غلطی کرنے والے ہیں؟“

یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب وہ بزرگوں کو وضاحت سے نہیں دے سکتا تھا۔ شرم مانع تھی۔ وہ کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

ہم زاد نے کہا۔ ”بیٹے! تمام ڈاکٹر، تمام دوست اور دشمن کہتے ہیں کہ کوئی بھی دیکھن تمہارے ساتھ ازدواجی تعلقات کی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ اس بے چاری کی پہلی سہاگ رات ہی آخری ہوگی۔“

عابی نے کہا۔ ”آپ کی پریشانیاں بجا ہیں۔ جو المناک سانحہ ہو چکا ہے، اس کے پیش نظر مجھے شادی سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن انسان موت کے ڈر سے جیتا نہیں چھوڑ دیتا۔ ہم موت سے لڑتے ہوئے لائف انجوائے کرتے ہیں اور اس طرح انجوائے کرتے ہیں کہ دوسروں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میری دلہن کو شاید نقصان نہیں پہنچے گا۔“

مراد اور ہم زاد نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلایا۔ زیب النساء اپنے بیڈ روم میں نیلہاں سے کہہ رہی تھی۔ ”بے شمار لڑکیاں میرے عابی کی دیوانی ہیں لیکن ماریہ کا انجام دیکھ کر سہم گئی ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے صاف طور پر سمجھا دیا ہے کہ کوئی بھی لڑکی میرے بیٹے سے ازدواجی رشتہ قائم نہیں کر سکے گی۔ کرے گی تو موت لازمی ہوگی۔“

اس نے نیلہاں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کیا تم خوف زدہ نہیں ہو؟ تم نے ہر پہلو سے سوچا ہوگا، غور کیا ہوگا، کیا تمہیں فکر و اندیشہ نہیں ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ مجھے کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔ میں نے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزاریں گے۔“

زبیب النساء نے اسے چپک کر کہا۔ ”جب تمہیں یقین ہے، تم مطمئن ہو تو ہم سب تمہارے لیے دعا میں مانگتے رہیں گے۔“



وہ بولی۔ ”اما! میں اپنے باپ سے رخصت ہونے جا رہی ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔ جلد ہی واپس آؤں گی۔“ وہ چلی گئی۔ زیب النساء نے ہم زاد سے کہا۔ ”نیلماں بہت پر اعتماد ہے۔ اسے کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔ کہتی ہے عابی کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی گزرے گی۔“

عابی نے کہا۔ ”بابا جانی! اللہ ہم سے راضی ہے۔ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ آپ ہماری شادی کا اعلان کریں۔ دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے باوجود میں کسی دہن کے لیے خطرناک نہیں ہوں۔ آج بعد نماز مغرب نیلماں میری زندگی میں آ رہی ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ سلامت رہ کر طبعی عمر گزارے گی۔“

مراد نے ایچ ایچ جیٹل سے رابطہ کیا۔ وہاں سے اعلان ہونے لگا کہ پندرہ منٹ کے بعد ٹھیک ایک بجے ریاست ارض اسلام کے فرماں روا ہزہائی نس مراد علی منگی ایک بہت ہی چونکا دینے والا اعلان کریں گے۔

پھر ایک بار ہلچل مچ گئی۔ یہ سب ہی کو تجسس ہوا کہ وہ چونکا دینے والا اعلان کیا ہوگا؟ پانچ منٹ کے بعد پھر اعلان کیا گیا۔ ”آج پرنس عابد علی منگی کی شادی خانہ آبادی ہے۔۔۔۔۔ آج بعد نماز مغرب نکاح خوانی ہے۔“

تمام چاہنے والیوں کے دل کی دھڑکنیں بیک وقت شور مچانے لگیں۔

یہ ایسا اعلان تھا کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مرد عورتیں جوان اور بوڑھے سب ہی ٹی وی کے سامنے آ گئے۔ اسے حاصل کرنے کے خواب دیکھنے والی لڑکیاں تو پاگل ہو رہی تھیں۔

اس وقت وہ باؤلی جی دار دلہنیا بننے والی تاریک دنیا میں اپنے باپ بارودا کے سامنے تھی۔ آنسو لارا اور کاہن اس کے اطراف موجود تھے۔ اس نے کہا۔ ”پاپا! میں آپ کو اور اس کالی دنیا کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“

باپ نے پوچھا۔ ”مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گی؟ میرے بغیر کیسے رہ سکو گی؟“

”جیسے دوسری لڑکیاں رہتی ہیں۔ اس عمر میں ہر لڑکی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر بیاہ کے گھر جاتی ہے۔“

لارا نے کہا۔ ”اچھا تو تم نے جیون ساتھی ڈھونڈ لیا ہے۔ مبارک ہو، کون ہے وہ؟“

”پرنس عابد علی منگی۔“ یہ نام توپ کے گولے کی طرح سب ہی کے سینے

پر لگا۔ بارودا نے ناگوار سی سی پوچھا۔ ”کیا؟ اس کر رہی ہو؟“

”میرے جانے کے بعد معلوم ہوگا کہ بکواس نہیں کر رہی ہوں۔ آج وہاں کے وقت کے مطابق شام سات بجے پرنس عابی سے میرا نکاح پڑھایا جائے گا۔ افسوس، بیٹی کی شادی میں باپ شریک نہیں ہو سکے گا۔“

کاہن نے کہا۔ ”کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ شیطان کی پرستش چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس برباد ہونے جاؤ گی؟“

آنسو نے پوچھا۔ ”یہ عابی کے ساتھ کب سے چکر چل رہا ہے؟ تم ہم سے چھپ کر اپنے باپ کو دھوکا دے کر اس دشمن سے ملتی رہی ہو۔“

لارا نے کہا۔ ”اور صرف ملتی نہیں رہیں، ہمارے خلاف جاسوسی بھی کرتی رہی ہو۔ عابی آنسو کو نہیں پہچانتا تھا۔ وہ تمہاری مدد سے آنسو تک پہنچ گیا تھا۔“

وہ کاہن سے بولی۔ ”میں یقین سے کہتی ہوں، آج میں مراد کے پاس جاتے ہی نیلماں کی دشمنی سے گرفت میں آنے والی تھی۔ یہ آستین کی سانپ ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔“

یہ کہتے ہی اس نے ایک الٹا ہاتھ نیلماں کے منہ پر مارا۔ وہ ہاتھ چرے پر سے گزرتا ہوا ادھر سے ادھر چلا گیا۔ وہ ٹرانسپیرنٹ ہوئی تھی۔ اس کا ٹھوس وجود نہیں رہا تھا۔

کاہن نے کہا۔ ”بارودا! اپنی بیٹی کو لگام دو۔ اسے جانے سے روکو۔“

بارودا نے اپنی بیٹی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”اپنا ہاتھ مجھے دو۔ تم باپ کی گرفت میں رہو گی۔ یہاں سے نہیں جاؤ گی۔“

”سوری پاپا! میں دین اسلام قبول کر چکی ہوں۔ نمازیں پڑھتی ہوں۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔ آپ شیطان پر تھوک کر میرے ساتھ چلیں۔“

اس نے شیطان پر تھوکنے کو کہا تھا۔ کاہن یہ سنتے ہی غصے سے لرز گیا۔ بارودا کے پیچھے بیڈ کے سرہانے ایک گن رکھی ہوئی تھی۔ اس نے جھپٹنے کے انداز میں گن کو اٹھایا پھر نیلماں پر تڑا تڑ گولیاں چلائیں۔ وہ گولیاں اس کے سر پہنچنے اور پیٹ سے گزر رہی تھیں اور اس کے پیچھے جا کر قد آدم آئینے کو توڑ رہی تھیں۔

وہ غصے میں بھول گیا تھا کہ وہ ٹرانسپیرنٹ ہے۔ گولیاں نہیں لگیں گی۔ اس کی طرف جو بھی چیز پھینکی جاتی تھی وہ



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





کر دی ہے۔ آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ وہ عداوت کے نتیجے میں کس طرح پرنس عالی سے شکست کھاتے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویشن ایک بہت ہی طاقت ور ہتھیار ہے۔ یہ ہتھیار دشمنوں کو دماغی طور پر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ان نادانوں کو یقین ہے کہ وہ جلد ہی اس ہتھیار کے ذریعے ہم پر حاوی ہو جائیں گے۔ تاریک دنیا کے ٹیلی ویشن جاننے والے بے دین ہیں۔ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ وہ شیطان کے پجاری ہیں اور ہماری دنیا سے تمام مذاہب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ خدا ہمیں بچانے والا ہے۔ ہمیں اپنے مذہب کو بچانا ہے۔ مذہب ہے تو تہذیب ہے۔ اخلاق ہے اور شرم و حیا ہے۔ اللہ ہمارے دین کا محافظ ہے۔ دین اسلام پر آج نہیں آئے گی۔ ہم انہیں شیطان کی پوجا پاٹ سے باز رکھیں گے۔ ہم ان کی دشمنی کے جواب میں دشمن بن جاتے ہیں لیکن دوستی اور محبت سے بھی پیش آرہے ہیں اور میں مراد علی منگی محبت کا ثبوت پیش کرنے کے لیے شیطان کے ایک پرستار کی بیٹی کو اپنی بہو بنا رہا ہوں۔“

اس نے نیلماں سے کہا۔ ”بیٹی! یہاں آؤ۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مراد کے پاس آئی۔ اس وقت جیسے پوری دنیا کی لڑکیاں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے ناظرین سے کہا۔ ”السلام علیکم محترم ناظرین.....! میرا نام نیلماں ہے۔ میں چند روز پہلے تک طاغوت پرست تھی۔ اب اللہ کا شکر ہے، میں دین اسلام کی رحمتوں اور برکتوں سے مالا مال ہو رہی ہوں اور آج شام کے بعد پرنس عابد علی منگی جیسے دین دار اور نیک نام مجازی خدا کے سامنے میں زندگی گزاروں گی۔“

ہائے.....! بے شمار حسیناؤں کے دل سے آہ بھی نکلی اور ہائے بھی نکلی۔

اسکرین پر مراد کی تقریر جاری تھی۔ اسے سننے والے سن رہے تھے اور طرح طرح کے سوالات کرنے کے لیے فون کا لز بھی کر رہے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”ناظرین! مجھے بتایا جا رہا ہے کہ ٹیلی فون کا لز کے ذریعے عالی کی شادی کے سلسلے میں کئی طرح کے سوالات کے جا رہے ہیں۔ سوالات کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ذرا صبر کریں۔ میرا بیٹا بے رحم قصائی نہیں ہے۔ وہ ایک ایمان لانے والی شریک حیات کی زندگی سے نہیں کھیلے گا۔“

”آپ صبر و تحمل سے انتظار کریں۔ آپ کو معلوم ہونا

وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ شیطان کے خلاف نفرت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ گن کے دستے سے اسے مارنے لگا۔ خالی اور کھوکھلے حملوں کے باعث ہانپنے لگا۔ لارا اور آنکس نے اسے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔ اسے سمجھانے لگے کہ وہ ذرا صبر کرے۔ جلد ہی شیطان کا قہر نیلماں پر نازل ہونے والا ہے۔

بارودا بیٹی کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ بے بسی سے سوچ رہا تھا کہ یہ ہاتھ سے گئی۔ کسی کی گرفت میں نہیں آئے گی۔ اس نے باپ کو بھی ہاتھ پکڑنے نہیں دیا تھا۔ ایک بار پکڑ میں آ جاتی تو پھر وہاں سے فرار نہ ہو پاتی۔ طاغوت کے بچہ رے میں قیدی بن کر رہ جاتی۔

وہ یولی۔ ”پاپا! آپ کی محبت میرے دل سے نہیں نکلے گی۔ میں اپنے رب سے دعائیں مانگتی رہوں گی کہ جس طرح میں پھر کئی اسی طرح آپ کا دل بھی شیطان سے پھر جائے۔ میں جارہی ہوں آپ آئیں۔ سیدھے سچے اور ایمان کے راستے پر آئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عزت اور نیک نامی دے گا۔ بیٹی سے محبت ہے تو آپ ایک دن ضرور آئیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مراد اور عالی ریاست کے ذاتی اسٹوڈیو میں تھے۔ وہاں انجیل جیمیل کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ مقررہ وقت کے مطابق دنیا کی تمام ٹیلی ویژن اسکرینز پر نظر آنے والے تھے۔ نیلماں نے وہاں پہنچ کر کہا۔ ”بابا جانی! میں تمام کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ اب یہاں میرا اللہ ہے آپ ہیں اور عالی ہیں۔“

مراد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خوش رہو۔ سیدھے اور سچے راستوں پر تمہیں کبھی کانٹے نہیں چھیں گے۔ تمہیں آسودگی اور نیک نامی ملتی رہے گی۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے کے سامنے آ گیا۔ ٹی وی اسکرین پر ناظرین کو دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ ”میری ماؤ! بہنو! بزرگو! بھائیو! اور دوستو! میں مراد علی منگی ایک طویل مدت کے بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ آپ میں سے بیشتر حضرات جانتے ہیں کہ میرے دن رات دشمنوں کے بچھائے ہوئے کائناتوں پر گزرتے رہتے ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ٹیلی ویشن جاننے والی بلائیں ہماری دنیا پر حکومت کرنے کے ناپاک ارادوں سے آگئی ہیں۔ انہوں نے آتے ہی میرے بیٹے عابد علی منگی سے عداوت شروع



ہمارے قریب بھی نہیں آ سکو گے کیونکہ وہ آلہ کارانہ تھا ہے۔  
وہ نہ تمہیں دیکھ سکے گا، نہ ہمیں دیکھ سکے گا۔ ہم سب اندھے  
دوست، اندھے اتحادی ہوں گے اور ایک دوسرے پر اندھا  
اعتماد کرنے پر مجبور ہوں گے۔“

یہ بہت ہی عمدہ تدبیر تھی۔ اس سے یہودیوں کی  
مکارانہ ذہانت کا پتا چلتا تھا۔ بارودا، لارا اور آبنوس ان سے  
راضی ہو گئے۔ انہوں نے کریگ ہوشن سے کہا تھا کہ وہ  
دو چار گھنٹوں کے بعد ان سے رابطہ کریں گے پھر اس  
اندھے آلہ کار کی آواز سن کر اس کے دماغ میں جا کر تفصیلی  
مفنگو کریں گے۔

مگر وہ دو چار گھنٹوں میں رابطہ نہ کر سکے۔ ان کے  
حالات تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ لارا چھپ کر مراد کی ٹوہ  
لینے گئی تھی اور اس کی نظروں میں آگئی تھی۔ اس کی شریک  
حیات بن کر اسے دھوکا دیتے رہنے کی پلاننگ ناکام ہو گئی  
تھی۔ اس کے حالات بدل گئے تھے۔ آئندہ مراد سے  
بدترین دشمنی جاری رہنے والی تھی۔

ایسی انجمن کے بعد دوسری انجمن یہ پیدا ہوئی کہ  
نیلماں اچانک مسلمانوں کی پناہ میں چلی گئی۔ بارودا اپنی  
بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ اس کی اچانک جدائی سے اب سیٹ  
ہو گیا تھا۔ مدے کے باعث ایک گوشے میں بیٹھ گیا تھا۔  
کسی سے نہیں بول رہا تھا۔

کاہن، نیلماں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بارودا سے کہہ  
رہا تھا۔ ”شیطان کی توہین کرنے والی پرتھوک دو۔ اسے یاد  
نہ کرو۔ بھول جاؤ۔ وہ مسلمانوں کے پاس حرام موت مرنے  
گئی ہے۔ میں ایسے شیطانی منتر پڑھوں گا کہ وہ ان دشمنی  
آگ میں جلتی رہے گی۔“

لارا نے سمجھایا۔ ”بیٹی کے غم میں یہودیوں کو نہ بھولو۔  
ان سے ہمیں بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ بہت ہی مکاری  
سے جالیں چلتے ہیں۔ اگر ان کی کسی تدبیر پر عمل کر کے ہم  
عابی کو چل ڈالیں گے تو نیلماں یکہ وتہا ہو کر پھر تمہارے  
پاس لوٹ آئے گی۔“

ایک باپ کو ہونے والے داماد سے دشمنی تھی۔ ہر  
طرف سے گونج سنائی دے رہی تھی کہ عابی کی بچھائی ہوئی جج  
دلہن کے لیے موت کا بستر ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی جان پر  
کھیلنے لگی ہے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اسے سحر زدہ کر دیا گیا  
ہے۔ کل صبح وہ اپنے باپ کو پا پا بولنے کے لیے زندہ نہیں  
رہے گی۔

بارودا نے تڑپ کر کریگ ہوشن کو فون پر مخاطب

چاہیے کہ ہم کس طرح طاغوتی قوتیں رکھنے والوں سے نمٹ  
رہے ہیں؟ میں نے دو روز پہلے لارا نام کی ایک دوئیزہ کو  
شریک حیات بنایا تھا۔ اس کے متعلق جلد ہی انکشاف ہوا کہ  
نہ وہ عیسائی تھی نہ اس نے ہمارا دین قبول کیا تھا۔ وہ شیطان  
کی پرستش کرتی تھی۔ آبنوس کے بعد تاریک دنیا سے آنے  
والی یہ دوسری دشمن ہے۔ نیلماں کے پا پا بھی ہمارے  
بدترین دشمن ہیں۔ تاریک دنیا میں اور نہ جانے کتنے طاغوتی  
قوتیں رکھنے والے ہیں جو اپنے مزاج اور اپنے حالات کے  
مطابق ہمارے لیے مسائل پیدا کرنے کی خاطر آتے رہیں  
گے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ صرف میرے اور میری فیملی  
کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ آپ سب کے دماغوں میں گھس کر  
آپ کو غلام بنا کر ہماری دنیا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ پھر  
پاور اور بے شمار طاقت ور تنظیموں نے آبنوس، بارودا اور لارا  
کے چہرے دیکھے ہیں۔ ان کی ٹیلی ویژنی سے نجات حاصل  
کرنے کے لیے آپ انہیں تلاش کریں۔

”فی الحال اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے  
تعاون سے ہی طاغوتی قوتوں کو پسا کر سکیں گے۔ میرے  
بیٹے کی شادی، ازواجی معاملے میں جو تجسس ہے وہ آج  
رات دور ہو جائے گا۔ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ آپ بھی  
انتظار کریں۔“

وہ اللہ حافظ کہہ کر اسکرین سے آؤٹ ہو گیا۔ اگلے  
بارہ گھنٹوں میں تجسس ختم ہونے والا تھا۔ اس وقت تک  
مردوں سے زیادہ عورتیں مضطرب اور بے چین تھیں۔

☆☆☆

بارودا اور یہودیوں کے درمیان سمجھوتا ہو رہا تھا۔  
دوستی کی ابتدا ہو رہی تھی۔ بارودا نے یہ تسلیم کیا تھا کہ ان کے  
پاس ٹیلی ویژنی کی خطرناک قوت ہے لیکن وہ اس قوت کو صحیح  
پلاننگ کے مطابق استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ اسی لیے عابی  
ہر مقابلے میں ان سے بازی لے جا رہا ہے۔

بارودا نے یہودیوں سے کہا تھا۔ ”ہم ایک بار تم پر  
بھروسہ کریں گے۔ تمہارے ساتھ مل بیٹھ کر ایک ٹھوس  
منصوبہ بنائیں گے پھر اپنی ٹیلی ویژنی کی طاقت کو آزمائیں  
گے لیکن مل بیٹھنے کے لیے تمہارے روبرو نہیں آئیں گے۔“  
ہوشن نے کہا تھا۔ ”ہمارا طریقہ کار یہ ہوگا کہ تم تمام  
ٹیلی ویژنی جاننے والے ہمارے ایک آلہ کار کے دماغ میں  
آکر بولو گے۔ ہم اس آلہ کار کے پاس بیٹھ کر بولتے رہیں  
گے۔ تم میں سے کوئی بھی خیال خوانی کے ذریعے یہ معلوم نہیں  
کر سکے گا کہ وہ آلہ کار کہاں ہے؟ تم اس کے ذریعے



کیا۔ ”مسٹر ہوشن! میں بہت آپ سیٹ ہوں۔ میرا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ بیٹی کو اس دشمن کی بیچ پر جانے سے کیسے روکوں؟ وہ مر جائے گی۔ میرا دل ابھی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔“

ہوشن نے کہا۔ ”آپ صبر کریں۔ وہ باپ بیٹے نادان نہیں ہیں۔ وہ پوری دنیا کے سامنے الزام اٹھانے کے لیے نیلماں کی ہلاکت کا سامان نہیں کریں گے۔ عابی کچھ سوچ سمجھ کر ہی ڈنکے کی چوٹ پر اسے شریک حیات بنا رہا ہے۔“

بارودا کو صبر اور انتظار کرنا ہی تھا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے ایسے وقت طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل کیا۔ ایک اندھے شخص کو کسی چار دیواری میں آرام سے بٹھا دیا گیا۔ وہ ناچینا نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں لایا گیا ہے۔ بارودا کو فون پر اس کی آواز سنا کر اس کے دماغ میں پہنچایا گیا تھا۔

اس نے کہا۔ ”ہم نے طے کیا تھا کہ چار گھنٹے بعد ہماری یہ میٹنگ ہوگی لیکن بدلتے ہوئے حالات نے ہم ٹیلی فنی جاننے والوں کو کئی معاملات میں الجھا دیا ہے۔ پہلے تو میری بیٹی کے مسئلے پر یوں۔ کیا کسی طرح ان کی نکاح خوانی کو روکا جاسکتا ہے؟ کیا میری بیٹی کو ان مسلمانوں کے چنگل سے نکال کر لایا جاسکتا ہے؟“

ہوشن نے کہا۔ ”اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے لیکن یہ ناممکن اس لیے ہے کہ وہ پوری ٹیلی اپنی ریاست میں اور اپنے محل میں ہے..... اور یہ اب تک کا تجربہ ہے کہ..... تمہارا کوئی ٹیلی فنی جاننے والا شیطان کا کوئی پجاری وہاں قدم رکھتے ہی بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جنگ لڑنے کے لیے میدان میں آنا پڑتا ہے۔ کیا تم ٹیلی فنی جاننے والوں میں سے کوئی وہاں جانا چاہے گا؟ اگر کوئی حوصلہ کرے گا تو ہم ابھی اس ریاست کی روحانی سکیورٹی کی سلامتی کے لیے چیخ بن جائیں گے۔ ایسے ہنگامے برپا کریں گے کہ شادی خانہ آبادی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ وہ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ عابی تمہاری بیٹی کو سہاگ کی قربان گاہ تک نہیں لے جاسکے گا۔“

آنجوس لارا اور کاہن بارودا کی رہائش گاہ میں بیٹھے خیال خوانی کے ذریعے اندھے آلہ کار کے اندر پہنچے ہوئے تھے۔ اس اندھے کے اطراف بیٹھے ہوئے کریگ ہوشن اور دوسرے چھ یہودی اکابرین سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ تمام یہودی یوگا کے ماہر تھے۔ پرانی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک لیتے تھے۔ اس لیے کوئی ٹیلی

فنی جاننے والا ان کے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ ہوشن نے کہا۔ ”میرے بھی نصیب اچھے تھے۔ میں بیچ کر آگئی۔ دوسری بار ادھر کا رخ نہیں کروں گی۔ دراصل مراد اور عابی ہماری غیر معمولی صلاحیتوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔ انہیں صرف روحانی قوتیں بھاری ہیں۔ روحانی قوتوں نے اس ریاست کو ہمارے لیے منموہ بنا دیا ہے۔ ہم وہاں جانے کی غلطی نہیں کریں گے۔“

بارودا نے کہا۔ ”کوئی وہاں جانے کا حوصلہ نہیں کرے گا۔ دشمنوں سے نشے کا کوئی راستہ نہیں کھلے گا۔ مسٹر ہوشن! تم نے کہا تھا ہمیں اپنی ٹیلی فنی کے ہتھیار کو استعمال کرنے کا صحیح راستہ بتاؤ گے لیکن تمہاری عقل بھی کام نہیں کر رہی ہے جبکہ ایسے ہی چیخ کے وقت کسی زبردست تدبیر کو ذہن میں آنا چاہیے۔ موجودہ حالات میں تم تمام یہودی بھی ہماری طرح مجبور اور بے بس ہو گئے ہو۔ ہم سے سمجھو اور اتحاد کرنے کے پہلے ہی دن ناکام ہو رہے ہو۔ ہمیں ابتدا میں ہی مایوس کر رہے ہو۔“

ہوشن نے کہا۔ ”تم مایوس ہو رہے ہو۔ ہم مایوس اور کمزور ہونا نہیں جانتے۔ دشمنوں کی کسی نہ کسی کمزوری پر نظر رکھتے ہیں۔ بے شک ہم نے کہا تھا کہ ریاست میں جا کر بھی ان سے جیت نہیں سکو گے۔ وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکو گے لیکن ہم انہیں ریاست سے باہر آنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ آج ہونے والی شادی کو روک سکتے ہیں۔“

بارودا نے تڑپ کر پوچھا۔ ”کیسے روک سکتے ہیں؟ کیا کچ کہہ رہے ہو؟ جلدی بتاؤ۔“

کاہن نے پوچھا۔ ”واقعی..... ایسا کیا کرو گے کہ شادی رک جائے گی؟“

ہوشن نے کہا۔ ”اے کاہن! ہم تمہاری طرح شیطانی منتر نہیں جانتے ہیں مگر ہمارے دماغ میں جادو بھرا ہے۔ ہم شطرنج کے کھلاڑی ہیں اور دشمن کے ایک ایک مہرے پر نظر رکھتے ہیں۔ مراد کا ایک اہم مہرہ اس کا ایک بیٹا شہزاد علی مغل لندن میں کہیں ہے۔ اس پر اچانک ٹیلی فنی کے حملے کرو گے اسے موت کی دلیلیز پر پہنچا دو گے تو مراد اور عابی جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ شادی خانہ آبادی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔“

وہ تمام ٹیلی فنی جاننے والے خوشی سے اچھل



پڑے۔ بارودا نے کہا۔ ”دشمنوں کی اتنی بڑی کمزوری جانتے ہو۔ اب تک کیوں نہیں بول رہے تھے؟ مراد ایک بیٹے کی شادی کے لیے دوسرے بیٹے کی موت نہیں چاہے گا۔ پرنس عابد علی منگی بھی بھائی کو بچانے کے لیے نکاح خوانی بھول جائے گا۔ ریاست سے باہر نکل آئے گا۔ اور ہم کیا چاہتے ہیں؟ وہ باپ بیٹے ریاست میں نہ رہیں اور شادی تو آج رکے گی ہی۔ ابھی رکے گی۔ ہمیں ابھی شہزاد علی منگی کی کھوپڑی میں پہنچ کر اسے اپنا غلام بنانا چاہیے۔“

ہوشن نے کہا۔ ”شہزاد کے متعلق چند اہم پوائنٹس ذہن میں رکھو۔ وہ ایک فولادی باپ کا بیٹا ہے۔ یقیناً یوگا کا ماہر ہوگا اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ وہاں اس کے نام سے دولت اور جائداد ہوگی۔ تم سب خیال خوانی کے ذریعے وہاں کے سرکاری اداروں میں جاؤ گے۔ اعلیٰ عہدیداروں کے دماغوں سے معلوم کرو کہ لندن میں اس کی جائداد کہاں ہے؟ یوں معلوم ہوگا کہ وہ وہیں رہتا ہوگا اور... وہاں کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ آسانی سے اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہو جائے گا۔“

وہاں بیٹھے ہوئے یہودی اپنے وسیع ذرائع سے لندن کے سرکاری اداروں میں پہنچ گئے۔ وہاں تینوں ٹیلی پیٹھی جاننے والوں کو پہنچا دیا۔ عالی اور نیلماں کی نکاح خوانی کے لیے دو گھنٹے رہ گئے تھے۔ وہ شہزاد کو گرفت میں لیتے ہی چیلنج کرنے والے تھے کہ نکاح خوانی نہ روکی گئی تو مراد کو ایک بیٹے کی میت اٹھانی ہوگی۔

انہیں ایک گھنٹے کے اندر معلوم ہو گیا کہ لندن کی رچرڈسن اسٹریٹ میں شہزاد علی منگی کا شاہانہ طرز کا بنگلا ہے۔ بارودا، لارا اور آبنوس یہودیوں کی مدد سے خطرناک شوٹروں کو اپنا آلہ کار بنا کر اس بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ایک نے کال بیل کے بٹن کو دبایا۔

وہ منزل تک پہنچ گئے تھے۔ ان کا شکار دو چار ہاتھ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ ایک نے کہا۔ ”ہم شہزاد علی منگی سے ملنے اور اس کے باپ کا ضروری پیغام دینے آئے ہیں۔“

”باپ کا پیغام؟“ ملازمہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کس باپ کا پیغام.....؟ وہ تو ابھی اپنے باپ کے پاس ہے پھر پیغام کس باپ کا لائے ہو؟“

بارودا نے اپنے آلہ کار کے ذریعے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ کیا وہ اپنے باپ کے پاس ہے؟“

”ہاں، وہ اپنے بھائی عابد علی منگی کی شادی میں

شریک ہونے کے لیے آئے۔ لوگ کون آہو؟“ وہ تینوں ٹیلی پیٹھی جاننے والے اور یہودی اکابرین جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ جسے پچانے آئے تھے، وہ بھی اسی ریاست میں پہنچا ہوا تھا جہاں وہ قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ مراد اور عالی کی بہت بڑی کمزوری سے کھیلنے میں کامیاب ہونے ہی والے تھے۔ کامیابی کے دروازے تک پہنچ گئے تھے لیکن...

بہت بڑی اور زبردست پلاننگ کرنے والوں کے دماغوں میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی خوشیوں میں شریک ہونے گیا ہوگا۔ ویسے عارضی طور پر ناکامی ہوئی تھی۔ شہزاد ہمیشہ اس ریاست میں رہنے والا نہیں تھا۔ وہ شادی کے بعد لندن واپس آنے والا تھا۔ تب وہ اپنا کھیل شروع کر سکتے تھے۔

☆☆☆

اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟ جو نہ سوچو وہ ہو جاتا ہے۔ کسی نے بھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ ازدواجی مسرتوں کے دوران دلہن ہلاک ہو جاتی ہے۔ ایسی ناقابل یقین واردات پہلے بھی ہو چکی تھی۔ اب دوسری ہونے جاری تھی۔

سترنی صدر مرد حضرات کہہ رہے تھے۔ آگ کا کام ہے جلانا، خنجر کا کام ہے پیوست ہو کر جان نکال لینا۔ پرنس عالی اپنی شہ زوری سے مجبور ہے۔ شاید خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے بھی ناکام ہو جائیں گے۔

باقی تیس فی صد خاموش تھے۔ بار بار ٹی وی کے سامنے آکر... خبریں سن رہے تھے۔ یہ بتایا گیا تھا کہ عالی اور نیلماں کا نکاح پڑھایا گیا ہے۔ وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے ہیں۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ ادھر رات جذبوں میں بھیگ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ آدمی گزر گئی تھی اور آدمی بھی گزرتی جا رہی تھی۔ بے شمار حسیناؤں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ اس خیال سے ٹی وی کے سامنے جاگ رہی تھیں کہ کسی وقت بھی اچانک کوئی چوٹکا دینے والی خبر نشر ہو سکتی تھی۔

کئی طرح کے سوالات ابھر رہے تھے اور جوابات بھی از خود سمجھ میں آرہے تھے۔

آخر سپر پاور کے ایک اعلیٰ حاکم نے فون پر عالی کو کامیاب ازدواجی زندگی کی مبارک باد دی تو اس نے جواباً شکر یہ ادا کیا۔ اس طرح یہ معلوم ہو گیا کہ دلہن زندہ سلامت ہے۔ یہ خبر انجمنل جمیل کے ذریعے دور تک پھیل گئی۔ یہ توقع



نہیں تھی کہ نیلماں خیر ہے۔ وہ کیسے ہو گیا؟ وہ کیسے بچ گیا؟ اس سوال کا جواب سب ہی چاہتے تھے، کیا نیلماں آئندہ بھی اس کے ساتھ راضی خوشی ازدواجی تعلقات رکھنے والی ہے؟

ایسے سوال کا جواب میاں بیوی کسی کو نہیں دے سکتے تھے۔

ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی۔ سمجھنے کی ہوتی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے کچھ محفوظ طریقے ہیں اور جہاں تک نیلماں کا تعلق تھا۔ وہ ٹرانسپیرنٹ ہو جاتی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ پیدا ہو۔ کوئی بھی فتنہ برپا ہو تو ابتدا میں بڑا شور ہوتا ہے۔ بڑی ہلچل پیدا ہوتی ہے پھر وہ مسئلہ کسی طرح حل ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ تب بھی وہ رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

نیلماں اور عالی کی شادی خانہ آبادی آگے چل کر شادی ہی رہی، بربادی نظر نہیں آئی تو پہلے جیسا تجسس اور معلومات حاصل کرنے کی بے چینی نہ رہی۔ سب اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔

یہ سب ہی تسلیم کر رہے تھے کہ مراد کی فیملی کئی دنیاوی معاملات میں ناقابلِ تسخیر ہے۔ مراد برسوں سے اپنی طاقت کا لوہا منواتا آ رہا تھا۔ عالی نے آتے ہی دن میں آرمی بن کر یعنی اپنی ذات میں تنہا ایک فوج بن کر کئی ممالک کی افواج کے چکے چھڑا دیے تھے۔ دونوں باپ بیٹے ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار کے ساتھ آنے والی شیطانی قوتوں کو مات دے رہے تھے۔ وہ صومِ مملوۃ کے پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں انعام دے رہا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انہیں حضرت صلاح الدین اجمیری کی نادیہ سرپرستی حاصل ہے۔

عالی روحانی صلاحیتوں کے باعث مجبورہ کہلا رہا تھا۔ ماروی کی پیدائش سے پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بھی روحانی صلاحیتوں کی حامل ہوگی اور اب سونے پر سہاگما یہ کہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل نیلماں اس خاندان میں آگئی تھی۔

اس کے باوجود طاغوتی محاذ کمزور نہیں تھا۔ بارودا، لارا، آبنوس اور کاہن غیر معمولی قوتوں کے حامل تھے۔ پراسرار قوتیں رکھنے والے شیطان کے پجاری اور بھی تھے۔ وہ بھی دین کے خلاف جنگ جاری رکھنے والے تھے پھر یہ کہ سیاسی مکاریوں کے حامل یہودی ان کے اتحادی تھے۔ وہ انہیں عداوت کے نت نئے راستے دکھا رہے تھے۔

اب مراد کو بھی دکھایا تھا کہ انہیں مراد کے بیٹے شہزاد علی منگی کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔ اب انتظار تھا کہ شہزاد ریاست سے واپس آئے گا تو اسے لندن میں جکڑ لیا جائے گا۔ اسے شکنجے میں رکھ کر مراد اور عالی کو بڑی آسانی سے کمزور بنایا جائے گا۔

وہ ٹیلی پیٹھی جاننے والے شہزاد کی بوڑھی ملازمہ کے دماغ میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ اس کے خیالات پڑھتے رہتے تھے۔ تقریباً پچیس دنوں تک انتظار کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ شہزاد دوسرے دن کی فلائٹ سے لندن اپنی رہائش گاہ میں آ رہا ہے۔

کریک ہوسٹن نے بارودا سے کہا تھا کہ فی الحال بوڑھی ملازمہ کے اندر رہیں۔ شہزاد کے دماغ میں نہ جائیں۔ وہ باپ اور بھائی کی طرح دماغی توانائی رکھتا ہوگا۔ ان کی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک کر انہیں بھگادے گا پھر یہ بھید کھل جائے گا کہ دشمن شہزاد تک پہنچ رہے ہیں۔ تب اس کی سلامتی کے لیے وہ اسے ریاست سے باہر جانے نہیں دیں گے۔ اسے اپنی پناہ میں سخت نگرانی میں رکھیں گے۔

ہوسٹن نے کہا۔ ”اگر مجھ سے اتحاد نہ ہوتا، میں یہ مشورہ نہ دیتا تو تم سب ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار کو پھر ذہانت سے استعمال نہ کرتے اور پھر ناکام ہوتے۔“

وہ ان خیال خوانی کرنے والوں کو سمجھانے لگا کہ شہزاد کو کس طرح ٹریپ کیا جائے گا؟ اس نے کہا۔ ”وہ لندن آئے گا تو پہلے تمہارے تین آلہ کار اس سے ملاقات کرنے کے لیے اس کی رہائش گاہ میں جائیں گے۔ جب وہ شہزاد کے روبرو پہنچ جائیں گے، تب تم تینوں اس کے دماغ میں جاؤ گے۔“

”ایسے وقت وہ تمہیں اپنے اندر آنے سے روکے گا تو تمہارے تینوں آلہ کار اسے گن پوائنٹ پر رکھیں گے۔ اسے زخمی کریں گے۔ یہی کامیاب طریقہ ہوگا۔ وہ زخمی ہو کر کمزوری کے باعث سانس نہیں روک سکے گا۔ تم لوگوں کو بھگانیں سکے گا۔ مراد کے ایک بیٹے کے دماغ پر تمہارا قبضہ ہو جائے گا۔“

بارودا نے کہا۔ ”واقعی یہ ہوتی ہے چالاکی اور چال بازی۔ ہم تم سے بہت کچھ سیکھتے رہیں گے۔“

مراد نادان نہیں تھا۔ بارہ برس پہلے اس نے اور محبوب علی چانڈیو نے لندن میں شہزاد کی تعلیم اور رہائش کے انتظامات کرتے وقت احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ وہ



”ہم نے بھی اس کے قد و قامت کے متعلق معلوم نہیں کیا ہے۔“ تعجب ہے۔ جسٹ اے منٹ۔ ہم ابھی اس کے تعلیمی ادارے سے معلوم کریں گے۔“

بارودا اپنے آلہ کار کے دماغ میں واپس آیا۔ وہاں لارا نے کہا۔ ”تم شہزاد ہو تو ہمیں دماغ میں آنے دو۔ ہم تمہاری اصلیت معلوم کر لیں گے۔ ورنہ ایک گولی چلے گی پھر تم زخمی ہو کر اپنے دماغ کے دروازے بند نہیں کر سکو گے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی آلہ کاروں کی چیخیں سنائی دیں۔ ان تینوں کے ہاتھوں سے ہتھیار نکل گئے۔ ان میں سے کوئی بیٹھ گیا، کوئی لمبا لیٹ گیا۔ اس نے پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”ہاں تو بولو اب کیا ہوگا؟ ان تینوں کو پولیس والے لے جائیں گے۔“

وہ ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے کیسے لے جاؤ گے؟ اپنی ہسٹری، اپنا کچھ جغرافیہ بتاؤ۔ کون ہو؟ کیا وہی بابا جانی کے ٹیلی پیٹھی جاننے والے دشمن ہو؟ اگر ہو تو وہاں آرام سے موت آ جاتی۔ اتنی دیر کیوں مرنے آئے ہو؟“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہاں کوئی آلہ کار کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ وہ ان کے دماغوں سے چلے گئے تھے۔ کبڈی نے فون کے ذریعے پولیس کو واردات کی اطلاع دی پھر لاؤنچ میں آ گیا۔ وہاں شہزاد ہاتھ میں گن لیے بیٹھا تھا۔ اس نے گن کو صوفے پر پھینکتے ہوئے پوچھا۔ ”ہنگل! یہ وہی شیطان کے بھاری ہیں؟“

وہ فون پر نمبر شیخ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بیٹے! انہوں نے یہاں کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ ہمیں اب ہر لمحہ محتاط رہنا ہوگا۔“

اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ ”ہاں مراد! ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ہم سے پہلے مسمیتیں پہنچی ہوئی تھیں۔ شیطان کے ہاتھ بڑے بے ہوتے ہیں۔ وہ ٹیلی پیٹھی جاننے والے اب شہزاد کے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”یہ بہت برا ہوا۔ ایک نیا محاذ کھل گیا۔ میں نے اسی لیے تمہیں وہاں شہزاد کا سر پرست اور نگران بنایا تھا۔ اب وہ تمام خبیث شہزاد کو میری کمزوری بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔“

”یہ چیخ تو ہمارے سامنے آنا ہی تھا۔ پریشانی یہ ہے کہ شہزاد امن و سکون سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا۔ آج

جانتے تھے کہ آج نہیں تو کل دشمن کبھی نہ کبھی شہزاد کو بھی ٹارگٹ بنائیں گے اور ایک باپ کی کمزوریوں سے پھیلیں گے۔ اب وہ اٹھارہ برس کا تھا۔ تاحال کسی دشمن نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ سلامتی اور اطمینان سے وہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

مراد بھی مطمئن تھا لیکن اب ٹیلی پیٹھی جاننے والے نئے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ دشمن کبھی شہزاد کے لیے مصیبت نہیں گے تو پھر جیسے بھی حالات پیدا ہوں گے ان سے تو نمٹنا ہی ہوگا۔

یہودیوں نے ادھر کا راستہ کھول دیا تھا۔ شہزاد دوسرے دن لندن آ گیا۔ بارودا بوڑھی ملازمہ کے اندر تھا۔ لارا اور آنکس اپنے تین آلہ کاروں کے دماغوں میں تھے۔ جب ملازمہ نے دروازہ کھول کر شہزاد کا استقبال کیا تو وہ تینوں آلہ کار اطمینان سے چلتے ہوئے وہاں آئے۔

شہزاد اندر چلا گیا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ نے دروازے کو کھولا تو وہ تینوں اسے دھکا دیتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ فرش پر گر کر تکلیف سے چلانے لگی۔

”یہ کیا زبردستی ہے..... کون ہو تم لوگ؟“ وہ گن نکال کر دندناتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے پھر اس بنگلے کے مختلف حصوں میں جا کر اسے تلاش کرنے لگے۔ بارودا ملازمہ کے دماغ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شہزاد کہاں ہے۔ وہ تکلیف سے گراہ رہی تھی اور فرش پر پڑی تھی یہ نہیں جانتی تھی کہ شہزاد کہاں ہے؟ اسے تلاش کرنے والے ناکام ہو کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ ایسے ہی وقت کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی۔ ان میں سے ایک کے منہ پر شوکر لگی۔ وہ پیچھے جا کر فرش پر گر پڑا۔

انہوں نے دیکھا وہ ایک بونا تھا۔ فضا میں قلابازیاں کھا کر ایک کوشوکر مارتا ہوا سینئر نیبل پر پہنچ کر دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ”ہاں تو کیا تکلیف ہے؟ میں ہوں شہزاد علی منگلی!“

وہ ٹیلی پیٹھی جاننے والے ایک بونے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بارودا نے فوراً ہی کریگ ہوشن سے پوچھا۔ ”کیا مراد کا بیٹا شہزاد بونا ہے؟“

”بونا.....؟“ ہوشن بھی حیران ہوا پھر بولا۔ ”اسے بونا تو نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم نے اپنے آلہ کار کے ذریعے ابھی اسے دیکھا ہے؟“

”ہاں لارا اور آنکس بھی دیکھ رہے ہیں۔ وہ بونا خود کو



مارسل کے۔ شہزاد بھی ہمارے گھنے میں ہوتا تو مراد پھڑ پھڑاتا رہتا۔ ہمارے آگے گھنے ٹکنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوتا۔“

ایک یہودی نے کہا۔ ”سہانے خواب دیکھنے کے میے نہیں لگتے۔ کسی وقت بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ دیکھو کہ خواب کی تعبیر نے تمہیں صرف مایوس نہیں کیا ہے۔ یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ پہلے سے محتاط تھے۔ آئندہ اور زیادہ محتاط اور مستعد رہیں گے۔“

دوسرے یہودی نے کہا۔ ”ہم ابھی جان نہیں سکیں گے کہ وہ شہزاد کی سکیورٹی کے لیے کیسی حکمت عملی اختیار کریں گے؟“

”جیسی بھی کریں، انہیں کچھ وقت تو لگے گا۔ ہم ابھی دوسرے آلہ کار بنا کر وہاں جاسکتے ہیں۔ اس بار وہاں پہنچنے ہی شہزاد کو گولی مار کر زخمی.....“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ ایک یہودی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

بارودا نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ہم وہاں کس پر گولی چلا دیں گے؟ وہاں تو صرف بونا تھا۔ کوئی اور بھی تھا جس نے چھپ کر ہمارے تین آلہ کاروں کو زخمی کیا تھا۔ ہم نے اس کی آواز بھی نہیں سنی ہے۔“

”بوزمی ملازمہ کے دماغ میں رہو۔ شہزاد نظر آجائے گا۔“ آبنوس نے کہا۔ ”تم یہاں پلاننگ کرو، میں وہاں جاتا ہوں۔“

وہ خیال خوانی کے ذریعے وہاں گیا پھر ایک منٹ میں واپس آکر بولا۔ ”انہوں نے ملازمہ کی چھٹی کر دی ہے۔ وہ اس جگہ میں نہیں ہے اور کوئی ایسا نہیں ہے جس کے اندر رہ کر شہزاد پر نظر رکھی جاسکے۔“

ہوشن نے کہا۔ ”فی الحال اپنے نئے آلہ کاروں کو جگہ کے باہر نگرانی کے لیے رکھو۔ شہزاد ضرور تباہ کر جائے گا تو اسے ٹریپ کیا جاسکے گا۔“

ہوشن نے لندن کے چار پیشہ ور سراغ رسالوں سے رابطہ کیا۔ وہاں کی یہودی تنظیم نے ان چار سراغ رسالوں اور شوٹر ز کو فوری سمٹ کی۔ وہ شہزاد کی نگرانی کے لیے اس جگہ کے باہر دور تک ٹھہرنے لگے۔

مراد اپنے بیٹے سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”فیلمیں! وہ لوگ ناکام ہو کر گئے ہیں۔ ان کا رد عمل معلوم کرو۔ اب وہ کیا کرنے والے ہیں؟“

وہ اسی وقت تاریک دنیا میں پہنچ گئی۔ کاہن کی

اس نے پہلی بار بندوق اٹھائی ہے۔ کیا مصیبت ہے۔ آج اس کے لباس میں بھی ہتھیار رہا کرے گا۔“

وہ عبد اللہ کبڈی سے فون لے کر بولا۔ ”بابا جانی! بیٹے کو وراثت میں وہی ملے گا جو باپ کے پاس ہے اور آپ کے پاس دشمنوں کی نہ ختم ہونے والی فوج ہے۔ ہتھیار ہیں سازشیں ہیں مکاریاں ہیں قدم قدم پر موت کی دھمکیاں ہیں اور نت نئے چیلنجز ہیں۔ یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ آپ نے جرائم کی دنیا میں جو شہرت حاصل کی ہے، وہ آج تک کوئی حاصل نہ کر سکا۔ عالی آپ کے نام کو چار چاند لگا رہا ہے۔ انشاء اللہ میں تعلیم اور ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں آپ کا نام روشن کروں گا۔“

”خوش رہو بیٹے! میری اور عالی کی کوشش ہوگی کہ تمہیں ہتھیاروں سے زیادہ نہ کھیلنا پڑے۔ تمہارے ہاتھوں میں قلم اور اوزار رہا کریں۔ ابھی جو ہوا اسے نظر انداز کرو اور تعلیم کی طرف دھیان دو۔“

مراد نے رابطہ ختم کیا پھر سر جھکا کر پریشانی سے سوچنے لگا۔ دشمن شہزاد کو چھیڑ کر بہت بڑا چیلنج بن گئے تھے۔ اب وہ ریاست سے باہر نکلنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اندھا آلہ کار ایک صوفے پر آرام سے بیٹھا اپنی پسند کی ڈشیں کھانے میں مصروف تھا۔ اسے ایک جگہ بیٹھ کر بولتے رہنے کے ہزاروں ڈالر ملتے رہتے تھے۔ اس اندھے کی زندگی سنور گئی تھی۔ وہ جو کمال تھا، اب اپنی بیوی بچوں کے ساتھ عیش و آرام سے رہنے لگا تھا۔

اس وقت کریگ ہوشن اور چھ یہودی اکابرین اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ بارودا لارا اور آبنوس اس کے دماغ میں آگئے تھے۔ وہ سب بری طرح جھنجھلا رہے تھے۔ شہزاد کو تر توالہ سمجھا تھا کہ جاتے ہی اسے نکل جائیں گے اور وہ محاورہ ہی نہیں، سچ سچ لوہے کا چننا ثابت ہوا تھا۔

کریگ ہوشن نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“ لارا نے کہا۔ ”ہمارے تینوں آلہ کار گولیاں کھا کر زخمی ہو گئے ہیں۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ شہزاد بے خبر ہوگا لیکن وہ باپ اور بھائی کی طرح صرف فائبر ہی نہیں ہے، جمناسٹک کے کرتب بھی دکھاتا ہے لیکن تعجب ہے، وہ بونا ہے۔“

ہوشن نے کہا۔ ”میں نے شہزاد کے تعلیمی ادارے سے معلوم کیا ہے، وہ بونا نہیں ہے۔ باپ اور بھائی کی طرح قد آور ہے۔ کسی بونے کو اس کا ہاڈی گارڈ بنا کر رکھا گیا ہے۔“

بارودا نے کہا۔ ”ہمیں یقین تھا کہ یہ خالی میدان ہم



رہائش گاہ میں بارود ڈالا اور آگ لگنے لگی۔ ان کی باتیں سن کر نیلماں کو معلوم ہوا کہ وہ تینوں کی آلہ کار کے دماغ میں ہیں اور وہاں کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ بارود دانے گفتگو کے دوران کسی کو مسٹر ہوشن کہا تھا اور کسی یہودی تنظیم کے سراغ رسالوں اور شوٹرز کا ذکر ہوا تھا۔ وہ مراد اور عابی کے پاس آکر بولی۔ ”وہ بھائی جان (شہزاد) کے بچکے کے باہر سراغ رسالوں کی ڈیوٹی لگا رہے ہیں۔“

عابی نے پوچھا۔ ”کیا ان ٹیلی فنی جتنی جاننے والوں کے ذرائع لندن تک ہیں؟“

”نہیں، وہ کسی آلہ کار کے دماغ میں رہ کر یہودیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ پاپا نے کسی کو مسٹر ہوشن کہا تھا۔“

عابی نے کہا۔ ”یا خدا..... وہ مجھے یہودیت کی گود میں بٹھانے والا ناکام ہو کر انتقاماً ٹیلی فنی جاننے والوں کے لیے سہولتیں پیدا کر رہا ہے۔“

مراد نے اسی وقت فون کے ذریعے عبداللہ کبڈی سے رابطہ کیا پھر اسے بتایا کہ بچکے کے باہر دشمن کے جاسوس ہیں اور شاید ان کی تعداد چار ہے۔

عبداللہ نے کہا۔ ”ڈونٹ وری میں ان سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تمہیں جلد ہی کال کروں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”یار، شہزاد کے لیے میرا دل بہت کمزور ہے۔ اسے ان معاملات سے دور رکھنا۔“

”اے مراد! کیا ہوا ہے تجھے؟ تیرے منہ سے پہلی بار کمزور بات سن رہا ہوں۔ دشمن نہیں گے تو نہال ہو جائیں گے۔“

”یار.....! حیرتی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں نمایاں مقام حاصل کرے اور ایک پُر امن سماجی، معاشرتی زندگی گزارے لیکن ایسی زندگی گزارنے والوں کو بھی موت آتی ہے اور ان پر بھی جبرِ الائی جاتی ہے۔ اب تو شہزاد سے بھی دشمنوں کی ٹھن مٹی ہے۔ کہیں سے کوئی اندھی گولی آکر اسے لگے تو تو کیا کرے گا؟ کیا ایک کمزور باپ کی طرح اپنا سر پھوڑے گا؟“

مراد نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”یار معاف کر دے۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ حالات ایسے ہیں کہ شہزاد کو بھی اپنی سلامتی کے لیے گن پکڑنی ہوگی۔“

”اچھا فون بند کرتا ہوں، ذرا دیکھوں تو باہر کیا ہو رہا ہے؟“

وہ رابطہ ختم کر کے بچکے کے میسر پر آیا۔ وہاں سے

چھپ کر لڑکھٹے لگا۔ بچکے کے پاس ایک کمرانی کرنے والے ادھر چھپ کر نہیں رہ سکتے تھے۔ سامنے ایک سڑک تھی اور کھلے میدان میں ایک اسٹینٹ اور لائبریری کی عمارت تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ دور تک نظریں دوڑاتا رہا پھر ایک گاڑی دکھائی دی۔ وہ اسٹینٹ کے پارکنگ ایریا میں جا کر رک گئی تھی۔ دو افراد اس کے اگلے دروازے کو کھول کر باہر نکلے اور کبڈی کی نظروں میں آگئے۔ اپنی گاڑی سے نکلے وقت ان کی نظریں شہزاد کے بچکے کی طرف تھیں۔ دیکھنے کا انداز کہہ رہا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کے پاس رہا جبکہ دوسرا بچکے کے انداز میں چلتا ہوا بچکے کے پیچھے جانے لگا۔

کبڈی بھی میسر کے بچکے کے لیے کی طرف آگیا۔ وہ شخص وہاں پہنچ کر کسی سے فون پر بولنے لگا۔ بولتے وقت اس کی نظریں بچکے پر تھیں۔ کبڈی کو یقین ہو گیا کہ وہ کرائے کا شوٹر ہے۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ اس سے اندازے کی غلطی ہو سکتی ہے۔ یونہی کسی کی زندگی سے نہیں کھیلتا چاہیے۔ پہلے اور یقین ہو جائے، اسے ایکشن میں آنے پر مجبور کیا جائے۔

اس نے نشانہ لیا پھر ٹریگر کو دبایا۔ بے آواز گولی اس کے بازو کو چھلیتی ہوئی گزری تو وہ بوکھلا گیا۔ ایک دیوار کی آڑ میں جاتے ہوئے اپنی گن نکالنے لگا۔ وہ بھی بڑا پھرتلا تھا۔ اس نے پلٹ کر میسر کی طرف دوبارہ قاتل کی تو یقین ہو گیا۔ تب کبڈی نے دوسری گولی صحیح نشانے پر داغ دی۔ وہ اچھل کر گر پڑا اور وہیں پڑ پڑا کر رہ گیا۔

آہٹ اس کے دماغ میں تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”بارودا! میرا آلہ کار مارا گیا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ ابھی تو وہاں پہنچا تھا۔“

بارودا نے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لوگ کتنے فاسٹ ہیں؟ کیسے فوراً ہی اپنے دشمنوں کو تباہ لیتے ہیں؟“

پھر وہ تینوں اپنے آلہ کاروں کے دماغوں میں پہنچ کر بولنے لگے۔ ”تمہارا ایک ساتھی مارا گیا ہے۔ تم لوگ نظروں میں آگئے ہو۔ چھپ کر وہاں ٹکرانی نہیں کر سکو گے۔ ابھی جاؤ وہاں سے۔“

کبڈی میسر پر تھا۔ اس نے بچکے کے سامنے دیکھا۔ وہ گاڑی پارکنگ ایریا سے نکل کر واپس جارہی تھی۔ اس نے فون پر مراد سے کہا۔ ”میں نے ایک کو مار گرایا ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی یہاں سے بھاگ گیا ہے۔ باقی میری نظروں



ایک وسیع و عریض معبد میں شیطان کا ایک قد آور مجسمہ تھا۔ وہاں مرد عورتیں بچے اور بوڑھے پوجا پاٹ کے لیے اور ناچنے گانے کے لیے آتے رہتے تھے۔

اس رات شیطان کے قدموں میں سالانہ جشن منایا جا رہا تھا۔ حسین عورتیں اور خوب مرد اپنی سالانہ کارکردگی کی روداد شیطان کے سامنے سنایا کرتے تھے۔ روداد یہ ہوتی تھی کہ وہ بیرونی دنیا میں کس طرح شیطانی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں۔ کس طرح لوگوں کو گناہوں کی نئی نئی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں سحرزدہ کر دیتے ہیں۔ ایسے سحرزدہ ہو جانے والے بظاہر مذہبی رہ جاتے ہیں لیکن درپردہ بے لگام گناہ آلود زندگی گزارتے ہیں۔

کاہن نے کہا۔ ”تم میں سے جو ٹیلی پتھی اور دوسرے خطرناک علوم جانتا ہے، وہ میرے سامنے آجائے۔“

ٹیلی پتھی شیطانی علم نہیں ہے لیکن یہ علم شیطان صفت لوگوں کو حاصل ہو رہا تھا۔ دو ٹیلی پتھی جاننے والے کاہن کے سامنے آ گئے۔ اس نے ایک سے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”میرا نام امی مالا ہے۔ میں خیال خوانی کے ذریعے کسی کو بھی ٹریپ کر لیتی ہوں۔“

”کیسے کر لیتی ہے؟ تیری عمر کچھ زیادہ لگ رہی ہے۔ چہرے پر بڑھاپے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ہاں مگر میں بوڑھی نہیں رہتی۔ شیطان معظّم کی جے ہو۔۔۔۔۔ میں جب چاہتی ہوں سولہ برس کی کنواری کنیا بن جاتی ہوں۔ جس پر دل آتا ہے اسے سولہ برس کے سبز باغ میں لے آتی ہوں۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہوں۔“

کاہن نے کہا۔ ”اب تم ہمارے لیے کام کرو گی۔ ایک باپ ہے اور دو بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹا لندن میں ہے۔ تم اسے ٹریپ کرو گی۔ کیا ان کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“

”مراد علی منگی اور پرنس عالی ہمارے شیطان کی طرح مشہور ہیں۔ انہیں کون نہیں جانتا؟ میں نے دو روز پہلے شہزاد علی منگی کو لندن انٹرپورٹ پر دیکھا تھا۔ وہ اپنی ریاست سے واپس آیا تھا۔ میرا دل اس پر آ گیا میں اس کے ذہن کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اس کے دماغ میں پہنچی تو وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔ اس کا دماغ قدرتی طور پر حساس ہے۔ وہ میری سوچ کی لہروں کے باعث پریشان ہو گیا۔“

اس نے کہا۔ ”ابھی نیلماں نے آکر بتایا ہے کہ وہ سب وہاں سے جا چکے ہیں۔ عارضی طور پر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ شاہاش کبڈی! تم نے میدان خالی کر دیا۔ سوچتا ہوں تم آدھے ہو۔ پورے ہوتے تو پتا نہیں کیسی قیامتیں برپا کرتے۔“

کبڈی نے ہنستے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

لارا کے مقاصد یہ تھے کہ وہ مراد کی زوجہ بن کر بڑی رازداری سے، بڑے اعتماد سے اس کے دین میں شگاف ڈالے گی۔ اس کے دینی طور طریقوں میں رفتہ رفتہ بے ترتیبی اور کمزوری پیدا کرے گی۔ اسے بھی شبہ نہیں ہونے دے گی کہ وہ کافروں سے بھی بدتر شیطان کی پجاری ہے۔

اس کا اہم مقصد یہ تھا کہ مراد کے بچے پیدا کرے گی اور ان کی اس طرح پرورش کرے گی کہ وہ جوان ہوتے ہوتے باپ کے سر پر شیطانی رقص کرنے لگیں گے۔ ان کے درمیان مذہبی تضاد پیدا ہوگا تو وہ باپ سے بغاوت کریں گے۔ مراد بھی ان کی شیطانی فطرت کو برداشت نہیں کرے گا۔ نیک نامی اور شہرت حاصل کرنے والے مراد علی منگی کا خاندانی شیرازہ بکھر جائے گا۔

منصوبے تو خوب کھل کھلا کے بنائے جاتے ہیں لیکن کوئی اپنے آنے والے کل سے آگاہ نہیں ہوتا۔ انسان سو برس کا سامان کرتا ہے اور پل کی خبر نہیں رکھتا۔ لارا کی حسرتیں دل میں ہی رہ گئیں۔ تمام تحریریں منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئیں۔

اس کی اصلیت معلوم ہونے کے بعد مراد نے سوچا تھا کہ اسے فریب اور مکاری کی سزا دے گا۔ اسے اس طرح ایاج بنا دے گا کہ کوئی اسے ایک رات کے لیے بھی قبول نہیں کرے گا۔ عورت کے لیے یہی سزا ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

وہ پہلے تو ریاستی معاملات میں مصروف تھا۔ اب دشمنوں نے شہزاد کی سلامتی کو چیلنج بنا دیا تھا۔ وہ اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ لارا کو عارضی طور پر نظر انداز کر رہا تھا پھر بھی یہ بات ذہن میں تھی کہ کبھی نہیں گھراؤ ہوگا تو اس کی گردن دیوچ لے گا۔ اسے چھوڑے گا نہیں سزا ضرور دے گا۔

ویسے ایک دن تو کھراؤ ہونا ہی تھا۔ اس کے آثار شیطان کی عبادت گاہ میں پیدا ہو گئے۔ تاریک دنیا کے



دور ہو جاتا ہے۔  
وہ حیرانی سے خوش ہو کر بولا۔ "واقعی میرا سر ہلکا پھلکا  
ساگ رہا ہے۔ کسی طرح کی بے چینی نہیں ہے۔"  
میں نے مسکرا کر کہا۔ "تو پھر میرا ہاتھ چھوڑو۔ مصافحہ  
بہت لمبا ہو گیا ہے۔"

وہ فوراً ہی ہاتھ چھوڑ کر بولا۔ "کیا ہم دوست بن  
سکتے ہیں؟"

"میں تو یہی چاہتی تھی کہ دوستی کی آفر اس کی طرف  
سے ہو اور یہی ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کا فون نمبر لیا پھر  
کسی وقت ملنے کا وعدہ کر کے بچھڑ گئے۔"

کاہن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "شاباش۔ تم  
نے پھانسنے کے معاملے میں واقعی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا  
ہے۔ اسے بہت خوب صورتی سے ٹریپ کیا ہے۔ مراد اور  
عابی تو عورتوں سے دور بھاگتے ہیں۔ تم نے اس کے اس بیٹے  
کو بھاگنے سے پہلے ہی دیو بچ لیا ہے۔"

بارودا وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "امی! تم سے  
اس کی ملاقات کے بعد ہی ہم نے اس کے بیٹے میں اسے  
ٹریپ کرنا چاہا تھا اور ناکام ہو گئے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ  
تم نے اسے پھانس لیا ہے تو ہم بھی اپنا وقت اور لاکھوں  
ڈالرز ضائع نہ کرتے، بہر حال تم نے خوش کر دیا ہے۔ آج  
ہم جشن منانے کے بعد ایسی پلاننگ کریں گے کہ وہ بھی  
تمہارے ٹکٹے سے نکل نہیں سکے گا۔ تم اسے دماغی طور پر  
کنزور بناتی رہو گی۔ اس کا دین بدل دو گی۔ ہمارے  
شیطان کا پرستار بنادو گی۔"

وہاں شیطانی پرستش کا سالانہ جشن منایا جا رہا تھا۔  
چنتی ہوئی جذباتی موسیقی کی دھن پر عورتیں مردوں کے ساتھ  
ناچ رہی تھیں۔ گارہی تھیں۔ وہاں شراب پانی کی طرح بہہ  
رہی تھی۔

دو ٹیلی فنی جاننے والوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک تو  
امی مالا تھی۔ دوسرا ایک درمیانے قد کا جوان تھا۔ کاہن نے  
اس سے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "میں شیطان معظم کی پرستش کرتا ہوں۔ اس  
کے نام سے طاغوتی کہلاتا ہوں۔ میں ٹیلی فنی کا کھلاڑی  
ہوں۔ ایسے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتا ہوں جو یوگا کے ماہر  
ہوتے ہیں۔ سانس روک کر مجھے اپنے اندر نہیں آنے  
دیتے۔ میں مختلف جھکندوں سے انہیں زیر کر لیتا ہوں۔"

کاہن نے کہا۔ "تم ہمارے موجودہ مشن کے لیے  
بہت ضروری ہو۔ تمہیں آئندہ ایسے لوگوں کے اندر پہنچنا ہے

تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک کیا ہو رہا ہے؟ وہ کس  
چیکنگ سے گزر رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ اس کے لب  
دلچے میں کہا۔ "مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ناگواری  
سی محسوس ہو رہی ہے۔ برداشت کرنا چاہیے۔ یہ دو شیزہ جو  
پاس کھڑی ہے اس کے حسن و شباب میں دلچسپی لوں گا تو دل  
بہل جائے گا۔"

"وہاں میرے سامان کی بھی چیکنگ ہو رہی تھی۔  
ویسے تو وہ مجھے پہلے بھی دیکھ رہا تھا۔ اس بار اس کی سوچ  
سے معلوم ہوا کہ دل سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے  
چور خیالات نے بتایا کہ رومیٹک موڈ میں رہنے والا جوان  
ہے۔ اسے پھانسنے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ چیکنگ کے  
دوران کسٹم کے افسران سے بھی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے  
اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے اہم خیالات پڑھے تو یہ  
جان کر حیران ہوئی کہ وہ مراد علی منگی کا بڑا بیٹا ہے۔ میری  
دلچسپی اور بڑھ گئی۔"

کاہن نے پوچھا۔ "پھر تو تم نے یہ معلوم کیا ہوگا کہ  
اس کا باپ اور بھائی پرنس عابی ہمارے ٹیلی فنی جاننے  
والوں سے دشمنی کر رہے ہیں؟"

وہ بولی۔ "شہزاد کے دماغ میں ایسی کوئی بات نہیں  
تھی۔ اس کے باپ سے ہماری جو دشمنی ہے، اس کا مجھے کسی  
حد تک علم ہے لیکن وہ اپنے باپ اور بھائی کی مصروفیات کے  
بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ایک طالب علم کی سیدھی سادی  
زندگی گزار رہا ہے۔"

کاہن نے پوچھا۔ "آگے بولو کیا ہوا؟"  
وہ بولنے لگی۔ "چیکنگ کے بعد اس نے میری ایک  
اٹھنی اٹھا کر ٹرائی پر رکھتے ہوئے کہا، میں ہیپ کر رہا  
ہوں۔ تمہارا سامان زیادہ ہے اور ہماری ہے۔"  
میں نے خوش ہو کر کہا۔ "او تھیک یو۔ یو آرسونائس ٹو

می۔ میرا نام امی مالا ہے۔"  
میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا  
ہاتھ تمام کر کہا۔ "میرا نام شہزاد علی منگی ہے۔"

"میں تمہیں دیر سے دیکھ رہی تھی۔ تم کبھی کبھی  
پریشان ہوتے تھے پھر نارمل ہو جاتے تھے۔"

یہ کہتے ہی میں پھر اس کے دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ اپنے  
سر کو چھو کر بولا۔ "پھر وہی عجیب سی بے چینی ہے۔ بتا  
نہیں یہاں پہنچے ہی اور آب و ہوا بدلتے ہی کچھ ہو رہا ہے۔"  
میں نے اس کے دماغ سے نکل کر مسکراتے ہوئے  
کہا۔ "اب کچھ نہیں ہوگا۔ جو مجھے چھو لیتا ہے اس کی تکلیف



جنہوں نے اپنے ملاغوں کو فلاوی لکھنا بنا لیا ہے۔

ان کی طاغوتی قوتوں میں اضافہ ہو رہا۔ وہ تاج رہے تھے۔ گارہے تھے۔ عورتوں نے کم سے کم لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ بڑے ہی ترغیب دینے اور بھڑکانے والے انداز میں بدن کی نمائش کر رہی تھیں۔ لارا بھی نشے میں مست ہو کر جھوم جھوم کر تاج رہی تھی۔

پھر اس کا دل اچانک ہی ڈوبنے لگا تھا۔ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ تب ہی اسے ابکاکی سی محسوس ہوئی۔ شاید شراب اندر سے باہر آنا چاہتی تھی۔ اس نے تے کرنے کی کوشش کی لیکن اندر سے کچھ نہیں نکل رہا تھا۔

وہاں بوڑھی عورتیں موجود تھیں۔ وہ سمجھ گئی۔ انہوں نے اسے وہیں لٹا کر اس کا معائنہ کیا پھر کہا۔ ”یہ ماں بننے والی ہے۔“

یہ ایسی چونکا دینے والی خوش خبری تھی کہ لارا پریشانی اور گھبراہٹ کو بھول گئی۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ شیطان کے مجسمے کی طرف پھیلا کر قہقہہ لگانے لگی۔ ”اہرمن.....! اے اہرمن.....! کھلا دیا میرے دل کا چمن۔ ہا ہا ہا..... اب کہاں بچ کے جائے گا دشمن؟“

وہ شیطان کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ”جے ہو تیری طلسماتی قوتوں کی۔ روحانی قوتوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ایک مراد علی منگی میرے پیٹ میں آگیا ہے۔“

کاہن نے کہا۔ ”تو نو سینے کے بعد یہاں شیطان کے سامنے اس ننھے مراد کو جنم دے گی۔ ہم اس کا نام بامراد رکھیں گے۔“

بارودا نے کہا۔ ”اس دشمن کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ والا، شیطان کی چھاؤں میں باپ بننے والا ہے۔“

وہ سب بیرونی دنیا کی ایک رہائش گاہ میں آگئے۔ لارا نے مراد کے نمبر بچ کر کے فون کوکان سے لگایا۔ دوسری طرف کانٹک ٹون جاری تھی۔ پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ وہ ناگواری سے بولی۔ ”لائن کاٹ دی۔ اونہہ، بہت اکڑ رہا ہے۔ ابھی سکر جائے گا۔“

اس نے پھر نمبر بچ کیے۔ مراد نے اپنے فون کو دیکھا پھر عابی سے کہا۔ ”لارا مجھے بار بار کال کر رہی ہے۔ میں اس کی آواز نہیں سنتا چاہتا۔ نیلماں سے کہو اس کی خبر لے۔ وہ کیوں ایک ماہ کے بعد اچانک کال کر رہی ہے؟“

اس نے مٹن دبا کر دوسری بار بھی کال کرنے والی کو چپ کرادیا۔ نیلماں وہاں پہنچ گئی تھی۔ ٹرانسپیرٹ ہو کر ایک

جلد ہی دنیا والوں کو اسپتال جینل کے ذریعے یہ دلچسپ اور سنگین خبر سنائی گئی۔ ”سنو دنیا والو.....! سنو کہ ایک ایمان والے کی اولاد شیطان کو کھ سے جنم لینے والی ہے۔“

لارا ایک جینل سے مراد کو مخاطب کر رہی تھی۔ لکار رہی تھی، کہہ رہی تھی۔ ”ارے او نا قابلِ شکست کھلانے والے سوربا! میں نے تجھے پچھاڑ دیا ہے۔“

وہ ٹی وی کے سامنے سر جھکائے بیٹھان رہا تھا۔ عابی نیلماں ہم زاد اور زیب النساء سب ہی پریشان تھے۔ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ آگے جا کر ایمان اور شیطان کے درمیان سنگین فسادات برپا ہوتے رہیں گے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

زیب النساء نے کہا۔ ”وہ عداوت سے باز نہیں آئے گی اور ہماری طرف سے عداوت نہیں ہو سکے گی کیونکہ لارا کو



نقصان پہنچائیں گے تو بچے کو بھی نقصان پہنچے گا۔“  
ہم زاد نے کہا۔ ”واقعی مراد.....! ہم اس سے دشمنی نہیں کر سکیں گے۔ اس سے کسی طرح بھی سمجھوتا کرنا ہوگا۔

بچے کو اپنے ماحول میں لا کر رکھنا ہوگا۔“  
”وہ بھی ہمارے ماحول میں نہیں آئے گی۔ اسے دشمنی کے لیے بہت بڑی طاقت مل گئی ہے۔“

عابی نے کہا۔ ”بابا جانی! کچھ کیا جائے۔ کوئی ایسی صورت ہو کہ بچہ ہمارے ماحول میں پرورش پائے۔ اسے یقین دلایا جائے کہ ہم اس ماں سے بچے کو نہیں چھینیں گے۔ وہ ہمارا ہے۔ ہم اسے تعلیم اور تربیت دیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”اسے کھل کر دشمنی کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ مجھ سے کسی طرح کا سمجھوتا نہیں کرے گی پھر بھی میں اس سے بات کرتا ہوں۔ دنیا والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اولاد کی خاطر اپنے اصولوں میں لچک پیدا کی ہے۔ اس سے سمجھوتا ہوگا تو دشمنی کم سے کم ہونی جائے گی۔ اچھا ہے۔

لوگ مانیں گے کہ امن و امان کی صورت نکالی جا رہی ہے۔“  
اس نے چیتل کے ذریعے کہا۔ ”میں لارا سے مخاطب ہوں۔ تم نے ماں بننے کی خبر سنائی ہے۔ اس خبر کو اپنے لیے خوش خبری اور میرے لیے عذاب کہا ہے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ میرے لیے بھی خوش خبری ہے۔ یہ بچہ بچھڑے ہوئے ماں باپ کو ملانے آیا ہے۔ ہم پھر سے ایک ہو سکتے ہیں۔ اس طرح بچہ ماں اور باپ کے سائے میں پرورش پاتا رہے گا۔“

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”ایسے وقت کہتے ہیں اونٹ آیا ہے پہاڑ کے نیچے۔ ویسے میں نادان نہیں ہوں۔ تمہارے جھگڑنے سے دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ اپنے بچے پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ ہم آگ اور پانی ہیں۔ شیطان آگ ہے جلاتا رہے گا، تم بجھاتے رہو گے اور تماشا دیکھتے رہو گے۔“

”کیا تم کسی بھی پہلو سے دوستی اور سمجھوتا نہیں کرو گی؟“  
”کروں گی لیکن تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ تم میرے پاس آؤ گے۔ میں نے تمہارے دین کا کلمہ پڑھا تھا۔ اب تم میرے شیطان کا کلمہ پڑھو گے۔ پھر ہم دونوں مل کر اپنی اولاد کو بھی یہی کلمہ پڑھاتے رہیں گے۔“

”تمہو ہے تم پر۔ تمہاری باتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ دوستی اور محبت تمہیں اس نہیں آئے گی۔ تم پوری دنیا کے سامنے شیطانی ارادے ظاہر کر کے اپنی موت کا سامان کر رہی ہو۔“

”یاد رکھو کسی چال بازی سے مجھے مارو گے تو میرے ساتھ بچہ بھی مارا جائے گا۔“  
”اللہ نے چاہا تو وہ سلامت رہے گا۔ تم دس ماہ تک جیو گی پھر میری چیز میرے لیے چھوڑ کر جاؤ گی۔“

”میں مرنے سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ میرے بعد بچے کو تاریک دنیا سے اور شیطان کے معبد سے باہر کوئی لے جائیں سکے گا۔ وہ مضبوط ہاتھوں میں پرورش پاتا رہے گا۔“  
”وہ بچہ جہاں جہاں، جن کے ہاتھوں میں جائے گا، وہ اپنے ہاتھوں سے محروم ہوتے جائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ مراد علی منگی کی اولاد ایمان والی ہی رہے گی۔“

چیتل سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ سب اندھے آلہ کار کے پاس آ گئے۔ ان سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ مراد کیا کرنے والا ہے؟  
کریگ ہوشن نے کہا۔ ”مراد کبھی کھوکھلا چیلنج نہیں کرتا ہے۔ اب تک اس کا یہی ریکارڈ ہے۔ وہ ضدی دشمن جو کہہ دیتا ہے اسے کر کے دکھاتا ہے۔“  
ایک یہودی نے کہا۔ ”اس بار تو اس کی اپنی اولاد کا معاملہ ہے۔ وہ کٹر مسلمان ہے۔ اپنے بچے کو شیطانی ماحول میں رہنے نہیں دے گا۔ لارا کے پیچھے پڑ جائے گا۔“  
لارا نے کہا۔ ”وہ میری پرچھا میں تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔ ہماری تاریک دنیا میں کبھی نہیں آ سکے گا۔ مجھے باہر کسی دوسرے روپ میں پہچان نہیں سکے گا۔ دیکھ لیتا میرے معاملے میں اس کا چیلنج کھوکھلا رہے گا۔“

آئینوں نے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو۔ عابی نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا پھر اچانک مجھے کیسے پہچان گیا تھا؟“  
”نیلماں ہم سے چھپ کر عابی سے ملتی تھی۔ اس نے تمہاری گردن تک اسے پہنچایا تھا۔ اب ہم سب کو نیلماں سے بھی محتاط رہنا چاہیے۔ میں اپنا چہرہ، اپنی شخصیت تبدیل کر کے یہاں رہوں گی تو وہ مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ میرے خلاف مخبری نہیں کر سکے گی۔“

ایک یہودی نے کہا۔ ”اگر تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں کبھی پہچان نہیں سکے گا تو یہ تم ہی جالو۔ ہم تو مراد کو دیکھتے آرہے ہیں۔ وہ انہونی کو ہونی اور ہونی کو انہونی بنا دیتا ہے۔“  
”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تم یہودی شطرنج کے کھلاڑی ہو۔ بولو میں کیا کروں؟“  
”نیلماں کو کسی طرح تاریک دنیا میں آنے سے روکو۔ ابھی تم تینوں وہاں بیٹھے خیال خوانی کے ذریعے ہم سے



بول رہے ہو۔ کیا وہ ایسے وقت پر آکر ہادی باتیں کر سکتی ہے؟ وہ کیسے آتی ہوگی؟ کیسے تم لوگوں سے چھٹی ہوگی؟

وہ تینوں اپنے آس پاس حد نظر تک دیکھنے لگے۔ بارودا نے کہا۔ ”وہ میری بیٹی ہے۔ دشمنوں کے جال میں پھنس گئی ہے۔ وہ روشنی میں چھپ کر آتی ہے تو ٹرانسپیرنٹ ہو جاتی ہے۔ ڈھونڈنے سے دکھائی نہیں دیتی جبکہ ہم اندھیرے میں آس پاس کی چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں۔“

لارا نے کہا۔ ”اسے تاریک دنیا میں چھپنے کی سہولتیں حاصل ہیں۔ میں جبکہ بدل کر روپ بدل کر رہوں گی، تب وہ مجھے ڈھونڈتی ہی رہ جائے گی۔“

”تم بھول رہی ہو۔ جب تمہارے جسم میں تبدیلیاں رونما ہوں گی تو کسی بھیس میں بھی پہچانی جاؤ گی۔“

”میں ایسے وقت تمہاری بیرونی دنیا میں آکر رہوں گی۔ اس وسیع و عریض دنیا میں کروڑوں عورتیں مائیں بنتی ہیں۔ وہاں آسانی سے چھپ کر رہ سکو گی۔“

”چلو اچھا ہے کہ تم ہر طرح سے محتاط رہو گی۔“

بارودا نے کہا۔ ”ہمارے لیے ایک اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اب مراد لارا تک پہنچنے کے لیے ریاست سے باہر آئے گا۔ وہ ریاست کا حکمران ہے لیکن لاکھوں میں پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے بھیس بدل کر آئے گا لیکن کہیں بھی حالات سے مجبور ہو کر ایکشن میں ہوگا تو اپنے دے آف ایکشن سے پہچانا جائے گا۔“

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ”بارودا! اسے اپنی بد نصیبی یا مراد کی خوش نصیبی کہو۔ تم لوگ شہزاد جیسے آسان ٹارگٹ کے ذریعے بھی اسے کمزور نہ بنا سکے۔ اب بھی وہ آسان ہے۔ اس کے بونے محافظ کو کھٹل کی طرح مسل سکتے ہو۔ اس کی طرف توجہ دو۔“

”ہم توجہ دے رہے ہیں۔ اب ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔ ہماری ایک اور ٹیلی پیسٹی جاننے والی امی مالا شہزاد کو شیشے میں اتار چکی ہے۔ ابھی کچھ روز عشق و محبت کا سلسلہ چلے گا۔ وہ اس کے دماغ کو فٹینے میں لینے کی کوشش کرتی رہے گی۔ ہم دیکھیں گے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے؟“

وہ فیصلہ کر رہے تھے کہ آئندہ شہزاد پر جارحانہ حملے نہیں کیے جائیں گے۔ اسے بڑی رازداری سے امی مالا کے فٹینے میں لایا جائے گا۔

☆☆☆

جان گلبرٹ ستر برس کا ایک کروڑ پتی تاجر تھا۔ بیوی

نہیں تھی، کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اب اسے آخری ایام ایک محبت کرنے والی خدمت گزار بیوی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے کسی عمر رسیدہ خاتون کی تلاش میں تھا۔ امی مالا کو معلوم ہوا تو اس نے ایک تقریب میں بوڑھے تاجر کو دیکھا پھر اس کے دماغ میں جا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی طرف مائل کرنے لگی۔ اس نے دور سے اسے دیکھا جبکہ وہ اس کے قریب اس کے اندر گئی۔ وہ بے اختیار اس کے پاس آ گیا۔

امی نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ آپ میرے سامنے آکر رک گئے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ہتا نہیں تم میں کیسی کشش ہے۔ مجھے تمہارے جیسی خاتون کی ضرورت ہے۔ لندن کے ٹاپ کار ڈیلرز میں میرا نام آتا ہے۔ میرا نام جان گلبرٹ ہے۔ میں تمہیں پروپوز کر رہا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”میرا نام انجو مالا ہے۔ میں ایک بیوہ ہوں۔ میری ایک سولہ برس کی بیٹی ہے۔ اس کا نام امی مالا ہے۔ کیا مجھے جوان بیٹی کے ساتھ قبول کر دو گے؟“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ مجھے بے اولاد کے لیے تم ایک اولاد بھی ساتھ لاؤ گی۔ میں اسے بیٹی بنا کر دل سے محبت دوں گا۔“

”ایک اہم بات یہ ہے کہ میری بیٹی مجھ سے ناراض رہتی ہے۔ ابھی میرے سامنے نہیں آتی۔ مجھ سے بات بھی نہیں کرتی۔“

”تعب ہے ایسی بھی کیا ناراضی ہے کہ پیدا کرنے والی ماں کا منہ بھی نہیں دیکھتی ہے۔ بات بھی نہیں کرتی ہے؟“

”ہم دونوں کے مزاج اور نظریات میں فرق ہے۔ میں دنیا کی باتیں کرتی ہوں۔ وہ دین کی باتیں سمجھاتی ہے۔ میں کلبوں میں جاتی ہوں، وہ چرچ میں جاتی ہے۔ قادرِ قدر اور دیگر نفس کے ساتھ رہتی ہے۔ ان کے ساتھ راتیں بھی گزارتی ہے۔“

”پھر تو تمہاری بیٹی قابلِ قدر ہے۔ میں دل و جان سے اس کی عزت کروں گا۔ تمہاری دنیا داری پر بھی اعتراض نہیں کروں گا۔“

وہی ایک امی مالا تھی۔ وہی ماں تھی۔ وہی بیٹی تھی۔ آئندہ ڈبل رول ادا کرتے وقت یہ ہوتا کہ جہاں ماں ہوتی، وہاں بیٹی نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے پہلے سے کہہ دیا کہ ماں بیٹی کے درمیان شدید اختلافات ہیں۔ وہ شوہر بننے کے



بعد بیوی کی موجودگی میں بیٹی کو اور بیٹی کی موجودگی میں بیوی کو نہیں دیکھ سکے گا۔  
کونہیں دیکھ سکے گا۔  
کونہیں دیکھ سکے گا۔

اب وہ جان گلبرٹ کی بیٹی بن کر رہتی تھی۔ اسے عزت، دولت اور شہرت حاصل تھی۔ ایسے ہی وقت لندن کے ائرپورٹ پر شہزادے اس کی شناسائی ہو گئی تھی۔

شہزاد مغربی ماحول کا پروردہ تھا۔ وہ روزے نماز کا پابند تھا اور وہاں کی آزادانہ روش پر بھی چلتا تھا۔ ہوس پرست نہیں تھا۔ لیکن پھول، رنگ، خوشبو اور حسن کا دلدادہ تھا۔ شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ موسیقی میں گٹار پلے کرتا تھا اور صحیح سروں میں گاتا بھی تھا۔

ایسی طبیعت رکھنے والا اسی سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس سے ملاقات ہونے سے پہلے ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسی اس کے اندر پہنچ کر بڑی خاموشی سے اس کے خیالات پڑھتی رہی ہے۔

اسے ٹیلی ویژن کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس نے جیمیل کے ذریعے اپنے بھائی عابدی اور آنکس کے مقابلے دیکھے تھے۔ بہت کچھ سمجھتا رہا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے اپنے اندر یوگا کی مہارت ہے۔ وہ سانس روک کر پرائی سوچ کی لہروں کو بھگا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ پرائی سوچ کی لہروں کے باعث وہ الجھن سی محسوس کرتا رہا تھا۔

اسی نے کہا تھا۔ ”جو مجھے چھو لیتا ہے، اس کی تکلیف فوراً ہی دور ہو جاتی ہے۔“

اس وقت وہ امی سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اسے چھو رہا تھا اور وہ اس کے دماغ سے نکل آئی تھی۔ اس نے حیرانی سے خوش ہو کر کہا تھا۔ ”واقعی میرا سر ہلکا پھلکا سا لگ رہا ہے۔ کسی طرح کی بے چینی نہیں ہے۔“

امی کی اس جادوگری نے اسے اور متاثر کیا تھا۔ اس نے اسی وقت اس سے دوستی کر لی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر بھی لے لیے تھے۔ بعد میں رابطہ رکھنے والے تھے لیکن ائرپورٹ سے گھر پہنچنے ہی ٹیلی ویژن جاننے والوں نے اس پر حملے کیے تھے۔ ان حملہ کرنے والوں سے امی کا طاغوتی رشتہ تھا لیکن اس وقت وہ ان کی عداوتوں سے بے خبر تھی۔

امی کئی گھنٹوں کے بعد اس کے دماغ میں پہنچی تو وہ پھر الجھن سی محسوس کرنے لگا۔ اس نے عبداللہ کبڈی سے کہا۔ ”اٹکل! پتا نہیں آج کیا ہوا ہے طیارے سے باہر آنے کے بعد بھی کبھی بے چینی اور ناگواری سی محسوس کرنے

پھر یہ کہ اس کے مزاج میں عیاشی رہی ہوئی تھی۔ وہ سولہ برس کی بن کر یوٹائیڈ فرینڈز کے ساتھ راتیں گزارتی تھی۔ اس لیے اس کی پارسائی بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ چرچ کے فائبرڈ اور انس کے ساتھ راتیں گزارتی ہے۔

اسی رات جب جان گلبرٹ اپنے بیڈروم میں سو رہا تھا، تب وہ اس کے اندر پہنچ گئی پھر اس پر تنویدی عمل کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں یہ نقش کیا کہ وہ اس کی ہونے والی بیوی انجی مالا کی تمام باتوں کو سچ سمجھے گا۔ اس پر شبہ نہیں کرے گا اور یہ کہ وہ انجی مالا سے زیادہ امی مالا کو اہمیت دے گا۔ اسے ایک سگی بیٹی کے تمام حقوق دیتا رہے گا۔

اس نے شادی سے پہلے ہی اس کے دماغ کو اچھی طرح جکڑ کر اپنے مزاج اور اپنے مقاصد کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ بظاہر ایک ذہین اور ہوش مند تاجر تھا لیکن یہ نہ جان سکا کہ محرزہ ہو گیا ہے۔ اب وہ شادی کے بعد سمجھ نہیں پار رہا تھا کہ امی کا تابع اور غلام بن کر رہنے لگا ہے۔

اس نے چاہا تھا کہ دولت مند تاجر کی بیٹی بن کر رہے۔ اس کے لیے اس نے ماں بن کر اس گھر میں نوخیز دو شیزہ کے لیے جگہ بنائی۔ ماں بیٹی کا تماشا زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ جان گلبرٹ کی تاجر برادری کے افراد سے بھی ملتے رہنا ضروری تھا۔ وہ سب ہی پر تنویدی عمل نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی ایک ہی وقت میں سب ہی کو ٹیلی ویژن کی لاشی سے ہانک سکتی تھی۔

اس نے گلبرٹ سے کہا۔ ”ڈیڈ! میں مام سے پردہ کرتے ہوئے ایک ہی گھر میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

اس نے کہا۔ ”نہیں امی! میں دل سے تمہیں بیٹی مانتا ہوں، مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔“

”تو پھر آپ مام کو چھوڑ دیں۔ میں نے ان کی ایک فون کال سنی ہے۔ وہ کسی سبیلی سے کہہ رہی تھیں کہ آپ سے طلاق لے کر یہاں سے چلی جائیں گی۔“

”اگر تم وعدہ کرو کہ باپ کے ساتھ ہمیشہ رہو گی تو میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا۔“

وہ وہی کہہ رہا تھا جو خیال خوانی اور تنویدی عمل کے ذریعے اس کے دماغ میں نقش کر دیا گیا تھا۔ امی نے جیسی پلاننگ کی تھی، اس کے مطابق اس نے انجی مالا کو طلاق دے دی۔ وہ اس کی زندگی سے نکل گئی۔ اس کا گھر چھوڑ



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                   |                 |                  |
|---------------|-------------------|-----------------|------------------|
| عمیرہ احمد    | صائمہ اکرام       | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد        | نبیلہ عزیز      | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر      | فائزہ افتخار    | عنایت اللہ التمش |
| قدسیہ بانو    | تنزیلہ ریاض       | نبیلہ ابرار     | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار      | آمنہ ریاض       | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل           | عنیزہ سید       | مستنصر حسین      |
| رضیہ بٹ       | رخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | ام مریم           | نایاب جیلانی    | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،  
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



لگا ہوں۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ اس وقت بھی سر بھاری لگ رہا ہے۔“

کبڈی نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ”ایک ذرا اپنی سانس روکو پھر سانس لینے لگو۔“

اس نے بھی کیا۔ سانس روکتے ہی امی اس کے اندر سے نکل گئی تھی۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”اوہ اٹکل! یو آر گریٹ۔“

وہ پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ ”اوہ مائی گاڈ! تم خیریت سے ہونا؟ یہ دشمن کہاں سے آگئے تھے؟“

کبڈی تشویش میں جھٹلا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بچے! اپنے باپ اور بھائی سے ہونے والی دشمنی کو سمجھو۔ کوئی ٹیلی فون سے جاننے والا ابھی تمہارے اندر تھا۔ وہ سانس روکتے ہی نکل بھاگا ہے۔ ہم نے اب تک تمہیں جرائم کی دنیا سے اور دشمنوں کی سازشوں سے دور رکھا ہے۔ اب حالات کا تقاضا ہے کہ تمہیں تمام دشمنوں کے بارے میں بتایا جائے۔ تم یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کر رہے ہو۔ اب مجبوراً تمہیں جرائم کی یونیورسٹی میں بھی داخلہ لینا ہوگا اور اس یونیورسٹی کا جو سب سے بڑا استاد ہے، وہ تمہارا باپ ہی ہے۔“

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔“

”مجھے اپنے بابا جانی پر فخر ہے۔ ساری دنیا بھی انہیں خطرناک مجرم کہتی تھی۔ آج کسی بھی ملک میں ان کی آمد پر گارنٹی آف آرڈر پیش کیا جاتا ہے۔ اب کوئی انہیں مجرم کہنے کی جرأت نہیں کرتا ہے۔ دنیا کی تمام عدالتیں بھی انہیں ایک ریاست کا ایک نام حکمران تسلیم کرتی ہیں۔“

اس نے حیرانی ظاہر کی۔ ”کیا واقعی؟ کیا اس مراد علی متکی کے بیٹے ہو جو ریاست ارض اسلام کا حکمران ہے؟“

شہزاد نے سانس روک کر امی کو دماغ سے نکال دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر ہو کر سوچ رہی تھی۔ ”مجھے اس کے اندر نہیں جانا چاہیے۔ وہ مجھ پر شبہ کر سکتا ہے۔ اسے تا بعد از بنانے کا دوسرا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”اوہ..... میں اتنی لگی ہوں۔ ایک ریاست کے شہزادے سے دوستی ہو گئی ہے۔ میں ابھی تم سے ملنا چاہوں گی۔“

اس نے کاہن سے کہا تھا کہ وہ شہزاد کو ٹریپ کرنے میں جلدی نہیں کرے گی۔ وہ شروع سے آئینس بارود اور لارا کی ناکامیاں دیکھتی آرہی ہے۔ اس لیے خوب سوچ سمجھ کر بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے گی۔

اس نے کہا۔ ”سوری۔ ابھی اٹکل مجھے باہر نہیں جانے دیں گے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ناکام ہونے والے دشمن پھر حملہ کریں گے۔ مجھے ابھی چار دیواری میں رہنا چاہیے۔“

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ نفیسی اسکرین کو دیکھ کر مسکرائی۔ شہزاد اسے پکار رہا تھا۔ اس نے شن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ وہ بولا۔ ”میں ہوں شہزاد علی متکی.....“

”تمہارے اٹکل درست کہتے ہیں۔ فی الحال تمہیں گھر سے باہر نہیں نکلتا چاہیے۔ حالات سازگار رہیں گے، کوئی دشمن پریشان نہیں کرے گا تو میں تم سے ملنے آؤں گی۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”تمہارا نام میرے فون کے نسخے سے دل میں محفوظ ہے۔ ہائے..... تم نے یاد کیا ہے۔ کال

”تمہارے آنے سے گڑبڑ ہو جائے گی۔ اٹکل کو بتانا ہوگا کہ تم کون ہو؟ ایک نامحرم مجھ سے کیوں ملنے آئی ہے؟ میرے بابا جانی جو ان لڑکے لڑکیوں کی دوستی اور میل جول کو پسند نہیں کرتے۔ مجھ پر بڑی پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔ ہم آئندہ کچھ دنوں تک چھپ کر ملیں گے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“

انہوں نے طے کیا کہ وہ انتظار کریں گے۔ صرف فون پر باتیں کریں گے۔ وہ تین دنوں کے بعد یونیورسٹی جائے گا تو وہاں ملاقات ہو سکے گی۔

امی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی چا تھا۔ وہ پڑے صبر و تحمل سے فکارتھی تھی۔ شہزاد کے سلسلے میں چاہتی تھی کہ دونوں کی دوستی راز میں رہے۔ مراد اور عالی کو اور اس



خاندان کے کسی فرد کو معلوم نہ ہوا کہ شہزادہ کی امی بالائی  
دو شیزہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔

☆☆☆

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ یہ محبت کی نہیں  
عداوت کی آگ تھی۔ مراد اور لارا دونوں ہی اندیشوں میں  
گھرے ہوئے تھے۔ مراد کو یہ اندیشہ تھا کہ لارا اس بچے کو  
باپ سے دور رکھنے کے لیے اس پر جادو اور ٹونے ٹونے  
کر داتی ہوگی۔ اس بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی شیطانی  
اثرات میں رکھتی ہوگی۔

لارا کو یہ اندیشہ تھا کہ مراد روحانی قوتوں کے ذریعے  
بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ختم کر دے گا تاکہ نہ بانس رہے  
نہ بانسری بچے۔ وہ بچے کی پیدائش تک انتظار کرے گا پھر  
اسے اپنے ہتھکنڈوں سے چھین کر لے جائے گا۔ وہ اس کے  
ہتھکنڈوں کو کبھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اب سے پہلے بھی وہ اور  
عابی اچانک چونکا دینے والے انداز میں انہیں نقصان پہنچا  
چکے تھے۔

اس نے احتیاطاً لارا کی حیثیت ختم کر دی تھی۔ شولی  
کے نام سے ایک دوسری عورت بن کر رہتی تھی۔ اپنی  
تاریک رہائش گاہ میں نہیں جاتی تھی کیونکہ نیلماں ادھر آتی  
تھی۔ وہ اسے نئے روپ میں پہچان نہیں سکتی تھی۔  
وہ کاہن کے پاس بھی نہیں جاتی تھی۔ نیلماں ادھر  
بھی آ جاتی۔ بارودا اور آبنوس سے بھی دور رہ کر خیال  
خوانی کے ذریعے ان سے بات کرتی تھی۔ وہ ہر پہلو سے  
مختاط رہنے لگی تھی۔

مراد اور ہم زاد کو ریاستی معاملات میں کئی ممالک کے  
اکابرین سے رابطہ رکھنا پڑتا تھا۔ دوستوں اور دشمنوں کو ان  
کی فون کال سے پتا چلا کہ مراد ریاست سے باہر آ گیا ہے۔  
کبھی فرینکلنٹ، کبھی پیرس اور کبھی لندن سے بولتا ہے۔ وہ  
یقیناً ان علاقوں میں لارا کو تلاش کر رہا ہے۔

حیثاً ہم زاد ان ملکوں اور شہروں میں جا کر سیاسی  
رابطے رکھتا رہا۔ اس طرح دنیا والوں کو خصوصاً لارا کو معلوم  
ہوتا رہا کہ مراد اسے کہاں تلاش کر رہا ہے۔ وہ ادھر نہیں  
جارتی تھی۔

ہم زاد صرف دو ہفتے تک باہر رہ کر ریاست میں  
واپس آ گیا تھا۔ اب مراد اٹلی کے شہر فلورنس میں تھا۔ وہاں  
سے اندھی تلاش شروع کر رہا تھا۔ ابھی یہ پتا چلنے والا نہیں تھا  
کہ وہ کہاں جا کر پھنسی ہوئی ہے۔

نیلماں لارا کو دوسرے جیس میں پہچان نہیں سکتی تھی۔

## نمل پارے

☆ شادی کے کچھ عرصے بعد شادی کی انگلی  
اور خاوند لنگ ہو جاتے ہیں۔

☆ شادی کرنے کے لیے کسی سیانے سے  
مشورہ کر لینا چاہیے اگر وہ سیانا کہے کر لو تو پھر کسی  
دوسرے سیانے سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

☆ ہر عورت اداکارہ ہوتی ہے مگر بیٹ ایکٹر  
خاوند ہی ہوتا ہے۔

☆ اداکارا میں دو وجہ سے مشہور ہوتی ہیں،  
ایک اداکاری کی وجہ سے دوسری کاری ادا کی وجہ  
سے۔

☆ بینک سے جو تھوڑا قرضہ لے، بینک کے رحم  
و کرم پر ہوتا ہے اور جو زیادہ قرضہ لے، بینک ان کے  
رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

## موقع

ایک خوب صورت لڑکی نے ایک لڑکے سے  
کہا۔

”میں تم سے ستر بار کہہ چکی ہوں کہ میں تم سے  
شادی نہیں کر سکتی۔“

لڑکے نے اس لیے میں کہا۔

”اوہ! میری زندگی ہی بے کار ہو گئی۔ میں نے  
پتا نہیں کیسے کیسے جتن کر کے دس لاکھ روپے جمع کیے  
تھے۔“

لڑکی ایک ادا سے بولی۔

”اوہ! کیا تم مجھے اکہتر واں موقع نہ دو گے؟“

## بلا فرمائش

ایک بیوی کے شوہر اور ایک درجن بچوں کے  
باپ کی میز پر ہمیشہ ایک چینی کے بڑے مرتبان میں  
ایک رنگین مچھلی تیرتی رہتی تھی۔

ایک دن ان کے ایک دوست نے مرتبان میں  
صرف ایک مچھلی کی موجودگی کا سبب پوچھا تو انہوں  
نے بتایا۔

”میں کم سے کم ایک ایسی شے بھی اپنے ہمراہ  
رکھتا ہوں جو اپنا منہ کھولتی ہے تو کوئی چیز نہیں مانگتی۔“

مرسلہ۔ ماہا ایمان، پنجاب



چند ماہ میں اس پر حمل کے اثرات ظاہر ہونے لگتے، تاہم اس  
تھایا ایک موبوم سے امید تھی کہ وہ پیٹ والی اپنی کسی نہ کسی  
فلسفی سے پہچانی جائے گی۔

ابھی دو ماہ کا حمل تھا۔ تیسرے مہینے میں مسئلہ پیدا  
ہوا۔ حاملہ عورتوں کو طرح طرح کے مسائل پیش آتے رہتے  
ہیں۔ لارا کے دل میں یہ شبہ جڑ پکڑ رہا تھا کہ مراد کسی طرح  
کے پراسرار عمل کے ذریعے بچے کو پیدائش سے پہلے ہی ختم  
کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے فون کے ذریعے کاہن سے کہا۔ ”میں اس  
دشمن سے بہت محتاط ہوں۔ اپنے بچے تک اسے پہنچنے نہیں  
دوں گی لیکن وہ کسی طرح کا روحانی عمل کر رہا ہے۔ بچے کو  
میرے پاس رہنے نہیں دے گا۔ اسے خود حاصل نہ کر سکا تو  
مار ڈالے گا۔ وہ شاید یہی کر رہا ہے۔ اسے روکو۔ شیطان  
معظم کے کسی بڑے تاتترک مہاراج سے روحانی عمل کا توڑ  
کرواؤ۔ میرے بچے کو اب کسی تاتترک مہاراج، کسی گرو  
گھنٹال کے سائے میں رہنا چاہیے۔“

کاہن نے کہا۔ ”گرو مہاشکتی مان کو مہاکالی ماتا  
نے بڑی شکتی دی ہے۔ وہ اپنے کالے سنتروں سے اور  
کالے عمل سے پہاڑوں میں شکاف ڈال دیتا ہے۔ وہ تو  
روحانی قوتوں کی دھجیاں اڑا دے گا۔ میں ابھی ان کے  
پاس جاتا ہوں۔“

وہ رکھو تاتھ کالیا کو گرو مہاشکتی مان کہہ رہا  
تھا۔ کالیا کالی مائی کا پجاری تھا۔ کولکھ کے علاقے ہوڑا  
کے جنوب میں خلیج بنگال کی سمت مہاکالی ماتا کا ایک  
بہت بڑا مندر ہے۔ جہاں پوجا کے سبب جانوروں کی  
بلی چڑھائی جاتی ہے اور دیوی کو پرسن کرنے کے لیے  
رات کی تاریکی میں زندہ انسانوں کو بھیٹ چڑھایا  
جاتا ہے۔ گرو مہاشکتی مان اس مندر کا سرپرست بھی تھا  
اور پنڈت اور پجاری بھی تھا۔

کاہن نے اس کے پاس آکر کہا۔ ”میں تاریک دنیا  
کے شیطانی معبد کا پنڈت اور پجاری ہوں۔ شیطان کی ایک  
بندی پر بڑی پتا آن پڑی ہے۔ روحانی قوتیں اسے نقصان  
پہنچانا چاہتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم ہی اپنی خطرناک کالی  
قوتوں سے اس ماں بننے والی کو بچا سکو گے۔“

اس نے گرو دیو کو مراد اور لارا کی پوری ہشتری سنائی  
تو کالیا چونک گیا۔ بیٹھے بیٹھے مراد جیسے دشمن کی بہت بڑی  
کنزوری ہاتھ آرہی تھی۔ وہ پوری مہابھارت سن کر بولا۔  
”جیسے دکھ ہے، اسے کچھ پانا ہے۔ اس یہاں آتا ہے۔ اسے

مہاکالی کی شکتی کے سائے میں رہتا ہے۔“  
”وہ ڈرتی ہے کہ یہاں آئے گی تو دشمن اس کے  
بچے چلا آئے گا۔ وہ روپوش رہ کر بہت سبھی ہوئی زندگی  
گزار رہی ہے۔“

”اس سے بولو کہ کسی سے نہ ڈرے۔ کوئی چتا نہ  
کرے۔ مہاکالی کے مندر میں روحانی قوتیں پانی ہو جائیں  
گی۔ وہ آئے اور کسی خوف و خطر کو خاطر میں نہ لائے۔“

لارا اپنے بچے کی سلامتی کے لیے پریشان تھی۔ اپنے  
اصلی روپ میں کالیا کے پاس آگئی۔ اس کے آگے جبک کر  
اس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا۔ وہ آشیر واد دینے کے انداز میں  
ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مہاکالی کلکتے والی تیرا دھن نہ جائے خالی۔  
تو نے دھن دیا ہے کہ جو تیرے چرنوں میں زندہ انسانوں  
کی بلی چڑھائے گا تو اس کا کلیان کرے گی۔ تیرے چرنوں  
پر بلی چڑھائی جائے گی تو اس دکھیاری ناری کو اور اس کے  
بچے کو دشت باپ سے مکتی دلانے گی۔“

اس نے کالی مائی کے کالے جسم کے آگے ڈنڈوت  
کیا۔ اس کے قدموں میں اوندھے منہ لیٹ کر منتر پڑھنے  
لگا۔ ان سنتروں سے اسے گیان حاصل ہوتا تھا کہ کسی دشمن  
سے نجات پانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟

☆☆☆

لارا اور کاہن اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے اسے  
دیکھ رہے تھے۔ وہ اوندھے منہ فرش پر پڑا ہوا پہلے تو سکون  
سے منتر پڑھ رہا تھا پھر کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔  
اسے گیان حاصل ہو رہا تھا کہ دشمن اپنے دین کے  
مطابق صوم و صلوة کے بہت مضبوط قلعے میں ہے۔ کوئی  
پراسرار منتر اسے چھو نہیں سکے گا۔ جادوئی ہتھکنڈے اسے  
نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہ ناکامی ناقابل برداشت تھی۔  
وہ کردھ میں آکر چیخا۔

پھر گیان حاصل ہوا کہ وہ لارا کو اور اس کے بچے کو  
دشمن باپ سے دور رکھ سکتا ہے۔ وہ دشمن کبھی لارا اور اس  
بچے تک پہنچ نہیں پائے گا۔

وہ تھوڑی دیر تک کالی مائی کو پکارتا رہا۔ منتر پڑھتا رہا  
اور گیان حاصل کرتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لارا کو دیکھتے  
ہوئے بولا۔ ”تجھے اشان کرنا ہوگا لہو سے..... بچے کو مہینے  
میں آتے ہیں۔ ایک ایک مہینے کے حساب سے نو کنواری  
کنیاؤں کے لہو سے نہائے گی تو وہ لہو ڈھال بن کر پیٹ کے  
بچے کی رکشا کرے گا۔ وہ دشمن کبھی اس بچے تک پہنچ نہیں  
پائے گا۔“



میری کنواری لڑکیوں کو۔ یہ تو بڑا مشکل ہے۔ کنواری لڑکیوں کو کسے شریب کیا جائے گا؟ نیلی جیسی کے ذریعے کوشش کی جاسکتی ہے نین دھن کو خبر ہوگی تو وہ کسی کنواری پر ظلم ہونے نہیں دے گا۔“

گرو مہاشتی نے کہا۔ ”تو لاکھ روپے دیوی کے چرنوں میں رکھ دے۔ تجھے اشان کرنے کے لیے نو کنواریوں کا لہو حاصل ہوتا رہے گا۔“

کاہن نے کہا۔ ”ہم ابھی رقم لا کر رکھ دیں گے۔“

لارا نے کہا۔ ”میں یہی چاہتی ہوں کہ وہ میرے بچے تک کبھی نہ پہنچے پائے لیکن یہ بنیادی مقصد کیسے پورا ہوگا کہ میرا بچہ طاغوت پرست رہے، روحانیت اور مذہب کی طرف نہ جائے؟“

وہ آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھنے لگا پھر آنکھیں کھول کر بولا۔ ”نو کنواریوں کا لہو دو چار گھونٹ پی لیا کرے گی تو وہ لہو پیٹ کے بچے تک پہنچے گا۔ اسے طاغوتی قوتوں میں جکڑتا رہے گا پھر وہ دنیا کے تمام مذاہب کے خلاف بولتا رہے گا۔“

☆☆☆

اس حد تک تو کامیابی ہو رہی تھی کہ کسی رکاوٹ کے بغیر بچے تک شیطانی اثرات پہنچ رہے تھے۔ محل کے مراحل سے گزرتے وقت جو ننھا سادل اور دماغ بنا جا رہا تھا، اس پر شیطانی غلاف چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ غلاف رفتہ رفتہ اس بچے کے وجود کا اہم حصہ بننے والا تھا۔

مراد اور عالی بہت پریشان تھے۔ یہ سمجھ رہے تھے کہ لارا بچے کی پیدائش سے پہلے ہی سبھی ہوئی ہوگی۔ اسے باپ سے دور رکھنے کے لیے شیطانی ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہوگی۔ بچے کو صاف سہرا دینی ماحول ملنا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا۔۔۔ جب وہ لارا کو کسی طرح پکڑ کر اپنی حراست میں رکھتے۔ اپنی موجودگی میں وہ پیدا ہوتا تو پھر کسی طرح کا اندیشہ نہ رہتا۔

نیلماس اسے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ تاریک دنیا میں جاتی تھی، چھپ کر بارودا، آبنوس اور کاہن کی باتیں سنتی تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ لارا ان سے بھی چھپ کر رہتی ہے۔

لارا نے کاہن کو تاکید کی تھی کہ بارودا اور آبنوس کو کوکلتہ کالی مندر کی کوئی بات نہ بتائی جائے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ نیلماس کسی وقت آکر ان کے منہ سے یہ سن سکتی ہے کہ بچے کو شیطانی قہقہے میں رکھنے کے لیے وہ ہر ماہ کنواریوں کے لہو سے غسل کرتی رہتی ہے۔

چھ ماہ گزر چکے تھے اور وہ راز داری برتنے میں کامیاب رہی تھی۔ وہ باپ بیٹے دشمنوں کی بوسوگھ لیا کرتے تھے۔ اس کی بونہیں پارے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس بل میں ہاتھ ڈال کر اس ناگن کو باہر لائیں۔

مراد نے سہر پاؤں اور اس کے اتحادی ممالک کے

”میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ وہ اپنے باپ کے دین کی دجیاں اڑائے۔ اس کا پورا خاندان جو دین و ایمان کا مضبوط قلعہ بنا ہوا ہے، اسے میرا بچہ کھنڈر بنا دے۔“

”وہ بنادے گا۔ اوش بنادے گا۔ اپنے باپ کے دین کا سروناش کر دے گا۔ باپ اور اولاد کے سچ ایسا بد (جنگ) ہوگا کہ دنیا دیکھے گی۔“

لارا کو اب اس کی ضرورت کے مطابق شیطانی قوتیں حاصل ہو رہی تھیں۔ ایسے وقت مراد اس سے بے خبر تھا۔ نیلماس کوشش کرنے کے باوجود لارا کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ غیب کی باتیں نہیں جان سکتی تھی ورنہ اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کوکلتہ کے مہاکالی مندر میں کالی قوتیں حاصل کرنے پہنچی ہوئی ہے۔

ابھی تین ماہ کا حمل تھا۔ اسے تین کنواریوں کے لہو سے غسل کرنے کے لیے تین دنوں تک اسی مندر میں رہنا تھا۔ گرو مہاشتی مان اس مندر کا صرف پنڈت اور پجاری ہی نہیں تھا، وہ اغوا اور قتل کی واردات کا ماہر بھی تھا۔ اس کے چلے ضرورت کے مطابق بچوں کو اور کنواری لڑکیوں کو اغوا کر کے دیوی ماں کی بھیٹ چڑھاتے تھے۔

ان کے بچے کی مہارت کے مطابق وہاں یہی ہو رہا تھا۔ مراد پہلے روزے کی افطاری کے وقت دعا میں پڑھ کر گلاس کو منہ سے لگا کر پانی پی رہا تھا، ٹھیک اسی وقت لارا



حکمرانوں سے کہا۔ ”تمہاری حکومت میں بے شمار یہودی اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ وہ سب ہی صیہونی تنظیم سے وابستہ ہیں۔ وہ ضرور جانتے ہیں کہ لارا کہاں روپوش رہتی ہے۔“ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”وہ کیسے جان سکتے ہیں، لارا کا ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔“

”جو مسلمانوں کے دشمن ہوتے ہیں، انہیں یہودی فوراً دوست بنالیتے ہیں۔ کریگ ہوشن اور چند یہودی اکابرین نے ان تین ٹیلی پیٹھی جاننے والوں کو دوست بنالیا ہے۔ انہوں نے یہودیوں کی شہ پر میرے بیٹے شہزاد کی طرف رخ کیا ہے ورنہ اب سے پہلے کسی دشمن نے میرے اس بیٹے کو بھی نہیں چھیڑا تھا۔ آپ حضرات یہودیوں کی چال بازیوں پر پردہ نہ ڈالیں۔ ہماری خاطر ان سے ڈینگ کریں۔ مجھے ہر حال میں لارا تک پہنچنا ہے۔ اگر آپ مجھے اس کی شہرگ تک پہنچا دیں گے تو یہ مراد علی منگی توقع سے زیادہ آپ کے کام آئے گا۔ آپ کو کسی بھی پیچیدہ مسئلے سے نکال لائے گا۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”یہودیوں کے حلقے سے کوئی بات اگلوانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے پھر بھی ہم کوشش کرتے ہیں۔ شاید وہ کسی لین دین پر راضی ہو جائیں۔“

عابی نے کریگ ہوشن سے کہا۔ ”تم لوگ ایک یہودی ماں کے بیٹے کو اپنی طرح یہودی نہ بنا سکے۔ اب مجھ سے دشمنی پر اتر آئے ہو۔ ان ٹیلی پیٹھی جاننے والوں کو میرے بڑے بھائی شہزاد کے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس کا بھی بُرا انجام تمہارے سامنے ہے۔ ہمارے خلاف آئندہ بھی ناکام رہو گے۔ تم لوگ بہت شاطر کہلاتے ہو پھر اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ ہم سے دشمنی کر کے نقصانات اٹھاتے آرہے ہو۔ آزماؤ ہمیں، لارا تک پہنچا دو پھر دیکھو کہ ہم تمہاری کتنی مشکلات میں کام آتے رہیں گے۔“

کریگ ہوشن نے کہا۔ ”عابی! ہم جانتے ہیں کہ تم زبان کے دشمنی ہو۔ ہم ایک بار تمہارے کام آئیں گے، تم دس بار ہمارے کام آتے رہو گے لیکن یقین کرو لارا نے خود کو بہت ہی پر اسرار بنالیا ہے۔ اس نے ٹیلی پیٹھی جاننے والے ساتھی بارود اور آبنوس کو بھی نہیں بتایا ہے کہ وہ کہاں روپوش رہتی ہے۔ ضرورت کے وقت ان سے خیال خوانی کے ذریعے بولتی ہے پھر کم ہو جاتی ہے۔ وہ تمہارے باپ سے بہت خوف زدہ ہے۔ وہ روپوش رہ کر بچے کو جنم دے گی۔ اسے تمہارے باپ کے ہاتھ لگنے نہیں دے گی۔ ویسے

ہم تمہیں اپنا جانا رکھنے کے لیے لارا تک پہنچنے کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔ جیسے ہی اس کا کوئی سراغ ملے گا، ہم اسی وقت تمہیں کال کریں گے۔“

ہوشن نے رابطہ ختم کر کے گوگلے فون کو دیکھا پھر کہا۔ ”ہم آلو کے پٹھے نہیں ہیں کہ مسلمانوں کو دوست بنائیں اور ان پر بھروسہ کریں۔ لارا انہیں خوب بھاری ہے۔ ہم اسے کبھی بھی ان کے ہاتھ لگنے نہیں دیں گے۔“

عابی نے ہوشن سے باتیں کرنے کے بعد پاس بیٹھی ہوئی نیلماں کو دیکھا پھر کہا۔ ”یہ یہودی بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا ہے کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہم اسے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ خدا کو ابھی منظور نہیں ہے اس لیے ناکامی ہو رہی ہے۔ جو بندے ناکامیوں سے حوصلہ نہیں ہارتے کوششیں جاری رکھتے ہیں، اللہ ان سے جلد راضی ہو جاتا ہے۔“

”درست کہتی ہو۔ اللہ ہماری مسلسل جدوجہد کا انجام ضرور دے گا۔“

نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے مصلے پر آگئے۔ نماز کی نیت کرتے وقت بھی ان کے دل کہہ رہے تھے۔ ”ہم کچھ نہیں چاہتے۔ صرف بچے کی سلامتی دین ایمان کے ساتھ چاہتے ہیں۔“

انہوں نے بڑی دل جی سے نماز ادا کی۔ آخر میں دعا مانگتے وقت نیلماں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”یا اللہ! میری اتنی سی دعا ہے کہ ابھی سجدہ کروں پھر سجدے سے یہاں نہ اٹھوں، جہاں وہ چھپی ہے وہاں سجدے سے سراٹھے۔“

وہ اللہ اکبر کہتی ہوئی سجدے میں گئی۔ تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کہا پھر پلکیں جھپکتے ہوئے سجدے سے سر کو اٹھایا تو ایک انجانی چار دیواری میں خود کو پایا۔

وہ خواب گاہ تھی۔ ایک جوان عورت بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چھ ماہ کی حاملہ ہے۔ بظاہر وہ لارا نہیں تھی۔ کوئی اجنبی عورت تھی۔

اس کا ایمان کہہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی ہے، اسے لارا کے پاس پہنچا دیا ہے۔ وہ مکان سے باہر آگئی۔ یہ معلوم کیا کہ وہ کس ملک اور کس شہر کے کس علاقے میں ہے؟

وہ اٹلی کے شہر فلورنس میں تھی۔ اسے کہتے ہیں تقدیر کا



تماشا۔ مراد ریاست ہے۔ نکل کر یہی شہر میں آیا تھا۔ بچے تین ماہ سے وہاں تھا۔ شاید اس نے بھی جگہ لارا کو دیکھا ہو اور لارا نے بھی اسے دیکھا ہو لیکن دونوں کے چہرے اور شخصیت تبدیل ہو چکی تھی۔ کسی نے کسی کو پہچانا نہ ہو گا یا ایک شہر میں رہ کر کبھی سامنا نہیں ہوا ہو گا۔

اسے کہتے ہیں بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ وہ سارے عالم میں اسے ڈھنڈوتا پھر رہا تھا۔ نیلماں نے اس کے پاس آ کر سلام کیا پھر کہا۔ ”بابا جانی! شاید لارا اسی شہر میں ہے۔ آپ ایٹ فلورنس میں ہیں۔ وہ ویسٹ میں ہے۔“

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بیٹی! تم شاید کہہ رہی ہو‘ کیا اس پر لارا کا شبہ ہو رہا ہے؟“

وہ بولی۔ ”رب کریم میرا ایمان سلامت رکھے۔ میں نے دعا مانگی اور وہاں پہنچ گئی۔ آپ اسے گرفت میں لیں گے تو اس کی اصلیت کھل کر سامنے آ جائے گی۔“

وہ نیلماں کے ساتھ باہر آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ تیز رفتاری سے ادھر جانے لگا۔ نیلماں نے فون پر عابی سے کہا۔ ”میں لارا تک پہنچ گئی ہوں۔ بابا جانی کے ساتھ اس کی رہائش گاہ میں جا رہی ہوں پھر کسی وقت کال کروں گی۔“

وہ ایک بڑے سے خوب صورت بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ اس بنگلے کا مالک ایک بوڑھا تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔ لارا نے خیال خوانی کے ذریعے اسے اپنا معمول اور تابعدار بتالیا تھا۔ اس کی بیوی بن کر وہاں رہتی تھی۔

وہاں احاطے کے مین گیٹ پر ایک چوکیدار تھا۔ بنگلے کے اندر ایک ملازمہ رہتی تھی۔ مراد نے دونوں کو آسانی سے قابو میں کر کے انہیں رسیوں سے باندھ کر ایک اسٹور روم میں بند کر دیا پھر اس خواب گاہ میں آیا۔ آہٹ سنتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ نیلماں کو ایک اجنبی کے ساتھ دیکھ کر وہاں سے غائب ہوتی، مراد نے چھلانگ لگا کر اسے دیوبچ لیا۔

وہ گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگاتے ہوئے بولی۔ ”کون ہو تم؟ کیوں مجھ پر ظلم کر رہے ہو؟ اگر چور ہو چوری کرنے آئے ہو تو جو مانگو گے وہ دوں گی۔ مجھے چھوڑ دو تو سہی۔“

وہ بولا۔ ”چھوڑتے ہی غائب ہو جاؤ گی۔ لارا اصلی روپ میں آ جائے گی۔“

”میں لارا نہیں ہوں۔ میرا نام شولی دا کر ہے میں

مشہور مصروف ڈاکٹر والہ دا کر کی دانتیں ہوں۔“  
”تم لارا نہیں؟ نہ جو۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تمہارے پیٹ میں میری امانت ہے۔ جب تک وہ امانت مجھے نہیں ملے گی، تم میری قید میں رہو گی۔ میں تمہیں غائب ہونے کا موقع نہیں دوں گا۔“

اس نے نیلماں سے کہا۔ ”کسی قریبی پولیس اسٹیشن میں جاؤ۔ وہاں سے ایک ہتھکڑی اٹھا کر لے آؤ۔“

وہ اسی وقت ایک پولیس اسٹیشن میں پہنچ کر ٹرانسپیرنٹ ہو گئی۔ ایک سپاہی نے حیرت سے کہا۔ ”ارے دیکھو یہ کیا ہے؟ یہ ایک لڑکی کی طرح جھلک رہی ہے۔“

دوسرے سپاہی اور وہاں کا افسر بھی اس کے قریب آ گئے۔ اس افسر نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونا چاہا تو وہ کوئی ٹھوس وجود نہیں تھا۔ اسے پکڑنا چاہا تو اس کی منگی بندھ گئی، وہ ہاتھ نہیں آئی۔ ایک دیوار پر کئی ہتھکڑیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ایک ہتھکڑی اٹھا کر وہاں سے غائب ہو گئی۔ سب ہی کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

نیلماں نے وہاں آ کر مراد کی ہدایت کے مطابق اس کی اور لارا کی کلائی میں ہتھکڑی پہنا دی۔ وہ اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے بولا۔ ”اب غائب ہونے کی حسرت پوری کرو۔“

وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم مجھے قیدی بنا کر نہیں رکھ سکو گے۔ میرا پیچھا چھوڑ دو، بچہ میرا ہے۔ تم اسے حاصل نہیں کر سکو گے۔“

وہ اسے کھینچتا ہوا بنگلے سے باہر لے آیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ نیلماں گاڑی ڈرائیور کرتی ہوئی اس کے اپارٹمنٹ میں انہیں لے آئی۔ لارا نے پوچھا۔ ”کیا اس ہتھکڑی میں دن رات میرے ساتھ رہ سکو گے؟“

اس نے کہا۔ ”زنجیر کا ایک سرا تمہاری اس ہتھکڑی سے اور دوسرا اسرا اس بیڈ سے بندھا رہے گا۔ میں تو تم سے دور ہی رہوں گا۔ اگر تم یہاں سکون سے رہ کر بچے کو جنم دو گی تو میں تمہیں یہاں سے زندہ جانے دوں گا۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”اگر میں زندہ نہ رہنا چاہوں تو کیا کرو گے؟ ذرا سوچو، میری موت کا مطلب ہے بچے کی موت۔ یہ تو میری زندگی اور موت سے جڑا ہوا ہے۔“

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“

”اور میں اگلے ایک گھنٹے تک انتظار کروں گی۔ اگر تم نے مجھے رہا نہ کیا تو میں یہاں خودکشی کر کے دکھاؤں گی۔“

یہ تشویش میں جھلا کرنے والا چیلنج تھا۔ مراد نے



پریشان ہو کر اسے سوچتی ہوئی نظر دوں۔ دیکھا پھر گیا۔  
”میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھوں گا۔ کیا ایک ہندی  
ہوئی عورت بچے کو جنم دے سکتی ہے؟“

یہ ممکن نہیں تھا۔ زچگی کے دن جیسے جیسے قریب آتے  
ہیں مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ماں بننے والی کو  
زیادہ آرام زیادہ سہولتیں پہنچانی جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ  
پاؤں باندھے نہیں جاسکتے۔ اس وقت وہ لیبر روم میں  
ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان رہتی ہے۔ ایسے وقت لارا  
آسانی سے خود کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔

یہ ایک اس کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ اسے ٹکنبے میں  
رہنا تھا۔ وہ سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے  
تھے کہ بچے کے دینی ماحول میں جانے سے پہلے ہی اپنی  
ممتا کو چل ڈالے گی۔ خود تو ڈوبے گی، اس بچے کو بھی لے  
ڈوبے گی۔

مراد نے اپنی ہتھکڑی کھول کر زنجیر کے ایک سرے کو  
اس سے باندھا۔ اس کے دوسرے سرے کو بیڈ کے آہنی راڈ  
سے باندھتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچوں گا کہ بچے کی پیدائش  
تک تمہیں کس طرح قابو میں رکھ سکوں گا اور ابھی دیکھوں گا  
کہ تم کس طرح خودکشی کرنا چاہو گی؟“

وہ اس سے دور ہو گیا۔ وہ زنجیر کو کھولے یا توڑے  
بغیر غائب نہیں ہو سکتی تھی۔ نیلماں نے کہا۔ ”لارا..... بے جا  
خند سے باز آ جاؤ۔ تمہاری دشمنی بابا جانی سے ہے۔ بچے سے  
دشمنی کی بات نہ کرو۔“

لارا نے کہا۔ ”یو شٹ اپ! شیطان کی پناہ سے  
بھاگنے والی عورت تیرا انجام برا ہوگا۔ تو نے مجھے پھنسا دیا  
ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مرتے مرتے تجھے بھی  
مار ڈالوں گی۔“

وہ بول رہی تھی، اس کا ایک ہاتھ اپنے لباس کے اندر  
تھا۔ وہ ہاتھ لباس کے نیچے رینگ رہا تھا پھر اچانک ہی وہ  
باہر آیا۔ ”خبردار! میں گولی چلا دوں گی۔“

اس نے پستول کی نال کو پھولے ہوئے پیٹ پر رکھ  
لیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ مراد کے قریب پہنچنے سے پہلے  
ہی ٹریگر دب جاتا۔ پیٹ پھٹ جاتا۔ پلک جھپکتے ہی قصہ تمام  
ہو جاتا۔

وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ بچے کے پاس ہی اس کی موت کو  
چھپا کر لائی تھی۔ مراد ایک چھلانگ میں پستول تک پہنچ سکتا  
تھا لیکن اس لمحے تک گولی چل جاتی۔ پستول کی نال لباس  
میں یوں دھنسی ہوئی تھی جیسے پیٹ میں گھس گئی ہو۔ موت

اب تب میں چنگھاڑنے والی تھی۔  
وہ بے بسی سے بولا۔ ”چیز لارا..... پستول کو وہاں  
سے ہٹاؤ، میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ دیکھو بات کو  
سمجھو، دھوکے سے ٹریگر دب سکتا ہے۔ تم ماں ہوا اپنے بچے  
پر رحم کرو۔“

”تو پھر بچے کی سلامتی چاہو۔ بیڈ کے راڈ سے ہندی  
ہوئی زنجیر کھول دو۔“

اس نے راڈ اور زنجیر کو دیکھا۔ وہ زنجیر کی لمبائی  
کے مطابق راڈ سے دس فٹ کی دوری پر تھی۔ وہ پھرتی  
نہیں دکھا سکتا تھا۔ بجلی کی طرح لپکتا، تب بھی گولی چل  
ہی جاتی۔

وہ ایسا مجبور اور لاچار پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ راڈ کی  
طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”یہ سمجھ گیا ہوں کہ بچے کو میرے  
پاس آنے سے پہلے مار ڈالوں گی۔ تمہارے پاس رہے گا تو یہ  
زندہ رہے گا۔ تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو کہ میں اس معصوم کو  
زندہ رکھوں گا پھر بھی مان لو کہ پیدائش کے بعد اسے اپنے  
سائے میں نہیں رکھ سکوں گی۔ میں اسے ہر حال میں، ہر قیمت  
پر حاصل کروں گا۔“

اس نے زنجیر کے اس سرے کو کھول کر راڈ سے الگ  
کر دیا۔ لارا نے جکڑ بندی سے ٹکٹے ہی مراد پر گولی چلائی۔  
نیلماں چیختی ہوئی اس کے پاس آئی۔ ”بابا جانی.....!“

ایسے وقت وہ ٹرانسپیرنٹ ہونا بھول گئی۔ دوسری گولی  
نے اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ اچھل کر گری پھر بابا جانی  
کے پاس تڑپ کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ جو کبھی سوچا نہیں جاسکتا تھا،  
وہ چند لمحوں میں ہو گیا۔

وہ پیار کرنے والی بہو سانسوں سے محروم ہو گئی تھی۔  
پہلی گولی مراد کے ایک کان سے لگتی ہوئی سنسنائی ہوئی گزر  
گئی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ غصے میں بھول گیا کہ دوسری  
گولی اس کا بھی کام تمام کر سکتی ہے۔ اس نے اس پر  
چھلانگ لگائی۔ لارا اندر سے سہمی ہوئی تھی کہ پھر پکڑی جائے  
گی۔ وہ چشم زدن میں غائب ہو گئی۔ مراد چھلانگ لگانے  
کے نتیجے میں خالی جگہ آ کر فرش پر گر پڑا۔ زندگی میں پہلی بار  
وہ پہاڑ زمین بوس ہو گیا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور  
سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان  
کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



# Downloaded From Paksociety.com



## گمان شیر عباس

تصوراتی دنیا میں ہر انسان اپنی سلطنت کا بادشاہ ہوتا ہے۔ چاہے سائنس لینے کی ہمت نہ ہو مگر وہ تصور میں ہمالیہ بھی سر کر لیتا ہے... یہی حال کچھ ان لوگوں کا بھی تھا جن کا دنیا میں پررشتہ ہوتے ہوئے بھی کوئی نہیں تھا اور وہ صرف اپنی قوتِ ارادی کے بل پر زندگی کے کنہن مراحل سے گزرتے جا رہے تھے۔

ترقی یافتہ ماحول میں خوشی اور غم کا امتزاج..... مغربی معاشرے کا المیہ

کبھی کبھی مدہم ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی میں ہال کی دوسری جانب سوتے جم کی سرگوشیاں سن سکتی ہوں۔ مجھے بلی کے چلنے کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور کافی فاصلے سے اسپتال کے ملازم کے جوتوں کی آواز بھی آرہی ہے۔ وہ

میں دا یونٹ میں رہتی ہوں جہاں نرسیں اور اسپتال کے ملازمین ہر وقت مسکراتے اور اونچی آواز میں بولتے رہتے ہیں جیسے ہم سب اونچا سنتے ہوں لیکن میری قوتِ سماعت ہمیشہ سے ہی تیز ہے، البتہ میری یادداشت



دوا میں تقسیم کرنے کے لیے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا ہے۔ میں اس کے چلنے کی رفتار سے اندازہ لگا سکتی ہوں کہ آج کی رات بھاری جسم والے اردلی ڈین کی ڈیوٹی ہے۔

جب کوئی رہائشی مگر جائے تو نرس ڈین کو ہی بھیجتی ہیں تاکہ وہ اسے اٹھا کر کرسی یا بستر پر بٹھا سکے، جب کبھی کوئی وہاں کارہنہ والا گھومنے نکل جائے تو ڈین اسے پکڑ کر واپس لے آتا ہے۔ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی۔ اس کی مسکراہٹ، خوش اخلاقی اور وہاں کے رہنے والوں کو بے تکلفانہ انداز میں مخاطب کرنے کے باوجود اس کے اندر کوئی خباثت چھپی ہوئی ہے۔ مجھے تو وہ کوئی بھوت پریت، سایہ یا عفریت لگتا ہے جسے دیکھ کر بچے ڈر جائیں۔

میرا بیٹا اسٹیو اب پچاس سال کا ہے۔ میں نے ایک دفعہ اسے بتایا کہ ڈین کے بارے میں کیا سوچتی ہوں تو اس نے اپنی آنکھیں کھاتے ہوئے کہا کہ یہ میرا وہم ہے۔ ”مما! ڈین بہت اچھا شخص ہے۔ ایک نہایت عمدہ اردلی۔ یہاں ہر کوئی اس سے محبت کرتا ہے۔“

”ہر کوئی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ہم اس وقت مرکزی ہال میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں یہ گنگو ہو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی براہ راست اسٹیو کے چہرے پر پڑ رہی تھی جس کی بدولت اس کی آنکھوں کے نیچے نمودار ہونے والی نئی ٹھنیں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشگوار نہیں تھی اور دوسری بیوی سے بھی اسے طلاق ہو چکی تھی۔ اب اس کی ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں بھی سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس وقت وہ مجھ سے بھی زیادہ عمر رسیدہ نظر آ رہا تھا حالانکہ میں اسی برس کی ہو چکی تھی۔

”اسٹاف، انتظامیہ اور فیملی ممبرز، سب ہی اسے پسند کرتے ہیں۔“ اسٹیو نے کہا۔

”لیکن یہاں مقیم افراد میں سے کوئی بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔“

اسٹیو محض سر ہلا کر رہ گیا جیسے کہہ رہا ہو کہ ماما کا مرض لاعلاج ہے۔

راہداری میں ڈین کے جوتوں کی دھمک رک گئی اور میں نے سنا کہ ڈین کسی رہائشی کی مزاج پرسی کر رہا ہے پھر میں نے دبی دبی آوازیں سنیں اور اچانک ہی گر بیٹا میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے لوی بھی تھی۔

گر بیٹا نے سوٹ اور ادائیگی ہلکے کے جوتے پہنے ہوئے تھے اور سر پر سوٹ کے ہم رنگ ہلکے کے رنگ کا ہیٹ تھا۔ لوی نے نہانے کا گاؤن اور سلپرز پہن رکھے تھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی میرے پاس آئیں۔

”ہائے راکل! تم ہمارے ساتھ شہر چل رہی ہو؟“ گر بیٹا نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں جوش سے چمک رہی تھیں۔ ”ہم ہیئر، دیکھنے جا رہے ہیں۔“

اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میرا نام راکل نہیں بلکہ روز ہے لیکن میں نے اسے یاد نہیں دلایا اور نہ ہی اسے یہ بتایا کہ وہ اور لوی اب نیویارک کے بجائے جنوبی فلوریڈا میں رہتی ہیں جبکہ ہیئر، اپریل انیس سواڑٹھ میں براڈوے میں دکھایا گیا تھا اور اس کے سترہ سو پچاس شوہر ہوئے تھے، مجھے پرانی باتیں خوب یاد رہتی ہیں البتہ یہ نہیں بتا سکتی کہ میں نے آج یا گزشتہ روز ناشتے میں کیا کھایا تھا۔

”کیا تم نے ٹیکسی کے لیے فون کر دیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہاں۔“ لوی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ٹیکسی آنے والی ہے۔ ہمیں باہر جانا چاہیے۔ راکل! تم بھی لباس تبدیل کر لو۔“ یہ وہ عورت کہہ رہی تھی جس نے خود کسی کارٹون کی طرح مضحکہ خیز لباس پہن رکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی دروازے پر ہلکی سی دسک ہوئی اور ڈین دواؤں کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گر بیٹا اور لوی کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”ہم تھیر جا رہے ہیں۔“ گر بیٹا نے اسے مطلع کیا۔ ”اوہ، اچھا۔“ ڈین سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہیئر دیکھنے۔ میں نے سنا ہے کہ بہت شاندار ڈراما ہے۔ کیا ٹیکسی آرہی ہے؟“

”بالکل۔ راستے میں ہے۔“ لوی نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”ہم پیدل براڈوے نہیں جاسکتے۔ تم ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو؟“

”میں نہیں جاسکتا۔“ ڈین نے جواب دیا۔ ”مجھے بہت کام کرنا ہے لیکن میں جانے سے پہلے تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔“ اس نے ٹرالی پر سے ایک پلاسٹک کی بوتل اٹھائی اور اس میں سے ایک دوا نکال کر اپنی پتیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔

”یہ تمہارے لیے ہے لوی۔“ اس نے وہ گولی لوی کو دی جو گر بیٹا اور مجھ سے بہت پہلے سے دایونٹ میں رہ رہی تھی۔ اس نے وہ گولی منہ میں



رکھی اور پانی کے بغیر ہی نگہ لی۔ اسے اس کی پرکھیں ہوگی  
تھی پھر بولی۔ ”گرٹا! آجاؤ..... ہمیں چلنا چاہیے۔“

گرٹا نے اپنا ہینڈ بیگ سیدھا کیا جو اس کے کندھے  
پر لٹک رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم  
آ رہی ہو اکیل؟“

”میرا خیال ہے کہ کچھ دیر آرام کر لوں۔“ میں  
نے ایک کتاب اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے ختم کرنا  
چاہ رہی ہوں۔“

”جانے سے پہلے تم بھی ایک گولی لے لو گرٹا۔“ ڈین  
نے ہوسل میں سے ایک اور گولی نکال کر اپنی تھیلی پر رکھی۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ وہ اپنا سرنگی میں ہلاتے  
ہوئے بولی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے لوسی کا بازو  
پکڑا اور ہم دونوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم  
دونوں سے بعد میں ملاقات ہوگی۔“

ڈین کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے تاریک ہو گیا گوکہ یہ  
کیفیت عارضی تھی لیکن اس نے مجھے دہشت زدہ کر دیا۔ پھر  
وہ آہستگی سے ان دونوں عورتوں کی جانب بڑھا اور اس نے  
گرٹا کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اتنی تیزی سے گھومی کہ اس کا خوب  
صورت ہیٹ سر سے نیچے گر گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی  
کہ ڈین نے اسے گھمایا یا پھر وہ خود ہی گھوم گئی۔ وہ پیچھے کی  
طرف لڑکھڑائی اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”آئندہ تم مجھے اس طرح ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“ اس  
نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

”اوہ، اوہ۔“ لوسی اپنا سر ہلاتے ہوئے مسلسل  
بڑبڑا رہی تھی۔ ”ڈین مشکل میں ہے۔ گرٹا مشکل میں  
ہے۔ سب لوگ مشکل میں ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی  
طرف مڑ گئی۔

”دوا لے لو۔ اس کے بعد ٹیکسی پکڑ لینا۔“ ڈین نے  
اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ اس کی تھیلی پر سرخ رنگ کی  
چھوٹی سی گولی خون کے قطرے کے مانند نظر آ رہی تھی۔

”ڈین نے بڑے الفاظ کہے۔“ لوسی نے کہا۔ وہ بار  
بار یہی الفاظ دہرا رہی تھی۔ اس کی آواز لختہ بہ لختہ بلند ہوتی  
جاری تھی۔ ڈین اسے خاموش کرنے کے لیے آگے بڑھا  
کہ میں نے لات مار کر دواؤں کی ٹرائی اس کی طرف دیکھ لیں  
دی جو اس کی کمر سے ٹکرائی اور وہ ڈمگماتا ہوا لوسی پر جا گرا  
اور وہ دونوں ہی فرش پر گر گئے۔ لوسی بڑی طرح چلا رہی تھی  
اور گرٹا اپنا ہینڈ بیگ اس کے سر، کمر اور ٹانگوں پر مارے  
ہوئے کہہ رہی تھی۔

دواؤں کی ٹرائی کو دھکا دیتے ہوئے میں اپنا توازن  
برقرار نہ رکھ سکی اور جب اٹھنا چاہا تو گھٹنوں میں شدید تکلیف  
کی وجہ سے رونے لگی۔ میری پیچ و پکار سے پورے یونٹ  
میں دہشت پھیل گئی اور عمارت میں لگا ہوا الارم بجنے لگا۔  
رات کی ڈیوٹی پر موجود نرس اور تین اردلی دوڑتے ہوئے  
کمرے میں آئے۔ اس وقت تک ڈین ہسٹریائی انداز میں  
جھلاتی ہوئی لوسی سے الگ ہو چکا تھا اور وہ تیزی سے لپکتی  
ہوئی اس سے دور جا چکی تھی۔ وہ زور زور سے ہچکیاں لے  
رہی تھی۔ اس کا گاہن سانسے سے پھٹ گیا تھا اور ایک سیلپر  
پیروں سے نکل کر ڈیوٹی میں پڑا ہوا تھا۔ گرٹا اب بھی اپنا  
بیگ گھما رہی تھی اور مسلسل چلا رہی تھی کہ ڈین نے اس کا بازو  
پکڑا اور لوسی کو روکا۔

ایک اردلی نے گرٹا کو قابو کیا اور اسے خاموش  
کرانے کے بعد میرے کمرے سے باہر لے گیا دروازے  
پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دوسرے اردلی نے لوسی کو  
سنجالا اور اسے میرے بستر تک لے آیا جبکہ تیسرا تیزی  
سے میری طرف لپکتے ہوئے بولا۔ ”روز! تم ٹھیک تو ہو؟“

میں نے اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو دبا رکھا تھا۔ میرا  
دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بالآخر میں نے نظریں اٹھا کر  
دیکھا۔ وہ کینیا کا رہنے والا خوب صورت شخص ٹوٹی تھا۔ اس  
کی سیاہ رنگت اور چاکلیٹی رنگ کی آنکھیں مجھے بہت پسند  
تھیں۔ وہ میرے سامنے کھڑا پریشان اور مضطرب نظر آ رہا  
تھا۔ وہ عام طور پر دن کی شفٹ میں کام کرتا تھا۔

میں اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ ہم گھٹنوں کینیا میں  
اس کی بیوی اور گھر والوں کے بارے میں باتیں کیا کرتے  
تھے لیکن میں زیادہ دیر انہیں یاد نہیں رکھ سکتی۔ میرے دماغ  
سے دوسرے لوگوں کی زندگی کے بارے میں تفصیلات چھلنی  
ہو کر نکلتی رہتی ہیں لیکن اس میں میری اپنی زندگی کی تفصیلات  
کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میرا دماغ تھک چکا ہے۔ اس  
لیے ایک دن پہلے کی بات بھی بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔

”میرا خیال ہے کہ.....“ میں نے ٹوٹی کو جواب  
دینے کی کوشش کی۔

ٹوٹی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں  
تمہیں اٹھنے میں مدد دیتا ہوں۔“

اگر اس کی جگہ ڈین ہوتا تو میں اسے بھی اس کی کوئی  
چال سمجھتی۔ اب بھی میں ہچکچا رہی تھی لیکن یہ ہچکچاہٹ زیادہ  
دیر نہ رہی۔ میں نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ سے اس کا



ہاتھ پکڑ لیا۔ سیاہ اور سفید جلد کا حسین امتزاج تھا۔ میں تقریباً رونے والی تھی۔ شکر یہ! میں بہ مشکل کھڑکی میں کھڑی ہو گئی تو ٹوٹی مجھے کرسی تک لے کر آیا اور بولا۔ ”کیا ہوا تھا روز؟“

”میں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔“ ڈین بیل کی طرح ڈکراتے ہوئے بولا۔ ”اس نے دواؤں کی ٹرالی میری طرف دھکیل دی تھی۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ ٹوٹی حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ داکر کے بغیر چل نہیں سکتی۔ کیا چھلانگ لگا کر ٹرالی میں جا گری تھی؟“

رات کی ڈیوٹی والی نرس مارتھا چالیس سال کی مضبوط عورت تھی اور دیکھنے میں لگتا تھا کہ اس نے کرائے میں بلیک بیلٹ حاصل کر رکھی ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان میں آئی اور انہیں الگ کرتے ہوئے بولی۔ ”بس بہت ہو چکا۔“ وہ زور سے نہیں بولی۔ اسے ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کی آواز میں اتنا رعب تھا کہ ڈین کو بھی خاموش ہونا پڑا۔

”ہم لوسی کو اس کے کمرے میں چھوڑنے جا رہے ہیں۔ روز کے لیے کچھ اسٹیکس اور ایک کپ گرم چاکلیٹ کا لے کر آؤ اور پھر میرے دفتر میں ایک میٹنگ ہوگی۔“ ٹوٹی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے لیے اسٹیکس لے کر آتا ہوں روز!“

وہ مارتھا اور ڈین کے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا جو زمین پر گر گئی ہوئی دوائیں اٹھا کر ٹرالی میں ڈال رہے تھے۔ ڈین کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا پھر مارتھا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو میں.....“ ”چپ ہو جاؤ۔“ مارتھا نے غصے سے کہا۔ ”یہ ایسا معاملہ ہے جس پر ہمارے خلاف مقدمہ ہو سکتا ہے۔ یہ ٹرالی یہاں سے لے جاؤ۔“

ڈین نے ایک نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہال میں چلا گیا جہاں دوسری نرسیں اور اردلی تماشا دیکھنے والوں کو ہٹا رہے تھے۔ الارم بھی خاموش ہو چکا تھا اور حالات معمول پر آ رہے تھے۔ مارتھا نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو روز کہ کیا ہوا تھا؟“

”گرٹا ڈراما دیکھنے کے لیے شہر جانا چاہ رہی تھی۔ لوسی اور اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ڈین چاہتا تھا کہ وہ جانے سے پہلے دوا لے لیں لیکن گرٹا نے

انکار کر دیا۔ اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میں یہ دیکھ کر خوفزدہ ہوئی اور چھلانگ لگا کر ٹرالی پر جا گری۔“

اس کے بعد میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ مارتھا نے میرا کندھا تھپتھپایا اور میرے کمرے سے چلی گئی۔ جب میں نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے تو وہاں رہنے والی بلی مجھ پر نظریں جمائے میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے چھلانگ لگائی اور میری گود میں بیٹھ گئی۔ وہ سیاہ اور سفید رنگ کی بلی میڈی تھی اور میں اس کی سنگت میں بہت آرام محسوس کرتی تھی۔

☆☆☆

میں نے کئی دنوں سے ڈین کو نہیں دیکھا اور نہ ہی گرٹا یا لوسی مجھے نظر آئیں۔ میں نے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی لیکن جب جم ناشتے کی میز پر میرے برابر بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اسے کچھ نہ کچھ معلوم ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے اور سوتے میں ہلکی آواز سے روتا ہے، جیسے بچہ ریں ریں کر رہا ہو۔ اس کی جھکی ہوئی کمر ایک سوالیہ نشان کی طرح خمیدہ ہے اور وہ چھڑی کے سہارے ٹکڑا کر چلتا ہے۔ اس کی انگلیاں جوڑوں کی سوجن کی وجہ سے ناہموار ہو چکی ہیں اور اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں ہے۔ کسی زمانے میں وہ وال اسٹریٹ پر کام کرتا تھا لیکن مارکیٹ تباہ ہونے سے پہلے ہی وہ فلوریڈا چلا گیا جہاں اس کی بیٹی اور خاندان کے دیگر افراد رہتے تھے۔ یہ کئی سال پرانی بات ہے۔ اب اس کے نواسے نواسیاں جوان ہو چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ یہاں کیوں رہ رہا ہے لیکن اس کے دماغ میں بھی میری طرح چند سوچاں ہیں جن کی وجہ سے اسے بھی کل کی بات یاد نہیں رہتی۔

”یہ کیسے کہتے ہیں روز؟“

”حیرت انگیز طور پر خوش ذائقہ۔“

”تمہیں تو یہ سیر بھی بہت پسند ہیں؟“

”یہاں کون سی چیز ایسی ہے جو مجھے پسند نہ ہو۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑا حالانکہ میں نے کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔ ”میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈین کی زخمی انا کا رنگ ان بیروں کے رنگ سے بھی زیادہ گہرا ہوگا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی نظریں ایک کی پلیٹ، بیروں، کافی کے کپ اور جوس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی دوائیں بھی ساتھ ہی رکھی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ہمارے ناشتے کے دوران اردلی کی موجودگی نہیں چاہتا۔



ہوئے تھے۔ میں اپنے داکر اور جم چھڑی کے سہارے بیٹھ  
ہوئے درختوں کے جھنڈ تک پہنچے تو میں نے اپنا موبائل فون  
نکال کر ٹونی کا نمبر ڈائل کیا، جواب میں اس کی حیرت زدہ  
آواز سنائی دی۔

”روز! تم ٹھیک تو ہو؟“

”اس وقت میں اور جم باہر باغ میں ہیں اور اس نے  
مجھے بتایا ہے کہ تمہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔  
کیا یہ سچ ہے؟“

”انہوں نے مجھے نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ لہذا میں  
نے خود ہی ملازمت چھوڑ دی۔“

”مجھے اس سے بات کرنے دو۔“ جم نے میرے  
ہاتھ سے فون چھینتے ہوئے کہا پھر ٹونی کو مخاطب کرتے ہوئے  
بولی۔ ”اگر میں اور روز اس قید خانے سے نکلنے میں کامیاب  
ہو جائیں تو تم ہمیں گاڑی میں بٹھا کر کہیں لے جاسکتے ہو؟“  
”کیا؟“ میں نے فون اس سے چھین لیا اور اسی گفتگو  
میں کال منقطع ہو گئی۔

”اسے دوبارہ فون کرو۔“ جم ایک دائرے کی شکل میں  
ٹھپکتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ہم کہاں مل سکتے ہیں۔  
میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے اور پوری منصوبہ بندی  
کر لی ہے۔ تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی روز۔“

”یہ بالکل پلن ہے۔“ یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے  
ہٹ گئی اور داکر کو دھکیلتی ہوئی تیزی سے واپس جانے لگی۔  
میں سوچ رہی تھی کہ کیا واکر کے بغیر چل سکتی ہوں۔ میری  
ٹانگوں، اعصاب اور پیروں میں کوئی نقص نہیں پھر کوئی وجہ  
نہیں کہ اپنی قوت ارادی کے سہارے نہ چل سکوں۔ میں  
رک گئی۔ داکر کو دائیں جانب دھکیلا اور اسے چھوئے بغیر  
ایک قدم آگے بڑھایا۔ میں نے اپنے پیروں کو دیکھا اور خود  
کلامی کے انداز میں ان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔  
”تم بالکل ٹھیک اور سلامت ہو اور کسی مدد کے بغیر چل سکتے  
ہو۔“ میں نے ایک قدم اٹھایا پھر دوسرا..... اس طرح چھ قدم  
کا فاصلہ کسی سہارے کے بغیر طے کیا پھر میں نے ایک قریبی  
بینچ کا سہارا لیا اور اس پر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں بعد جم نکلا تاہم میرے پاس آیا۔ وہ ایک  
ہاتھ سے میرا داکر دھکیل رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں اس  
نے چھڑی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے معنی خیز انداز میں  
دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”فرار ہونا چاہتی ہو؟“

”یقیناً!“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”لیکن ہم  
جاہیں کے کہاں؟“

”تم میرا دکھ بانٹنا چاہا رہے ہو یا محض گھبرائی کر  
رہے ہو؟“

اس نے چوری چوری مجھے دیکھا۔ میں اس کی نیلی  
آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات نہ پڑھ سکی۔ اس  
نے آہستہ سے کہا۔ ”ناشتے کے بعد مچن میں بیٹھ کر باتیں  
کریں گے۔“

ایک نرس نے بتایا تھا کہ پورے یونٹ میں یہ واحد  
جگہ ہے جہاں خفیہ کمرے نہیں لگے ہوئے۔ یہ وہاں کے  
رہنے والوں اور ان کے ملاقاتیوں کے لیے ایک پرائیویٹ  
جگہ تھی لیکن مجھے شبہ تھا کہ مچن میں نے اس جگہ کی پرائیویسی  
کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ میں نے کئی سالوں تک  
وکالت کی ہے اور اپنے تجربے سے یہی سیکھا ہے کہ سچ کے  
سوا کسی پر بھروسہ نہ کرو۔

جم اور میں تھوڑی دیر بعد مرکزی مچن میں ملے۔  
ہم نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو فورے  
سے نزدیک تھی تاکہ پانی کے شور میں ہماری آواز کوئی اور  
نہ سن سکے۔

”تم جانتی ہو کہ اس رات جب وہ اسے کمرے میں  
واپس لے کر گئے تو لوسی کے ساتھ کیا ہوا؟“  
”میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔“  
”انہوں نے اسے برقی جھکوں سے علاج کے لیے  
میا می بھیج دیا۔“

”وہ اسے مزید برقی جھکے نہیں لگا سکتے جم۔“  
”بہر حال انہوں نے اسے یہاں سے روانہ کر دیا  
ہے اور اس کی جلد واپسی ممکن نہیں۔“  
”مگر کیا کہاں ہے؟“

”اس کی بیٹی اسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“  
”اور ڈین..... وہ بھی نظر نہیں آ رہا؟“  
”اسے ایک ہفتے کے لیے معطل کر دیا گیا تھا۔ وہ کل  
کام پر واپس آ جائے گا جبکہ ٹونی کو ملازمت سے برطرف  
کر دیا گیا ہے۔“

میرے پاس ٹونی کا سبیل نمبر تھا۔ اصولاً مجھے اس سے  
رابطہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہاں کے رہائشیوں اور عملے کے  
درمیان اس طرح کے تعلق کی سخت ممانعت تھی لیکن میرے  
خیال میں قانون توڑنے کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔

میں نے جم سے کہا۔ ”باغ میں چہل قدمی کرتے ہیں۔“  
”مچن کی طرح باغ کے گرد بھی چار دیواری تھی لیکن  
وہاں طرح طرح کے پھل دار درخت اور خوشنما پودے لگے



میں اس شخص کو فوری طور پر نہ پہچان سکی جو ڈر کے دوران میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا گوکہ اس کی ڈاڑھی اور بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا اور میرے شوہر کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی ادا سی تیر رہی تھی۔

”کیسی ہو مام؟“

”مام؟ کیا میں تمہاری ماں ہوں؟ اگر یہ سچ ہے تو مجھے کیوں یاد نہیں رہا؟ میرا پورا نام کیا ہے؟“

”روز رینج میٹھین۔ آر آر ایم۔ تم دستخط کرتے وقت اپنے نام کا یہی مخفف استعمال کیا کرتی تھیں۔“

اس کے ساتھ ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ اسٹیو تھا..... میرا بیٹا اسٹیو۔ میں نے کہا۔ ”تم پاس ہو گئے؟“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”مارتھانے مجھے اس رات کے واقعے کے بارے میں ایک رپورٹ ای میل کی تھی جو ڈین، گرینا اور لوسی کے درمیان پیش آیا تھا۔“

”یہ پرانی بات ہو گئی۔“ میں نے کہا۔

”میں نے وہ رپورٹ ول سولیون کو بھیج دی تھی۔“

ول سولیون میرا وکیل ہے۔ میں نے اسٹیو سے پوچھا کہ اسے یہ رپورٹ بھیجنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

”میں تمام رپورٹیں اسے بھیج دیتا ہوں حالانکہ میں اس کی ضرورت نہیں ہے اور وہ کافی مہنگا بھی ہے لیکن صرف تم ہی اسے فارغ کر سکتی ہو۔“

میں ایسا کیوں کروں گی۔ ول سولیون ہفتے میں ایک بار مجھے ملنے آتا ہے اور میرے روزمرہ اخراجات کے لیے کچھ رقم دے جاتا ہے تاکہ میں اپنے بال رنگ سکوں اور جب ہمیں تفریح کے لیے باہر لے جایا جائے تو کچھ شاپنگ کر سکوں۔ ول میرے شوہر کا سب سے ذہین طالب علم تھا جب بین میا می یونیورسٹی میں قانون پڑھایا کرتا تھا۔

”میں ول کو پسند کرتی ہوں۔ یہ بتاؤ تم اتنا غصہ کہاں رہے؟“

”میں نے ایک نئی ملازمت شروع کی ہے اور فلوریڈا اٹلانٹک یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں۔ اس کی وجہ سے مصروفیت بڑھ گئی ہے۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ اسے یہ اندازہ نہیں کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی وجہ سے میں کتنی مصروف رہا کرتی تھی۔ میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے

ہوئے بولا۔ ”یہاں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور تمہاری پینشن اس کے لیے ناکافی ہے۔ جب تک میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا، میرے لیے تمہاری دیکھ بھال کے اخراجات برداشت کرنا مشکل ہے۔“

یہ جھوٹ تھا۔ کھل جھوٹ۔ جب وہ مجھے لے کر یہاں آیا تھا تو میں نے اسے ول سولیون کے ذریعے اپنے اکاؤنٹس تک رسائی دے دی تھی اور میں جانتی ہوں کہ سرمایہ کاری، جائیداد اور اثاثوں کی شکل میں لاکھوں ڈالرز موجود تھے۔ یہ میری اور بین کی محنت کی کمائی تھی۔ ممکن ہے کہ مجھے کل کی باتیں یاد نہ رہتی ہوں یا میں اپنے بیٹے کو نہ پہچان سکتی ہوں لیکن اعداد و شمار کے معاملے میں میری یادداشت غیر معمولی تھی۔ جب بین کا انتقال ہوا تو ہم دولت مند تھے اور اب اسٹیو غربت کا رونا رو رہا تھا۔

میں نے کانٹے سے مرغی کا کھڑا اٹھانا چاہا لیکن میرا دھیان ہٹ گیا اور میں نے اسٹیو کے ہاتھ کی پشت میں کانٹا گھونپ دیا۔

جو عورت مجھے دیکھنے آئی، اس نے پہلا سوال خوابوں کے بارے میں کیا۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”کیسے خواب؟ ان دواؤں کے ہوتے ہوئے کیا خواب دیکھ سکتی ہوں۔“

”تم جو دوائیں لے رہی ہو، ان سے خوابوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

اس کے لیے یہ کہنا آسان تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کی تھی جو زندگی کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے اور اسے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ عمر کے اس حصے میں میرے لیے اس بات کی کیا اہمیت ہے۔ ڈین بھی کمرے میں موجود تھا اور اسے گزشتہ چند ہفتوں کے دوران میرے غیر متوازن رویے کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ مثلاً گرینا اور لوسی سے ملنے اور باتیں کرنے کا مطالبہ، چند چیزوں کو کھانے سے انکار اور چند قوانین کی خلاف ورزی وغیرہ وغیرہ۔ ہاں، میں ان کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی لیکن اس عورت یا کسی اور کو یہ اختیار نہیں کہ میری زندگی کو کنٹرول کرے۔ میرے اندر سے آواز آئی۔ ”چلے جاؤ، سب چلے جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

ول سولیون اور میں مرکزی صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دبلا پتلا پچاس سال سے زیادہ عمر کا شخص ہے اور خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں کالج جاتی ہیں۔ اس روز وہ اپنے ہمراہ ایک بریف کیس بھی



”اسٹیو نے مجھے اس واقعے کے بارے میں رپورٹ ای میل کی ہے جو کئی مہینے قبل پیش آیا تھا اور حال ہی میں ہونے والے چند واقعات کے بارے میں بھی بتایا ہے۔“

”مثلاً میں نے اس کے ہاتھ کی پشت میں کانٹا گھونپ دیا تھا؟“

”وہ تجوری چڑھاتے ہوئے بولا۔“ ای میل میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ واقعہ کب پیش آیا؟“

”جب وہ گزشتہ بار مجھ سے ملنے آیا تھا؟“

”میں نے اسے دو دن پہلے دیکھا ہے۔ اس کا ہاتھ تو بالکل ٹھیک ہے۔“

یہ کیسے ممکن تھا؟ میں نے اتنی زور سے کانٹا اس کے ہاتھ کی پشت میں گھونپا تھا کہ پوری میز پر خون پھیل گیا تھا لیکن جتنا میں اس بارے میں سوچتی ہوں، اتنا ہی میرا یقین کم ہوتا جاتا ہے کہ واقعی ایسا ہوا ہوگا۔

”ممکن ہے یہ میں نے تصور کیا ہو۔ جانتی ہوں کہ میں اس کے ہاتھ میں کانٹا گھونپتا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کوئی دوسری سہولت برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ میں غریب ہو گئی ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں بھی قارغ کر دوں۔“

”دل کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔“ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اس نے یہ تجویز پیش کی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دو دن پہلے اس سے ملا تھا کیونکہ اس پر ایک بڑی چوری کا الزام لگ گیا ہے۔ اس نے اسٹاک سے تمہارا تمام سرمایہ نکال لیا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے اسے اپنے اکاؤنٹس کے اس حصے کے معاملات دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ اس نے تمہارے دوسرے اکاؤنٹس سے بھی رقوم نکالنا شروع کر دیں۔ ہم اس کے خلاف گزشتہ موسم گرما سے ایک کیس تیار کر رہے ہیں۔“

کاش میں کہہ سکتی کہ مجھے حیرت ہوئی لیکن اس کے بجائے میری زبان سے نکلا۔ ”اب کیا پوزیشن ہے؟ کیا میں بالکل تلاش ہو گئی ہوں؟“

”وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔“ جب بین اسپتال میں تھا تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ سارا پیسا ایک دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کر کے تمہارے لیے ایک ٹرسٹ بنا دوں۔ اسٹیو کو اس رقم کا علم نہیں ہے لہذا اس لحاظ سے تم اچھی پوزیشن میں ہو، میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو

کہ اپنے طور پر زندگی گزار سکتی ہو، اگر تمہیں گھر پر ہی تمام سہولتیں مہیا کر دی جائیں؟“

”میرے پاس کوئی گھر نہیں ہے۔ اسٹیو اسے بھی بچ چکا ہے۔“

”تمہارے پاس اب بھی ساحل پر ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ ہے جس کا گرائے دار گزشتہ ماہ چکا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس یا ٹر دوسری اسٹور تک جانے کے لیے کیوٹی کی طرف سے ٹرانسپورٹ کی سہولت موجود ہے۔ اس عمارت میں کئی عمر رسیدہ افراد رہتے ہیں۔ وہاں تیرا کی کا تالاب اور دیگر کئی سہولتیں بھی موجود ہیں۔“

”بہت اچھا خیال ہے۔ کیا میرا دوست جم بھی وہاں آ سکتا ہے؟ کیا تم اس کی نوآسی سے بات کر سکتے ہو؟“

”ول نے ایک بار پھر تجوری چڑھائی اور بولا۔“ جم رٹھ؟ میں اس سے اور اس کی نوآسی سے گزشتہ ماہ مل چکا ہوں۔ جب میں اور تم کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کی بات کر رہے تھے۔ بعد میں اس کی نوآسی نے فون کر کے کہا کہ اسے بھی اس مشورے میں شامل کیا جائے کیونکہ اگر تم کہیں چلی گئیں تو جم کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ اس کے تمہارے ساتھ جانے پر رضامند تھی۔“

مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں تھی اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ”جب ہم گزشتہ ماہ یہاں سے جانے کی بات کر رہے تھے تو تم نے اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے کے امکان کی جانب اشارہ کیوں نہیں کیا؟“

”کیونکہ اس وقت کچھ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔“

”میں کتنی جلدی یہاں سے جاسکوں گی؟“

”دو مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔“

”اتنی دیر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے تمہارے لیے کچھ اردلیوں کے انٹرویوز کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ اپارٹمنٹ کی صفائی بھی کروانی ہے۔“

”میں ایک بہت اچھے صفی کار کو جانتی ہوں۔“ میں نے اسے فون کے بارے میں بتایا اور اس کا فون نمبر دے دیا۔

”میں اسے فون کروں گا۔“ ول نے کہا تو میں نے فرط مسرت سے اس کے گلے میں ہانپیں ڈال دیں اور رونا شروع کر دیا۔

رات کی ڈیوٹی والا اردلی ڈین اپنی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ میرے کمرے میں آیا تو میں سوچنے لگی کہ یہ گھر کب جاتا ہے اور بھی چھٹی بھی کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف      ایڈفرس لنکس  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ      ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ      ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First  
See new posts at the top of News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow



ہاتھ میں بہت سی گولیاں تھیں۔ اس نے اپنے منہ سے کہنا شروع کیا۔  
انداز میں کہا۔ ”تمہاری دوا اس روز!“

وہ بھونڈے انداز میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے  
ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ تمہیں دہی اور چاکلیٹ کتنی پسند ہیں  
اور تم گھنٹوں تک اسٹور میں وقت گزارتی تھیں۔“

”ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“  
”تم نے مجھے ایک ہفتے کے لیے ملازمت سے معطل  
کر دیا تھا۔ اب میں تمہاری زندگی عذاب بنا دوں گا۔ یہ  
میرا تم سے وعدہ ہے۔ ممکن ہے کہ میں تمہاری گولیاں میں  
کوئی ایسی دوا ملا دوں جسے کھانے کے بعد تم اپنے آپ کو بھی  
نہ پہچان سکو۔“ اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور شرابی دھکیلتا ہوا  
ہال کی طرف چلا گیا۔

میں نے زبان کے نیچے رہ جانے والی گولیاں تھوک  
دیں اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر منہ صاف کیا۔ اس کے  
باوجود میرے منہ کا ذائقہ ٹھیک نہیں ہوا۔ اس کے الفاظ  
میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کہیں واقعی اس نے  
میری دواؤں میں کچھ ملا نہ دیا ہو؟

میرے سینے کے وسط میں شدید درد اٹھا، میں وا کر کا  
سہارا لیے بغیر ہی الماری کی طرف بڑھی۔ اس میں سے اپنا  
سوٹ کیس نکالا اور پینٹنگ شروع کر دی۔ میں دو ہفتے انتظار  
نہیں کر سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس دوران میری موت واقع  
ہو جاتی۔ ڈین کسی بھی وقت میرے کمرے میں آکر سوتے  
ہوئے میرے منہ پر ہتھیے رکھ کر دبا دیتا اور کسی کو خبر بھی نہ  
ہوتی۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے دماغ میں  
اتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ ”میں تمہاری زندگی  
عذاب بنا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

جب میرا سوٹ کیس بھر گیا تو میں نے اپنا ٹائٹ  
سوٹ اتارا۔ لی شرٹ، چٹلون اور آرام دہ جوتے پہنے اور  
جم کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ الماری کے سامنے کھڑا  
پینٹروں سے کپڑے اتار کر سوٹ کیس میں رکھ رہا تھا۔ وہ  
مجھے دیکھ کر چونک گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”دروازہ بند  
کر دو۔“

میں نے ایسا ہی کیا اور بولی۔ ”تم جارہے ہو جم؟“  
”ہاں جیسے ہی رات کی شفٹ ختم ہوگی اور صبح کی  
شفٹ والے آنا شروع ہوں گے۔ اس وقت یہاں کافی  
افرا تفری ہوتی ہے۔“

”تم کہاں جاؤ گے؟“  
”اگر مجھے کسی پل کے نیچے بھی رہنا پڑا تو رہ لوں گا  
لیکن اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ

میں کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی شاعرہ این سیکسن  
کی شاعری کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میری لمبی میڈی بھی  
میرے زانو پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈین نے کتاب کا سرورق  
دیکھا اور بولا۔ ”وہ پاگل عورت تھی۔ میں نے کالج کے دنوں  
میں اس کی شاعری پڑھی ہے۔ بالآخر اس نے خودکشی  
کر لی۔“

”ہیمینگوے نے بھی تو خودکشی کی تھی۔“  
”اس کا کیس مختلف تھا۔“  
”وہ کیسے؟“ میں بحث پر آمادہ تھی۔  
”اپنی دوا میں لے لو۔“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میں نے  
اس سے گولیاں لے کر منہ میں رکھیں اور انہیں زبان کے  
نیچے دبایا۔ اس پر یہ ظاہر کیا کہ اس نے مجھے جو پانی کا گلاس  
دیا ہے، اس کے ذریعے انہیں نگل لوں گی۔ وہ گولیاں نگھلنا  
شروع ہو گئی تھیں لیکن مجھے امید تھی کہ ان کے مکمل طور پر  
نگھلنے سے پہلے وہ کمرے سے چلا جائے گا پھر میں انہیں  
تھوک سکوں گی۔

”ہیمینگوے کی زندگی میں آنے والی عورت نے  
اس کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔“ ڈین نے جواب دیتے  
ہوئے کہا۔

بالکل جیسے میرے بیٹے کی زندگی میں آنے والی اس  
کی دو سابقہ بیویوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اس  
کے پاس میری رقم چرانے اور مجھے اس اولڈ ہوم میں داخل  
کرانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مرد ہمیشہ عورتوں کو ہی  
الزام دیتے ہیں چاہے وہ ماں، بہن، بیوی یا مالکن ہی کیوں  
نہ ہو۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ میں تو بس یہ چاہ  
رہی تھی کہ وہ فوراً میرے کمرے سے چلا جائے۔

”مارتھا کا خیال ہے کہ کل تم علاقے کی سیر کے لیے  
چلی جاؤ۔“ وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔  
”کہاں؟“

”اس چھوٹے شاپنگ سینٹر میں جہاں دہی کی  
دکانیں اور بک اسٹور ہے لیکن میں نے اسے بتا دیا ہے  
کہ گزشتہ چند روز سے تم اتنے پُر تشدد اور مخالفانہ طرز عمل کا  
مظاہرہ کر رہی ہو کہ تمہیں یا ہر جانے کی اجازت نہیں ہونی  
چاہیے۔“ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے  
انتقام جھلک رہا تھا۔



اس باہر میں لڑکی ان کی گرائی کر رہا ہوگا۔ رات کی ڈیوٹی پر  
 مامور نرس اور اردلی اسٹاف روم میں بیٹھے کافی پی رہے ہوں  
 گے اور اولڈ ہوم میں رہنے والے بوڑھوں کو برا بھلا کہہ رہے  
 ہوں گے۔

جب ہم ہنگامی دروازے پر پہنچے تو جم نے جھک کر  
 اندر دیکھا۔ کسی الارم کے بجنے کی آواز نہیں آئی۔ اس نے  
 چھڑی کی مدد سے اسے کھلا رکھا جب تک میں اس سے نہ گزر  
 گئی۔ میرے پیچھے وہ بھی پھسلا ہوا آگیا۔ ہمارے پیچھے  
 دروازہ آہستہ سے بند ہوا اور ہم اپنے سامنے ڈھلوان  
 سیڑھیاں دیکھنے لگے۔

”ہم اپنے بیگ سیدھے رکھ کر انہیں زور سے دھکا  
 دیتے ہیں۔“ اس نے تجویز پیش کی۔

پہلے میں نے اپنے سوٹ کیس کو دھکا دیا لیکن اس  
 کے لڑھکنے سے جوشور ہوا، اس کے پیش نظر ہم نے اس  
 کے سوٹ کیس کو سیڑھیوں سے اتارنے کا فیصلہ کیا۔ اس  
 کے لیے جم نے یہ ترکیب کی کہ اس نے چھڑی اپنے  
 کندھے پر لٹکائی۔ ایک ہاتھ سے سوٹ کیس پکڑا اور  
 دوسرا ہاتھ زینے کی ریٹنگ پر رکھا جبکہ میں نے دوسری  
 طرف کی ریٹنگ پکڑ رکھی تھی اور سوٹ کیس ہمارے  
 درمیان تھا۔ گوکہ میں وا کر کے بغیر چل سکتی تھی لیکن میری  
 جال ہموار نہیں تھی اور لینڈنگ تک پہنچنے سے پہلے میں  
 لڑکھڑا گئی اور میں نے جس طرف سے سوٹ کیس پکڑ رکھا  
 تھا، وہ حصہ سیڑھیوں سے ٹکرایا جس کی وجہ سے جم اپنا  
 توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ آگے کی جانب جھکا اور سوٹ  
 کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سیڑھیوں پر جا گرا۔

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے  
 پر دہشت نظر آئی لیکن اس کے پیچھے جو سرت چھپی ہوئی تھی،  
 وہ ہمیں برسوں بعد نصیب ہوئی تھی۔ ہم نے یہ کارنامہ انجام  
 دے لیا تھا اور ایسی خوف ناک جگہ سے نکلنے میں کامیاب  
 ہو گئے تھے جہاں ہماری سرگرمی کو نوٹ کیا جاتا تھا۔ ہماری  
 خوراک، دوائیں، بلڈ پریشر، آمدورفت، ہر بات کی کڑی  
 نگرانی ہوتی تھی۔ اب ہم اس سے آزاد ہو رہے تھے۔

جم اور میں لینڈنگ تک پہنچے۔ ہم نے اپنے اپنے  
 سوٹ کیسوں کے ہینڈل پکڑے اور اس دروازے کی  
 جانب بڑھے جو باغ میں کھلتا تھا۔ جب ہم باہر آئے تو  
 ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا اور آزادی کی  
 خوشبو سے ہماری طبیعت سرشار ہو گئی۔

”ہم دیوار سے باہر کیسے جائیں گے؟“ جم نے پوچھا۔

ڈین نے کیا کہا ہے۔ جب وہ کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا کہ  
 مجھے دماغی امراض کے اسپتال بھیجا جا رہا ہے کیونکہ میری  
 نواسی میرا دماغی معائنہ کروانا چاہتی ہے۔  
 ”مگر کیوں؟“

”کیونکہ اگر مجھے نا اہل قرار دیا گیا تو وہ میرے مالی  
 معاملات سنبھال لے گی۔“ اس نے الماری سے تمام چیزیں  
 نکال کر سوٹ کیس میں رکھیں اور کہا۔ ”ڈین نے مجھے یہ وجہ  
 نہیں بتائی لیکن میں جانتا ہوں کہ یہی بات ہے۔ میں نہیں  
 بلکہ میری نواسی پاگل ہے۔“

میرا بیٹا، اس کی نواسی، دونوں ہی لالچ جیسی متحدی  
 بیماری میں مبتلا تھے۔ ”ہم دن کی روشنی میں یہ سوٹ کیس  
 عمارت سے باہر نہیں لے جاسکتے۔“ میں نے کہا۔  
 ”ہم!“ وہ چوہکتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے جلدی جلدی دل سے ہونے والی  
 گفتگو کے بارے میں بتایا جو ہم نے اپارٹمنٹ کے  
 بارے میں کی تھی۔ ”میں نے ٹونی کو ایس ایم ایس کر دیا  
 ہے۔ وہ تیس منٹ میں دروازے پر پہنچ جائے گا۔ ہمیں  
 فوراً نکل جانا چاہیے کیونکہ ابھی اندھیرا ہے اور تم پل کے  
 نیچے رہنے کا خیال دل سے نکال دو۔ میرے اپارٹمنٹ  
 میں دو بیڈروم ہیں۔“

اس کے جھریوں بھرے گالوں پر آنسو بہنے لگے پھر  
 سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا۔ جس طرح چارلی چپلن کی  
 فلموں میں ہر چیز بڑی تیزی سے دکھائی جاتی ہے۔ جم نے  
 ہال میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”راستہ بالکل صاف ہے۔“  
 اس نے سرکوشی میں کہا۔ ”حفاظتی دروازے کی طرف چلو۔  
 وہاں سے ہم سیڑھیاں اتریں گے۔“

”الارم تو نہیں بجے گا؟“  
 ”وہ کئی مہینوں سے خراب ہے۔ چند روز قبل کچھ لوگ  
 اسے ٹھیک کرنے آئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو  
 یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ پورا سسٹم بدلا جائے گا۔“

جم نے دروازہ کھولا اور ہم راہداری میں داخل  
 ہو گئے جہاں مدھم روشنی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا  
 تھا اور سانس سینے میں انگ رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایک خواب  
 کے مانند غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ ہمارے سوٹ کیسوں کے پیچھے  
 فرش پر رگڑنے سے آواز پیدا کر رہے تھے لیکن مجھے امید تھی  
 کہ یہ آواز نرسنگ اسٹیشن تک نہیں جائے گی۔ راہداری میں  
 لگے ہوئے دو سکیورٹی کیمرے ہماری نقل و حرکت ریکارڈ کر  
 رہے تھے لیکن اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ رات کے



”جلدی سے چھو۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہارا سامان رکھتا ہوں۔“

جم اور میں اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ ٹوٹی نے سامان بچھلے حصے میں رکھا اور ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔ عملے کے چار افراد تیزی سے ٹرک کی جانب لپکے۔ ٹوٹی نے فوراً ہی ٹرک کی رفتار بڑھادی اور ان کی پہنچ سے بہت دور نکل گیا۔ میں ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھی اور میں نے مضبوطی سے اپنے زانو پکڑ رکھے تھے۔ ”کیا میں نے اسے مار ڈالا؟“ جم ہکلاتے ہوئے بولا۔

”تم نے اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کیا ہے۔“ ٹوٹی نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی مسٹر سولیون کو فون کر کے ساری بات بتادی ہے۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ کل صبح تمہارے بیانات لینے آئیں۔“

میری ساری انجمن دور ہو گئی۔ جم نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں نے ٹوٹی کا بازو تھام لیا۔ اس طرح ہم تینوں آپس میں جڑ گئے۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں مکمل لباس میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور میرا سوٹ کیس قریب ہی فرش پر رکھا ہوا تھا۔ یہ حقیقت جان کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ میں ابھی تک اولڈ ہوم میں ہی تھی۔ تو کیا وہ سب کچھ خیالی تھا؟ کیا اب میں حقیقت اور تصور کے درمیان فرق محسوس کرنے کے قابل بھی نہیں تھی لیکن اس میں کسی حد تک حقیقت تھی۔ مثلاً میں نے باہر جانے کے لیے مکمل لباس اور جوتے پہن رکھے تھے اور میرا سوٹ کیس تیار تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میرا تصور تھا۔

میں نے اپنا فون اٹھا کر چیک کیا۔ سارے بیانات پڑھ ڈالے لیکن ان میں کوئی پیغام ایسا نہیں تھا جس میں ٹوٹی سے کہا گیا ہو کہ وہ مجھے یہاں سے لے جائے پھر میں نے سولیون کو ایس ایم ایس کیا۔

”کیا ساحل پر میرا کوئی اپارٹمنٹ ہے؟“

”ہاں۔“ اس کا جواب آیا۔

”میں یہاں سے کب نکل سکتی ہوں؟“

”میں کل صبح تمہیں اور جم کو لینے آؤں گا۔“

یہ سنتے ہی میں جم کو یہ خبر سنانے کے لیے لڑکھڑاتی ہوئی ہال کی جانب بڑھی کہ ہم اپنی زندگی کا نیا باب شروع کرنے والے ہیں اور اس کے لیے اب اسے کسی ڈین نامی عفریت کو مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

مجھے اس کا کوئی اعلا لہ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اپنی دور کا سوچا تھا۔ ہم ٹنگ پکڑنڈی پر آگے بڑھتے گئے پھر اچانک ہی میرا سل فون بج اٹھا۔ ٹوٹی کی طرف سے پیغام تھا۔ ”میں دروازے پر ہوں۔ میرے پاس اب بھی گیٹ کی ایک چابی ہے۔ اس سے میں نے تالا کھول دیا ہے اور اب اپنی تاریخ روشن کر رہا ہوں۔“

میں نے جلدی سے اس جانب دیکھا لیکن جم پہلے ہی تاریخ کی روشنی دیکھ چکا تھا۔ ”وہاں.....!“ اس نے میرا کندھا پکڑتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”کیا وہ ٹوٹی ہے؟“

”ہاں اور اس نے گیٹ کا تالا کھول دیا ہے۔“

”چلو چلتے ہیں۔“

میں آگے تھی اور میرے سوٹ کیس کے پیچھے پکڑنڈی پر کھڑکھڑا رہے تھے۔ میرے پیچھے جم کی چھڑی کی ٹنگ ٹنگ سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ایک دروازہ کھلا اور تیز روشنی نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا پھر اس دروازے سے ڈین نمودار ہوا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں سے نکلنے ہوئے باہر چلے جاؤ گے۔“

”ہم بالکل سچی کر رہے ہیں۔“ میں نے تیز نیچے میں کہا۔ لیکن ڈین سیدھا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور راستہ روکتے ہوئے بولا۔ ”نہیں۔“ محاف کرنا روز اور تمہارا داکر کہاں گیا۔ کیا وہ محض دکھاوا تھا؟“

جیسے ہی اس نے میرے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا، جم کی چھڑی فضا میں لہرائی اور ڈین کی ناک پر جا لگی۔ وہ درد سے چلاتا ہوا پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ اس کے تھنوں سے خون بہنے لگا پھر چھڑی کی ضربیں مسلسل اس کے کندھوں، گھٹنوں، کمر اور جسم کے دوسرے حصوں پر لگتی رہیں۔ بالآخر ڈین بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے چاروں طرف خون ہی خون تھا۔

جم اپنی جگہ کھڑا ہوا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی چھڑی اب بھی فضا میں بلند تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ خوف اور دہشت نے اسے منجمد کر دیا ہے۔

”چلو۔“ میں اس کا بازو پکڑتے ہوئے پولی اور اسے آگے کی طرف کھینچنے لگی۔ ہم اپنے سوٹ کیس کھینچتے ہوئے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اولڈ ہوم کی روشنیاں ہم سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے ہم گیٹ پار کر کے ٹوٹی کے ٹرک تک پہنچے میں کامیاب



بیٹا، اللہ کے فضل سے، پاکستان کی سرحدوں پر امن ہے۔ وہاں کی حالتیں اور ان کی اصلاحیں میں  
روڈ انڈیا سڑکوں کی سہولتیں اور ان کی اصلاحیں میں  
سے ایک سڑک پر چڑھ کر میں وہاں کی سڑک پر چڑھ کر  
کرا سرائیل اپنا لئے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہمارے پاسپورٹ پر

دلے وقت کی زبردستی کی گئی ہو، اس کی اصلاحیں

## مکینہ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

جتنی انسیت ہمیں اپنے ماضی سے ہوتی ہے شاید اتنی اپنات اپنے حال سے  
بھی نہیں ہو پاتی... جب جب کوئی چند لمحوں کے لیے بھی ذرا پلٹ کر  
پدیکھتا ہے تو ٹھٹک سا جاتا ہے... وہ بھی کراچی کی محبت میں پور پور  
ڈوبا ہوا تھا مگر افسوس... جن مہکتی فضائوں اور بسنے والوں کے  
خلوص کو وہ گرہ میں باندھ کر لے گیا تھا زندگی کے آخری لمحات میں وہ  
گرہ اچانک اس طرح کھل گئی گویا جیسے اس کے ہاتھوں سے کوئی قیمتی  
خزانہ نکل گیا ہو۔



Downloaded From  
Paksociety.com



خواب ضرور دیکھتا ہے۔

حضرت سیدی اور حضرت مولیٰ کے زمانے میں پہنچ گیا تھا۔  
فرائین اور رونوں کے اس زمانے میں، جن کی داستانیں  
بچپن سے اتنی باریکی سے کہ ذہن کے پردے پر ہر ایک کی  
تصویر بن گئی تھی، واضح صاف ستھری اور زندگی سے  
بھرپور۔ یروشلم ایسا ہی شہر تھا۔ وہاں تاریخ سانس لیتی ہوئی  
محسوس ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی، دھیمے دھیمے  
تاریخی کتابوں کے اوراق کی طرح جو الٹتے الٹتے پڑھنے  
والے کو ڈراتے بھی ہیں اور حیرت زدہ بھی کر دیتے ہیں۔

انسان اپنے ماضی کی پرورش کرتا ہے اور ماضی سے  
کبھی بھی رشتہ نہیں توڑتا۔ اپنے حال کی تشریح بھی ماضی سے  
چاہتا ہے اور مستقبل بھی ماضی کی بنیاد پر بناتا ہے۔ یروشلم  
ایسی ہی ایک مثال تھی..... ماضی، حال اور مستقبل جہاں پر  
مل جاتے ہیں۔ اپنی شدتوں کے ساتھ وعدے لیے ہوئے،  
امیدیں کیے ہوئے اس رات میں خوب تھک ہار کر سویا تھا۔  
دوسرے دن صبح پرانے شہر کے بازار میں گھومتے  
گھاتے ہوئے، پتھروں کی پرانی عمارتوں، اینٹوں کے  
بنے ہوئے راستوں اور پتلی پتلی گھوٹوں سے ہوتے ہوئے  
میں نہ جانے اس گلی میں کیسے پہنچ گیا تھا کہ صبح راستہ مل ہی  
نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ پاکستانی پاسپورٹ کے ساتھ  
کسی ایسی جگہ نہ پہنچ جاؤں کہ جہاں داخلہ بند ہو۔ پھر خواخواہ  
کے مسائل میں الجھ جاؤں۔ فلسطینیوں کے ساتھ یہودیوں  
کے عجیب و غریب سلوک کی بہت سی داستانیں میں نے سنی  
ہوئی تھیں۔ یہی سوچتا ہوا میں ایک کشادہ گلی میں نکلا تھا کہ  
مجھے وہ پولیس والا نظر آیا تھا۔ جیک اوہل نام تھا اس کا۔

میں نے اسے اپنے ہوٹل کا کارڈ دکھایا جہاں مجھے جانا  
تھا۔ اس کی انگلی بہت معقول تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم بہت  
دور نکل آئے ہو۔ یہاں سے تمہیں بس یا ٹیکسی کرنی پڑے  
گی۔ چلو میں تمہیں بڑے روڈ تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

اس نے مجھے پولیس کی گاڑی میں بٹھالیا۔ درمیانے قد  
کے سالو لے رنگ کا آدی تھا وہ۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا  
کہ وہ اسرائیل میں ہی پیدا ہوا تھا اور یہیں پڑھ لکھ کر پولیس کی  
ٹریننگ کے بعد یروشلم پولیس میں کام کر رہا تھا۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں سے آیا  
ہوں۔ میرے بتانے پر کہ میں پاکستان سے آیا ہوں، اس  
نے پوچھا..... ”پاکستان.....؟ کراچی؟ کراچی؟“ میں نے  
مسکرا کر کہا کہ ہاں کراچی ہی میرے شہر کا نام ہے۔ اس کی  
آنکھوں میں ایک چمک سی عود کر آئی تھی۔ میرے پڑوس  
میں رہنے والے بھی اس شہر کا نام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

پاکستان اور سعودی عرب دنیا کے دو عجیب و غریب  
ملک ہیں۔ دونوں ملکوں کے شہری اسرائیل نہیں جاسکتے اور  
دونوں ہی ملکوں میں اسرائیل کو کرۂ ارض پر قائم و دائم رکھنے  
والے ملک امریکا کے شہریوں کو جو عزت و احترام میسر ہے،  
وہ امریکیوں کو امریکا میں بھی نہیں ہے۔ میں تو قاہرہ گیا ہی  
اس لیے تھا کہ مجھے یروشلم دیکھنا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے  
بڑے سے بزرگندہ والے اس شہر کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ میں  
نے پڑھا تھا کہ یہ بزرگندہ عروہی چٹانوں کے اوپر بنا یا گیا  
ہے۔ میرے ذہن میں ایک تصویر تھی، بیت المقدس کو دیکھنے  
کی ایک آرزو، تاریخ کو سمجھنے کی ایک تمنا تھی، اس بزرگندہ  
کے نیچے نماز پڑھنے کی ایک حسرت تھی اور اس کو ہی دیکھنے کی  
تمنا لے کر میں قاہرہ پہنچا تھا۔

قاہرہ سے بسیں جب اسرائیل کی سرحد پر پہنچی تھیں تو  
یہودی امیگریشن آفیسروں نے پاکستانی پاسپورٹ کو دیکھا  
اور پینتالیس ڈالر فیس لینے کے بعد مجھے ایک محدود مدت  
کے لیے اسرائیل میں گھومنے کا پروانہ بنا کر دے دیا۔ میں  
نے تین دن کی میعاد مانگی تھی، انہوں نے مجھے سات دن کا  
ویزا دے دیا تھا۔ ایک چھوٹا سا کارڈ جو مجھے اپنے پاس رکھنا  
تھا یا جیب کے اوپر لگانا تھا جس کے اوپر لکھا تھا ”سیاح  
پاکستانی اور سات دنوں کا قیام۔“

چھوٹا سا ہوٹل صاف ستھرا تھا اور پرانے یروشلم میں  
واقع تھا۔ میں نے اپنا سامان رکھا اور مسجد اقصیٰ دیکھنے کے  
لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں بھی مجھے ایک فلسطینی گائیڈ مل گیا تھا  
جس نے بزرگندہ، مسجد اقصیٰ، دیوار گریہ، انبیاء کی قبریں،  
مسلمانوں کے گھر، یہودیوں کی آبادی، مسلمانوں کا  
قبرستان، عیسائیوں کے مکان، حضرت مریمؑ کی رہائش گاہ  
اور صلاح الدین ایوبی کے قصبے سنائے تھے۔ بوڑھے فلسطینی  
گائیڈ کو ایک پتھر، ایک ایک انچ اور ایک ایک  
دروازے کھڑکیوں کے بارے میں سب کچھ پتا تھا۔ وہ  
فلسطین، یروشلم، مسلمانوں کی عیاشی اور یہودیوں کی تاریخ  
سے مکمل طور پر آگاہ تھا۔

مجھے پہلی دفعہ پتا لگا کہ یروشلم کا بزرگندہ، مسجد اقصیٰ کا  
حصہ نہیں ہے۔ یہ تو چٹانوں کے اوپر ایک گول گنبد ہے جس  
پر اندر سے سونا چڑھایا گیا ہے۔ مسجد اقصیٰ تھوڑے سے  
فاصلے پر بنی ہوئی ہے جہاں غیر مسلموں کا داخلہ ممکن نہیں  
ہے۔ وہ شام اور رات میری زندگی کی عجیب ترین رات  
تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں ہزاروں سال کا سفر کر کے



کراچی سے ہی اسرائیل آئے تھے۔ میری سبک دہی میں تو نہیں آتا کہ کراچی سے کیے آئے ہیں لیکن وہ اس شہر کا اسکا نام لیتے ہیں کہ ہمیں یاد ہو گیا ہے۔ میری ان کے خاندان سے بڑی دوستی ہے، انکل تو ابھی تک کراچی کو یاد کرتے ہیں مگر کسی اسرائیلی کا پاکستان جانا ممکن نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اسرائیل میں کسی کراچی کے خاندان کا ہاتھ مل جائے گا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرا ہوٹل آگیا۔ وہ بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہوا تھا۔

میں چل چل کر کافی تھک گیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں ٹھنڈے پانی سے خوب نہایا پھر جیکب اور کراچی کے بارے میں سوچتا ہوا شام کی چائے پینے کے ساتھ سی این این کی خبریں دیکھ رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ میری آنکھ دوکھنے کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ دوسری طرف سے جیکب بول رہا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ اس کے پڑوسی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، کیا میں ان کے ساتھ رات کا کھانا کھانا پسند کروں گا؟ اس سے اچھی بات تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جیکب کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا تھا کہ کراچی کے کسی پرانے آدمی سے ملنے میں کیا برائی ہے مگر کسی جھجک کی وجہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

جیکب شام سات بجے مجھے ہوٹل سے لینے آگیا۔ مغربی یروٹلم کی نئی عمارتوں میں جیکب کا کھلا کھلا سا پارٹمنٹ تھا جہاں بوڑھے سولومن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دبلا پتلا اسی پچاسی سال کا آدمی تھا۔ لائے قد کے ساتھ سفید بال جو کبھی سیاہ رہے ہوں گے اور لمبی نوکلی ناک اس کے چہرے پر بہت واضح تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کراچی کے گارڈن روڈ پر واقع گرینڈ لیز بینک سے نکلنے والا کوئی پرانا باری ہے۔ ویسی ہی رنگت تھی، وہی انداز۔ بڑے میاں نے مجھے غور سے دیکھا اور شلوم کہہ کر ہاتھ ملا پایا۔ وہ اچھی انگلیش بولتا تھا اور اسے ابھی تک سندھی اور گجراتی کے الفاظ یاد تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ وہ سندھی اور گجراتی بڑی اچھی بولتا تھا مگر اسرائیل آکر تقریباً بھول گیا ہے۔

بڑے میاں مجھ سے کرید کرید کر کراچی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بہت سی ایسی جگہیں جہاں میں سالوں سے نہیں گیا تھا، انہیں ان کے بارے میں کیا بتانا مگر میں انہیں مایوس نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بتایا کہ برنس گارڈن ویسا ہی ہے۔ گاندھی گارڈن کے چاروں طرف دکانیں بن

گئی ہیں۔ فریئر ہال اب کے ایچ سی کے زیر حجام ہے۔ کھٹن پر لوگوں کا میللا لگا ہے۔ سینڈز پت، ہاگس بے کے راستے اب اچھے بن گئے ہیں اور راستوں پر ابھی تک کراچی کی پرانی آبادی رہتی ہے۔

بڑے میاں کو کراچی کی ایمپریس مارکیٹ اور سولجر بازار کی دکانیں یاد تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ پولٹن مارکیٹ کا ٹاور ٹوٹ گیا ہے اور وہاں پر کوئی بھی گھنٹا گھر نہیں ہے۔ پریڈی اسٹریٹ کا مندر بند ہو چکا ہے اور کراچی میں ہندوؤں اور پارسیوں کے بنائے ہوئے پانی کے وہ تمام اڈے جہاں جانور پانی پیا کرتے تھے، ٹوٹ چکے ہیں۔

بڑے میاں نے پوچھا تھا کہ جانور اب کدھر پانی پیتے ہیں؟ کیا گھوڑا گاڑیاں، اونٹ گاڑی، گدھا گاڑی سب ختم ہو گئی ہیں؟

میں نے بتایا۔ ”ختم تو نہیں مگر کم ہو گئی ہیں۔“ پہلے میں نے سوچا کہ اب بڑے میاں کو کیا بتاؤں مگر پھر میں نے بتا دیا کہ اب کراچی میں انسانوں کو پانی نہیں ملتا ہے، جانوروں کی کسے فکر ہے۔ اب تو وہاں سڑکوں پر لوگوں کو گولی ماری جاتی ہے۔ بڑوں ہندو کراچی چھوڑ گئے جو جانوروں کو پانی پلاتے تھے۔ اب کراچی والوں کو کراچی والے خون پلاتے ہیں..... خون۔

بڑے میاں نے پوچھا کہ کراچی پورٹ ٹرسٹ کی خوب صورت بلڈنگ کیسی ہے؟ میں نے بتایا کہ ویسی ہی ہے، سامنے سے صاف ستھری مگر اندر دیواروں، سیڑھیوں اور کونوں پر کراچی کے نئے شہریوں نے پان کی پچکاری مار مار کر گندا کر دیا ہے۔ کراچی اب عجیب شہر ہے جہاں نہ بلیک ٹوائلٹ ہے، نہ ہی جانوروں کے پانی پینے کا اڈا۔ بے ہنگم عمارتیں ہیں جن کی سیڑھیوں پر پان کی بیکیں ہیں۔ کے پی ٹی کی بلڈنگ کا بھی وہی حال ہے جو بقیہ شہر کا ہے۔ بڑے میاں کے چہرے پر جیسے ایک سایہ سا آکر گزر گیا تھا۔ انہوں نے مزید پوچھا کہ ٹیلس، پیراڈائر اور کیمپٹل سنیا میں اب بھی فلمیں چلتی ہوں گی؟ میں نے کہا کہ یہ سنیا ہال ختم ہو گئے ہیں، ان جگہوں پر بلڈنگیں بن گئی ہیں۔ اوپن اور خوف ناک..... وہ کراچی کے چہرے پر ایسی ہی لگتی ہیں جیسے کسی حسینہ کے چہرے پر برص کا نشان۔

بڑے میاں کا شوق اور کراچی کی محبت دیکھ کر میں بہت جھوٹ نہیں بول سکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کراچی اب 1947ء سے پہلے کا کراچی نہیں ہے جہاں ہندو، مسلمان، پارسی، یہودی اور عیسائی ساتھ رہا کرتے تھے۔ جہاں



جالوروں کے لیے بننے کے پانی کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ جہاں سڑکیں روزانہ دھوئی جاتی تھیں۔ جہاں شام کے وقت انٹرنیشنل اسٹریٹ پر لوگ گھوما کرتے تھے، جہاں ٹرام کی ٹن ٹن شہر میں کسی موسیقی کی طرح رہتی تھی۔ جہاں کینٹنل سینما میں فلمیں چلتی تھیں اور سب لوگ دیکھا کرتے تھے، جب کراچی لیبیل اور تین ہٹی کے پل پر ختم ہو جاتا تھا۔ جہاں محبت کی ہوا تھی چلتی تھیں، جہاں پورٹ ٹرسٹ سے ریلوے ٹیک اور کسٹم سے کے ایم سی ٹیک قابلیت کی بنیاد پر نوکری ملتی تھی۔ جب اندرون سندھ کے زمین دار کراچی آرام کرنے آتے تھے، شہر سے محبت کرتے تھے، یہاں کے قوانین کی پاسداری کرتے تھے۔ جب کراچی چھوٹا تھا اور کراچی والوں کا دل بہت بڑا تھا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا، کسی مجرم کی طرح اور میں نے رک رک کر انہیں بتایا کہ اب کراچی بہت بڑا ہے اور کراچی والوں کا دل بہت چھوٹا ہے۔ اب کراچی میں زیادہ تر مندر بند ہو گئے ہیں۔ سڑکیں گندی ہیں۔ پرانی عمارتیں توڑ کر وہاں پر لوگوں نے پلازے کھڑے کر دیے ہیں، جہاں انسان کو جانوروں کی طرح ٹھونس دیا گیا ہے۔ کراچی کے نئے شہریوں نے پان تھوک تھوک کر کراچی کو چھک زدہ بنا دیا ہے۔ باہر سے آنے والوں نے چاہے وہ کسی بھی قومیت سے تعلق رکھتے ہوں، سب نے کراچی کو لوٹا ہے، اسے دیا کچھ نہیں ہے۔ اب انٹرنیشنل اسٹریٹ، زیب النسا اسٹریٹ ہے اور میکوڈ روڈ، چندر نگر روڈ ہے اور بندر روڈ، جناح روڈ ہے۔

اب وہ کراچی نہیں ہے جب گدھا گاڑی اور اونٹ گاڑی والے جاہل لوگ سڑکوں پر چلتے والے پیدل لوگوں کا خیال کرتے تھے۔ ٹریفک پولیس کے ہاتھ کے اشاروں پر رکتے تھے، اس کے ہی اشاروں پر چلتے تھے۔ اب بڑی بڑی گاڑیوں میں تعلیم یافتہ ڈرائیور اور مینی بس اور ٹرکوں کے جاہل ڈرائیور یکساں طریقوں سے انسانوں کو کچلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ آٹو چیک ٹریفک سگنل سے گزر جاتے ہیں۔ انسان، انسان سے نفرت کرتا ہے۔ گھروں میں مہس کر گولی مار دی جاتی ہے۔

بوڑھے کے چہرے پر دوبارہ تاریکی سی چھا گئی تھی۔ انہوں نے جیکب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”جیکب..... جیکب! ایسا تو یہاں بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایسا تو قدامت پسند یہودی، فلسطینیوں کے ساتھ بھی نہیں کرتے ہیں۔ نہیں، تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔“ بڑے میاں کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت صاف ظاہر تھی۔

میں نے کہا۔ ”نہیں، میں کچھ کہہ رہا ہوں بلکہ کچھ تو یہ ہے کہ بہت سا کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں چھوڑیں۔“ میں نے جائے کے ساتھ بکٹ کھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتائیں آپ کراچی میں کہاں رہتے تھے میں نے تو سب کچھ بتا دیا ہے۔“ بوڑھا سولومن دھیرے سے مسکرایا پھر دھیرے سے بولا۔ ”میں تو کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا۔ میرا باپ بھی کراچی میں پیدا ہوا تھا۔ میرا دادا کوچین سے تجارت کرنے کراچی جاتا تھا پھر نہ جانے کیا بات ہوئی اور کراچی اسے ایسا لگا کہ وہ کراچی میں ہی رہ گیا۔ سو بھر بازار میں رہتے تھے ہم لوگ اور بھگوان داس روڈ پر ہم لوگوں کا سنی گاگ تھا جہاں عبادت کرتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں پر اب ایک مارکیٹ بن گئی ہے اور بھگوان داس روڈ کا نام نشتر روڈ ہو گیا ہے۔“

”میں نے کراچی کے یہودی اسکول میں پڑھا تھا اور ڈی جے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی کراچی کے سنی گاگ میں چودہ سال کی عمر میں برت می لا کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ اس تقریب میں ایک یہودی بچہ اپنے ایمان کی توثیق کرتا ہے۔ اسی سنی گاگ میں اپریل کے ماہ میں ہماری یہودی کیونٹی پیساک کے تہوار کی عبادت کرتی تھی اور اکتوبر میں سو کوٹ کی عبادت ہوتی تھی۔ ہم لوگ اپنے گھروں کے باہر حضرت موسیٰ کی یاد میں چھوٹے چھوٹے خیمے لگاتے تھے جہاں مسلمانوں کی تواضع پھلوں سے کرتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے جس نے حضرت موسیٰ پر مہربانیاں کی تھیں۔ کراچی خوب صورت تھا، صاف تھا۔ نہ پانی کی کمی تھی اور نہ ہی جگہ کی کمی تھی اور شام کی ہوا میں کھانسی سے سمندر کی خوشبو لے کر آتی تھی تو ہم لوگ پاگل سے ہو جاتے تھے۔ تم نے اس عمر میں مجھے کیا بتا دیا ہے، مجھ سے میرا کراچی چھین لیا ہے۔ وہ حقیقت جس کے خواب میں بار بار دیکھتا تھا، اسے گندا اور میلا کر دیا ہے۔“ بوڑھے نے عجیب طرح سے مجھے دیکھا۔

”میں نے اپنے دماغ میں ایک کراچی بسا رکھا تھا اور اسرائیل کے اس جنگل میں جہاں یہودی نہ ہوتا بھی ایک جرم ہے، جہاں روز دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم یہودی لوگ کس طرح سے اس زمین میں ہزاروں سال سے بسنے والے فلسطینیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں..... اس پریشانی میں اسی کراچی کو یاد کر لیا کرتا تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔“

میں نے بھی دل میں سوچا کہ اچھا نہیں کیا میں نے، نہیں بتاتا تو کیا فرق پڑتا مگر اب بات ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا سولومن خود ہی بولا۔



”مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے تو یہی بتایا ہے جو ہے۔“ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔  
”ہمارا کراچی بہت اچھا تھا۔ ہم سب ہی باہر سے آئے تھے ایران اور ہندوستان کے پارسی، گوا اور بمبئی کے صیائی، کوچین اور تامل ناڈو کے یہودی، مقامی ہندو اور مسلمان سب نے مل کر کراچی کو بنایا تھا۔ سڑکیں، باغ، اسکول، کالج، کلب..... ہم لوگ انسان کو کیا جانور کو بھی نہیں مارتے تھے۔“

سولومن کے مزید کچھ کہنے سے پہلے آواز دی گئی، کھانا تیار ہے۔ کھانے کی میز پر سولومن نے دعا پڑھی۔ صدیوں پرانی یہودیوں کی دعا جس میں خدا کو حضرت موسیٰ سے کیے ہوئے وعدے کی یاد دہانی تھی اور شکر تھا کہ جس نے زمین پر بھی موسیٰ کے ماننے والوں کو اپنی رحمتوں سے نوازا ہے۔

میں نے تجس کے ساتھ دعا کا مطلب پوچھا۔ کھانا سادہ اور مزیدار تھا۔ کھانے کے دوران بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جیکب نے مجھے بتایا کہ اسرائیل میں دو طرح کے یہودی رہتے ہیں۔ ایک وہ جو یورپ سے آئے ہیں اور ایک وہ جو ایشیا اور افریقا سے آئے ہیں اور دونوں ایک کو دوسرے پر برتر سمجھتے ہیں۔ مذہب ضرور ایک ہے مگر ثقافت جدا جدا ہے۔ اب تو آپس میں شادیاں بھی ہوتی ہیں، پہلے یہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اسرائیل میں دو طرح کے یہودی رہتے ہیں۔ ایک وہ جو موجودہ اسرائیل کے رہتے ہوئے فلسطینیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو فلسطینیوں کو اس جگہ سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو بنیاد پرست یہودی ہیں، جنگی اور بالکل دیوانے جن کے سامنے کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور ان کی حرکتوں پر ہم لوگوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔

کھانے کے بعد ہم لوگ دوبارہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ چائے کے دوران سولومن نے مجھ سے پوچھا کہ کراچی میں اس کا ایک کام کرنے میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔

میں نے کہا بڑی خوشی سے۔ بوڑھے سولومن میں مجھے پرانے کراچی کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ ”ضرور کروں گا اگر ممکن ہو سکا تو۔“

اس نے کہا۔ ”جب اسرائیل بنا تھا اور کراچی میں ہندوستان کے مسلمان آنے لگے تھے تو کراچی کے دو ہزار

## پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں تمہارے خزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی اکتوبر کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں



ڈال سکا اور نہ ہی موسمِ غی جلا سکا۔ ہر سال ماں کی بڑی کے دن ہم صرف دعا کر کے رہ جاتے ہیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے، قبرستان کے شروع ہوتے ہی دائیں جانب عورتوں کی قبریں ہیں۔ اوپر سے گتو تو چودھویں لائن کی آخری قبر ہے۔ تم وہاں جا کر میری طرف سے پھولوں کا ایک گلدستہ رکھ دینا اور میری ماں ربیکا کو بتانا کہ اس کا بیٹا اسے بھولا نہیں ہے اور یہاں دیوار گریہ پر درود کر اس کے لیے دعا کرتا ہے اور اب اس کے پاس آنے والا ہے۔“

بوڑھے کا چہرہ فرط جذبات سے سرخ ہو گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

میں جیکب سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی رہا تھا کہ سولومن پھر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک کاغذ تھا جس پر عبرانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ممکن ہو سکے تو پھولوں کے ساتھ کاغذ کا یہ ٹکڑا اس کی ماں کے قبر کے سر ہانے رکھ دوں۔ مجھے اس نے غور سے دیکھا تھا جیسے تول رہا ہو پھر جیسے اسے یقین آ گیا کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ اس نے جی سانس بھر کر کہا تھا۔

”تم کو پتا ہے مکین شلوم کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ مکین شلوم کراچی کے سنی گائے کا نام تھا۔ بہت پرانا سنی گائے تھا وہ، صدیوں سے اس مکین شلوم میں ہم لوگ عبادت کر رہے تھے۔ مکین شلوم کا مطلب ہوتا ہے تحفظ دینے والی جگہ جہاں امان ملتی ہے۔ وہ جگہ تو ٹوٹ گئی ہے، ختم ہو گئی ہے، کراچی بھی اجڑی کا شکار ہے۔ ایسا لگتا ہے بڑی جگہ ہے بغیر کسی روح کے، نہ کوئی تحفظ ہے اور نہ ہی امان۔“

مجھے نہیں پتا تھا کہ شہروں کی روح ہوتی ہے۔ ان کی بھی کوئی روحانیت ہوتی ہے لیکن بوڑھے سولومن نے جس یقین سے یہ بات کہی تھی مجھے لگا تھا جیسے سچ کہہ رہا ہے۔ کراچی اب ایسا ہی شہر تھا بغیر کسی روح اور روحانیت کے۔ تھوڑی دیر مزید بیٹھنے کے بعد میں نے اجازت چاہی اور رات کے گیارہ بجے جیکب مجھے میرے ہوٹل واپس چھوڑ گیا۔

ایک دن میں خود سے گھومتا رہا اور ایک دن جیکب مجھے اپنے ساتھ نیا اور پرانا شہر دکھانے لے گیا پھر اسی راستے سے واپس قاہرہ آ کر میں کراچی واپس پہنچ گیا۔

کراچی کا وہی حال تھا۔ گندگی، گھٹن، دھواں، ٹریفک، بد اخلاقی، اچھے ہوئے گٹر، ٹوٹی ہوئی سڑکیں، نعروں سے بھری ہوئی دیواریں، اغواء، قتل، ڈکیتیاں اور چوریاں۔ میرا شہر، پیارا شہر کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

چار ماہ کی عمر کے بعد جب مجھے اپنے کاسٹل سے تھوڑی فرصت ملی تو میں پرانے کراچی میں نستر روڈ پر مکین شلوم کی تلاش میں پہنچا۔ نستر روڈ اور جیلہ اسٹریٹ کے جکشن پر جس جگہ پر سنی گائے ہوتا تھا، وہاں ایک کپڑے کی بڑی مارکیٹ تھی جس کے پیچھے ایک پرانی بلڈنگ کے بوڑھے مالک نے بتایا کہ یہاں پر یہودیوں کی عبادت گاہ ہوتی تھی۔ بوڑھے کو یاد تھا کہ مکین شلوم میں ہفتہ وار پابندی سے عبادت ہوتی تھی۔ بوڑھے نے ہی بتایا میوہ شاہ کے قبرستان میں یہودیوں کا قبرستان بھی ہے۔

میوہ شاہ کا قبرستان بہت بڑا ہے جہاں ہر قومیت کے الگ الگ قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی کراچی والوں نے ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا پسند کیا ہے۔ اصل قبرستان سے پہلے پتھروں کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے احاطے میں ایک جگہ پر چھ کونوں کا ستارہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے اوپر بنا ہوا تھا۔ میں پہچان گیا، یہی یہودیوں کا قبرستان تھا۔

یہاں بے تحاشا گھاس پھوس لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے کونے میں ایک کمراتھا، ٹوٹا بھوٹا، شاید سالوں سے وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ پرانی قبروں کے کتبے ٹوٹے ہوئے تھے اور بہت ساری قبروں سے غائب ہو چکے تھے۔ قبروں کی قطار غائب ہو چکی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ربیکا کی قبر تلاش کی جاسکے۔ میں کافی دیر تک بوڑھے سے کیے گئے وعدے کو نبھانے کے لیے قبروں کی قطاروں کو گنتا رہا، بھٹکتا رہا، تلاش کرتا رہا۔ حضرت موسیٰ کے ماننے والوں کے درمیان کراچی کے پرانے شہریوں کی قبروں کے درمیان، بیت المقدس میں کھوئے ہوئے ایک کراچی کے بیٹے کی ماں کی قبر نہیں تلاش کر سکا تھا۔ میں قبرستان میں سب سے صاف اور اونچی جگہ پر گیا، گلدستہ رکھ کر انگلیوں اور پتھر سے زمین کھود کر بوڑھے کا دیا ہوا خط مٹی میں دبا دیا۔

بوڑھے سولومن کو میں نے ایک خط لکھا جس میں ایک بہت بڑا جھوٹ تھا کہ قبرستان مجھے مل گیا تھا اور اوپر سے گزر کر چودھویں قطار میں آخری قبر محفوظ تھی۔ اس قبر پر میں نے پھول رکھ دیے تھے اور زمین میں تمہارا خط بھی دبا دیا تھا۔

شاید یہ میری زندگی کا پہلا جھوٹ تھا جس کے بعد میرے دل میں اطمینان تھا..... یہ سوچ کر کہ وہ بوڑھا یہودی اپنی ماں کا قرض لے کر نہیں مرے گا لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی تھا کہ مکین شلوم کا کیا ہوگا؟ کراچی کا کیا ہوگا؟



قطب الدین نے ایک مہم وکن روانہ کی اور اس کا سپہ سالار خسر و خان کو بنادیا گیا۔ مسلمان امراء کو بادشاہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ علاؤ الدین خلجی کے دو بیٹے خضر خان اور شادی خان خواجہ نظام الدین کے مرید تھے۔ قطب الدین کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اس کو خواجہ نظام الدین سے بغض پڑی ہو گیا تھا۔

## محبوب الہی

ضیائیم بگرامی دوسرا اور آخری حصہ

ولیعوں کا پیدا ہونے کے لیے گھرانوں کا انتخاب... اور پھر ان کی تربیت اور پرورش کے لیے انسانوں کا انتخاب... اس کے بعد حالات اور تعلیم کا سلسلہ... اگر غور کیا جائے تو یہ تمام مراحل عام انسانوں سے کس قدر مختلف اور دشوار ہوتے ہیں۔ گویا اللہ کے خاص بندوں میں شمار ہونے کے لیے آزمائشیں اور کٹھن مرحلے پہلے سے کاتب تقدیر لکھ دیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کون اس کے امتحان پر پورا اترتا ہے وہی اس کا برگزیدہ بندہ کہلائے گا... خواجہ نظام الدین سے کون واقف نہیں... کیا شان ہے آپ کی... تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی نامور اولیا سے ہوتے ہوئے بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے عنایات کی بارش کے بعد کہا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“ اور پھر حضرت بختیار کاکی کی دستار اور اپنا عصا بھی عطا فرمایا۔ اللہ کے مقبول بندوں کی یہی تونشائیاں ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے نشیب و فراز



Downloaded From  
Paksociety.com



قطب الدین کے درباری بھی حضرت نظام الدین سے جڑتے تھے وہ اپنی بادشاہ کو چاہتا تھا۔ آپ اپنے مریدوں میں پند و نصائح کی بات کر رہے تھے کہ نئے سلطان کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔

آپ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کیوں آئے ہو؟“

سلطان کے آدمی نے جواب دیا۔ ”نئے بادشاہ نے حضور کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ آپ دہلی سے کہیں اور چلے جائیں کیونکہ اس شہر میں آپ کی رہائش حکومت کے لیے خطرناک ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جا اپنے سلطان سے کہہ دے کہ میں ایک گوشے میں پڑا ہوں۔ تیرا کچھ بگاڑتا نہیں! تیرے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ میری طرف سے تجھ کو مطمئن رہنا چاہیے۔“

لیکن نئے بادشاہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے دربار میں آپ کے خلاف گستاخانہ باتیں شروع کر دیں۔ جب آپ کو یہ باتیں بتائی جاتیں تو فرماتے۔ ”وہ میرے خلاف باتیں ہی تو کرتا ہے، مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تا اور پھر یہ کہ ختم حقیقی اللہ ہے اگر بادشاہ تجاؤز کرے گا تو وہ خدا کی پکڑ سے کس طرح بچے گا۔“

کئی دن بعد پتا چلا کہ بادشاہ کا پیشاب بند ہو چکا ہے اطباء عاجز و پریشان ہیں کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بادشاہ کو وہ کون سی بیماری لاحق ہو چکی ہے جس کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں۔

آپ نے فرمایا۔ ”مرض کے لیے دوا نہیں، دعا درکار ہے اور یہ چیز اس کے پاس ہے نہیں۔“  
بادشاہ تین دن تک علاج کروا تا رہا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بادشاہ کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے! میں تجھ سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“  
ماں نے کہا۔ ”تو نے نظام المشائخ کو اکثر برا بھلا کہا ہے۔ یہ تو اسی کی سزا بھگت رہا ہے، ان کے پاس جا اور دعا کا طالب ہو۔ ان سے معافی مانگ۔“

بادشاہ نے ناگواری سے کہا۔ ”میں فقیروں کو نہیں مانتا۔ ان دکاندار لوگوں کی دعا سے میرے مرض کا کیا تعلق؟“  
اس کے باوجود ماں آپ کے پاس پہنچی اور رورو کر عرض کی۔ ”حضرت! بادشاہ نادان ہے، نوجوان ہے اور آپ سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ خدا کے لیے اس کی شوخیوں کو نظر انداز کر دیجیے اور اس کی خطا معاف کر دیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اس کی خطا اس وقت معاف کروں گا جب باعث خطائے بادشاہ کے پاس نہیں رہے گی۔“  
ماں نے پوچھا۔ ”میں حضرت کا مطلب نہیں سمجھی؟“

آپ نے فرمایا۔ ”بادشاہ کو خطرہ ہے کہ میں اس کی بادشاہی کے خلاف بغاوت کر دوں گا، اس لیے وہ بدگمانی کی خطا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ میں بادشاہ کے لیے دعا کروں گا مگر اس وقت جب وہ اپنی بادشاہی مجھ سے دے دے گا۔“

ماں دم بخود رہ گئی۔ چند دنوں میں بادشاہ کا حال بالکل ابتر ہو گیا اور اس نے تھک ہار کر خود ہی اپنی ماں سے کہا۔ ”ماں! میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ دوا کا وقت گزر گیا۔ دعا کا آگیا۔ آپ نظام المشائخ کے پاس تشریف لے جائیں اور ان سے میرے حق میں دعا کرائیں۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! میں ان کے پاس گئی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ میں دعا کر دوں گا لیکن اس وقت جب بادشاہ باعث خطائے ان کے حوالے کر دے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ماں! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“  
ماں نے جواب دیا۔ ”مطلب صاف ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ تو اپنی حکومت ان کے نام لکھ دے، وہ تیرے حق میں دعا کر دیں گے۔“

بادشاہ اپنی جان سے عاجز آیا ہوا تھا، بولا۔ ”ماں! آپ حضرت کے پاس جائیے اور ان سے کہیے کہ میں اپنی بادشاہی آپ کے نام کر دوں گا، آپ میرے مرض کو دور فرما دیجیے۔“

ماں آپ کی خدمت میں دوبارہ پہنچی اور عرض کیا۔ ”حضرت! میرا بیٹا اپنی بادشاہی آپ کو دینے کو تیار ہے، آپ دعا فرما دیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں بادشاہ کی بات پر اعتبار نہیں کر سکتا..... وہ اپنی بادشاہی لکھ کر دے دے، اس کے بعد میں دعا کروں گا۔“



ماں نے پوچھا: "ہنسنا! وہ کس طرح؟" آپ نے فرمایا: "بادشاہ اپنی بادشاہی دینے کا ایک فرمان لکھے اور اس فرمان پر اپنی مہر لگائے۔ سب امیروں و وزیروں کی تصدیق کرائے اور یہ فرمان میرے حوالے کر دے، تب میں اس کے حق میں دعا کروں گا۔"

بادشاہ کی ماں جزبہ ہو گئی، عرض کی: "لیکن حضور تو تارک الدنیا ہیں، آپ کو بادشاہی کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

آپ نے جواب دیا: "میں دنیا کا تارک بھی ہوں اور جو لوگ دنیا کا غلط استعمال کرتے ہیں، ان سے ان کی غلطیوں کا ترک کرانے والا بھی ہوں۔ جاؤ خاتون، محل واپس جاؤ۔ جب تک میری یہ شرط پوری نہیں ہوگی، میں دعا نہیں کروں گا۔"

ماں بادشاہ کے پاس واپس گئی اور سب کچھ صاف صاف بیان کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت امراء و وزراء کو طلب کیا۔ وہ جاکتی میں جھٹکا تھا۔ اس نے فرمان تیار کرایا اور ماں کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "ماں! آپ فوراً ان کے پاس جائیے اور میرے حق میں دعا کر دیجیے۔"

ماں یہ فرمان لے کر آپ کی خدمت میں پہنچی۔ فرمان آپ کے حوالے کر دیا، بولی: "حضرت! یہ فرمان حاضر ہے آپ خدا کے لیے جلد از جلد دعا فرما دیجیے۔"

آپ فرمان پڑھ کر مسکرائے، فرمایا: "خاتون! تم یہ فرمان واپس لے جاؤ۔ بادشاہ سے کہنا، میں نے تیری بادشاہی تیرے ہی پیشاب کی دھار پر مار دی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں۔ بادشاہ سے کہنا وہ اس فرمان کو اپنے امیروں اور وزیروں کے سامنے چاک کر دے، فوراً پیشاب آجائے گا۔"

ماں نے یہ فرمان بادشاہ کے حوالے کیا اور کہا: "نظام المشائخ نے فرمایا ہے کہ اسے اپنے امیروں اور وزیروں کے سامنے چاک کر دے، فوراً پیشاب آجائے گا۔"

یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ طوعاً و کرہاً اس نے اپنے امراء اور وزراء کو طلب کیا اور ان کے سامنے ہی اپنے فرمان کو چاک کر دیا۔ فرمان کے چاک ہوتے ہی بادشاہ کا پیشاب جاری ہو گیا۔ مسرت اور شادمانی سے بادشاہ کا حال غیر ہو گیا۔ ماں بھی بے حد خوش تھی، بولی: "بیٹے! سلطان المشائخ کا مرتبہ اب تو معلوم ہو گیا۔ ان کے پاس جا اور معافی مانگ۔ وہ بادشاہی سے بے نیاز ہیں۔ تیری بادشاہی کو تیرے ہی پیشاب کی دھار پر مار دیا۔ ان کی خدمت میں حاضری دے اور اپنی پچھلی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ۔"

بادشاہ ماں کی باتیں سن کر ہنسنے لگا، بولا: "ماں! آپ کتنی سادہ لوح ہیں، آپ بادشاہی کی باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔ جس شخص نے مجھ سے یہ فرمان لکھوایا تھا، میں اس شخص کو خوب جانتا ہوں۔ وہ بکا و کا ندار ہے۔ میں نے اپنی بادشاہی حکمت سے ایسا فرمان لکھوایا تھا کہ وہ اس کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے پیشاب آ گیا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں ان کی دعا کا کچھ دخل نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ دواؤں کی تاثیر سے ہوا ہے۔"

ماں نے بڑی افسردگی سے کہا: "بیٹا! خلی خاندان کی بس تو ایک ہی نشانی ہے۔ اپنے سب بھائیوں کو تو نے ہلاک کر دیا۔ تیرا باپ نظام المشائخ کا کتنا معتقد تھا۔ تیرے بھائی بھی ان کے مرید تھے۔ تیری فوج کے امراء اور وزراء بھی آپ کے بے حد عقیدت مند ہیں۔ تیری ان کی شان میں گستاخیاں تجھے تنہا چھوڑ دیں گی اور وہ سب تیرے دشمن ہو جائیں گے۔"

بادشاہ نے اپنی تلواریں کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا: "ماں! مجھے اپنی تلواریں پر بھروسہ ہے اور ساتھ ہی اپنی قوت بازو پر بھی..... میں نے اپنی بادشاہی کا راستہ اس تلواریں سے صاف کیا ہے۔ اب یہ ایک کاٹنا بانی رہ گیا ہے، اس کو بھی میری تلواریں بہت جلد صاف کر دے گی۔"

ماں اپنے بیٹے کی نادانی پر افسوس کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ بادشاہ نے اپنے مشیروں سے پوچھا: "اس خطرناک درویش کا کیا انتظام کیا جائے؟"

کسی نے جواب دیا: "حضور والا! نظام الدین چشتیہ سلسلے کے بزرگ ہیں اور ملتان کے مشائخ سہروردیہ ہیں۔ آپ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے پوتے شیخ رکن الدین کو دہلی بلوائیں اور اپنے امراء اور دوسرے معززین کو مجبور کریں کہ وہ سب شیخ رکن الدین کی بہت زیادہ عزت کریں پھر جب....."

بادشاہ سب کچھ سمجھ گیا۔ خوشی میں بولا: "میں سب کچھ سمجھ گیا۔ آپ لوگ ان دونوں خاندانوں کے حسد و رقابت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"



میر نے کہا۔ ”بیشک بالکل ممکن بات ہے۔“  
بادشاہ نے اسی دن رکن الدین کے نام ایک شاہی دعوت نامہ ملتان روانہ کر دیا۔ اس دعوت نامے پر شیخ رکن الدین ملتان سے روانہ ہو گئے۔ جب یہ دہلی کے قریب پہنچے تو بادشاہ کے حکم کے بموجب وزراء، امراء، مشائخ اور علمائے شیخ کے استقبال کے لیے شہر کے باہر پہنچ گئے۔ خود بادشاہ دوسرے دن صبح شہر کے باہر پہنچا۔ بیرون شہر ایک عارضی بستی قائم ہو گئی تھی۔ بادشاہ کی نظریں ملتان سے آنے والی راہ پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد چند گھوڑے آتے دکھائی دیے۔ جب یہ قریب آئے تو ان میں ایک بزرگ کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ یہ شیخ رکن الدین خود تھے۔ بادشاہ اپنے گھوڑے سے اتر کر پیادہ شیخ کی طرف بڑھا اور ان کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ شیخ نے گھوڑے سے اترنا چاہا مگر بادشاہ نے گھوڑے کی رکاب تھام کر عاجزی سے سوال کیا۔ ”حضور کو میرے سر کی قسم، آپ اسی طرح گھوڑے پر رہیں اور یہ فرمائیں کہ اس شہر دہلی میں سب سے پہلے آپ سے کون ملا؟“  
شیخ نے جواب دیا۔ ”اس شہر کا سب سے اچھا آدمی۔“

بادشاہ نے درخواست کی۔ ”آپ براہ کرم اس شخص کا نام بہ آواز بلند فرما دیجیے۔“  
شیخ نے پوچھا۔ ”کیا اس سب سے اچھے آدمی کا نام لینا بہت ضروری ہے؟“

بادشاہ کا خیال تھا کہ سب سے پہلے وہی بادشاہ سے ملا ہے، بولا۔ ”حضرت! میں اس کا نام حاضرین کے علم میں اس لیے لانا چاہتا ہوں کہ یہ سب بھی اس کا احترام کریں اور اس کے حکم کی تعمیل اپنے حق میں موجب رحمت و سعادت گردانیں۔“  
شیخ نے بلند آواز سے فرمایا۔ ”لوگو! اس شہر میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہے اور اس کو سارا ہندوستان شیخ المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے نام سے یاد کرتا ہے۔“

ہجوم میں اظہارِ ادب اور خوشنودی سے ہلکا سا شور بلند ہوا۔ بادشاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”شیخ! آپ کیسی متضادات کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے یہ فرمایا تھا کہ سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو سب سے پہلے آپ سے ملا ہے اور اب آپ یہ فرما رہے ہیں کہ سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو یہاں موجود نہیں ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟“  
شیخ نے جواب دیا۔ ”بادشاہ! تو نہیں جانتا کہ سلطان المشائخ دہلی سے ایک منزل دور میرے استقبال کو پہنچ چکے تھے۔ مجھ سے سب سے پہلے وہی ملے تھے اور میرا اشارہ انہی کی طرف تھا کہ دہلی کے سب سے اچھے آدمی وہی ہیں۔“

بادشاہ شیخ سے بھی ناراض ہو گیا اور واپس جا کر شیخ ضیا الدین رومی نامی درویش کا مرید ہو گیا۔ پھر یہ چرچا ہونے لگا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ کے خلاف ہر روز صلاح مشورے کرتا رہتا ہے۔ بادشاہ چاہتا ہے کہ آپ کو دہلی سے جلا وطن کر دیا جائے۔  
شام کو مغرب کے بعد سلطان المشائخ کی خانقاہ میں مجلس جمی۔ اس مجلس میں بہت زیادہ لوگ تھے۔ اس دوران ایک نیا شخص مجلس میں داخل ہوا اور کھت لہجے میں پوچھا۔ ”شیخ نظام الدین بدایونی کس کا نام ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
خواجہ سید محمد امام کھڑے ہو گئے اور پوچھا۔ ”ان سے مجھے کیا کام ہے؟“

اجنبی نے جواب دیا۔ ”میں سلطان کی طرف سے شیخ نظام الدین بدایونی کے نام ایک فرمان لایا ہوں۔“  
خواجہ سید محمد امام نے فرمایا۔ ”جو خط تولا یا ہے، مجھے دے دے تاکہ میں اسے حضرت کی خدمت میں پیش کر دوں۔“  
سلطانی قاصد نے شاہی خط خواجہ سید امام کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے یہ خط پہلے خود پڑھا، اس کے بعد سلطان المشائخ نے حکم دیا۔ ”سلطان کے خط کو بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا جائے۔“  
”سلطان کو معلوم ہوا ہے کہ شیخ نظام الدین بدایونی کے اصطلیل میں گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھے جاتے ہیں حالانکہ وہ تارک الدنیا ہونے کے دعوے دار ہیں، لہذا یا تو وہ اس کا معقول جواب دیں ورنہ اس دنیاوی کروفر کو لے کر دہلی سے کہیں اور چلے جائیں۔“

خواجہ نظام الدین نے ہندو ہر دیو سے فرمایا۔ ”قلم دوات لاؤ۔“  
جب قلم دوات حاضر کر دیے گئے تو آپ نے سید محمد امام سے فرمایا۔ اس خط کی پیشانی پر لکھ دو۔  
کجا اندا ختم در در  
مگر اندا ختم در در

(میں نے اپنے دل میں سونے کی میخ نہیں گاڑی بلکہ مٹی میں گاڑی ہے)

سلطان کا خط قاصد کو واپس دے دیا گیا، آپ نے فرمایا۔ ”میں نے جواب خط کی پیشانی پر لکھوا دیا ہے، لے جا اور بادشاہ کو



**450/- انسان اور دیوتا**  
 پہلی سامراج کے ظلم و بربریت کی مدد میں پانی داستان جس نے اچھوتوں کو راول محل اختیار کرنے پر مجبور کیا

**300/- پاکستان سے دیارِ حرم تک**  
 تاریخی پس منظر میں کشمیل کے علاقہ دیپ سترہ جاز

**450/- آخری چٹان**  
 سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شہادت جو تاریخوں کے سلی رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

**225/- سو سال بعد**  
 گاندھی جی کی مہاتما جی، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

**325/- سفید جزیرہ**  
 بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

**475/- شاہین**  
 انڈس میں مسلمانوں کے کشیب خرازی کی کہانی

**475/- معظم علی**  
 لارو کاٹھو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستانِ شہادت

**550/- خاک اور خون**  
 سکھ، برہمنی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستانِ خونچکاں

**450/- کلیسا اور آگ**  
 فروری 1947ء کی عید کی مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوطِ غرناطہ اور انڈس میں مسلمانوں کی گھٹت کی داستان

**599/- قافلہ حجاز**  
 راجہ کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

**425/- محمد بن قاسم**  
 عالم اسلام کے 17 سالہ ہیر کی تاریخی داستان، جس کے حوالے سے مسلمانوں نے ستاروں پر کشیدیں مثال دیں

**300/- پورس کے ہاتھی**  
 1965ء کی جنگ کے پس منظر میں غیور اور دھڑلے کے سامراجی عزائم کی گھٹت کی داستان، جنہیں ہر گلابی مدنی کھائی پڑی

**550/- اور تلوار ٹوٹ گئی**  
 شیر میسور (نچھ سلطان شہید) کی داستانِ شہادت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

**500/- گمشدہ قافلے**  
 انگریز کی اسلام دشمنی، پٹنہ کی عید کی دسکری اور سکوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں تھلانے کی لڑوہ خیر جنگی داستان

**300/- داستانِ مجاہد**  
 فتح پور کے بعد راجہ دھرم پور نے راجوں مہاراجوں کی مد سے دوسو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فتح محمدی کی حرکت لارو داستان

**450/- پردیسی درخت**  
 اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکوں کے گھڑ جوڑی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

**500/- یوسف بن ناشفین**  
 انڈس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے اکرام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گم گم پانی کی داستان

**550/- آخری معرکہ**  
 جب سومات کے بہت سے کوڑے نے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا کہ اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے ترشہ اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بہت فروش نہیں، بہت کم کھانا ہوتا ہوں" تہذیب و ثقافت کی ایک خطہ بھی خیر

**اندھیری رات کے مسافر**  
 انڈس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخیز مناظر، یورپوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم تاک داستان

**475/- ثقافت کی تلاش**  
 نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں کا ایک تجربہ، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طیلوں کی تھاپ ہتھکڑوں کی چمناچمن کے ساتھ پامال کیا

**625/- قیصر و کسریٰ**  
 تلپور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندِ خدا اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

## سب سے زیادہ پڑھنے والی کتابیں



- 165/- اقوال حضرت علی الرضی
- 165/- اقوال آئمہ کرام
- 195/- حکایات گلستانِ سعدی
- 140/- اقوال شیخ سعدی
- 180/- حکایات رومی
- 170/- دلچسپ و عجیب حقائق
- 199/- حکایات بوستانِ سعدی

- 150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں
- 180/- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات
- 165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات



## ادولفت

(جامع ترین)  
 مضمون سے لے کر تصانیف کے اندراج کے ساتھ روزنامے کا پہلا نمونہ

042-35757086 022-2780128  
 021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو



## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





جب سلطانی قاصد خط لے کر چلا گیا تو آپ نے سن بادر ہستہ ہستہ فرمایا۔ ”میرا اندازم درمل، میرا اندازم درمل، مگر اندازم درمل۔“ (بلکہ مٹی میں گاڑی ہے بلکہ مٹی میں گاڑی ہے بلکہ مٹی میں گاڑی ہے)

صبح ہوتے ہوئے یہ خبر عام ہو گئی کہ بادشاہ کے پیر و مرشد شیخ عیسیٰ الدین رومی کا چانک انتقال ہو گیا۔

تیسرے دن مرحوم شیخ کی خانقاہ میں سوئم کی نیاز میں حضرت نظام الدین بھی اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ وہاں پہلے ہی سے بہت سے لوگ موجود تھے۔ سلطان قطب الدین بھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ سلطان المشائخ جیسے ہی خانقاہ میں داخل ہوئے، ایک پھل سی میچ گئی اور سلطان کے رعب و دبدبے کو بالائے طاق رکھ کر لوگ آپ کے آس پاس پہنچ گئے۔ سلطان نے آپ کو کون انکھیں سے دیکھ کر اپنے ایک امیر کے کان میں کچھ کہا۔ وہ امیر آپ کی خدمت میں پہنچ کر گویا ہوا۔ ”حضرت! سلطان قطب الدین غلی اس مجلس میں موجود ہیں اگر آپ سلطان کو سلام کرنا چاہیں تو میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔“ سلطان المشائخ نے جواب دیا۔ ”اس وقت میں تلاوت کلام پاک میں مشغول ہوں، اس حالت میں کسی شخص سے بھی ملاقات کرنا جائز نہیں۔“

قرآن خوانی کے بعد مرحوم شیخ کی نیاز ہوئی اور سلطان آپ کو کون انکھیں سے دیکھتا ہوا خانقاہ سے چلا گیا۔ اس کے بعد آپ بھی چلے گئے۔

اس واقعے کے کئی دن بعد چند امراء نے سلطان کی طرف سے آپ کی مجلس میں حاضری دی اور کہا۔ ”حضرت! سلطان نے فرمایا ہے کہ چاند رات کو دہلی کے مشائخ مجھے سلام کرنے اور نئے چاند کی دعا دینے دربار میں آتے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ ایک بار بھی نہیں آئے۔ آپ کا یہ طرز عمل بادشاہ کی توہین کا موجب ہے لہذا آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس چاند رات کو حضرت بھی نئے چاند کا سلام کرنے اور دعا دینے کے لیے دربار میں آئیں۔“

آپ نے نہایت مہر و وقار لہجہ میں جواب دیا۔ ”بادشاہ سے کہہ دینا کہ اس سے پہلے نہ تو میرے کسی بزرگ نے دربار میں حاضری دی ہے اور نہ میں نے ایسا کیا، اس لیے میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتا ہوں۔“

اسی شام کو چاند رات تھی، آپ کا خادم خاص خواجہ اقبال پاکی لے کر حاضر ہو گیا اور آپ سے کہا۔ ”حضرت! پاکی حاضر ہے۔“

سلطان المشائخ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ کس لیے؟“

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ ”حضور! ہم سب پر رحم فرمائیں، آپ کو نہیں معلوم بادشاہ نے حکم دیا ہے اگر خواجہ نظام الدین خوشی سے نہ آئیں تو انہیں تھوڑے زور سے لایا جائے۔ حالانکہ خانقاہ کے باہر آپ کے سیکڑوں جاں نثار جمع ہو گئے ہیں اور وہ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ اگر سلطان کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی ہوئی تو وہ سب آپ پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔“ آپ نے فرمایا۔ ”اقبال! یہ آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ باہر جو لوگ جمع ہو گئے ہیں، ان سے کہہ دو کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں کیونکہ میرا بچانے والا ہر وقت میرے ساتھ ہے۔“

مہندر ہر دیو ہاتھ جوڑ کر آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ”حضرت! شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ اصل فتنہ و گجراتی ہندو ہے جو بظاہر مسلمان ہو کر خسرو خان بن گیا ہے۔ سلطان اس ہندو زادے پر عاشق ہے اور یہ ساری شرارتیں خسرو خان کی طرف سے ہی سرزد ہو رہی ہیں کیونکہ خسرو خان جانتا ہے کہ جب تک آپ دہلی میں موجود ہیں، وہ ہندو حکومت قائم نہیں کر سکتا۔“

آپ نے متحسم ہو کر فرمایا۔ ”مگر ہر دیو! تم بھی تو ہندو تھے اور کیا تم علاؤ الدین غلی کے خلاف نہیں تھے؟ کیا تمہارے دل میں انتقام کا جذبہ نہیں؟“

ہر دیو نے جواب دیا۔ ”یہ سب کچھ ہے مگر میں آپ کا غلام ہوں۔ میں نے سچے دل سے اسلام قبول کیا ہے مگر خسرو خان نے بناوٹی اسلام قبول کیا ہے۔ میں گواہ ہوں کہ اس نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ یہ مسلمان جو باہر سے آئے ہیں، انہوں نے ہم ہندوؤں کو اپنا غلام بنالیا ہے۔ میں تجھ کو دکھاؤں گا کہ ان مسلمانوں کو میں کیسی عبرت ناک سزا دوں گا۔ اس پر میں نے اس سے کہا کہ تو جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اس سے تمام ہندو مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔“

خواجہ نظام الدین ہر دیو کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ جواب میں آپ نے ایک شعر پڑھا۔

اے رو بہک چرانہ نستی بجائے خویش

باشیر پنچہ کردی دیدی مزائے خویش



اس کے بعد ہر ویسے چلا گیا۔ مجلس پر غصہ ہوئی کہ ہر شخص اگر غمزد اور غمزہ خیز نہ ہو تو اس کیسے اچھا ہوتا ہے اور بادشاہ کی طرف سے کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔

دوسرے دن علی الصباح جب لوگ سو کر اٹھے تو ہر طرف یہ خبر گشت کر رہی تھی۔  
 ”نصف شب کو سلطان قطب الدین خلجی کو محل ہزارستون کی چھت پر مندو بچے خسرو خان نے قتل کر ڈالا۔“

☆☆☆

خسرو خان نے اقتدار سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ میں دین محمدی کا ناصر و مددگار ہوں۔ میرا نام ناصر الدین محمد ہے۔ جو میری اطاعت کرے گا، اپنے عہدے پر بحال رہے گا..... جو سرکشی کرے گا، مارا جائے گا۔

ہردیو نے اپنے بیرومرشد سے عرض کیا۔ ”حضرت! خسرو خان کٹر ہندو ہے۔ میری اور میرے باپ کی خیر نہیں ہے کیونکہ خسرو خان ہندو ہے اور میں مسلمان ہو چکا۔ میرے باپ کا مشورہ ہے کہ ہمیں دہلی چھوڑ کر دیوگرھ چلا جانا چاہیے لیکن میں حضرت کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تیرے باپ کا مشورہ درست ہے۔“  
خسرو خان نے ہندو فوج کی بھرتی کا حکم دے دیا۔ مسجدیں جلا دی گئیں۔ قرآن پاک پھاڑ دیے گئے۔ امراء پر پھرے  
بٹھا دیے گئے اور بڑے بڑے عہدے ہندوؤں کے حوالے کر دیے گئے۔

خسرو خان نے تمام صوبے داروں کو خلعت بھیجی۔ دوسروں نے تو ان خلعتوں کو قبول کر لیا مگر ملتان اور دیوبال پور (بہاولپور) کے صوبے دار غازی ملک نے اس کو لوٹا دیا اور خسرو خان کو پیغام بھیجا۔ ”میں خاندانوں اور غداروں کی سرکوبی کے لیے دہلی آ رہا ہوں۔ تم میرا انتظار کرو۔“

اتنی دیر میں خسرو خان نے ہندوؤں کی دولاکھ کی فوج تیار کر لی تھی۔

فرماتے۔ ”جو کچھ ہوا دیکھ لیا، جو کچھ ہوگا اسے بھی دیکھ لو گے پھر پریشانی کس بات کی؟“

سرسا کے قریب غازی ملک اور خسرو خان کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ غازی ملک اپنی فوج کی کمان خود کر رہا تھا اور خسرو خان کی فوج کی کمان اس کے بھائی جاہر یا کے ہاتھ میں تھی۔

اور سرکوشان کی فوجوں نے ان کے بانی جابر بن عبد اللہ سے ہاتھ بندھ کر لیا۔  
 ۱۔ دونوں فوجوں میں غضب کا معرکہ ہوا۔ آخر خسرو خان اور جابر یا کی فوج کو شکست ہو گئی۔ جابر یا دہلی میں مور چاند ہو گیا۔  
 کیونکہ وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے حوض خاص کے غریبوں میں مور چے بنائے اور اپنی مدد کے لیے حاروں طرف کے  
 ہندو را جاؤں کو طلب کر لیا۔ جب یہ کمپنیاں دہلی پہنچیں تو مسلمان ان کی کثرت سے مرعوب ہو گئے اور ان کے حوصلے پست ہو گئے۔  
 غازی ملک ان حالات اور نفسی کیفیتوں کا نہایت عمیق مطالعہ کر رہا تھا۔ حوض خاص کے سامنے دونوں فوجیں پھر آمنے  
 سامنے کھڑی ہو گئیں۔ دونوں میں غضب کا معرکہ ہوا اور اس معرکہ میں ہندوؤں کو شکست ہو گئی اور غازی ملک فاتح رہا۔ اس نے  
 اپنے بیٹے جو نا خان کو حکم دیا کہ وہ جابر یا اور خسرو خان کو تلاش کرے۔ دونوں جہاں بھی ملیں گرفتار کر لیا جائے۔ ان کا زندہ رہنا  
 خطرے سے خالی نہیں۔

جو ناخاں نے دونوں کو تلاش کر کے اپنے باپ غازی ملک کے حوالے کر دیا۔ جب ان دونوں کو غازی ملک کے سامنے پیش کیا گیا تو خسرو خان نے کہا۔ ”غازی ملک! آج تو ہندوستان کا شہنشاہ ہے، کل تک میں بادشاہ تھا۔ پس تو مجھ سے وہ سلوک کر جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔“

غازی ملک نے جواب دیا۔ ”پیشک میں تیرے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔ تو نے جو سلوک قطب الدین خلجی سے کیا ہے، وہی میں تجھ سے کروں گا۔“

اس کے بعد غازی ملک نے ان دونوں کو اپنے بیٹے جو ناخان کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ ان دونوں کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھو کرو۔

جو نا خان ان دونوں کو محل ہزارستون کی چھت پر لے گیا۔ اس کے بعد دونوں سے پوچھا۔ ”تم دونوں سچ بتانا، دونوں نے قطب الدین خلجی کو کس جگہ قتل کیا تھا؟“

دونوں نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور ایک جگہ دکھادی، بولے۔ "اس جگہ۔"



جونا خان نے دو سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”(ان دونوں کی گردنیں ایک ہی وار میں اڑا دو۔“ حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں کو کھوار کے ایک ہی وار سے قتل کر دیا گیا۔ جونا خان نے ان دونوں کی لاشیں چھت کے نیچے پھینکوا دیں۔ اب غازی ملک غیاث الدین تغلق کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔

ہردیو نے یہ خبر دیو گڑھ میں سنی تو وہ دوبارہ اپنے باپ کے ساتھ دہلی کی طرف چل پڑا۔ غیاث الدین تغلق کی ماں ہندو تھی اور باپ تاتاری مسلمان۔ اس کی بیوی بھی ہندو تھی۔ جونا خان جو بعد میں سلطان محمد تغلق کہلایا، اس ہندو بیوی کا بیٹا تھا۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق سے ہندو بھی خوش تھے اور مسلمان بھی۔ جب ہردیو اپنے باپ کے ساتھ حضرت نظام الدین کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ”ہردیو! ہم تجھے بھولے نہیں تھے، تم دونوں کی آمد مبارک ہو۔ وضو کی پابندی کا کیا حال ہے؟“

ہردیو نے جواب دیا۔ ”حضرت! سفر کی دشواریوں میں وضو کی پابندی نہیں ہو سکی۔“ آپ ابدیدہ ہو گئے، فرمایا۔ ”ہردیو! انسان کے پیدا ہوتے ہی دنیا کا کھن سفر شروع ہو جاتا ہے مگر اس سفر کی آسانی اس بات میں ہے کہ ہم اپنے خالق اور اپنے معبود کو یاد رکھیں، اس کو اپنے سامنے رکھیں۔“

اس کے بعد آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر فرمایا۔ ”ہردیو! سلطان محمود غزنوی کا ایک بہت مقبول غلام تھا ایاز اور اب تو بھی رسول مقبول ﷺ کی غلامی میں آچکا ہے۔ رسول مقبول ﷺ کا ایک نام احمد علیؑ بھی تھا چنانچہ اسی نسبت سے میں نے تیرا نام احمد ایاز تجویز کیا ہے۔ تو اپنی توجہ لفظ احمد کی طرف ہمیشہ رکھ۔ جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو یہ خیال کرتو احمد کا الف ہے۔ جب رکوع میں ہو تو یہ سمجھ کہ گو احمد کی ح ہے اور جب سجدے میں جاؤ تو خود کو احمد ایاز سمجھنا یعنی احمد کے غلام۔“

ہردیو آپ کے قدموں میں گر کر زار و قطار رونے لگا، بولا۔ ”آج سے میں حضرت کا بے دام غلام ہوں۔“ اس واقعے کے تین دن بعد احمد ایاز آپ کے دوسرے مریدوں کے ساتھ آپ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ نئے سلطان غیاث الدین تغلق کا آدمی ایک حکم لے کر حاضر ہوا، پوچھا۔ ”نظام الدین بدایونی کون ہے؟“

خواجہ سید محمد امام نے عرض کیا۔ ”حضرت کے نام اگر کسی کا کوئی پیغام ہو تو میرے حوالے کر، میں انہیں دے دوں گا۔“ آنے والے نے جواب دیا۔ ”میں بادشاہ کا آدمی ہوں، بادشاہ نے کہا ہے کہ خواجہ نظام الدین بدایونی گانا سنتے ہیں جبکہ گانا شریعت میں حرام ہے اس لیے آپ میرے دربار میں آئیں اور میرے مفتی اعظم سے شہر کے جملہ علما کے سامنے اور میری موجودگی میں بحث کیجیے۔ اگر آپ نے گانے کا جواز ثابت کر دیا تو ہم سب بھی گانا سننا شروع کر دیں گے ورنہ آپ کو اس گناہ سے توبہ کرنی ہوگی۔“ آپ نے بادشاہ کا خط نہایت توجہ سے سنا، آپ نے سید محمد امام سے کہا۔ ”میرا جواب بنام بادشاہ لکھ۔“

سید محمد امام نے کاغذ قلم اور دو دات سنبھالا۔ آپ نے جواب میں لکھوایا۔ ”میری اور میرے بزرگوں کی یہ عادت رہی ہے کہ ہم بھی کسی بادشاہ کے پاس نہیں گئے اور نہ ہی بادشاہوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن تو ہمیں جس دربار میں بلارہا ہے وہ شریعت کا دربار ہے۔ میں اس دربار میں اس شرط پر آنے کو تیار ہوں کہ بادشاہ اس دربار میں اہل علم سے اونچی جگہ پر نہ بیٹھے۔ سب لوگ زمین کے فرش پر مساوی حالت میں نشست کریں۔“ بادشاہ نے جواب میں کہلایا بھیجا۔ ”مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔“

دوسرے دن آپ گھوڑے پر سوار ہو کر تغلق آباد تشریف لے گئے۔ یہ نیا شہر تھانیر تعمیر، بادشاہ کے نام پر۔ آپ کے ارادت مند اور مرید آپ کے ساتھ ساتھ چلے اور درخواست کی کہ اس مناظرے اور مباحثے میں انہیں بھی ساتھ رکھا جائے مگر آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔ فرمایا۔ ”اگر تم لوگ شاہی دربار میں میرے ساتھ گئے تو یہ کہا جائے گا کہ نظام الدین مریدوں کے ہجوم کے ساتھ یہاں آیا اور اس نے مفتی اعظم کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔“

لیکن مریدوں نے اصرار جاری رکھا، آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔ شاہی محل کے سامنے زمین پر فرش بچھا دیا گیا تھا۔ صدر میں بادشاہ اپنے فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور یہ سب ہتھیار بند تھے۔ بادشاہ کے داہنی ہاتھ علما کی صف تھی، ان کے درمیان میں مفتی اعظم تشریف فرما تھے۔ بادشاہ نے اشارہ کیا کہ بحث کا آغاز کیا جائے۔

مفتی اعظم نے کھٹکھار کر فرمایا۔ ”کیا آپ مسلمان ہیں؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”بھگت میں مسلمان ہوں۔“ مفتی نے دوسرا سوال کیا۔ ”کیا آپ خنئی ہیں؟“



آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا ہوں۔“  
مفتی نے پوچھا۔ ”کیا آپ گانا سنتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں گانا سنتا ہوں۔“

مفتی نے پھر سوال کیا۔ ”کیا اس گانے میں مزامیر (ساز) بھی ہوتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کبھی ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔“

مفتی نے پوچھا۔ ”وہ گانا گھر کے اندر مخفی طریقے سے ہوتا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں دونوں ہی طرح سنتا ہوں، گھر کے اندر بھی اور مجلس عام میں بھی۔“

مفتی نے پوچھا۔ ”اس طرح گانا سننے کے جواز میں آپ کے پاس کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”بخاری شریف میں صحیح حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مدینے کی انصار لڑکیاں دف بجا بجا کر گارہی تھیں اور آپ ان کا گانا سن رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ وہاں آگئے اور انہوں نے لڑکیوں کو گانے بجانے سے روکا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا..... عمر! ان لڑکیوں کو گانے بجانے سے نہ روکو۔ آج ان کا عید کا دن ہے اور ہر قوم کا ایک عید کا دن ہوتا ہے۔“

مفتی اعظم نے کہا۔ ”تراہا حدیث چراکار؟ تو کہ مشرب ابوحنیفہ داری، قول ابوحنیفہ بیار۔“ (تم کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے کیا واسطہ..... تم خفی ہو اور ابوحنیفہ کا مسلک رکھتے ہو، ابوحنیفہ کا قول دلیل میں پیش کرو۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”سبحان اللہ۔ من کہ قول رسول اللہ ﷺ آرم تو می گوئی کہ قول امتی بیار۔ ابوحنیفہ کہ بود کہ من قول او بمقابلہ قول رسول اللہ ﷺ می آرم؟“ (سبحان اللہ۔ میں رسول اللہ ﷺ کا قول پیش کرتا ہوں اور تم ایک امتی کا قول مانگتے ہو۔ ابوحنیفہ کون تھے جن کا قول میں رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں پیش کروں؟“ مزید فرمایا۔ ”جو قوم رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں ایک امتی کا قول مانگتی ہے وہ اس سے نہیں ڈرتی کہ وہ قوم جلاوطن ہو جائے، قحط میں مبتلا ہو جائے اور اس کا شہر برباد اور ویران ہو جائے۔“

مفتی اعظم اور دوسرے علما لا جواب ہو چکے تھے۔ کھسکا کر انہوں نے بادشاہ اور حاضرین کو اشتعال دلانے کی کوشش کی۔ ”خدا کی پناہ! یہ شخص حاجی شریف اور ناصر فقہ خفی بادشاہ کی موجودگی میں امام ابوحنیفہؒ کی توہین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابوحنیفہؒ کون تھے حالانکہ کچھ دیر پہلے انہوں نے یہ کہا تھا کہ میں حقیقی ہوں اور امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں۔“

مفتی اعظم کی حکمت رنگ لائی۔ مجلس میں علما نے چیخ چیخ کر غصے سے کہنا شروع کیا۔ ”اس نے امام کی توہین کی ہے، یہ شخص مجرم ہے، یہ شخص گستاخ ہے۔“

لیکن بادشاہ آپ کی باتوں سے وقتی طور پر مرعوب ہو چکا تھا، بولا۔ ”میں حکم دیتا ہوں کہ شیخ نظام الدین بدایونی اور ان کے مریدوں اور ان کے خلفا کو گانا سننے اور گانے کی مجلسیں کرنے سے میری حکومت کا کوئی آدمی نہ روکے۔“

☆☆☆

اچانک بنگالے سے خبر آئی کہ وہاں بغاوت ہو گئی ہے۔ غیاث الدین تغلق باغیوں کی سرکوبی کے لیے بنگال چلا گیا اور اپنے بیٹے جو ناخان کو جس کا خطاب الغ خان تھا، اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ الغ خان کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔

الغ خان نے آپ کے خادم خاص خواجا اقبال سے ایک دن کہا۔ ”خواجا اقبال! میں درویش کا بھیس بدل کر حضرت کی بارگاہ میں حاضری دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ حضرت مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں؟“

خواجا اقبال نے یہ اجازت دے دی۔ اس دن مجلس میں چند نئے درویش بھی نظر آئے۔ ان کے کپڑے پھٹے پرانے اور بوسیدہ تھے۔ احمد ایاز نے ان درویشوں میں الغ خان کو پہچان لیا کیونکہ احمد ایاز جب ہر دیو تھا تو اس وقت الغ خان کو دیکھ چکا تھا۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ سب زمین بوسی کے لیے اٹھے اور زمین کو جوم کر مجلس میں ایک صف میں بیٹھ گئے۔ بعد میں الغ خان نے آپ سے جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے الغ خان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”ایک بادشاہ آتا ہے اور ایک بادشاہ جاتا ہے۔“

خواجا اقبال نے احمد ایاز سے کہا۔ ”یہاں ایک بادشاہ الغ خان تو موجود ہے مگر دوسرا بادشاہ کہیں نظر نہیں آتا۔“

الغ خان درویشوں کے ساتھ واپس جا چکا تھا۔ آپ نے سید محمد سے پوچھا۔ ”کیا درویش چلے گئے؟“

سید محمد نے جواب دیا۔ ”جی حضرت جی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اچھا اب ذرا باہر نکل کر تو دیکھ، وہاں ایک بادشاہ باریابی کی خواہش میں بیٹھا ہے۔ اسے اندر بلالا اور



اسے کھانا کھلا۔“  
 سید محمد باہر گئے اور ادھر ادھر دیکھ کر اندر واپس آئے اور آپ سے کہا۔ ”حضرت! باہر کوئی امیر یا بادشاہ تو موجود نہیں البتہ ایک خوب صورت نوجوان ضرور بیٹھا ہے اس کے کپڑے بہت پرانے اور میلے ہیں۔“  
 آپ نے فرمایا۔ ”دوبارہ جا اور اس کے حالات پوچھ کر آ۔“  
 اس بار خواجہ سید محمد کے ساتھ احمد ایاز نے بھی باہر کا رخ کیا۔ وہاں ایک خوب صورت لڑکا بیٹھا تھا۔  
 احمد ایاز نے پوچھا۔ ”لڑکے! تم کون ہو؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”میں ایک ایرانی ہوں، ایرانی امیر زادہ۔ مغللوں کے ہاتھوں میرا خاندان برباد ہو گیا۔ میں نوکری کی تلاش میں ادھر چلا آیا۔ میں کئی سال سے دھکے کھا رہا ہوں مگر کہیں نوکری نہیں ملتی۔ اس وقت میں تین وقت کا بھوکا ہوں۔ سنا تھا حضرت کا لنگر عام ہے اور اس لنگر سے جو شخص روٹی کھا لیتا ہے، اس کی مصیبت دور ہو جاتی ہے مگر میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ لنگر خانے میں جا کر کھانا مانگوں۔ اب میں دروازے پر یہ سوچ کر بیٹھا ہوں کہ شاید حضرت کی باطنی توجہ سے میری تکلیف دور ہو جائے۔“  
 احمد ایاز اور خواجہ سید محمد دوبارہ اندر گئے اور عرض کیا۔ ”حضرت! باہر ایک ایرانی لڑکا بیٹھا ہے، وہاں بادشاہ نام کی کوئی چیز نہیں۔“  
 آپ نے فرمایا۔ ”بادشاہ کو اندر بلاؤ اور کھانا کھلاؤ۔ اسے لنگر خانے میں مت لے جانا۔ اس کو میرے پاس لاؤ۔“  
 وہ دونوں پھر گئے اور لڑکے سے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے لڑکے؟“  
 لڑکے نے جواب دیا۔ ”حسن۔“

خواجہ سید محمد نے کہا۔ ”اندر چل، تجھ کو حضرت یاد فرماتے ہیں۔“  
 وہ ان دونوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اسے قہرا کے دربار میں حاضری دینے کے آداب نہیں معلوم تھے۔ سید محمد آپ کے پاس جا کھڑے ہوئے، یہ لڑکا بھی ان کے پاس ہی جا کھڑا ہوا۔

آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ ”بھئی! اے بادشاہ دکن۔“ (بادشاہ دکن بیٹھ جاؤ)  
 لڑکا آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے سید محمد سے کہا۔ ”دکن کے بادشاہ کے لیے کھانا لاؤ۔“  
 سید محمد لنگر خانے سے روٹیوں کے ٹوٹے ہوئے چند ٹکڑے لے آئے اور حضرت نظام الدین کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”حضرت! لنگر خانے میں خیر کے سوا اب کچھ بھی نہیں جو بچا تھا، لے آیا۔“  
 آپ نے ان ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا نکال کر لڑکے کو اشارے سے قریب بلا یا فرمایا۔ ”لے، یہ دکن کی بادشاہی کا تاج ہے۔“ لڑکے نے وہ ٹکڑا حضرت کے ہاتھ سے لے کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔

سید محمد نے کہا۔ ”لڑکے! احرا! حضرت کے سامنے جھک جا۔“  
 لڑکا تعظیماً جھک گیا۔ احمد ایاز (ہردیو) نے باپ سے سرگوشی میں کہا۔ ”والد محترم! یہ شخص یقیناً ہمارے وطن کا بادشاہ ہو جائے گا اس لیے ہمیں اس سے ابھی سے تعلقات قائم کر لینے چاہئیں۔“  
 باپ نے جواب دیا۔ ”میں تیری ملازمت کی ولی عہد الخ خان سے بات کر چکا ہوں۔ انہوں نے تجھے اپنی تعمیرات کا افسر مقرر کر دیا ہے۔ کل تجھے ولی عہد کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا منصب سنبھالنا ہے۔“

احمد ایاز نے پوچھا۔ ”اگر دربار میں بات نہ بنی تو؟“  
 باپ نے کہا۔ ”ولی عہد کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔“  
 احمد ایاز نے کہا۔ ”میں اس سلسلے میں پہلے اپنے پیر و مرشد سے پوچھوں گا اگر وہ اجازت دے دیں تو افسر تعمیرات کا عہدہ سنبھال لوں گا، ورنہ نہیں۔“

باپ نے کہا۔ ”تو اسی وقت حضرت سے اس کی اجازت حاصل کر لے اگر وہ انکار کر دیں تو میں خود بھی انکار کر دوں گا کیونکہ حضرت کی مرضی کے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔“

جب یہ درخواست خواجہ نظام الدین کے روبرو پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ ”احمد ایاز! تو اس نوکری کو قبول کر لے کیونکہ تیری یہی ملازمت تیرے عروج کی تعمیر کی پہلی سیڑھی ہے۔“  
 چنانچہ جب احمد ایاز کو الخ خان کے دربار میں پیش کیا گیا تو اس نے اسے حکم دیا۔ ”تغلق آباد کا جو نیا قلعہ تعمیر کیا جا رہا ہے، اس کا سارا کام تیرے سپرد کیا جاتا ہے اور تجھے کوشاں عمارات کا شمعہ بنایا جاتا ہے۔“



www.paksociety.com احمد یاز نے عہد کے سامنے جھک گیا۔ دلی عہد نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“ احمد یاز نے جواب دیا۔ ”میرا نام ہر دیو تھا مگر حضرت نظام الدین نے احمد یاز نام عطا فرمایا ہے۔“ دلی عہد نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا تو مسلمان ہو گیا ہے؟“

احمد یاز نے جواب دیا۔ ”خدا کا شکر ہے جس نے مجھے خواجہ کی برکت سے اسلام کا شرف عطا فرمایا۔“ دلی عہد الخ خان نے خوش ہو کر حکم دیا۔ ”اس کو سونے کا کنگن پہنایا جائے اور آئندہ اسے احمد یاز خواجہ جہاں کہا جائے۔“ نوکروں نے حکم کی تعمیل کی اور احمد یاز کے دونوں ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنا دیے گئے۔ احمد یاز دلی عہد کی دوبارہ تعظیم بجالایا۔ اس وقت احمد یاز کی نظر اس نوجوان پر پڑی جو دلی عہد کے عقب میں کھڑا ہوا رومال سے کھیاں اڑا رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جسے خواجہ نظام الدین نے بادشاہ دکن کہہ کر مخاطب کیا تھا..... حسن۔

خواجہ نظام الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ احمد یاز خواجہ جہاں ہو چکا ہے اور شہنشاہ قعیرات مقرر ہوا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ آپ کی مجلس میں احمد یاز کی باتیں ہورہی تھیں، آپ نے فرمایا۔ ”ابھی تو آغاز ہوا ہے ورنہ احمد یاز کو ابھی بہت کچھ بننا باقی ہے۔“

اسی وقت مجلس میں ایک اجنبی داخل ہوا اور پوچھا۔ ”حضرات! میں خواجہ نظام الدین بدایونی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

سید محمد نے جواب دیا۔ ”میرے حضرت سے تمہارا کیا کام ہے، یہ بتاؤ تو میں ان سے ملوا دوں۔“

اجنبی نے کہا۔ ”میں غیاث الدین تغلق کا قاصد ہوں اور اس وقت بنگالے سے چلا آ رہا ہوں۔ میں حضرت کے نام بادشاہ کا ایک پیغام لایا ہوں۔“

پیغام تھا۔ ”شیخ نظام الدین بدایونی کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں دہلی واپس آ رہا ہوں۔ وہ میری واپسی سے پہلے ہی دہلی چھوڑ کر کہیں چلے جائیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ دہلی میں آنے کے بعد میں ایک ایسے شخص کو دیکھوں جو انسان ہے اور دوسرے انسانوں سے اپنے سامنے سجدے کرتا ہے اور جو حنفی ہے اور امام ابوحنیفہ کی فقہ کے خلاف کٹنا سستا ہے اور کھلم کھلا گانے بجانے کی مجلسیں منعقد کرتا ہے۔“

آپ خط کا مضمون سن کر مسکرائے۔ سید محمد سے کہا۔ ”اس خط کی پیشانی پر لکھ دے۔ ہنوز دلی دور است۔“ (دلی ابھی دور ہے) سید محمد نے خط کی پیشانی پر آپ کی فرمودہ عبارت لکھ دی۔ آپ نے یہ خط سلطان کے قاصد کو واپس دے دیا اور فرمایا۔ ”میرا جواب بادشاہ کو بنگالے پہنچا دے۔“

احمد یاز نے جب یہ بات سنی تو فکر مند ہو گیا۔ سید محمد نے کہا۔ ”تم کیوں فکر مند ہو؟“

احمد یاز نے جواب دیا۔ ”اس وقت میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔“

سید محمد نے کہا۔ ”اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ بادشاہ حضرت کی مخالفت کیوں کر رہا ہے تو اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے سلطان قطب الدین غلامی بھی حضرت کی مخالفت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق بھی اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے آپ کی مخالفت کو ضروری سمجھتا ہے۔“

احمد یاز نے کہا۔ ”جی نہیں، میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک خط دلی عہد کے پاس بھی آیا ہے۔ اس میں سلطان نے لکھا ہے..... مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ تم درویشانہ لباس میں شیخ نظام الدین کی مجلس میں گئے تھے اور شیخ نے تمہیں ہندوستان کے بادشاہ ہونے کی دعا دی ہے اور یہ کہ تم نے شیخ کے ایک ہندو مرید کو میر عمارات کا عہدہ دیا ہے۔ ان باتوں سے تمہاری بدخواہی ظاہر ہوتی ہے۔ آئندہ احتیاط سے کام لو ورنہ تم دلی عہد کی سے محروم کر دیے جاؤ گے۔“

سید محمد نے کہا۔ ”لیکن یہ اطلاع تمہیں کس نے دی؟“

احمد یاز نے جواب دیا۔ ”حسن ایرانی نے۔ وہ کہتا تھا کہ دلی عہد بادشاہ سے ڈر گیا ہے اور تعجب نہیں کہ تم میر عمارات نہ رہو اور ملازمت سے الگ کر دیے جاؤ۔“

سید محمد نے کہا۔ ”تب پھر تمہیں یہ سب باتیں حضرت کے گوش گزار کر دینی چاہئیں۔“

احمد یاز نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی خوفزدہ نہیں کیونکہ میرے لیے حضرت کا لنگر خانہ کافی ہے اور حضرت نے یہ تو فرمایا

دیا ہے کہ ایک بادشاہ آتا ہے اور ایک بادشاہ جاتا ہے۔“

یہ دونوں باتیں کر کے الگ ہو گئے۔ اس وقت شیخ کی عمر نوے سال... ہو چکی تھی اور چونکہ یہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اس لیے بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے اور آپ کے مرید اور ارادت مند ہر وقت فکر مند رہنے لگے تھے۔



اس بیماری اور کمزوری کے دوران بادشاہ کا ایک خط اور آگیا۔ یہ خط ولی عہد کے نام آیا تھا۔ اس میں بادشاہ نے لکھا تھا۔  
 ”میں نے سنا ہے شیخ نظام الدین بدایونی چراغوں اور مشعلوں کی روشنی میں ایک باؤلی تعمیر کر رہا ہے اور یہ کام وہ انہی  
 مزدوروں سے لے رہا ہے جن سے تم دن میں کام لیتے ہو۔ تم شہر کے تاجروں کو حکم دے دو کہ وہ نظام الدین بدایونی کے ہاتھ تیل  
 فروخت نہ کریں اور نظام الدین بدایونی کو میری طرف سے مطلع کر دو کہ میں بنگالے سے روانہ ہو چکا ہوں اور وہ میرے دہلی پہنچنے  
 سے پہلے ہی کہیں اور چلے جائیں۔“

ولی عہد نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شہر کے تاجروں کو حکم دے دیا کہ وہ نظام الدین بدایونی یا ان کے کسی مرید کے ہاتھ تیل  
 نہ فروخت کریں۔

اس کے بعد شہزادے نے سلطان کا پیغام آپ کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے اس بار بھی اپنا پہلا والا فقرہ دہرایا۔ ”ہنوز دلی  
 دور است۔“

یہ ربیع الاول 725ھ کا ذکر ہے، بادشاہ بنگالے سے چل کر دہلی کے قریب افغان پور میں داخل ہو گیا۔ یہاں ولی عہد نے  
 ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ بادشاہ نے اس محل کو دیکھا تو بہت خوش ہوا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا نظام الدین بدایونی کو میرا پیغام پہنچا دیا گیا تھا؟“

ولی عہد نے جواب دیا۔ ”جی اعلیٰ حضرت۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا شیخ نے دہلی چھوڑ دی؟“

ولی عہد نے ڈرڈر کر عرض کیا۔ ”نہیں، انہوں نے دہلی چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے آپ کے جواب میں کہا  
 دیا تھا کہ ہنوز دلی دور است۔“

بادشاہ غضب ناک ہو گیا، بولا۔ ”اس دنیا دار درویش کو تو میں ٹھیک کر دوں گا۔“

اس وقت احمد ایاز بھی وہیں موجود تھا۔ بادشاہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”احمد ایاز..... اور جب یہ ہندو تھا تو اس کا نام مہندر ہر دیو تھا۔ اس کو شیخ نے مسلمان کر لیا ہے اور

میں نے اسے میری عمارت کا عہدہ دے دیا ہے۔ یہ دیو گڑھ کے شاہی خاندان کا ایک فرد ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”بہت خوب!“ پھر محل کی تعریفیں کرنے لگا۔ بولا۔ ”میں محل کی چھت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اس پر بہ وقت

ضرورت ہاتھی لے جائے جاسکتے ہیں؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، ہاتھی اوپر لے جائے جاسکتے ہیں۔“

پھر شہزادے نے احمد ایاز کو حکم دیا۔ ”ہم لوگ اوپر جا رہے ہیں، تم نذرانے کے ہاتھی اوپر ہی بھیج دو۔“

سلطان کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا محمود بھی تھا اور چند امراء بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سلطان ان سب کو لے کر

محل کی چھت پر چلا گیا۔ ولی عہد نیچے ہی موجود رہا۔ اتنے میں نذرانے کے ہاتھی بھی آگئے اور بادشاہ نے ان کو بھی اوپر ہی بلوایا۔

جب یہ لوگ اوپر چلے گئے اور ان کے ہاتھی بھی اوپر پہنچائے جانے لگے تو عمارت کی چھت میں زلزلہ محسوس ہوا پھر چھت

ہاتھیوں، بادشاہ اور اس کے شہزادے سمیت زمیں بوس ہو گئی۔

ولی عہد نے چیخ نکار شروع کر دی۔ ”مزدوروں کو جلدی بلا جائے۔“

اس وقت مزدور قریب نہیں تھے۔ شیخ رکن الدین ملتان سے قریب ہی موجود تھے۔ محل کے زمیں بوس ہونے کی آواز

انہوں نے بھی سن لی تھی۔ فوراً بھاگے ہوئے منہدم محل کے پاس پہنچ گئے۔

کافی دیر بعد مزدور آئے اور انہوں نے محل کا لمبا جو ہٹایا تو اس کے اندر سے بادشاہ، شہزادہ محمود اور دوسرے امراء کی کھلی

ہوئی لاشیں نکل آئیں۔ ولی عہد نے امراء کی لاشوں کو تو الگ کر دیا اور بادشاہ اور اپنے بھائی کو قلعے کے قریب دفن کر دیا۔ بادشاہ

نے یہ جگہ اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر کے لیے مخصوص کر دی تھی۔

بادشاہ کی حادثاتی موت کا سبھی کو بڑا دکھ ہوا۔ کئی دن تک بادشاہ کا سوگ منایا گیا۔ اس سوگ کے بعد شہزادہ الفخ خان

ہندوستان کے شاہی تخت پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

بادشاہ کی غلوت میں احمد ایاز بھی موجود تھا اور شیخ رکن الدین ملتان بھی۔ الفخ خان..... جواب سلطان محمد تغلق ہو چکا تھا، اس



نے احمد ایاز سے پوچھا۔ ”احمد ایاز اتم کئی سال سے سلطان المشائخ کی خدمت میں رہ رہے ہو۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ حضرت نے شادی کیوں نہیں کی؟“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا کیونکہ میرے سامنے اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔“ لیکن شیخ رکن الدین ملتانی نے فرمایا۔ ”میں اس سلسلے میں سلطان المشائخ سے تخلیہ میں بات کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا..... میں نکاح کا منکر نہیں ہوں مگر جب میں قرآن پاک پڑھتا ہوں اور اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھتا ہوں کہ تمہاری دولت اور اولاد تمہارے لیے فتنہ ہوتی ہے، تو میں بہم جاتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سنت کی پیروی کے خیال سے نکاح کروں اور خدا کے فرائض فوت ہونے لگیں۔ میں اولاد کے فتنے میں پھنس کر فرائض خداوندی کو بھول جاؤں۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”آپ کے خیال میں یہ جواب کیسا ہے؟“

شیخ ملتانی نے جواب دیا۔ ”نہایت معقول، اس سے زیادہ معقول جواب ہو ہی نہیں سکتا۔“

مجلس خلوت سے فارغ ہونے کے بعد احمد ایاز بادشاہ سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو ذرا دیر بعد شیخ ملتانی بھی بادشاہ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے۔ یہ دو پہر کا وقت تھا۔ احمد ایاز اپنے گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ شیخ ملتانی کا ایک مرید اس کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔ ”ہمارے شیخ نے فرمایا ہے کہ شام تک ان سے ایک ملاقات کر لو۔“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”اپنے پیرومرشد سے عرض کر دینا کہ میں آج نہیں آسکوں گا۔ میرے پیرومرشد کی طبیعت نامناسب ہے۔ میں ان کی خدمت میں جاؤں گا۔ ہاں، کل ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔“

لیکن تھوڑی دیر بعد شیخ ملتانی کا مرید دوبارہ آ گیا اور کہا..... ”پیرومرشد نے فرمایا ہے کہ اپنے مرشد کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا۔“

شام کو احمد ایاز سید صاحب ملتانی کی خدمت میں پہنچا اور کہا۔ ”حضرت! میں آ گیا ہوں۔ فرمائیے مجھ سے کیا کام ہے؟“ شیخ ملتانی نے دھڑ دھڑ دیکھ کر آہستہ سے فرمایا۔ ”احمد ایاز بادشاہ تجھ سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو اپنے شیخ سے دریافت کر کے کل صبح تک اپنے جواب سے مطلع کر دینا تا کہ میں بادشاہ کو اس کی اطلاع دے سکوں۔“

احمد ایاز دوبارہ اپنے گھر گیا اور اپنے باپ کو یہ بات بتادی۔ وہ بہت خوش ہوا، اس نے کہا۔ ”یہ سب حضرت کی توجہ کی تاثیر ہے۔“ جب احمد ایاز سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچا تو اس وقت آپ بالا خانے کی چھت پر تشریف فرما تھے۔ ان کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ احمد ایاز نے شیخ ملتانی کے حوالے سے بادشاہ کی پیشکش کا ذکر کر دیا اور پوچھا۔ ”میں حضرت کی اجازت کے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“

آپ نے متبسم ہو کر احمد ایاز کی طرف دیکھا، فرمایا۔ ”جا۔ میری اجازت ہے۔ میں مشیت الہی کی مخالفت نہیں کر سکتا ورنہ بادشاہوں سے رشتے داری کرنا خدا پرست انسانوں کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔“ احمد ایاز نے شیخ ملتانی کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ بادشاہ نے اوائل ربیع الآخر 725ھ میں اپنی بیٹی کی شادی احمد ایاز سے خفیہ طور پر کر دی۔ اب احمد ایاز کا مرتبہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے محبوب الہی کی خدمت میں ایک ہفتہ مسلسل نہیں جاسکا۔ اپنے غلام مقبل کو بھیج کر خیریت معلوم کر لیا کرتا تھا۔

ایک دن سید محمد نے خبر دی کہ پیرومرشد کی حالت بہت نازک ہے۔ احمد ایاز نے یہ خبر بادشاہ کے گوش گزار کر دی۔ بادشاہ نے کہا۔ ”تم اسی وقت میرے طبیب خاص کو لے کر وہاں پہنچ جاؤ اور حضرت سلطان المشائخ سے کہو کہ میں بھی عیادت کے لیے حاضری دینا چاہتا ہوں لیکن جب تک باریابی کی اجازت نہ مل جائے، میں کس طرح آسکتا ہوں۔“

جب احمد ایاز شاہی طبیب اور دو غلاموں کے ساتھ شیخ کی خدمت میں پہنچا تو وہ بحالت بے ہوشی فرما رہے تھے۔ ”کوئی چیز باقی نہ رہے اقبال۔ سب کچھ لٹا دے ورنہ تو ذمے دار ہوگا۔“

کسی نے جواب دیا۔ ”اقبال نے آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی ہے، ہاں انبار خانوں میں غلہ بھرا ہوا ہے محض اس خیال سے کہ درویش کیا کھائیں گے؟“

آپ کو ہوش آچکا تھا۔ آپ نے غصے میں فرمایا۔ ”انبار خانوں کے دروازے توڑ ڈالو اور زمین کی اس ریت (غلہ) کو لٹا دو۔“ چنانچہ اطراف کے فقیروں اور مسکینوں کو انبار خانوں کے سامنے بلوا کر ان کے دروازے کھلوادے گئے اور ذرا سی دیر میں غلے کے گودام خالی ہو گئے۔



آپ پھر بے ہوش ہو گئے۔ احمد ایاز نے خادم خاص خواجہ اقبال سے کہا۔ ”بادشاہ نے حضرت کے علاج کے لیے اپنا طبیب خاص میرے ساتھ کر دیا ہے۔ میں اس طبیب کے ذریعے آپ کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔“

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں وہ شاہی طبیب سے اپنا علاج نہیں کرائیں گے پھر بھی میں اس طبیب کو آپ کے پاس لیے چلتا ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ جیسا حکم دیں گے میں اس پر عمل کروں گا۔“

جب شاہی طبیب کو آپ کے قریب پہنچا دیا گیا تو اس نے اجازت لیے بغیر ہی آپ کی نبض اپنی انگلیوں میں لے لی۔ آپ نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور طبیب کو پلک چپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

خواجہ اقبال نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ”حضرت! سلطان تغلق نے آپ کے علاج کے لیے اپنے خاص طبیب کو یہاں بھیجا ہے۔ کیا آپ اس کو علاج کرنے کی اجازت دیں گے؟“

آپ نے اپنی کمزور آواز میں جواب دیا۔ ”طبیب سے کہہ دو کہ درد مند عشق رادار و بجز دیدار نیست“ (عشق کے بیمار کے لیے دیدار کے سوا کوئی علاج کارگر نہیں ہوگا)

آپ ساری رات بے ہوش رہے مگر صبح فجر کی نماز بھی ادا کی۔ اس کے بعد پھر غشی طاری ہو گئی۔ کسی نے بحالت بے ہوشی فرماتے سنا۔ ”دیکھو شیخ العالم تشریف لائے ہیں، مجھے ان کی تعظیم کے لیے اٹھاؤ۔“

لیکن وہاں شیخ العالم کا کہیں پتا نہ تھا۔ یکا یک سکوت طاری ہو گیا۔ سانس رک گئی۔ آفتاب غروب ہو گیا۔ یہ بروز بدھ 18 ربیع الاول 725ھ کی بات ہے۔ ہر شخص دم بخود کھڑا تھا۔ پھر حاضرین میں بے قراری بڑھنے لگی اور لوگوں نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

سید محمد نے روتے ہوئے کہا۔ ”حضرات! حیح حیح کر مت رونا کیونکہ آپ نے ہمیشہ اس سے منع فرمایا ہے۔“

یکا یک حاضرین میں ہلچل سی ہوئی اور وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگے۔ وہاں سلطان محمد تغلق اور شیخ متانی آ چکے تھے۔ سلطان نے آپ کے پٹنگ کے قریب آ کر چہرے پر سے چادر ہٹائی اور خوب رویا، پھر پوچھا۔ ”دفن کا انتظام کہاں ہوگا؟“

سید حسین کرمانی نے جواب دیا۔ ”حضرت کی وصیت تھی کہ انہیں اس تالاب میں دفن کیا جائے۔“

بادشاہ نے احمد ایاز کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ”اس تالاب کو چند ساعتوں میں پاٹ دیا جائے اور پھر اس میں حضرت کی تدفین عمل میں لائی جائے گی۔“

احمد ایاز اسی وقت مزدوروں کی تلاش میں نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو آپ کی آخری رسوم ادا کی جا چکی تھیں۔ خواجہ سید محمد نے حیرت سے کہا۔ ”میں خوش ہوں کہ بادشاہ بہت صبح ہی آ گیا تھا اور دوسری خوشی کی بات یہ کہ حضرت کو کندھا دیئے والوں میں ان کے مخالفین بھی شامل تھے، شاید بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے۔“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ بادشاہ دیر تک بھوکا رہا۔ حالانکہ اتنی دیر میں بادشاہ تین بار کھا چکا ہے۔“

خواجہ نظام الدین اولیاء جو سلطان المشائخ اور محبوب الہی بھی تھے، ان کی خانقاہ برصغیر کی سب سے بڑی روحانی جامعہ تھی۔ آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی تھی۔ لوگ پابندِ صوم و صلوة ہو گئے تھے اور ہر طرف دین کا چرچا تھا۔ آپ نے کتنے ہی ہندوؤں کو مسلمان کیا اور ان میں راسخ الاعتقاد اور استقامت پیدا کر دی۔

جب آپ دہلی تشریف لے جائیں گے تو آپ کو خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے مشرق میں نصف میل دور دریائے جمن کے کنارے شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ نظر آئے گا۔ خواجہ محبوب الہی کی خانقاہ اس مقبرے کے شمالی گوشے میں ہے۔ خانقاہ کے مغرب میں سید شمس الدین اودا اللہ کا مزار ہے۔ قریب ہی جنوب مغرب میں عرب سرائے ہے جو اب ویران ہو چکی ہے۔ سرائے کے شمال مغربی گوشے میں حلیمہ کا بارگاہ ہے اور مسجد ہے..... یہاں شیر شاہ سوری کے ایک امیر عیسیٰ خاں کی قبر ہے۔ مغرب میں لوہارو خاندان کی قبریں ہیں۔ انہی قبروں میں مرزا غالب کی بھی قبر ہے۔ یہاں مدت سے یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ محبوب الہی کے پڑوس میں دفن ہونے والوں کو نجات حاصل ہوتی ہے۔

### ماخذات

سیر الاولیاء امیر خورد۔ سیر العارفین حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیع عبدالحق محدث  
فوائد الفوائد امیر حسن منجری۔ گلزار ابرار، محمد غوث مائٹوی۔ غریب المجالس، ملفوظات چراغ دہلی



انسانی دماغ تماشا کرنے کی مشین ہے اور تماش بین اس مشین کی تسکین کا ذریعہ... اس نے بھی ایک ایسا ہی کرشمہ دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو تسکین دینا چاہی مگر... سیر کو سواسیر ملا تو ساری تسلی بے کلی میں بدل گئی... کیونکہ کرامات پر کسی ایک کی اجارہ داری تو ہونہیں سکتی۔

اچانک بازی پلٹ جانے پر ایک شاطر کی کایا پلٹ

سیاہ بالوں والی دراز قامت عورت نے کیری آن بیگ اٹھا کر اوور ہیڈ کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا تو نشستوں کی قطار کے درمیانی راستے کی جانب بیٹھی ہوئی سنہری زلفوں والی نوجوان عورت نے اپنے گھٹنے ایک جانب سکیڑ لیے تاکہ دراز قامت عورت اس کے سامنے سے گزر کر کھڑکی کے پاس والی نشست پر بیٹھ جائے۔

ان دونوں کے درمیان والی جہاز کی نشست خالی تھی۔ باہر دوپہر کی تیز دھوپ میں ائر پورٹ کا ٹارمیک اپ

Downloaded From  
Paksociety.com



”میرا مطلب تمہارے شوہر کے بارے میں تھا۔“

”تم میرے شوہر کو جانتی ہو؟“ سوزی نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں لیکن تم ہی نے تو کہا تھا؟“

سوزی بے چینی سی ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے کہ میں

نے جنہیں مغالطے میں ڈال دیا ہے۔ میرا شوہر بالکل ٹھیک

ٹھاک اور خیریت سے ہے۔ کم از کم اس وقت تک...

بہ خیریت تھا جب آج میں نے انرپورٹ روائٹی کے وقت

اسے گڈ بائی کہا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اپنی

نشست پر ٹیک لگاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”تو، وہ تم سے ملنے کے لیے آیا تھا؟“ اولیو نے پوچھا۔

سوزی ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔

”معاف کرنا، میں سمجھی نہیں۔“

”وہ تم سے یہاں لاس اینجلس میں ملنے کے لیے آیا تھا؟“

”ملنے کے لیے؟ اگر یہ سچ ہوتا تو اس کا سامان

میرے پاس کیوں ہوتا؟“

اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اولیو نے

مطمئن نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا میں

تم سے ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ سکتی ہوں؟“

سوزی فریمین نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میرا خیال ہے کہ

پوچھ سکتی ہو۔“

”تمہاری عمر کیا ہوگی؟“

”ستائیس برس۔“

”اور تمہارا شوہر..... کیا اس کا قد لانا ہے؟“

”زیادہ لانا تو نہیں ہے کیوں؟“

”کتنی قامت ہے؟“

”تقریباً میرے جتنی۔ شاید کچھ کم بھی ہو سکتی ہے۔“

”آئی سی!“ اولیو نے اپنی نظریں کھڑکی کی

جانب پھیر لیں اور باہر گزرتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے

لگی۔ پھر قدرے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔ ”تم

کیسا محسوس کر رہی ہو مس سوزی فریمین؟“

”کس بارے میں؟“

”جو کچھ تم کر چکی ہو اور جو کچھ تم کر رہی ہو، اس کے

بارے میں۔“ اولیو نے جیسے جیسے لہجے میں کہا۔

”ایکسکیوز می، میں کچھ سمجھی نہیں۔“

رہا تھا۔

”میرا بیگ اٹھا کر اوپر کمپارٹمنٹ میں رکھنے کا

شکریہ۔“ سنہری زلفوں والی نوجوان عورت نے دراز

قامت سے کہا۔ اس نے اپنی گود میں بیگ سے بچ کر تباہا

چڑے کا ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا۔

”مجھے خوشی ہوئی۔“ دراز قامت نے کہا پھر ایک

نگاہ نوجوان عورت کی گود میں رکھے ہوئے بریف کیس پر

ڈالتے ہوئے بولی۔ ”تو تمہارا شوہر ایک فزیشن ہے۔“

نوجوان عورت نے نظریں نیچے بریف کیس پر

جمادیں جس کے لیمینیٹڈ ٹیک پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر اسٹورٹ فریمین سوم۔“ اس کے ساتھ ایک گنجے

گول منول آدمی کی تصویر بھی تھی جس کی عمر پچاس برس کے

لگ بھگ رہی ہوگی۔

”فزیشن تھا۔“ نوجوان عورت نے کہا۔

نوجوان عورت نے مزید کوئی وضاحت نہیں کی۔

اس کے بجائے اس نے اپنی نشست پر پیچھے ٹیک لگالی اور

آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں ملنے لگی۔

اس کی انگلی کی انگوٹھی میں موجود ہیرا کافی بڑا تھا۔

جب جہاز فضا میں بلند ہو گیا تو دراز قامت عورت

نوجوان عورت کی جانب گھومی اور بولی۔ ”بائی داوے

میں اولیو یا اسمتھ ٹینکس ہوں۔“

”میرا نام سوزی فریمین ہے۔“ سنہری زلفوں والی

نوجوان عورت نے کہا۔

”تم کیا کرتی ہو مس فریمین؟“

”میں ایک ڈیزائنر ہوں۔“

”بہت خوب! ایک تخلیقی ذہن کی مالک! تم کیا

ڈیزائن کرتی ہو؟ ملبوسات..... کچن سافٹ ویئر؟“

”لینڈ اسکیپس!“

”اور تمہارا دفتر.....؟“

”یہاں لاس اینجلس میں ہے۔ میں ایک سیمینار میں

شرکت کے لیے ڈیلیس جا رہی ہوں۔“

ان کے درمیان چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر

اولیو یا ٹینکس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ ”آئی

ایم سوری۔“

سوزی فریمین نے جو کہتے ہوئے استفہامیہ نظروں

سے دراز قامت عورت کی طرف دیکھا۔



”کیا تم مجھے کچھ بتانا چاہ رہی ہو؟“  
”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو.....“ سوزی فریمین کے لہجے سے اب انہیں عیاں تھی۔

اولیویا نے اپنا چہرہ سوزی کی جانب گھمایا۔  
”تمہارے سامان پر لگا ہوا ٹیگ بتا رہا ہے کہ تمہارا شوہر ڈاکٹر اسٹورٹ اونٹاریو میں رہتا ہے۔“  
”یہ درست ہے۔“

”اور تمہارے بلاؤز کا سامنے کا ایک بٹن غائب ہے۔“

سوزی نے نگاہیں جھکا کر اپنے بلاؤز کا جائزہ لیا اور اس کی آنکھیں حیران رہ گئیں۔ ”تو پھر؟“

اولیویا کے چہرے پر وہی اطمینان تھا۔ ”اونٹاریو، لاس اینجلس سے دو ہزار میل کے فاصلے پر ہے مس سوزی فریمین..... اور کوئی بھی شوہر جسے تم نے آج صبح رپورٹ روانگی کے وقت الوداعی بوسہ دیا ہوگا، وہ تمہیں عام پبلک کے درمیان جانے سے قبل اس بارے میں بتا سکتا تھا کہ تمہارے بلاؤز کے سامنے کا بٹن غائب ہے؟ یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ کورجٹم ہو یا اس کا قد اتنا لبا ہو کہ اس کی نظر ہی اس جگہ نہ پڑ سکی ہو جہاں اس بٹن کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ تم عمر میں اس کی جوان بیٹی کی طرح لگتی ہو۔“

سوزی فریمین نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، تم اور تمہارا دولت مند ڈاکٹر شوہر یہاں تعطیلات منانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔“ اولیویا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور صاف صاف کہوں تو میرے خیال میں تم اسے اس حالت میں چھوڑ آئی ہو کہ وہ تمہارے لباس یا کسی بھی اور چیز کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا۔“

سوزی فریمین یہ سن کر حیرت سے پلکیں جھپکاتے لگی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں صحیح کہہ رہی ہوں۔“

”تمہارے خیال میں، میں نے اسے قتل کر دیا ہے؟“ سوزی فریمین کے لہجے میں بدستور حیرت تھی۔  
اولیویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اسے گھورتی

رہی۔  
”تم یہی سمجھ رہی ہو نا؟“ سوزی فریمین نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہے نا؟“

”کیا تم نے اسے قتل نہیں کیا..... اپنے شوہر کو؟“  
اولیویا نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔  
سوزی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب ان کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ دونوں بس ایک دوسرے کی صورت نکلے جا رہی تھیں۔

اتنے میں ایک فلائٹ اینڈنٹ سروس کارٹ لیے راہداری میں سوزی فریمین کی نشست کے پاس آ کر رک گیا اور پوچھا۔ ”آپ کوئی مشروب لیتا چاہیں گی؟“  
سوزی نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے لیے کافی اور شوگر کا آرڈر دے دیا۔ اولیویا نے بھی اپنے لیے کافی اور شوگر طلب کی۔

فلائٹ اسٹوارڈ نے کافی بھرے دو کپ اور چینی کے دو سفید پیکٹ اس ٹرے میں رکھ دیے جو سوزی اپنے سامنے کی نشست کی پشت سے کھول کر نیچے کر چکی تھی۔  
سوزی نے اپنا پرس کھولا اور اپنے کمپیٹ کو بے مقصد ٹٹولنے لگی پھر اولیویا سے مخاطب ہو کر آہستہ سے بولی۔  
”تم کون ہو؟ پولیس؟“

”پلیز..... کوئی قابلِ فخر شعبہ بتاؤ۔“  
”تو پھر کیا ہو؟ وکیل؟ رپورٹر؟“

”ماہر نفسیات۔ میں یہاں ایک ہیپتھس کرنے کے لیے آئی تھی۔“ اولیویا نے جواب دیا۔

”بے شک!“ سوزی نے کافی کے دونوں کپوں میں چینی چمڑکتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں میں کسی قسم کی کپکپاہٹ نہیں تھی۔ اس نے اولیویا کا کپ اس کی جانب بڑھا دیا۔ ”ایک تخلیقی ذہن!“ اس نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“  
”لیکن تم نے جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے، وہ ایک خیالی بلاؤ ہے۔“ سوزی فریمین نے کہا۔

”وہ کس طرح؟“ اولیویا نے کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”ویل، ایک بات تو یہ کہ اونٹاریو لاس اینجلس سے دو ہزار میل کے فاصلے پر نہیں ہے۔ وہ صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے۔“ سوزی نے بتایا۔



لے گئے۔ پھر اچانک اس کا جسم تن گیا اور اس کی نگاہیں اپنے کافی کے کپ پر جم گئیں۔

”یہ انتہائی ذی اثر ہوتا ہے۔“ سوزی فریمین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اولیو یا آنکھیں پھاڑے سوزی فریمین کی ٹرے کو دیکھنے لگی جہاں فلاٹ اسٹینڈنٹ کے دیے ہوئے چینی کے دونوں سفید پیکٹ اپنی اصل حالت میں پیک رکھے ہوئے تھے۔ البتہ ان کے برابر میں ایک کھلا ہوا اسی طرح کا پیکٹ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس پیکٹ کی رنگت بھی سفید تھی۔

”مائی گاڈ!“ اولیو یا کے ہاتھ سے اس کا کپ چھوٹ گیا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کرنے لگی۔

سوزی کو اپنی ٹرے کو سیدھا کرنے اور اٹھا کر بند کرنے میں عجلت سے کام لینا پڑا۔ اولیو یا حیرتی سے نشستوں کی درمیانی راہداری میں داخل ہوئی اور وہاں قدم رکھتے ہی پڑمردہ چہرے کے ساتھ ابکیاں لیتے ہوئے جہاز کے عقبی حصے کی جانب دوڑ پڑی جہاں فلاٹ اسٹینڈنٹس کا ایک گروپ موجود تھا۔

سوزی کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ رکھاں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر شیج کرنے لگی۔

دوسری جانب سے فون کال کا جواب ملنے پر وہ بولی۔ ”اسٹورٹ؟ یہ میں ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تمہیں پہلی صبح کیسی لگ رہی ہے؟“ پھر اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ”ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تم سے رخصت ہونے کے بعد تمہاری عینک مجھے بریف کیس میں رکھی ہوئی مل گئی ہے۔ میں ہوٹل پہنچ کر تمہاری عینک فیڈ ایکس کے ذریعے تمہیں بھجوا دوں گی اور باقی داوے، جانتے ہو جو سردرد کا سفید پاؤڈر تم نے آج میرے ساتھ رکھنے کو دیا تھا؟“

یہ کہہ کر اس نے پلٹ کر جہاز کے عقبی حصے کی جانب دیکھا جہاں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی پھر اپنی بات جاہری رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ کمال کا پاؤڈر ہے۔ اس نے اپنی کرامات دکھادی ہیں۔“

”اونٹاریو، کینیڈا؟“

”نہیں، اونٹاریو، کیلی فورنیا!“

”ایسی تو کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”واقعی؟ تب تو میں گھر پہنچنے پر یہ بات اپنے میسر کو ضرور بتاؤں گی۔“

اولیو یا نے اپنی ٹھوڑی چڑھالی اور بولی۔ ”مجھے تم پر یقین نہیں ہے۔“

سوزی فریمین نے جواباً اپنے شانے لچکا دیے اور کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں یقین کیونکر ہوگا؟ آخر کار میں ایک قاتل ہوں نا!“

ان کے درمیان ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو چند لمحات گزرنے کے بعد سوزی فریمین نے توڑا۔ ”تمہارے خیال میں، میں نے اپنے شوہر کو کس طرح قتل کیا ہوگا؟“

تب اولیو یا نے ایک نگاہ سوزی کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ ”درجنوں طریقے ہو سکتے ہیں۔ امکانی طور پر اس کے چہرے پر تکیہ رکھ کر اس کا دم گھونٹا گیا ہوگا۔ تم دیکھنے میں طاقتور لگتی ہو اور وہ پستہ قد تھا؟“

”پستہ قد ہونے کا مطلب کمزور نہیں، مس اولیو یا!“ سوزی نے اسے احساس دلاتے ہوئے کہا۔

”یا شاید عقب سے اس کی کھوپڑی پر وار کیا ہوگا جب وہ اپنے جوتے پہننے کے لیے جھکا ہوگا یا اپنے دانت برش کر رہا ہوگا۔“

”یہ تو بڑا مایوس کن جواب ہے مس اولیو یا۔“ سوزی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”اور تم خود کو ماہر نفسیات کہتی ہو؟“

یہ سن کر اولیو یا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”آل رائٹ! تو پھر تم خود ہی بتاؤ کہ تم نے اسے کس طرح قتل کیا ہے؟“

”زہر دے کر۔“ سوزی نے جواب دیا۔

”کون سا زہر؟“

”آرسینک ٹرائی آکسائیڈ! یہ سفید پاؤڈر کی شکل میں ہوتا ہے۔ میں نے اس کی کافی میں چینی کے بجائے یہ سفید پاؤڈر چمک دیا تھا۔“ سوزی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اولیو یا کو سوزی کی بات کو ذہنی طور پر سمجھنے میں چند



بھی اسے اپنی طرح اداس اور تنہا کی گئی تھی..... کم از کم اس نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔

اس قبرستان میں وہ اس وقت سے گورکن تھا، جب اس کی مسیں بھیلی ہی تھیں..... اور اب اس کے سر اور ڈاڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ دھرتی کے سینے پر، زندگی سے جدا ہونے والے انسانوں کو دفن کر پیٹ بھرنے کا یہ کام اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا باپ، دادا اور شاید پڑا دادا بھی یہی کام کرتے تھے۔ موت، زندگی، قبریں، ویرانیاں اور زندگی سے رخصت ہونے والے تہا لوگ..... وہ یہی کچھ دیکھتا آیا تھا۔

اور اب دودن گزر گئے تھے، اس کے گھر چولہا نہیں جلا

دھاتی شام ہے، سدا ہے دھاتی دھاتی پر پہلے لے

تھے۔ اس نے تاریک شب کی طرح شب کا اندھیرا کائنات پر اپنے پر پھیلانے کے لیے بے قرار تھا۔ قبرستان میں ہوا سنکیاں لیتی گزرتی رہی۔ بھوتے درختوں کی سرسراہٹ، موت جیسی ناموشی اور قبروں پر پھیلی ویرانی گویا اس کے سامنے نزع کا منظر پیش کر رہی تھی..... وہ لہو..... جو مرنے والا اپنے وجود سے روح کے رخصت ہونے پر محسوس کرتا ہے۔ وہ اس منظر میں ایک نیم کے بیڑ کے نیچے یوں کم سہم بیٹھا تھا جیسے اپنی سیاہ تنہائی پر ماتم کر رہا ہو۔ شہر و شاہ میں اس کا ٹوٹا پھوٹا وجود پراسرار لگ رہا تھا۔ قریب ہی اس کی کدال رکھی تھی۔ وہ

## گورکن

ابراہیم جمالی

بھوک افلاس... معاشرے کی وہ تلخ حقیقتیں ہیں جو ایک سیدھے سادے انسان کو بھی جانور بنا دیتی ہیں... وہ بھی اپنے خون جگر کے فاقوں سے رنجیدہ ہو کر فرار ہوا تو اگلا قدم اسے ایسی پستی میں لے گیا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ جن کے لیے زندگی خریدنے گھر سے نکلا ان کے لیے موت لے کر گھر لوٹ آیا۔

اپنے پیروں پر کھاڑی مارنے والے ایک باب کے  
خون دل کا عبرت اثر واقعہ

Downloaded From  
Paksociety.com



## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

|               |                    |                  |                  |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد   | صائمہ اکرام        | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد       |
| نمرہ احمد     | سعدیہ عابد         | نبیلہ عزیز       | نسیم حجازی       |
| فرحت اشتیاق   | عفت سحر طاہر       | فائزہ افتخار     | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو   | تنزیلہ ریاض        | نبیلہ ابرار      | ہاشم ندیم        |
| نگہت سیما     | فائزہ افتخار       | آمنہ ریاض        | ممتاز مفتی       |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل            | عنیزہ سید        | مُستنصر حُسین    |
| رضیہ بٹ       | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد  | علیم الحق        |
| رفعت سراج     | اُمِ مریم          | نایاب جیلانی     | ایم اے راحت      |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،  
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،  
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،  
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



تھا۔ بھوک موت کی طرح پھر پھیلائے کھڑی تھی۔ ان دونوں میں وہ ہارے ہوئے جوار کی طرح گھر لوٹتا تھا۔ ان دونوں میں اس کی کدال بھی اداں تھی۔ اس کے بچوں کی آنکھوں میں بھوک کے سائے تھے..... اور بیوی کے چہرے پر دکھوں کی پرچھائیاں مزید گہری ہو گئی تھیں۔

پچھلے دو دنوں سے موت نہ جانے کہاں جاسوئی تھی۔ اس شہر میں کسی کی زندگی کا تار نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ جہاں روزانہ بے شمار لوگ زندگی سے رشتہ توڑ دیتے ہیں، وہاں دو دن سے سب زندہ ہیں۔ اس شہر میں کوئی دوسرا قبرستان بھی تو نہیں ہے..... دو دن سے جب وہ خالی ہاتھ گھر لوٹتا تو اس کے بچوں کے چہرے اسے دیکھ کر تیل سے محروم دیے کی طرح بجھ جاتے تھے۔ گزشتہ رات اس کا چھوٹا بیٹا بھوک سے آدمی رات تک روتا رہا تھا۔ اسے خاموش کراتے کراتے اس کی بیوی بھی سکے لگی تھی۔

ان سوچوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے پورے قبرستان پر نظر دوڑائی۔ پھر گردن جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کدال کندھے پر لٹائی اور لڑکھڑاتے قدموں سے قبرستان سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر اس نے ایک بار پھر گردن گھما کر دور دور تک پہلی قبروں کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بہت سارے مردے قبروں سے نکل کر سفید کفن میں ملبوس موت کا رقص کر رہے ہوں، قہقہے لگا رہے ہوں۔ وہ گھبرا کر پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا قبرستان سے دور نکل آیا۔

وہ گھر کے قریب پہنچا تو اچانک اسے خیال آیا کہ اسے قبرستان کی طرف واپس چلے جانا چاہیے۔ کیا پتا آج کسی کی زندگی کا چراغ بجھ ہی جائے۔ پھر خیال آیا کہ اگر ایسا ہوا تو ہمیشہ کی طرح لوگ اسے گھر سے بلا لیں گے۔ تب وہ ہچکچاتا ہوا دروازے پر پڑاٹ کا پردہ ہٹا کر گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ لائین کی ملنگی روشنی میں اس کی بیوی گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ سامنے اس کا چھوٹا بیٹا سویا ہوا تھا۔ اس کے گالوں پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کے نشان دھیمی روشنی میں بھی اس نے صاف دیکھ لیے تھے۔ اس کو اپنے اندر کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ زمین پر اس کے دونوں بڑے بیٹے کچھوں سے کھیل رہے تھے..... یا شاید اپنے آپ کو بہلا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ سب ایسے چونک اٹھے جیسے برسوں سے اس کا انتظار کر رہے ہوں مگر اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے دیکھ کر وہ مزید اداں ہو گئے۔ وہ گردن جھکا کر جھانگ چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”چھوٹا روٹی کے لیے رو رو کر ابھی سویا ہے۔“ اس کی

بیوی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”بابا مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔“ اس کے بچلے بیٹے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بابا.....! آج بھی کوئی نہیں مرا؟“

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے اس کے ہونٹ کسی نے سی دیے ہوں۔

”بابا جب کوئی مرے گا تب روٹی کپے گی؟“ بیٹے نے دوبارہ پوچھا۔

”ہاں۔“ جواب دیتے ہوئے اس کی آواز پاتال سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس کے بیٹے نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اللہ سائیں! اب آپ کسی کو مار دوتا کہ ہمارے گھر روٹی کپے..... اے اللہ سائیں!“

اچانک اس کے اندر دور کہیں ”آمین“ کی صدا ابھری۔ وہ خود بھی پچھلے دو دن سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی اچانک مر جائے۔

اس کے دونوں بڑے بچے اس امید پر کہ شاید کل کوئی مر جائے، آنکھیں موند کر لیٹ گئے حالانکہ بھوک کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اور اس کی بیوی سر جھکائے بیٹھے رہے۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس کی بیوی کی آواز ابھری۔ ”تم کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے؟“

”کونسا کام کروں؟ میرے لیے دوسرا کام رہا ہی کیا ہے..... میں کوئی دوسرا کام جانتا بھی تو نہیں ہوں.....“ اس کی آواز میں دنیا جہاں کی مایوسیاں تھیں۔

”تم کب تک یہ کام کرتے رہو گے۔ روز روز تو کوئی نہیں مرتا۔ اب گندم اور آٹے کی طرح موت بھی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ کم بخت ڈاکٹر جو پیدا ہو گئے ہیں۔ کسی کو مرنے ہی نہیں دیتے۔“

”بھنڈا! انسان کے نصیب میں جب موت آئے گی تب ہی وہ مرتا ہے۔ جب بھی کوئی مرے گا، اپنے وقت پر مرے گا۔ تب تمہارے گھر میں روٹی کپے گی۔“ وہ اپنی بیوی کو سمجھانے لگا حالانکہ وہ خود اندر سے ریت کے گھر وندے کی طرح بکھر رہا تھا۔

”میں نے تو بادشاہ پیر کی منت مانی ہے کہ جب کوئی مرے گا تو کچھ باتوں کی۔ دو دن سے میرے بچے بھوکے ہیں۔ آخر کب تک بھوک کا عذاب سہتے رہیں.....“ یہ کہہ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اپنے بچے ہوئے دوپٹے کے پلو سے



www.paksociety.com

# JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to  
Millions of Our Readers  
World Wide  
Through



JASOOSI DIGEST    SUSPENSE DIGEST    MONTHLY PAKEEZA    MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI-75500-PAKISTAN.  
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551  
Email : jdpgroup@hotmail.com



آنکھیں پونہ لگی۔ بیوی کو رونا دیکھ کر اس نے لائین بچا دی۔ کہیں وہ اس کے آنسو نہ دیکھ لے جو اس کی ڈاڑھی کو جھگور رہے تھے۔ وہ تاریکی میں آدمی رات تک روتا رہا۔ اس خیال سے کہ اس کے بچے دو دن سے بھوکے ہیں، اس کی آنکھیں دروازے پر گڑی رہیں۔ اس کے کان کسی پکار کو سننے کے لیے بے چین تھے..... شاید کوئی اسے بلانے آجائے مگر..... اس کا انتظار رائگاں گیا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ باہر صرف گلی کے کتے بھونکتے رہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی بھی رات بھر روتی رہی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی پتا تھا کہ پوری رات وہ بھی آنسو بہا رہا ہے۔ کئی بار اس کی بیوی کے آنسوؤں نے اس کے بازو کو جھگودیا تھا اور اس کے اشک بیوی کے چہرے پر گرتے رہے۔

اگلے دن پو پھننے سے پہلے ہی وہ کدال کندھے پر رکھ کر قبرستان چلا گیا۔ پورے راستے اس کے کانوں کو کسی کے رونے کا انتظار رہا۔ لیکن چاروں طرف زندگی اپنے خوب صورت پر پھیلائے بیٹھی رہی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر آج بھی کوئی جنازہ نہ آیا تو وہ چوری کرے گا مگر خالی ہاتھ گھر نہیں جائے گا۔ قبرستان میں سارا دن اس کی آنکھیں کسی جنازے کی منتظر رہیں۔ لوگ آتے، قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور چلے جاتے۔ کوئی قبر پر پھول رکھتا اور کوئی قبر پر سسک سسک کر چلا جاتا۔ یہ مناظر اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ روز بھی سب کچھ دیکھتا تھا۔ اس میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی کیونکہ اس میں اس کے اور اس کے بچوں کے لیے زندگی کا کوئی پیغام نہیں تھا۔ دن گزرتا رہا۔ گزبے کل کی طرح آج کا سورج بھی خاموشی سے ڈوب گیا۔ ”پتا نہیں کل سورج نکلے گا بھی یا نہیں۔“ اس نے مایوسی سے سوچا۔ اچانک اسے ایک واقعہ یاد آ گیا اور تیر کی طرح اس کے دل میں اتر گیا۔ ایک نوجوان نے ایک قبر کے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا۔

”اے موت! کاش تجھے بھی موت آئے۔“

تب موت کے لیے بددعا سن کر اس کے رونے کھڑے ہو گئے تھے..... اور آج رہ رہ کر اس کے کانوں میں یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اس نوجوان کی دعا قبول ہو گئی ہے اور موت کو بھی موت آ گئی ہے۔ رات کی پھیلتی تاریکی میں وہ اپنی ہی سوچوں سے گھبرا گیا۔ آج اس کے بچوں کی بھوک کو تیسرا دن تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ بچہ سا گیا۔ وہ ان کا سامنا کیسے کر پائے گا..... کیا وہ ان کی اداس آنکھیں دیکھ سکے گا..... وہ ان کے سوالوں کے کیا جواب دے گا۔ وہ اندر ہی اندر جلتا بجھتا رہا۔ رات کے بارہ بج گئے تھے۔ وہ قبرستان میں بیٹھا رہا لیکن کوئی نہیں آیا۔ آخر کار وہ اٹھا

اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ گھر کے راستے پر چلنے لگا۔ کدال اس کے کندھے پر لگی تھی۔ راستے میں وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ اب اسے کوئی دوسرا کام کرنا چاہیے۔ مزدوری نہ ملی تو چوری کرے گا۔ وہ آنے والے دن کے لیے کئی ترکیبیں سوچتا رہا اور پھر انہیں رد کرتا رہا۔ اندر ہی اندر ٹوٹا اور بکھرتا رہا۔ زندگی اس کے لیے کائنات کا سب سے بڑا المیہ بن گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس لیے پر ماتم کرتا جا رہا تھا۔

گلیوں میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر بھی گھور اندھیرا سانس لے رہا تھا۔ اچانک اسے کچھ فاصلے پر ایک سایہ آگے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن کے سنان ایوانوں میں ابھرا۔ اگر اس نے کدال کے ایک ہی وار سے اس سائے کو ختم کر دیا تو..... اس کے بعد کی سوچ کس قدر خوب صورت تھی۔ اس نے تصور میں بیوی کو چوہے پر روٹیاں پکاتے دیکھا اور وہ مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کے تینوں بیٹے ماں کے قریب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں بھی کر رہے تھے۔

وہ مسکرا دیا۔ مگر اس سائے کو ختم کرنے کا تصور بہت خوفناک تھا۔ اس نے تو کبھی چوری نہیں کی تھی، قتل کیسے کر سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے کانوں میں بچوں کی صدا گونجنے لگیں۔ اس کے قدم تیز ہو گئے۔ گلی میں گہری تاریکی تھی۔ وہ اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا سائے کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کی سانس پھول گئی۔ اس کا دل طوفان میں گھرے جہاز کی طرح کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ کدال کے دستے پر اس طرح مضبوطی سے جم گئے جیسے بھی جدا نہیں ہوں گے۔

وہ سائے کے قریب جا پہنچا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کدال بلند کر کے وار کر دیا۔ ایک کراہ ابھری اور ڈوب گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ کراہ شاید کسی بچے کی تھی لیکن اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ جھک کر دیکھتا۔ بس ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے چہرے گھوم گئے۔ اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ وہ پلٹا اور قبرستان کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لمحہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو۔ پہلی بار اسے موت سے خوف محسوس ہوا تھا۔ موت..... جو کسی بدروح کی طرح اپنے کالے بال پھیلائے، میلے دانت نکالے قہقہے لگاتی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہو۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والا لہو جھننے لگا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے ابھی سانس کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ وہ قبرستان کے گیٹ پر پہنچا۔ پلٹ کر پیچھے نظر دوڑائی۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ سنان گلیاں، سوتے ہوئے لوگ، رات کا گھور



وہ بہ ظاہر ان باتوں سے بے نیاز بنا قبر کھودتا رہا۔ قبر تیار ہوگئی تو لوگوں نے کفن میں لپیٹی لاش کو ہاتھوں میں اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ کفن پر خون کے داغ لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں میلی ہو گئیں۔ جب وہ بچے کو قبر میں اتارنے لگے تو اس کا دل چاہا کہ وہ بچے کا چہرہ دیکھے۔ وہ لوگوں کے کاندھوں سے جھانک کر بچے دیکھنے لگا۔ پھر وہ گویا تار کی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی ہر ہوند میں اندھیرے ہی اندھیرے سماتے چلے گئے۔ موت کے زہر جیسا کڑوا سیلا ذائقہ اس کے حلق میں چبھنے لگا۔

وہ گھر جاتے ہوئے کئی بار ٹریفک کی زد میں آتے آتے بچا۔ اس کی مٹھی میں تین کرارے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ آج اس کا دوسرا ہاتھ خالی تھا۔ اس نے کدال کہیں پیچینک دی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنا وجود بے حد بھاری محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اس کے انتظار میں گھر کی ولیمز پر بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلسا رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہ اس کے پیچھے ہلکی اور قریب جا کر سسک پڑی۔

”منورات سے تمہارے پیچھے نکلا ہوا ہے..... میں نے بہت منع کیا لیکن وہ مانا ہی نہیں۔ کہنے لگا جا کر دیکھتا ہوں بابا کو پیسے ملے یا نہیں..... وہ تمہارے پاس پہنچا تھا یا نہیں؟“ وہ خاموش رہا، موت کی طرح۔

”تت..... تم..... بولتے کیوں نہیں۔“ اس نے کپکپاتے ہونٹ پر دانت گاڑ دیے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کی ڈاڑھی میں جذب ہونے لگے۔

”تت..... تم رورہے ہو..... کیوں رورہے ہو.....؟“ وہ چیخی۔ ”تم بتاتے کیوں نہیں.....؟“

وہ پاگلوں کی طرح چیختی گئی۔ دونوں بچے حیرت سے ماں باپ کی طرف دیکھ رہے تھے..... اور وہ ایک ایسے مجرم کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا، جس میں جرم قبول کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔

”میرا منو کہاں ہے؟“ اس کی بیوی کی چیخ کوڑے کی طرح اس کے وجود کو لرزائے گی۔

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے تین نوٹ بیوی کے ہاتھ پر رکھے پھر وہ اپنے چہرے بٹنے کو سینے سے لگا کر بچوں کی طرح سسکنے لگا۔

اندھیرا اور وہ اکیلا تھا۔ اس نے قبرستان کے گل پر خون آلود کدال کو دھویا اور نیم کے درخت کے نیچے آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر طوفان برپا تھا لیکن وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا کہ صبح کو لوگ اس بچے کا جنازہ لے کر آئیں گے۔ اس کی قبر کھودنے کی اجرت ملے گی..... اور پھر ایک ہفتہ..... پورا ہفتہ کتنا شاندار گزرے گا۔ اس کے بچے کتنا خوش ہوں گے۔ وہ بھی کیسی شان سے گردن اٹھائے گھر میں داخل ہوگا۔ اس کی بیوی بادشاہ پیر کی منت پوری کرے گی۔ وہ اپنا جرم کسی کو نہیں بتائے گا۔ اپنی بیوی کو بھی نہیں۔ جس سے وہ کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔

ان تمام سوچوں پر خوف بھی سایہ قلم تھا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو اسے ضرور عمر قید ہو جائے گی۔ پھر اس کے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟ وہ تو بھوکوں مرجائیں گے۔ وہ ان کے لیے جیل میں روتا رہے گا۔

رات گزر گئی۔ صبح ہوئی اور نیا طلوع ہونے والا سورج اس کے لیے امیدوں کی روشنی پھیلاتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گیٹ کے اس پار سڑک پر جمی تھیں جہاں سے وہ جنازہ آتا تھا۔ دوپہر کے وقت کچھ لوگ جنازے کے ساتھ گیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ وہ سچ کچ کسی بچے کا ہی جنازہ تھا۔ لیکن کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ کسی کے چہرے پر دکھوں کا ہجوم نہیں تھا، جو کسی پیارے کے بچھڑنے پر سایہ قلم ہوتا ہے۔ ایسا دکھ کسی کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ گویا ایک فرض ادا کرنے کے لیے وہاں آئے ہوں۔ ایسا فرض جس میں ان کی کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس نے کدال اٹھائی اور قبر کھودنے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یہ خیال اسے لرزائے دے رہا تھا کہ اس کے دل میں چھپے ہوئے خوف سے کوئی آگاہ نہ ہو جائے..... کہیں بچے کی لاش اٹھ کر نہ بیٹھ جائے اور چیخ چیخ کر سب کو بتانے لگے کہ دیکھو یہ ہے میرا قاتل..... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ قبر کھودتا رہا۔ اس دوران جنازے کی نماز پڑھی گئی اور وہ قبر کی تیاری کا انتظار کرنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ لوگ آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے سننے کی کوشش کی لیکن سمجھنے سے قاصر رہا۔ وہ کچھ فاصلے پر موجود تھے۔

”نہ جانے کن بد نصیبوں کا بچہ ہے.....“ اس نے ایک جملہ سنا۔ ”کس کو اس معصوم سے دشمنی ہو سکتی ہے.....“ اب لوگ قریب آگئے تھے اور وہ ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”نہ جانے کون ظالم تھا۔“

”بے رحم کوڑا بھی رحم نہیں آیا تھا۔“

”اس کے ماں باپ اس بچارے کو ڈھونڈتے پھر رہے“



زندگی بھی انسان کو کسی کیسے رو بہ دکھائی ہے... دور سے سہارے اور قریب سے بھیانک مناظر عقل کو دنگ کر دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود... ہم اس ماحول اور منظر کا حصہ بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی "فاعل اور کوئی مفعول" ہوتا ہے یعنی ظالم اور مظلوم کا فارمولا کچھ یوں ہوگا کہ دو میں سے کسی ایک کا ظالم ہونا ضروری ہے تب ہی دوسرا مظلوم کہلائے گا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی پُر قریب منظر تھا جہاں جیون ساتھی کے روپ میں وہ دونوں ساتھ رہتے، ساتھ ہنستے اور ساتھ روتے تھے پھر اچانک ان کا ساتھ صرف رہنے کی حد تک محدود رہ گیا... ایک دوسرے کی سنگت کا احساس کہیں دفن ہو گیا... لیکن آپس کا اعتبار اور بہرم اس غیر یقینی صورت حال میں بھی باقی تھا... جس کے سہارے کئی رشتے ایک دوسرے سے جڑے تھے کہ ایک روز اس پُرسکون ندی میں اچانک ہلچل ہوئی اور کسی کی انا کے پتھر نے طوفان برپا کر ڈالا... ایسا طوفان جس میں تمام خواہشیں، خواب، گھمنڈ حتیٰ کہ خلوص اور وفا بھی بہہ گئیں... باعزت پیشے سے وابستہ درندوں کا اس کی ناموس پر حملہ سوچ کے کئی دروا کر گیا کہ معاشے کا ایسا کون سا رشتہ ہے جس کا "بہرم" باقی رہ گیا ہو۔ در کے اندر ہویا باہن عورت ذات شاید بھر بھری ریت سے زیادہ کچھ بھی نہیں جو بس بکھرنے کے لیے ہوتی ہے۔

کنگرہٹ کا الہ چنگی دیواروں کا بہرم اور کسی کی حیا و شرم کی عبرت ناک داستان



Downloaded From  
Paksociety.com







”محبوب بھائی! یہ لیس لسٹ اور جلدی سے سب چیزیں لادیں۔ پلیز جلدی لائیے گا۔ میں منٹ بعد میرا ہیریڈ شروع ہونے والا ہے اور ہاں..... دیکھیے گا میڈم جیلہ نے مرغ چھولے اور نان لانے کو کہا ہے۔ وہ تو کالج کینٹین میں ملیں گے نہیں اس لیے آپ پہلے کینٹین سے ملنے والا سامان لادیں پھر ان کالج لینے باہر جائیے گا۔“ نازک سی جواں سال لیکچرر میڈم سارہ نے بیون محبوب علی کو ایک فہرست تھما کی اور جلدی جلدی ہدایات جاری کرتی چلی گئی۔ وہ اسٹاف میں سب سے کم عمر لیکچرر تھی اور چند سال قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔

”بے فکر رہیے میڈم! میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔“ محبوب علی نے فہرست کے بعد آگے بڑھائے جانے والے نوٹ بھی تھامے اور مسکرا کر سارہ کو تسلی دی۔ وہ ایک عرصے سے اس کالج میں ملازمت کر رہا تھا اور یہاں ملازمت کرنے والے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے ہر فرد کی عادات و اطوار سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سارہ تھوڑی جگلت پسند اور کچھ کچھ بوکھلائی ہوئی فطرت کی مالک ہے اور اسے ہر بات کی ٹینشن ہو جایا کرتی ہے۔ اس نے سارہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے کینٹین کا رخ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود فہرست کینٹین والے کو تھماتے ہوئے بولا۔ ”یار، ذرا جلدی سے سب چیزیں دے دو۔ مجھے باہر بھی جانا ہے۔“

”فکرنٹ کریں محبوب بھائی، سب سے پہلے آپ ہی کونٹاتے ہیں۔ چل شیر باز پہلے میڈم لوگوں کا آرڈر پورا کر دے۔“ کینٹین والے نے محبوب علی کو تسلی دینے کے ساتھ ہی اپنے اسٹنٹ کو پکارا اور شیر باز نائی اس کو عمر لڑکے نے واقعی بے حد پھرتی سے وہ سب اشیاء ایک بڑے سے شاپر میں رکھ کر محبوب علی کے ہاتھ میں تھما دیں جن میں میڈم سارہ کے علاوہ اس کی دوسری کولیکز کی فرمائشی اشیاء بھی شامل تھیں۔ اس کے یہ کام کرنے کے دوران محبوب علی کینٹین کے مالک کو بل ادا کر چکا تھا چنانچہ شاپر ہاتھ میں آتے ہی بھاگتے قدموں سے ڈیپارٹمنٹ واپس پہنچ گیا۔

”تھینک یو محبوب بھائی۔ آپ واقعی بڑے کام کے بندے ہیں۔“ میڈم سارہ نے اس سے شاپر وصول کرتے ہوئے خوش دلی سے اس کی کارکردگی کو سراہا۔ محبوب علی کے پاس جواب میں بس ایک عاجزانہ مسکراہٹ ہی تھی۔ اس مسکراہٹ کی جھلک دکھا کر وہ اگلے قدموں پلٹا اور میڈم جیلہ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے کالج کے قریب واقع

ہوٹل کی طرف دوڑا نہ ہو گیا۔ کالج کی کینٹین والا تو رچی بنیادوں پر اس کی طلب کردہ اشیاءے نور و نوش فوراً اس کے حوالے کر دیتا تھا لیکن ہوٹل پر یہ سہولت حاصل نہیں تھی اور اسے عام گاہکوں کی طرح قطار میں لگنا پڑا تھا اس لیے اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ وہ واپس کالج پہنچا تو میڈم جیلہ بے قرار بیٹھی تھیں۔

”اتنی دیر لگا دی محبوب! اتنی شدید بھوک لگ رہی ہے، پتا ہے میں صبح ناشتا کیے بغیر آئی ہوں اور رات میں بھی کچھ موڈ آف تھا تو صبح سے کھا نا نہیں کھا سکی تھی۔ اب تو بھوک سے بری حالت ہو گئی ہے۔“ میڈم جیلہ نے خوشبو بکھیرنا شاپر اپنے ہاتھ میں لے کر بے قراری سے کھولتے ہوئے کہا تو محبوب علی بس یوں ہی سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے خاک چٹا نہیں تھا کہ میڈم جیلہ کب کی بھوک ہے البتہ خود اس کی بھوک خوشبو کی لپٹوں کے باعث چمک اٹھی تھی اور زبان مرغ چھولوں اور بحث نان کے ذائقے کو محسوس کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی لیکن وہ میڈم جیلہ کی طرح اپنی بے قراری کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا چنانچہ خود پر قابو پا کر پلٹا اور جلدی سے میڈم جیلہ کے آگے دھلی دھلائی صاف پلیٹیں رکھ دیں تاکہ وہ اپنا کھانا تناول کر سکیں۔

”ارے بھی محبوب! آج چائے نہیں ملے گی کیا؟“ وہ پلیٹیں رکھ کر پیچھے ہٹ رہا تھا تو سر حامد اسے پکارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

”کیوں نہیں ملے گی سر! بس پانچ منٹ انتظار کریں۔“ اس نے ایک بار پھر مستعدی کا مظاہرہ کیا اور کچ کچ پانچ منٹ میں خوش رنگ و خوشبودار چائے بنا کر لے آیا۔ سر حامد کے علاوہ اس نے اسٹاف روم میں موجود میڈم جیلہ اور میڈم ترندی کو بھی چائے پیش کی۔

”محبوب کی چائے کا کوئی مقابلہ نہیں ہے بھی۔ یہ چائے پی کر ساری ٹھکن اتر جاتی ہے۔“ سر حامد نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اور تعریف کرنے لگے۔ محبوب علی نے حسب عادت محض مسکرانے پر اکتفا کیا اور ٹیبل پر سے وہ جھوٹے برتن سمیٹنے لگا جو اس کی غیر موجودگی میں کھاپی کر جانے والے یونہی چھوڑ گئے تھے۔

”سارہ تمہارا حصہ بھی رکھ کر گئی ہے محبوب! وہ اس پلیٹ میں۔“ میڈم جیلہ نے اپنی کرخت آواز میں اسے وہ اطلاع دی جو روزانہ ہی اسے مژدہ جاں فزا محسوس ہوتی تھی۔ وہ روزانہ بغیر ناشتے کے کالج آتا تھا اور بھاگ بھاگ کر سارے کام انجام دیتے ہوئے اس کی خالی آستیں



دہائیاں دے لگتی تھیں تو ایسے میں سٹائی دینے والا یہ جملہ اسے بہت خوشگوار لگتا تھا۔

”یہ بھی کھا لینا۔“ میڈم جیلہ نے مرغ چھولوں کا بچا ہوا سالن اور آدھا نان بھی اسے عنایت کر دیا۔ بے حد بھوکا ہونے کے باوجود محبوب نے کوئی جلدی نہیں دکھائی اور اپنا سارا کام سینے کے بعد ملنے والی سوغائیں لے کر اسٹاف روم سے متصل لیپ میں پہنچ گیا۔ ابھی وہاں کوئی پریکٹیکل نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہ آرام سے وہاں بیٹھ کر کھانی سکتا تھا۔

”آپ کا لُچ ٹائم ہو گیا محبوب بھائی۔“ جوان العزب لیپ اینڈنٹ نے اسے اندر آتے دیکھ کر کہا۔

”ہاں بھائی ہو ہی گیا۔ بس یہ دو گھڑی کا وقفہ ہی ہوتا ہے جو ہماری ٹانگوں کو بھی تھوڑا سکون مل جاتا ہے۔“ محبوب علی نے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا اور اپنے ہاتھ میں موجود پلٹیش میز پر رکھ کر ان میں موجود اشیا کا جائزہ لینے لگا۔ آلو کا ایک سموسا، آدھی پیسٹری، تھوڑی سی نمکو، برگر کا چوتھائی حصہ اور ان کے علاوہ میڈم جیلہ کے عطا کردہ مرغ چھولے اور نان مل کر اس کے صبح سے خالی پیٹ کی تسلی کا کچھ نہ کچھ سامان کر سکتے تھے۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا اور آپریش سیٹ کرتے لیپ اینڈنٹ سے مخاطب ہوا۔

”تھوڑا سا کچھ لوسلیم۔ یہ مرغ چھولے کا سالن تو بہت ہی مزے کا ہے۔“

”آپ کھائیں محبوب بھائی۔ میں اپنی امی کے ہاتھ سے بنا انڈے پر اشوں کا ناشا خوب ڈٹ کے کر کے آیا ہوں اس لیے پیٹ میں بالکل جگہ نہیں ہے۔“ سلیم نے اس کی ترغیب کے باوجود حسب معمول انکار کر دیا۔ اسے یہاں ملازمت کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن محبوب علی نے اس کی عادت و اطوار کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک غیرت مند اور وضع دار لڑکا تھا جس کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔ اس کے والد حیات نہیں تھے اور والدہ اور چار بہن بھائیوں پر مشتمل کفالت اس کی ذمہ داری تھی اس لیے وہ اپنی عمر کے دیگر لڑکوں کی طرح نہ تو نئے نئے شوق پالتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی فضول خرچی کرتا تھا۔ محبوب نے اتنے دنوں میں اسے بھی کھاردی جانے والی چائے کے علاوہ کبھی کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً ذمے داریوں کا بوجھ اسے اپنی ذات پر کچھ خرچ کرنے سے روکتا تھا لیکن تھا غیرت مند اس لیے کبھی محبوب علی کے اصرار پر بھی اس کے ساتھ کھانے پینے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ شاید اسے یہ بھی

بھی اشیا کھانا برا لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں محبوب علی اس قسم کی غیرت مندی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چھ بچوں کا باپ تھا اور اس کے بوڑھے والدین بھی اسی کے ساتھ رہتے تھے۔ بیوی بچوں کے علاوہ بوڑھے والدین کی ذمہ داریاں نبھانے میں اسے دانتوں پسینا آ جاتا تھا۔ ایک بیوی کی تنخواہ ہی بھلا کتنی ہوتی ہے جو دس افراد کا پیٹ ڈھنگ سے بھر سکے۔ وہ تو اس کی بیوی اچھی عورت تھی اور گھر پر لوگوں کے کپڑے سی کر کچھ نہ کچھ رقم کما لیتی تھی تو ان کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ گھر کے ڈھیر دس کاموں کے ساتھ اس اضافی مشقت کے کرنے پر وہ اپنی بیوی سے تھوڑا شرمندہ رہا کرتا تھا اور اپنی طرف سے اس نے صبح کا ناشا نہ کرنے کا معمول اپنا کر تھوڑی سی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ اپنی صبح کی دو روٹیاں چھوڑتا ہے تو وہ گھر کے کسی اور فرد کا پیٹ بھرنے کے کام آ جاتی ہیں اور چھوٹی سی بچت ہو جاتی ہے۔ بچت کی اس تدبیر کا اس نے کبھی کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا اور گھر میں یہی کہا کرتا تھا کہ اس کا صبح سویرے ناشا کرنے کا دل نہیں چاہتا اس لیے خالی پیٹ کالج کے لیے نکل جاتا ہے۔ کالج میں اسے تدریسی اسٹاف کے چٹورے پن کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کھانے کو مل ہی جاتا تھا۔ اس ”کچھ نہ کچھ“ کا معیار اور مقدار اگرچہ ہر دن مختلف ہوتی تھی لیکن اس کا گزارہ بہر حال ہو جاتا تھا۔ آج بھی اس نے اپنے سامنے موجود اشیا کو شکر و صبر کے ساتھ اپنے پیٹ میں منتقل کیا اور پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ اس مختصر عرصے میں بھی اس کے نام کی پکاریں پڑنا شروع ہو گئی ہوں گی۔

☆☆☆

”اچھا یار چلتا ہوں۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کل پڑھیں گے۔“ سلیم نے اپنے سامنے رکھی کتاب بند کی اور کامی سے بولا۔ کامران عرف کامی اسکول کے زمانے سے اس کا دوست تھا۔ اس کے والد اچھی مالی حیثیت کے مالک تھے اس لیے وہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ سلیم کے معاشی مجبور یوں کے سبب تعلیم چھوڑ کر ملازمت کر لینے کے باوجود ان کی دوستی کا سلسلہ جاری تھا بلکہ اس نے سلیم کو یہ راہ بھائی تھی کہ وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ آگے تعلیمی سلسلہ جاری رکھ کر اپنے لیے بہتر مواقع پیدا کر سکتا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنی خدمات بھی پیش کر دی تھیں، چنانچہ سلیم شام کے اوقات میں روزانہ اس کے گھر آنے لگا تھا۔



روزانہ کی اس ملاقات میں دونوں دوست مل جل کر مصالحت بھی کرتے تھے اور آپس میں کچھ گپ شپ بھی ہو جاتی تھی۔ کامی جس محلے میں رہتا تھا، وہیں سلیم کے تایا کا گھر بھی تھا۔ سلیم یہاں تک آتا تھا تو کسی کی دن تایا کے گھر کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔ آج بھی اس کا کچھ ایسا ہی ارادہ تھا۔ ”کیا تایا کے گھر جانے کا ارادہ ہے؟“ اس کے جلد کتاب بند کر دینے پر کامی نے اس کا ارادہ بھانپ کر سوال کیا۔

”ہاں۔ کافی دن سے نہیں گیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں آج جا کر خیر خیریت معلوم کر لوں۔“ سلیم نے اسے جواب دیا۔

”اچھا چائے تو پی لے۔ ٹوپی لے کر آتی ہی ہوگی۔“ کامی نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا۔

”نہیں یا رہنے دو۔ چائے میں تایا کے گھر ہی پی لوں گا۔ غزالہ بہت اچھی چائے بناتی ہے۔“ سلیم کے تصور میں غزالہ کا سراپا لہرایا تو لبوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”یہ بول کہ تجھے اس کے ہاتھ کی چائے اچھی لگتی ہے۔“ کامی نے اسے پیھڑا۔ وہ سلیم کا قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اس کے بہت سے رازوں سے بھی واقف تھا۔ اس کے علم میں تھا کہ سلیم اپنی تایا زاد غزالہ کے لیے کسے جذبات رکھتا ہے۔ اس کے ان جذبات کے پیچھے اس کی دادی کی خواہش بھی کارفرما تھی۔ غزالہ کی پیدائش کے فوراً بعد ہی انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنی اس پوتی کی شادی اپنے لاڈلے پوتے سلیم سے کریں گی۔ انہوں نے صرف ایک بار اعلان کرنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً اپنی اس خواہش کو دہراتی بھی رہی تھیں۔ اس لیے سلیم اور غزالہ کے کانوں میں بھی بات پڑ گئی تھی اور وہ بہت نوعمری میں ہی ایک دوسرے کے ساتھ کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ سلیم میٹرک کا امتحان دے رہا تھا، اس وقت دادی اس دنیا سے چلی گئیں لیکن ان کی کہی بات سلیم اور غزالہ کے دلوں پر نقش رہی۔ حالات سازگار ہوتے تو شاید اب تک سلیم اور غزالہ کی شادی کا قصہ چھڑ چکا ہوتا لیکن فی الحال ایسی کوئی بات اس لیے نہیں اٹھ سکی تھی کہ سلیم معاشی استحکام کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف تھا۔ بہر حال اسے اطمینان تھا کہ غزالہ اس کی ہے اور وقت آنے پر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ تایا اور ان کے مالی حالات میں خاص فرق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ غزالہ کو اسی وقت بیاہ کر اپنے گھر لائے جب وہ خود معاشی طور پر مضبوط ہو چکا ہوتا کہ وہ سسرال میں اپنے میکے کے مقابلے میں تنگی محسوس

نہ کرے۔ صرف اس کی ذاتی خواہش تھی ورنہ غزالہ کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔ تایا اور ان کے گھر والوں کے رویے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ اپنے اور ان کے درمیان موجود فرق کو محسوس کر پاتا۔ تایا سمیت سب ہی اس سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے۔ اس کے گھر والوں سے بھی ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ یہاں تک کہ تائی اور امی کے درمیان جھگڑائی اور دیورائی والی روایتی چپقلش بھی موجود نہیں تھی۔ ان حالات میں وہ اپنے اور غزالہ کے رشتے کے بارے میں پھر یقین تھا تو یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اب بھی کامی کے غزالہ کے حوالے سے ہیمز نے پر اس کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ شوخ لہجے میں بولا۔

”تجھے کسی سے محبت ہو جائے تو پھر پوچھوں گا کہ محبوب سے بڑھ کر کچھ کیسے اچھا لگتا ہے؟“

”مجھے تو بھی معاف ہی رکھو اس جھیلے سے۔ میں نے یہ عشق و محبت کا رنگ پالنے کی کوشش کی تو میرے ابا کاں سے پکڑ کر گھر سے نکال دیں گے اور میں اتنے شاندار گھر کی وراثت سے محروم ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا۔“ کامی نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔ جو ابا سلیم نے ایک تہتہ لگا یاد پھر کامی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ وہ تایا کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا جب اس نے ان کے گیٹ سے کچھ خواتین کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ خواتین کے چہرے اس کے لیے شامسا نہیں تھے لیکن اس نے ان کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔ وہ تائی کی جاننے والیاں یا ان کی بہو کے میکے سے تعلق رکھنے والی خواتین ہو سکتی تھیں۔ خواتین گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد سامنے ہی کھڑی ایک گاڑی میں سوار ہو رہی تھیں۔ یہ نئے ماڈل کی کلش تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے مرد کو وہ صحیح طرح نہیں دیکھ سکا البتہ اس نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے تایا اور تائی دونوں بذات خود گیٹ پر موجود ہیں۔ سلیم کے نزدیک پہنچنے تک کلش اسٹارٹ ہو کر وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ تایا جو کلش کی روانگی کے بعد گیٹ بند کرنے لگے تھے، یکدم سلیم کو سامنے پا کر ٹھٹک سے گئے اور ان کے چہرے کی رنگت ذرا سی تبدیل ہوئی۔

”السلام علیکم تایا اور تائی! کیسے ہیں آپ لوگ؟“

سلیم نے دونوں میاں بیوی کے انداز میں کچھ عجیب سا محسوس کرنے کے باوجود خوش دلی سے انہیں سلام کرتے ہوئے ان کی خیریت دریافت کی۔



”وعلیکم السلام۔ کیسے ہو بھی سہو میاں؟ بڑے دن بعد جگر لگایا۔“ تایا نے فوراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور اسے اس نام سے پکارا جو بچپن میں اس کا نیک نیم تھا اور دادی کی وفات کے بعد کوئی اسے اس نام سے پکارنے والا نہیں رہا تھا۔ آج اتنے عرصے بعد تایا کے منہ سے اپنا نیک نیم سننا اسے عجیب سا لگا۔ بہر حال اس نے اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رکھی اور انہیں اپنی مصروفیت کے بارے میں بتانے لگا۔ باتوں کے دوران وہ لوگ اندر آچکے تھے اور اب وہ تایا اور تائی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا تایا کے گھر بے تکلفانہ آنا جانا تھا اس لیے یہاں آمد پر کبھی بھی اسے رکھی مہمانوں کی طرح ڈرائنگ روم میں نہیں بٹھایا جاتا تھا۔ وہ آزادانہ پورے گھر میں کہیں بھی آجاسکتا تھا لیکن فی الحال تایا کے کمرے میں بیٹھا تائی کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ اس سے اس کی والدہ کی خیریت دریافت کرنے کے علاوہ اس کی ملازمت اور بہنوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی پے در پے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتی چلی جا رہی تھیں اور وہ فرماں برداری سے ان کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے غزالہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ آج گھر پر موجود نہیں ہے ورنہ اب تک اس کے سامنے آچکی ہوتی۔ نادیا بھابی نے لوازمات کے ساتھ اس کے سامنے چائے لاکر رکھی تو اس کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ اس کے لیے چائے ہمیشہ غزالہ ہی لے کر آتی تھی اور زیادہ تر صرف چائے ہی ہوتی تھی یا پھر اس کے ساتھ کوئی ایک آدھ اسٹیک۔ یوں بھری ہوئی ٹرے بھی اس کے سامنے نہیں رکھی گئی تھی کہ وہ گھر کا فرد شمار ہوتا تھا اور گھر والوں کے لیے بھلا کسی اہتمام کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کچھ ان مہمان خواتین کے لیے منگوا یا گیا ہوگا جو اس کی آمد کے وقت یہاں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ اس بار وہ زبان پر سوال آنے سے نہیں روک سکا اور تائی کی طرف رخ کر کے پوچھنے لگا۔

”گھر پر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ کون لوگ تھے وہ میں انہیں پہچان نہیں سکا؟“

”میری کچھ جاننے والیاں تھیں۔ تم یہ کیک کھاؤ نا، بہت مزے کا ہے۔“ تائی نے سرسری لہجے میں اس کے سوال کا جواب دے کر اس کی توجہ پائن اپیل کیک کی طرف مبذول کروائی تو وہ ایک کیک جس کا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھنے کے بعد اسے کھانے لگا۔ کیک واقعی مزیدار تھا بلکہ فزے میں جتنی بھی چیزیں اس کے سامنے رکھی تھیں، سب ہی

جستہ اچھی اور منجاری تھیں اور عارف پتا چل رہا تھا کہ کسی مہنگی بیکری سے منگوائی گئی ہیں۔ تایا کے حالات اچھے تھے لیکن تائی تھوڑی سی کنجوس خاتون تھیں اس لیے اس نے کبھی اپنے تایا کے گھر اس قسم کی ”فضول خرچی“ نہیں دیکھی تھی۔ تائی ہمیشہ فخر سے کہا کرتی تھیں کہ ان کی بچت کی عادت کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوا ہے کہ آج کے دور میں انہوں نے اپنا ذاتی اور وہ بھی اتنا اچھا گھر بنا لیا ہے۔ وہ یہ بات بھی برملا کہتی تھیں کہ انہوں نے صرف ایک بیٹے اور بیٹی پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے خاوند پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا اس لیے بھی وہ لوگ ایک خوش حال اور آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس قسم کی سوچ رکھنے والی خاتون نے اگر اپنے گھر آنے والے کسی مہمان کی ایسی خاطر مدارت کی تھی تو یہ بات طے تھی کہ مہمان بہت خاص تھے لیکن اخلاقاً تسلیم ان کی بابت زیادہ سوال جواب نہیں کر سکتا تھا چنانچہ کیک سے انصاف کرنے کے بعد چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ چائے غزالہ نے ہی بنائی ہے۔ غزالہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیش کیے جانے کا مطلب تھا کہ غزالہ گھر میں ہی موجود ہے لیکن وہ اب تک سامنے کیوں نہیں آئی تھی؟ یہ ایسا سوال تھا جس نے تسلیم کو ابھرن میں ڈال دیا تھا۔ سامنے نہ آنے کی ایک وجہ جو اسے سمجھ آرہی تھی، وہ یہ بھی کہ شاید غزالہ اس سے کسی بات پر ناراض ہے لیکن کس بات پر؟ یہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ چائے پینے کے دوران وہ اس سوال کا جواب ڈھونڈتا رہا لیکن کاسیابی حاصل نہیں ہوئی اور زندگی میں پہلی بار اس نے غزالہ کے ہاتھ سے بنی چائے بے دلی سے ختم کر ڈالی۔

”میں ذرا واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔“ چائے پینے کے بعد وہ بہانہ بنا کر تایا کے کمرے سے باہر نکلا۔ غزالہ اسے کچن میں دکھائی دے گئی۔ وہاں اس کے ساتھ نادیا بھابی بھی موجود تھیں۔ ان کے سامنے وہ کھل کر کوئی بات نہیں کر سکتا تھا لیکن بات تو کرنی ہی تھی، سو لہجے میں خوشگوار سی حیرت بھرتے ہوئے غزالہ سے مخاطب ہوا۔

”السلام علیکم۔ تم گھر پر ہو غزالہ! میں تو سمجھا تھا کہ تم کہیں گئی ہوئی ہو۔“

”وعلیکم السلام۔“ غزالہ نے محض اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور اس نے رخ موڑ کر سلیم کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ پوری تندہی سے چولہے پر چڑھی ہندیا میں چھچھلانے میں مصروف رہی تھی۔

”لگتا ہے کچھ خاص آپک رہا ہے۔ جب ہی غزالہ بی بی



.... کو رخ موڑنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔“ سلیم کو اس کا رویہ کھلا اور وہ خود کو طنز کرنے سے نہ روک سکا۔

”غزالہ پسند ہے بنا رہی ہے۔ تمہیں پسند ہیں نا۔ اب رات کا کھانا کھا کر ہی جانا۔“ جواب غزالہ کے بجائے برتن دھونی نادیا بھابی نے دیا۔

”آپ نے چائے کے ساتھ ہی اتنا کچھ کھلا دیا ہے کہ اب تو کھانے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔“ سلیم نے مسکرا کر نادیا سے کہا لیکن اس کی توجہ غزالہ کی طرف ہی مبذول رہی۔ وہ غزالہ کو جانتا تھا اور اس کی ایک ایک ادا سے واقف تھا چنانچہ اس نے محسوس کر لیا کہ مسئلہ ناراضی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ غزالہ اس سے ناراض ہوتی تو انداز کچھ اور ہوتا، ابھی تو وہ بڑی ست اور تھکی ہوئی سی لگ رہی تھی یوں جیسے کسی بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی ہو اور یہ سارے انداز سے وہ اس کی پشت پر کھڑے ہو کر اس کی پاؤں لینگوٹج سے لگا رہا تھا۔ غزالہ کا چہرہ اب تک اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔

”ابھی تو کھانے میں تھوڑی دیر ہے، تب تک کچھ نہ کچھ گنجائش بن ہی جائے گی۔“ نادیا نے بھی مسکرا کر اس سے کہا اور آخری پلیٹ دھو کر ریک میں رکھنے کے بعد کپڑے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے بولی۔

”میں ذرا چائے کے برتن سمیٹ کر لے آؤں۔“

”جی بالکل۔“ سلیم نے اسے گزرنے کا راستہ دیا۔ نادیا کے باہر نکلتے ہی وہ غزالہ کے قریب پہنچا اور بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیرا۔ یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا کہ غزالہ کی پلکیں بری طرح بھیگی ہوئی ہیں اور ضبط گریہ کی کوشش میں ستواں ناک سرخ ہو گئی ہے۔

”کیا بات ہے غزالہ..... کیا ہوا ہے؟“ اس نے کسی انہونی کے اندیشے سے دہل کر وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ غزالہ جواب تک اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی، ہچکیوں سے رو پڑی۔

”کچھ تو بولو غزالہ! ایسے تو تم میری جان لے لو گی۔“ غزالہ کے آنسو سیدھے اس کے دل پر گر رہے تھے۔

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی سلیم۔ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گی۔“ غزالہ نے ہچکیوں کے دوران یہ دو جملے ادا کر کے اس کی تشویش میں مزید اضافہ کر دیا۔

”تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ مسئلہ کیا ہے، مجھے بتاؤ تو کسی؟“ اسے اندیشوں اور جھنجھلاہٹ نے ایک ساتھ گھیر لیا۔

”ای اور ابو میرا رشتہ کیسی اور طے کر رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو لوگ آئے ہوئے تھے، وہ میرے رشتے کے سلسلے میں ہی آئے تھے۔“ غزالہ نے اس کی روح کو لرزا دینے والا انکشاف کیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تایا اور تائی دادی کے طے کیے ہوئے ہمارے رشتے کو بھول گئے ہیں کیا؟“ وہ بیک وقت غصے اور بے یقینی کا شکار ہوا۔

”دولت انسان کو سب کچھ بھلا دیتی ہے سلیم۔ امی اور ابو بھی اپنے تئیں میرے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“ غزالہ نے اداسی سے بتایا۔

”کیا تم بھی اپنے لیے آسانشوں بھرا بہتر مستقبل چاہتی ہو؟“ سلیم نے ذرا رکھائی سے اس سے دریافت کیا۔ ”میں صرف تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔“ غزالہ نے تڑپ کر اس کی بات کا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے پھر..... میں امی کو یہاں بھیجتا ہوں۔ وہ اس سلسلے میں تایا اور تائی سے بات کریں گی۔ دیکھتے ہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“ سلیم نے کہا اور پلیٹ کر سیدھا بیرونی دروازے تک جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ غم دغصے کی شدت کے باعث اس نے روانہ ہوتے ہوئے تایا اور تائی سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ ٹرے اٹھائے کچن کی طرف آتی نادیا بھابی سے بھی مخاطب نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

”آج ابا کو دل کے اسپتال لے گئی تھی۔“ رات کے کھانے اور دیگر کاموں سے فراغت پانے کے بعد محبوب علی کی بیوی سکینہ اس کے پاس آ کر بیٹھی تو بھی اس کے ہاتھ میں سلائی کے لیے آنے والی ایک قمیص موجود تھی جس کے دامن پر وہ تڑپائی کر رہی تھی۔

”کیا کہا ڈاکٹروں نے؟“ محبوب علی نے بیوی کے چہرے کے سنجیدہ تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

”کہتے ہیں اب دواؤں سے گزارہ نہیں ہو سکتا۔ آپریشن کروانا ہوگا۔“ سکینہ نے اسے بتایا۔

”بائی پاس آپریشن.....“ محبوب علی آہستہ سے بڑبڑایا اور فکر مندی سے بولا۔ ”ابا بہت کمزور ہیں۔ اس عمر میں اتنا بڑا آپریشن برداشت کر پائیں گے؟“

”ڈاکٹر کو زیادہ صحیح پتا ہوگا۔ اس نے ابا کی حالت دیکھ کر ہی آپریشن کا مشورہ دیا ہوگا۔“ سکینہ نے دانت سے دھاگا توڑتے ہوئے کہا پھر فکر مندی سے بولی۔ ”سوچنے کی بات یہ نہیں کہ ابا آپریشن کی تکلیف برداشت کر پائیں گے



یا نہیں، اصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ تم اتنے بڑے آپریشن کا خرچ اٹھا پاؤ گے یا نہیں۔ میں نے وہاں اسپتال میں کافی لوگوں سے اس بارے میں معلوم کیا تھا۔ پرائیویٹ اسپتالوں کی طرف جانے کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے لیکن سرکاری اسپتالوں میں بھی کچھ کم خرچ نہیں آئے گا۔ وہاں بھی لاکھوں کی کہانی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میرے ایک دوست کے بڑے بھائی کا پچھلے سال سرکاری اسپتال میں ہی آپریشن ہوا تھا اسی نے ساری معلومات دی ہیں۔“

”کہاں سے آئیں گے... اتنے پیسے...“ اس کی بیوی نے سوال اٹھایا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ محبوب علی سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا کر لو گے تم...؟“ سکینہ نے اسے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

”تو نے پچاس ہزار کی کمیٹی ڈال رکھی ہے نا، وہ کب نکلے گی؟“ محبوب علی نے اس سے پوچھا۔

”تیسرے مہینے میں نکلنے والی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ نکلے گی تو زینبی کے لیے زیور بنوا کر رکھ لوں گی۔ گھڑی کی طرح لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ دو تین سالوں میں بیاہ کے قائل ہو جائے گی۔“ اس نے محبوب علی کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی مستقبل میں ملنے والی رقم کے حوالے سے اپنے منصوبے سے بھی آگاہ کیا۔

”زیور پھر کبھی بن جائے گا۔ ابھی کونسا زینبی کی برات دروازے پر کھڑی ہے۔“

”پانی کی رقم کہاں سے پوری کرو گے؟ پچاس ہزار میں تو کچھ نہیں ہونے والا۔“ سکینہ نے اندر ہی اندر جربز ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

”سوچ رہا ہوں اپنے فنڈ میں سے نکالوں۔“ محبوب علی کی بات نے سکینہ کو تڑپا کر رکھ دیا۔

”فنڈ میں سے... تم فنڈ میں سے ابا کے آپریشن کے لیے رقم نکالو گے؟“ اس نے بے یقینی اور صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔

”اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔“ محبوب علی اپنی بیوی کے جذبات و کیفیات کو سمجھ رہا تھا اس لیے بے چارگی سے بولا۔

”اتنی بڑی رقم نکالوانے کے بعد تمہارے فنڈ میں بچے گا ہی کیا؟ معلوم ہے نا کہ تمہاری ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے

والے فنڈ کی رقم سے ہم نے کیا کیا کام کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ میں دن رات سلائی مشین پر بیٹھ کر اس لیے اپنی آنکھیں پھوڑتی رہتی ہوں کہ جب تک ہاتھ پیروں میں دم ہے، بچوں کے بیاہ کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑ کر رکھ لوں۔ ابھی محنت کر کے بچوں کے لیے جوڑ لیا تو تمہارے فنڈ کی رقم سے ہم اپنا ڈھنگ کا گھر بنا سکتے ہیں۔ گھر بن گیا تو تینوں بیٹوں کی شادی کر کے انہیں اپنے ساتھ رکھ سکیں گے اور خود بڑھاپے میں پوتا پوتی کے ساتھ آرام سے رہیں گے ورنہ تو بچے جگہ کی تنگی کی وجہ سے ادھر ادھر کرائے کے گھروں میں جا کر رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہیں بھی پریشانی ہوگی اور ہمارا بڑھاپا بھی رُل جائے گا۔“ سکینہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس سے وہ پہلے ہی واقف تھا بلکہ اس ساری منصوبہ بندی میں وہ خود بھی سکینہ کے ساتھ شامل رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے سکینہ کتنی محنت کرتی ہے۔ گھر کے ڈھیروں کاموں کے ساتھ سلائی مشین سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آدمی آدمی رات تک بھی کپڑے سکتی تھی۔ سخت محنت نے اس کی صحت پر بھی اثر ڈالا تھا اور اب وہ کہیں سے بھی وہ سکینہ نہیں لگتی تھی جسے وہ سالوں پہلے بیاہ کر اپنے گھر لایا تھا اور جس کا روپ رنگ دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا تھا۔ اس کے گھر میں بسنے اور اس گھر کو چلانے میں سکینہ نے اپنی ہستی کو مٹا دیا تھا۔ وہ اس کی قربانیوں اور محنت کا معترف تھا اور سمجھتا تھا کہ فنڈ کی رقم ابا کے آپریشن پر خرچ کرنے کا مطلب ہوگا۔ سکینہ کی آنکھوں میں بے خوابوں کو نوچ لینا۔ لیکن وہ اپنے باپ کو کبھی تو بغیر علاج کے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ باپ جس نے اسے کڑی محنت و مشقت سے پال کر جوان کیا تھا اور اپنے سارے خواب اور امیدیں اس کی ذات سے وابستہ کر لی تھیں اگر بغیر علاج کے مر جاتا تو وہ اپنے ضمیر کو کیا جواب دیتا۔ اولاد کی محبت میں وہ بوڑھے بے بس باپ کو فراموش تو نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بات اس نے سکینہ سے بھی کہی جسے سن کر وہ ہل بھر کے لیے چپ ہو گئی پھر سر دلچے میں بولی۔

”ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔“ اتنی بات کہہ کر وہ کمرے میں رکی نہیں اور ہاتھ میں ترپائی کے لیے موجود قمیص لے کر باہر نکل گئی۔ محبوب علی سمجھ گیا کہ وہ اس کے فیصلے پر دل سے راضی نہیں ہے اور ناراض ہو کر کمرے سے باہر نکلی ہے۔ سکینہ کے اتنے برسوں کے ساتھ میں اسے تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ بات بات پر



روشنی والی عورت نہیں تھی لیکن جب روشنی تھی تو اسے مانتا مشکل ہو جاتا تھا اور اس وقت تو وہ ایک ایسی بات پر روشنی تھی کہ وہ اس کو منانے کے سلسلے میں بھی خود کو بے بس پارہا تھا۔ اپنی اس بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے تکیے پر زور دار مکا مارا اور پھر بستر پر چت لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اب لاسحدود مدت تک اسے اسی عذاب میں رہنا ہے۔

☆☆☆

”گوگر اس وقت یہاں گلاب کا پھول لا کر رکھ دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی آپ کے آگے ہار مان جائے گا۔ بنانے والے نے آپ کو بڑی فرصت سے بنایا ہے اور آپ پر وہ بات صادق آتی ہے کہ تو جس رنگ کا کپڑا پہنے، وہ موسم کا رنگ بن جائے۔“ سر حامد نے یہ الفاظ روز پنک کھر کے جدید تراش خراش کے لباس میں ملبوس سارہ کے لیے ادا کیے تھے۔ وہ اس کے عین مقابل بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی نظریں سارہ کے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت وہ دونوں اسٹاف روم میں تنہا موجود تھے اور اس تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ہی سر حامد نے اتنی بے باکی سے اس کی تعریف میں یہ کلمات ادا کرنے کی جسارت کی تھی۔ سر حامد کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور وہ ابھی تک کنوارے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ ان سے چھوٹی چھ عدد بہنیں بھی کنواری بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی والدہ نے اعلان کر رکھا تھا کہ جب تک بیٹیوں کی شادی سے فارغ نہیں ہو جاؤں، حامد کی دلہن لانے کے بارے میں نہیں سوچوں گی۔ والدہ کے حکم کے آگے مجبور سر حامد کی نفسیات میں تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی اور وہ خواتین کو موقع دیکھ کر گھورنے کے علاوہ ان سے فلرٹ کی کوشش بھی فرماتے رہتے تھے۔ سارہ اسٹاف کی سب سے کم عمر اور خوب صورت فرد ہونے کی وجہ سے زیادہ ہی ان کے نشانے پر رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے نہایت ناگواری سے ان کے الفاظ سنے اور تیوری پر بل ڈال کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

”آپ کو شاید میرا تعریف کرنا پسند نہیں آیا لیکن کیا کروں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ کوئی خوب صورت شے سامنے آ جائے تو خود کو اسے سراہنے سے روک نہیں پاتا۔ میں ذرا حسن پرست فطرت کا مالک ہوں اور آپ تو خالق کی کارگیری کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ خوش ذوقی اور عقل مندی آپ کی اضافی خوبیاں ہیں۔ آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ کس قسم کا سنسار آپ کی شخصیت کو مزید نکھار دے گا اور آپ

اپنے حسن کو منجھال کر رکھنے سے نفی سے بھی واقف ہیں۔ شادی کے فوری بعد ماں نہ بن کر بھی آپ نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں خواتین شادی کے اگلے برس ہی ماں بن جاتی ہیں اور پھر ایسی بھدی اور بے ڈھب ہو جاتی ہیں کہ شوہر کا بیوی کی جانب دیکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“ سارہ کی پیشانی کے بلوں میں مسلسل ہوتے

اضافے سے بے نیاز سر حامد اپنی دھن میں بولتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ان کی چلتی زبان کو اس وقت بریک لگا جب سارہ نے زور سے میز پر ہاتھ مارا اور قدرے بلند آواز میں ان پر برس پڑی۔

”آپ نہایت اہل منیر ڈاڈی ہیں حامد صاحب! آپ کو ذرا تمیز نہیں ہے کہ خواتین سے کس انداز میں گفتگو کرنی چاہیے۔“ ”مم..... میں..... تو صرف آپ کی تعریف کر رہا تھا۔“ اس کے رد عمل پر سر حامد بوکھلا گئے۔

”آپ صرف تعریف نہیں کر رہے تھے۔ آپ میرے نجی معاملات کو بھی ڈسکس کر رہے تھے۔“ سارہ شدت سے ماں بننے کی خواہش مند تھی لیکن اس کا شوہر زبیری فی الحال فیملی بڑھانے میں انٹرنسڈ نہیں تھا۔ شوہر سے اس اختلاف نے سارہ کو ایسے ہی ڈپیشن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سر حامد نے اپنی بے لگلی باتوں کے دوران اس موضوع کو بھی چھیڑ دیا تو سارہ کی برداشت جواب دے گئی اور وہ پھٹ پڑی۔

”آپ کو بات کرتے ہوئے اس بات کا بھی خیال نہیں رہتا کہ آپ کوئی کان بوائے نہیں جو اپنے سامنے آنے والی ہر فیملی سے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اپنے معزز پیشے کا کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔ اگر آئندہ آپ نے اس قسم کی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تو میں پرنسپل سے آپ کی کسپلین کر دوں گی۔“ لال بھوکا چہرے کے ساتھ سر حامد کی طبیعت صاف کرتی سارہ کی آواز اتنی بلند ہو گئی تھی کہ اسٹاف روم کے باہر اسٹول پر بیٹھے محبوب علی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی اور بے ساختہ ہی وہ اندر چلا آیا۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوا، سارہ ٹیکچر کی تیاری کے سلسلے میں لائبریری سے ایشو کروائی ہوئی کتابیں سمیٹ رہی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بہت خراب موڈ میں ہے۔

”کیا ہوا میڈم! میری مدد کی ضرورت ہے تو بتائیں۔“ محبوب جس بے ساختگی سے اسٹاف روم میں چلا آیا تھا، اسی بے ساختگی کے ساتھ سارہ سے مخاطب ہوا۔

”میڈم سارہ کو کوئی کولڈ ڈرنک وغیرہ لا کر پلاؤ یا!



اور ہو گئی اور سر حامد کی شخصیت میں بتدریج تبدیلی آتی چلی گئی۔ سر حامد کی والدہ کو تو شاید اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر بیٹھی ہیں اور ایک اچھے خاصے انسان کی نفسیات کو الجھا دینے کی مجرم ہیں۔

سر حامد کے لیے افسردہ محبوب علی آج کل اپنے مسئلے کی وجہ سے بھی اداس رہنے لگا تھا۔ ابا کا بانی پاس ہونا ضروری تھا اور اس کے پاس رقم کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ انتظام کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ اپنے فنڈ میں سے رقم نکالوا لیتا لیکن اس کے لیے سکینہ راضی نہیں تھی اور اسے سکینہ کے اعتراضات غلط بھی نہیں لگ رہے تھے لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ باپ کو بھی اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ سے بہت محبت تھی اور وہ کوشش کرتا تھا کہ اس کی ذات سے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ اب بھی اپنے سر پر ان کے سائے کی ضرورت محسوس کرتا تھا لیکن لگتا تھا کہ اب یہ سایہ اس کے سر پر سے اٹھنے کو ہے۔ بے شک موت کا ایک دن مقرر ہے لیکن اگر ابا علاج نہ کروانے کی صورت میں اپنی جان سے چلے جاتے تو وہ خود کو بھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ سر حامد کے لیے چائے بناتے ہوئے بھی وہ مسلسل اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ مسلسل سوچنے کے باعث اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی اس کی اندرونی کیفیت کا اظہار ہونے لگا تھا چنانچہ جب وہ چائے بنا کر سر حامد کے لیے لے گیا تو انہوں نے بھی اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور پوچھنے لگے۔

”کیا بات ہے محبوب، کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ گھر میں کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ ان کا اتنا پوچھنا ہی کافی ثابت ہوا۔ ذرا سی ہمدردی پا کر محبوب پھٹ پڑا اور اپنا سارہ دکھ کہہ سنایا۔ سر حامد نے اس کی ساری بات غور سے سنی اور ان کے چہرے پر سوچ کے بادل چھا گئے۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد انہوں نے اپنے لب کھولے اور بولے۔

”تمہارے ابا کے آپریشن کے لیے میں تمہیں قرض دے سکتا ہوں محبوب۔“

”واقعی سر لیکن اتنی بڑی رقم کا قرض اتارنے میں تو مجھے کافی وقت لگ جائے گا۔“ محبوب علی ایک لمبے کے لیے تو بہت خوش ہوا لیکن پھر قدرے مایوسی سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم اپنی سہولت سے جب چاہو اور جیسے چاہو قرض اتارتے رہنا۔ ممکن ہوا تو میں تمہیں اس میں سے کچھ رقم معاف بھی کر دوں گا۔“ سر حامد نے اسے نرمی

ان کا مزاج بہت گرم ہو رہا ہے۔ سارہ سے پہلے سر حامد بول پڑے جس پر سارہ اور بھی جھنجھلا گئی اور غصے سے بولی۔

”اگر کہیں سے غیرت ملتی ہو تو لا کر سر حامد کو پلا دیں۔ شاید یہ سدھر جائیں۔“ اپنی بات کہنے کے بعد وہ اسٹاف روم میں رکی نہیں اور کتابیں سینے سے لگائے پیر پختی ہوئی باہر نکل گئی۔

”لگتا ہے صبح شوہر سے جھگڑ کر گھر سے نکلی ہے جو

خواجواہ دماغ گھوما ہوا ہے اور میری معمولی سی بات پر مجھ سے الجھ گئی ہے۔“ سر حامد اپنی بے عزتی پر کھیا گئے تھے لیکن محبوب کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے خود بھی ذرا جارحانہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے سارہ کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے۔ محبوب جواب میں کیا کہتا۔ کئی برس کے ساتھ کی وجہ سے وہ سر حامد کے مزاج سے بھی واقف تھا اور سارہ کے کہے گئے کئی الفاظ بھی اس کے کانوں میں پڑے تھے اس لیے وہ یہ تو سمجھ چکا تھا کہ غلطی سر حامد ہی کی ہے لیکن ان کے سامنے اس بات کا اظہار کرنا اس کی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لیے کچھ نہ بولا اور موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”آپ کے لیے چائے بناؤں سر؟“

”بنا دو یار۔ میڈم کر بلا نے تو میرا حلق تک کڑوا

کر دیا ہے۔ بتائیں کس خاندان کی ہے۔ ڈگری لے کر

لیکچرر شپ تو کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن تمیز اور تہذیب تو

انسان اپنے گھر سے ہی سیکھتا ہے۔ سچ خاندانوں کے لوگوں

کے پاس یہ سب چیزیں کہاں ہوتی ہیں۔“ سارہ کے ہاتھوں

اٹھائی گئی بے عزتی نے سر حامد کو بھی چراغ پا کر دیا تھا اور وہ

مسلسل اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کہتے جا رہے تھے۔ محبوب

علی نے اس بار بھی اپنی خاموش رہنے کی پالیسی کو برقرار رکھا

اور چائے بنانے کے لیے باہر نکل گیا۔ دل ہی دل میں وہ

سر حامد کی حالت پر بھی افسوس کرتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ جب

سر حامد نئے نئے اپائنٹ ہو کر اس کالج میں آئے تھے تو کتنی

دلکش اور باوقار شخصیت کے مالک تھے اور اسٹاف و طلبہ میں

یکساں مقبولیت رکھتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان

میں یہ بدلاؤ آتا چلا گیا اور اس تبدیلی کی وجہ وقت پر شادی

نہ ہو سکتا تھی۔ سننے میں یہاں تک بھی آیا تھا کہ وہ کسی لڑکی

کو پسند کرتے تھے۔ لڑکی کے گھر والے انہیں اپنی بیٹی کا

ہاتھ دینے کے لیے تیار بھی تھے لیکن وہ اس لامتناہی انتظار

کے لیے راضی نہیں تھے جو انہیں سر حامد کی تمام بہنوں کی

شادی انجام پانے تک کرنا پڑتا۔ نتیجتاً لڑکی کی شادی کہیں



سے جواب دیا۔

”بہت بہت شکریہ سر! اس مہربانی کے لیے میں ساری عمر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

محبوب علی کو تو جیسے کوئی رحمت کا فرشتہ دکھائی دے گیا تھا اور وہ بڑی ممنونیت کے ساتھ سر حامد کو دیکھ رہا تھا لیکن سر حامد کی توجہ اس سے زیادہ اپنے دماغ میں پکتی پھڑکی کی طرف تھی۔ اصل میں وہ سارہ کے ہاتھوں اٹھائی گئی بے عزتی کے احساس میں ڈوبے ہوئے تھے اور کسی طرح اس سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ محبوب کی مدد کا فیصلہ بھی ان سے اسی جذبہ انتقام نے کروایا تھا۔

”آپ بہت اچھے ہیں سر۔ میں آپ کی اس مہربانی کے لیے ساری عمر آپ کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔“ اپنا مسئلہ حل ہوتا نظر آیا تو محبوب علی قطعی طور پر بھول گیا کہ کچھ دیر قبل اس نے سارہ اور سر حامد کے درمیان ہونے والی تند و ترش گفتگو کے چند جملے سننے کے بعد سر حامد کے لیے اپنے دل میں تھوڑی سی ناپسندیدگی محسوس کی تھی۔ وہ دوسرے سے تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے اس واقعے کو ہی بھول گیا تھا لیکن سر حامد کو سب یاد تھا اور وہ بے چین تھے کہ سارہ کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔ محبوب علی کی شکل میں انہیں ایک راستہ بھی دکھائی دے گیا تھا چنانچہ محبوب علی کی احسان مندانہ باتوں پر توجہ دے بغیر ذرا سراسر اچھے میں اس سے بولے۔

”میں تمہیں رقم دینے کو تیار ہوں محبوب لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔“

”کیسی شرط سر؟“ محبوب علی کا بکھل جانے والا چہرہ مرجھانے لگا۔

”تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔“ وہ بے حد دھیمی آواز میں اسے اپنا کام بتانے لگے۔

”یہ..... یہ تو بہت خطرناک کام ہے سر۔“ محبوب علی ان کا مطالبہ سن کر بدک گیا۔

”کوئی خطرناک کام نہیں ہے یار! بس میں اس تک چڑھی حینہ کو چھوٹا سا سبق دینا چاہتا ہوں۔“ سر حامد نے اسے تسلی دی۔

”پھر بھی سر رسک تو ہے۔ کسی کو خبر ہوگئی تو میری نوکری چلی جائے گی۔“ محبوب علی کو شک تھا کہ سر حامد نے اسے جس حد تک اپنے منصوبے سے آگاہ کیا ہے، بات اس سے بھی آگے جاسکتی ہے۔

”میں نے کہا ہے نا کہ ایسا دینا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر

کوئی تمہاری طرف انکی اٹھائے تو تم سارا الزام میرے سر رکھ دینا۔“ سر حامد نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے دو چار مزید باتیں کہیں تو محبوب علی کو قائل ہونا ہی پڑا۔ سر حامد کے دلائل سے نہیں اپنی مجبوری کی وجہ سے۔ اس کے ہامی بھر لینے پر سر حامد خوش ہو گئے اور اسی وقت فیصلہ سنا دیا۔

”میں تمہیں دیے گئے قرض میں سے ایک لاکھ روپے معاف کر دوں گا۔ بس تم میرا کام صفائی سے کر دینا۔“

”آپ اطمینان رکھیں سر۔“ محبوب ایک لاکھ کی معافی مل جانے پر خوش ہو گیا۔ جس وقت وہ یہ جملہ ادا کر رہا تھا، میڈم جیلہ نے اسٹاف روم میں قدم رکھا۔

”اوہ پیریڈ ادور ہو گیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ سر حامد خفیف سے ہوئے۔

”آپ دوسری باتوں کے بجائے اپنی جاب پر زیادہ توجہ رکھیں تو ایسا نہیں ہوگا۔“ میڈم جیلہ نے قدرے کٹیلے لہجے میں ان سے کہا اور پھر فوراً ہی محبوب علی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”میرے لیے ایک کپ ذرا اسٹراگ سی چائے تو بنا دو محبوب۔“

محبوب علی ”جی اچھا میڈم“ کہتا ہوا تیر کی طرح اسٹاف روم سے باہر نکلا۔ سر حامد کو بھی کلاس میں پہنچنے کی فکر تھی کہ ان کے شعبے کے سربراہ اس معاملے میں بہت سخت تھے، اس لیے وہ میڈم جیلہ سے ان کے کپے جملے کا مطلب پوچھنے کے لیے وہاں نہرک سکے۔

”سر حامد سے کیا باتیں ہو رہی تھیں محبوب؟“ محبوب علی چائے لے کر میڈم جیلہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اس سے دریافت کیا۔

”کچھ نہیں میڈم! بس ایسے ہی سر میرا حال احوال معلوم کر رہے تھے۔ مجھ سے بھلا انہیں کیا بات کرنی تھی۔“ محبوب علی نے انہیں ٹالا۔

”تم نے سارہ اور سر حامد کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی کیا؟“ میڈم جیلہ نے ذرا رازداری سے اس سے دریافت کیا۔ یقیناً سارہ اسٹاف روم سے نکلنے کے بعد ان کے پاس گئی تھی اور انہیں سارا ماجرا سنا دیا تھا اور اب وہ محبوب سے اس کی تصدیق چاہتی تھیں۔

”نہیں میڈم! میں ان کی ادنیٰ آوازیں سن کر اندر ضرور آیا تھا لیکن ان کے درمیان کس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی، یہ مجھے پتا نہیں لگ سکا۔“ سر حامد سے طے ہونے



نے مشکل سے آدھا گلاس پانی پی لیا تھا۔ اصل میں وہ جس کیفیت کا شکار تھیں، ان کے لیے حلق سے پانی بھی نیچے اتارنا مشکل ہو رہا تھا۔

”آپ نے بتایا اور بتائی سے بات کی امی! کیا کہا انہوں نے؟“ سلیم مزید صبر نہ کر سکا اور زرین کے پلٹتے ہی ماں سے سوال کر ڈالا۔ غزالہ کی زبانی یہ جاننے کے بعد کہ بتایا اور بتائی اس کا رشتہ کہیں اور طے کرنے چلا ہے ہیں وہ مسلسل انگلیوں پر کوٹ رہا تھا اور اس نے اس سلسلے میں اپنی والدہ ناعمہ خاتون کو بتایا اور بتائی سے بات کرنے ان کے گھر بھیجا تھا۔

”کیا بتاؤں بیٹا! انہوں نے جو کچھ کہا وہ حقیقت ہی ہے۔ میں نے کوشش تو کی تمہارا مقدمہ لڑنے کی لیکن مجھے خود بھی لگا کہ میرے مقابلے میں ان کے دلائل زیادہ بھاری ہیں۔“ ناعمہ خاتون نے ایک سر دآہ بھرتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”کیا مطلب امی! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں، مجھے صاف صاف لفظوں میں بتائیں؟“ سلیم مزید بے قرار ہو گیا۔

”میں غزالہ کے لیے آئے ہوئے رشتے کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بھابی نے مجھے اس رشتے کے بارے میں بتا دیا۔ لڑکے نے ایم بی اے کیا ہوا ہے اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر کام کرتا ہے۔ پیچھے سے بھی خوش حال لوگ ہیں۔ باپ کا گارمنٹس کا کاروبار ہے اور لڑکے کے دوسرے بھائی اپنے باپ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ہزار گز کی کوٹھی میں رہتے ہیں وہ لوگ اور ہر بیٹے کے لیے الگ پورشن بنا ہوا ہے۔ ایک بہن ہے، اس کی کئی سال پہلے شادی ہو چکی ہے۔ ہر بیٹا اپنی ذاتی گاڑی کا مالک ہے۔ مرضی سے سب ایک کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی بیٹا اپنا الگ گھر بنانا چاہے تو ماں باپ کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔ غزالہ کو بھابی کے جاننے والوں میں سے کسی کی شادی میں دیکھ کر لڑکے نے خود پسند کیا ہے، یوں رشتے کا سلسلہ چلا ہے۔ بھابی نے نہایت صاف گوئی سے مجھے بتایا کہ رشتہ اتنا عمدہ ہے کہ سلیم اور غزالہ سے متعلق اماں کی خواہش ذہن میں ہونے کے باوجود وہ لوگ سوچ میں پڑ گئے اور دونوں میاں بیوی کئی دن تک آپس میں اس بارے میں بحث کرتے رہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکلا کہ قسمت سے آنے والا یہ رشتہ تمہارے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ تم ابھی تک خود اپنے قدموں پر اچھی طرح کھڑے نہیں ہو سکے ہو اور تم پر بہنوں کی ذمے داریوں کا

والے معاملے کے بعد مجھ پر ان کے خلاف کیسے مکمل ہوا۔ سلیم کا چنانچہ کئی کتر گیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ میڈم جیلہ نے فوراً ہی اس کی بات پر یقین کر لیا اور وہ جان چھوٹ جانے پر تیزی سے ان کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

”ذرا ایک گلاس پانی تو پلا دے زرین!“ ناعمہ خاتون نے چادر پائی پر بیٹھ کر بیٹی کو آواز لگائی اور اپنے گرد لپٹی بڑی سی چادر کو اتار کر اسی کے ایک پلو سے وہ چہرے پر بہتی پسینے کی بوندوں کو صاف کرتے ہوئے بڑبڑائیں۔

”بڑی گرمی ہے بابا! گھر سے باہر نکلتا عذاب ہو گیا ہے۔“ ان کی واپسی کے انتظار میں جلے پیر کی لمبی کی طرح اندر باہر ہوتے سلیم نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے خاموشی سے یہ تبصرہ سنا اور سوالیہ نظروں سے ان کے چہرے کو تکتے لگا۔ ناعمہ خاتون اس کی نظروں کے سوال کو پڑھ سکتی تھیں لیکن فوری طور پر جواب دینے کی ہمت نہیں تھی ان میں، چنانچہ نظریں چراتی ہوئی پانی کا گلاس لانے والی بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”کھانا بنا لیا بیٹا؟“ گلاس تھامتے ہوئے انہوں نے بیٹی سے سوال کیا۔

”جی امی!“ اس نے تابعداری سے جواب دیا۔

”کیا پکایا ہے؟“ انہوں نے پانی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بلاوجہ ہی دوسرا سوال کیا۔

”مونگ کی دال پکائی ہے۔ آپ جاتے ہوئے خود ہی تو کہہ کر گئی تھیں۔“ زرین نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس سے یہ بلاوجہ کے سوال جواب کا سلسلہ مہلت حاصل کرنے کی ایک لا حاصل سی تدبیر ہے اور ناعمہ خاتون اپنے اکلوتے بیٹے کی آنکھوں میں تحریر سوال کا جواب دیتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔

”اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے کھانا لے کر آجاؤں؟“ ماں کے سوال جواب سے زرین کو گمان ہوا کہ شاید انہیں بھوک لگی ہے چنانچہ ان سے پوچھنے لگی۔

”نہیں، بھوک نہیں ہے۔ کھانے کے لیے رکنے پر تو وہاں بھائی صاحب اور بھابی بھی بہت اصرار کر رہے تھے لیکن مجھے بھوک ہی نہیں تھی۔ اب بھی نہیں ہے، بس ایسے ہی تم سے پوچھ رہی تھی کہ پتا کروں میرے پیچھے سب کام نمٹا لیے ہیں یا نہیں۔“ ناعمہ خاتون نے اسے جواب دیا اور پانی کا گلاس واپس تھمایا۔ گرمی کا شور مچانے کے باوجود انہوں



خود بھی یہ بات سمجھیں اور بتایا اور بتائی کو بھی سمجھائیں۔  
مکمل مزاج سلیم کے مزاج کا یہ رنگ بھی ناعمہ خاتون نے  
بھی نہیں دیکھا تھا۔ سلیم اپنی کہہ کر چلا بھی گیا اور وہ جہاں کی  
تہاں بیٹھی دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

تیز تیز قدموں سے چلتے رضا کمال نے کار پور ٹیکو  
سے کوٹھی کے مرکزی دروازے تک کا فاصلہ طے کیا تو ان کا  
داماد زبیر ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔ اس کے  
چہرے پر شدید پریشانی اور تفکر کے تاثرات تحریر تھے اور وہ  
خاصا بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”سارہ کا کچھ پتا چلا زبیر! اس سے تمہارا کوئی رابطہ  
ہوا؟“ رضا کمال جو خود بھی خاصے پریشان اور گھبرائے  
ہوئے تھے، اس کے قریب پہنچتے ہی اس سے پوچھنے لگے۔  
”نہیں انکل! اس کا موبائل مسلسل آف جا رہا ہے۔  
میں نے اس لیے آپ کو فون کر کے اس کے بارے میں  
پوچھا تھا کہ شاید وہ کالج سے سیدھی آپ کی طرف چلی گئی  
ہو یا پھر اس نے آپ سے کوئی رابطہ کیا ہو۔“ زبیر نے ان کی  
بات کا جواب دیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میری اس سے دو دن پہلے بات  
ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ چھٹیوں میں میرے پاس  
رہنے آئے گی تاکہ زرا بھی اپنے بچوں کے ساتھ آ سکے اور  
دونوں بہنیں اکٹھی کچھ دن گزار سکیں۔“ رضا کمال نے  
پریشانی سے اپنی پیشانی کو مسایا۔

”مجھے بھی اس نے اپنے اس پروگرام کے بارے  
میں بتایا تھا اور کیونکہ کل سے چھٹیوں کا آغاز ہو رہا ہے تو میں  
سمجھا کہ شاید وہ کالج سے سیدھی آپ کی طرف چلی گئی  
ہے۔“ زبیر ان سے کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے پیچھے دروازہ  
کھلا اور اس کے والد باہر نکلے۔

”یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا مناسب نہیں ہے  
زبیر! رضا بھائی کو اندر بلا کر آرام سے بٹھاؤ۔“ انہوں نے  
بیٹے کو ٹوکا تو اسے احساس ہوا۔

”اوہ ہاں انکل۔ پلیز آپ اندر آئیے۔ اصل میں  
پریشانی کی وجہ سے میرا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے اس  
لیے مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ کو اندر لے جا کر  
بٹھاؤں۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور پھر تینوں  
حضرات چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔

”مجھے زبیر نے سارہ کے غیاب کے بارے میں بتایا  
ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کل رات دونوں کے درمیان طے ہوا

بھی بوجھ ہے۔ تمہارے ساتھ یہ ساری دے دار ہیں  
نبھاتے ہوئے غزالہ حالات کی چکی میں پس کر رہ جائے گی  
جبکہ دوسری طرف ایک پرتیش زندگی اس کی منتظر ہے اور  
انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک بہترین  
زندگی کے انتخاب کا موقع ضائع نہیں کریں گے۔“ ناعمہ  
خاتون نے اسے تفصیل سے سب بتا ڈالا۔

”بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں بتایا اور بتائی۔ انہیں  
اندازہ نہیں ہے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ کوئی غزالہ کو  
ہیروں اور موتیوں میں تول دے، تب بھی وہ میرے بغیر خوش  
نہیں رہ سکتی۔“ ساری بات سننے کے بعد سلیم تڑپ کر بولا۔

”اس بات کا میں نے بھی انہیں احساس دلانے کی  
کوشش کی تھی اور دلیل دی تھی کہ دونوں بچے اتنی چچی عمر سے  
ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کہ اب انہیں ایک دوسرے  
سے الگ کرنا ان کے ساتھ ظلم ہوگا۔ لڑکی ہونے کے ناتے  
غزالہ تو خاص طور پر اس قسم کی صورت حال کو برداشت نہیں  
کر سکے گی لیکن انہوں نے میری یہ دلیل نہیں مانی۔ ان کا کہنا  
ہے کہ اتنی چاہت سے غزالہ کا ہاتھ مانگنے والا جب اسے  
پھولوں کی طرح رکھے گا اور وہ ہر طرح کی آسائش کے ساتھ  
زندگی گزارے گی تو اسے سلیم سے اپنا تعلق یاد بھی نہیں رہے  
گا۔“ شرقی لڑکیاں یوں بھی شوہر پرست ہوتی ہیں اور شادی  
کے بعد شوہر کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچنے کو گناہ  
سمجھتی ہیں۔“

”بتایا اور بتائی اپنی بیٹی کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے امی!  
میں جانتا ہوں کہ اگر اسے زبردستی کسی اور سے بیاہنے کی  
کوشش کی گئی تو وہ اپنی جان سے گزر جائے گی۔ اس نے خود  
مجھ سے یہ بات کہی ہے۔“ سلیم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس  
طرح بتایا اور بتائی کے فیصلے کو غلط قرار دے سکے۔

”اچھی بات منہ سے نکالو بیٹا! اللہ نہ کرے کہ ایسا  
کچھ ہو۔ اولاد میں ماں باپ کی جان ہوتی ہے اور وہ اپنے  
حساب سے اپنی اولاد کے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔“ ناعمہ  
خاتون نے اسے ٹوکا۔

”کسی کی زندگی کا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر کر ڈالنا  
سب سے بڑا ظلم ہے۔ بتایا اور بتائی اگر سمجھتے ہیں کہ وہ غزالہ  
کے ساتھ کوئی بھلائی کر رہے ہیں تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ہم  
دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اور ایک دوسرے  
سے جدا ہو کر کسی صورت زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اگر زبردستی  
جدا کرنے کی کوشش کی گئی تو ہم ہر جہہ سے گزر جائیں گے۔  
ساتھ جینے کا موقع نہیں ملا تو ساتھ مرنا ہمیں قبول ہوگا۔ آپ



تھا کہ زبیر کالج سے سارہ کو ایک کمرے کا اور دونوں سیدھے شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے۔ سارہ میکے جانے سے پہلے زارا اور اس کی بچیوں کے لیے کچھ کنفیس لینا چاہتی تھی۔ زبیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ یہ بیچ ٹائم میں اپنے آفس سے اٹھ جائے گا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ صبح ناشتے کے وقت دونوں میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر جھڑپ ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو کر اپنی اپنی جاب پر روانہ ہو گئے لیکن اس کے باوجود زبیر، سارہ سے کیا ہوا وعدہ نہیں بھولا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ بیچ ٹائم میں آفس سے نکل جائے گا۔ اتفاق سے یہ ایک میٹنگ میں پھنسنے کی وجہ سے ٹھیک ٹائم پر نہیں نکل سکا۔ اس نے سارہ کو فون کر کے اطلاع دینے کی کوشش کی لیکن اس کا موبائل آف جا رہا تھا۔ زبیر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے سارہ کے کالج پہنچا لیکن گیٹ پر موجود چوکیدار نے اطلاع دی کہ کوئی موجود نہیں ہے اور تمام اسٹاف جا چکا ہے۔ اس نے سوچا کہ سارہ بھی گھر آگئی ہوگی لیکن یہ گھر پہنچا تو وہ گھر پر بھی نہیں تھی۔ اسے لگا کہ شاید وہ ناراضی میں یہاں آنے کے بجائے سیدھی میکے چلی گئی ہے اور یہ بات اسے بھی اچھی نہیں لگی اس لیے سارہ سے رابطہ کرنے کے بجائے خود بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ دو تین گھنٹے بعد اس کے موبائل پر ایک میسج آیا جو بہت پریشان کن تھا چنانچہ اس نے مجھے اس سے آگاہ کیا اور میرے مشورے پر آپ سے رابطہ کر کے آپ کو یہاں بلوایا۔ ابھی اس واقعے کے بارے میں گھر کے کسی اور فرد کو معلوم نہیں ہے۔ سارہ آپ کی بیٹی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں آپ سے مشورہ ضرور لینا چاہیے۔ زبیر بیٹا! رضا بھائی کو وہ بیچ پڑھواؤ۔“ زبیر کے والد سبحان صاحب نے رضا کمال کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا اور آخر میں خاموش بیٹھے زبیر سے مخاطب ہوئے۔ زبیر نے اپنے موبائل کا این باکس کھول کر رضا کمال کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہاں کسی ان نوٹ نمبر سے آیا پیغام ان کے سامنے موجود تھا۔

”سارہ ہمارے پاس ہے۔ پولیس سے رابطہ نہ کرنا۔“ ان دو مختصر جملوں میں گویا پوری کہانی درج تھی۔ انوار پرانے تادان کی وارداتیں اب کسی گے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔ لوگ ذرا سے اشارے پر بھی سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آچکا ہے۔ رضا کمال بھی سمجھ گئے اور انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔

”حوصلے سے رضا بھائی۔ سارہ آپ کی بیٹی نہیں میری

بھی بیٹی ہے۔ اس کی باحفاظت واپسی کے لیے جو کچھ ہو سکا، میں ضرور کروں گا۔“ سبحان صاحب نے ان کے برابر بیٹھ بیٹھے ہوئے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

”پریشان نہ ہوں تو کیا کروں سبحان بھائی۔ سارہ اور زارا میری کل کائنات ہیں۔ ان کی ماں کے گزرنے کے بعد میں نے کس جدوجہد سے دونوں بچیوں کو سنبھالا اور ان کے گھروں کا کیا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ دونوں کو ان کے گھر کا کرنے کے بعد میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی، بس اب ان کی خوشیاں دیکھوں گا اور نواسوں نواسیوں کو دیکھ دیکھ کر جیوں گا لیکن لگتا ہے ابھی میرا امتحان ختم نہیں ہوا ہے۔“ رضا کمال کا لہجہ دکھ اور بے بسی کا غماز تھا۔

”اتنے دل برداشتہ نہ ہوں رضا بھائی۔ اللہ نے امتحان میں ڈالا ہے تو اس امتحان میں سرخ رو بھی کرے گا اور انشاء اللہ جلد ہماری بیٹی ہمارے درمیان ہوگی، بس اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ان حالات میں ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے۔“ سبحان صاحب نے انہیں دلاسا دینے کے ساتھ ساتھ درپیش مسئلے سے غمخیزی کی طرف بھی متوجہ کیا۔

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ کہیں کسی نے ہمارے ساتھ مذاق تو نہیں کیا ہے؟“ رضا کمال کا دماغ صورت حال کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔

”نہیں، یہ مذاق نہیں ہو سکتا۔ سارہ کبھی بھی ایسے بے ہودہ تکلیف دہ مذاق کا حصہ نہیں بن سکتی۔ وہ بہت باشعور لڑکی ہے۔“ زبیر نے فوراً ان کے خیال کی مخالفت کی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ تو بس میں اپنے دل کی تسلی کے بہانے تلاش کر رہا ہوں۔“ رضا کمال کے لہجے میں شک کی سی تھی۔

”ہمیں حقیقت کو قبول کر کے اس مسئلے کو دیکھنا ہوگا انکل۔ سارہ آپ کی بیٹی ہے تو میری بیوی ہے اور میں اس کی نگہداشت پر آپ سے کم پریشان نہیں ہوں۔ میرا تو اس وقت سب کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔“ زبیر تھوڑا سا چڑچڑا ہوا۔

”زبیر..... آرام سے بیٹا۔ ہمیں بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس معاملے کو ہینڈل کرنا ہوگا۔ یہ سارہ کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔“ سبحان صاحب نے فوراً بیٹے کو نوک کر صورت حال کا احساس دلایا۔

”مجھے معلوم ہے ابو اور اسی لیے میں ٹینشن میں ہوں۔“ زبیر نے اپنے سر کے بال منہ میں دبوچے۔

”میرے دو تین شاگرد پولیس میں اچھی پوسٹ پر ہیں۔ کیا خیال ہے میں ان میں سے کسی سے رابطہ کر کے دیکھوں؟“



رضا کمال کو بالآخر ایک راستہ دکھائی دے ہی گیا۔  
 "پولیس سے رابطہ کرنے سے منع کیا ہے ان لوگوں  
 نے۔" سبحان صاحب نے انہیں یاد دلایا۔  
 "ہم خفیہ طور پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں کہوں گا تو  
 میرے جاننے والے افسران پوری احتیاط کریں گے اور کسی  
 صورت خبر لیک آؤٹ نہیں ہوگی۔" رضا کمال پر یقین تھے۔  
 "رہنے دیجیے اکل، پولیس کی کارکردگی کا سب کو  
 اچھی طرح پتا ہے۔ پولیس سے رابطہ کرنے کا مطلب ہوگا  
 سارہ کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا اور میں یہ رسک نہیں لے  
 سکتا۔ فرض کیا کہ وہ افسران بہت قابل ہیں اور اس کیس کو  
 حل کر لیں گے تب بھی میرے کچھ تحفظات ہیں۔ میں اس  
 بات کو کسی کے علم میں نہیں آنے دینا چاہتا کہ میری بیوی اغوا  
 ہوئی ہے۔ یہ بات اوپن ہوگئی تو لوگوں کے ذہنوں میں  
 طرح طرح کے شکوک پیدا ہوں گے اور سارہ کی واپسی کے  
 بعد میرے لیے اس کے ساتھ نارل لائف گزارنا مشکل  
 ہو جائے گا۔" زبیر کا لہجہ تلخ تھا۔ رضا کمال کے ہونٹوں پر  
 قفل پڑ گیا۔ وہ ایک قانون پسند اور اصولوں پر چلنے والے  
 آدمی تھے لیکن زبیر کے الفاظ نے انہیں احساس دلایا کہ اگر  
 انہوں نے اپنی ان صفات کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو  
 سارہ کے حال کے ساتھ ساتھ مستقبل بھی خطرے میں  
 پڑ جائے گا۔

"زبیر اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہا ہے رضا بھائی۔ مرد کی  
 فطرت کو آپ بھی سمجھتے ہیں۔ بیوی کے معاملے میں سب  
 یوزر سیو ہوتے ہیں۔ عورت چند گھنٹے بھی کسی غیر مرد کے ساتھ  
 گزار آئے تو عمر بھر کے لیے شک میں پڑ جاتا ہے۔ میرا بیٹا  
 اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ بے قصور ہوتے ہوئے بیوی کو سزا  
 دے لیکن اس کی یہ خواہش تو بالکل جائز ہے کہ مستقبل میں  
 کوئی اس کی بیوی پر انگلی نہ اٹھانے پائے۔ صورت حال کی  
 اس نزاکت کی وجہ سے ہی ہم نے گھر میں کسی اور کو اس بات  
 کا علم نہیں ہونے دیا ہے۔ اس معاملے کی خبر صرف ہم تین  
 افراد کو ہے اور مزید کسی کو علم نہ ہو یہی بہتر ہے۔" سبحان  
 صاحب نے بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے نرم لہجہ میں  
 رضا کمال کو سمجھایا۔

"جیسا آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ مجھے تو سب سے  
 زیادہ اپنی بیٹی کی فکر ہے کہ وہ زندہ سلامت واپس آجائے۔  
 اس کی واپسی کے لیے آپ لوگ جو بھی قدم اٹھائیں گے، میں  
 آپ کا ساتھ دوں گا۔" رضا کمال کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔  
 "پیغام سے واضح ہے کہ سارہ کو کسی نے اغوا کیا ہے

☆ ☆ ☆  
 محبوب علی نے کالج کے گیٹ کی طرف قدم بڑھائے تو  
 اس کے قدم بوجھل تھے اور وہ یوں چل رہا تھا جیسے منوں وزن  
 اٹھا رکھا ہو حالانکہ میس کے نیچے موجود صندری میں رکھے گئے  
 نوٹوں کا وزن اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ چلنا مشکل ہو جائے،  
 ہاں ضمیر کے بوجھ کی بات الگ تھی۔ ساری زندگی رزقِ حلال  
 کمانے اور دوڑ دوڑ کر خدمتیں کرنے والے محبوب علی نے  
 ایک ایسے کام کی قیمت وصول کی تھی جسے کرنے کے بارے  
 میں وہ عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ صاف  
 ستھری زندگی گزارنے والا ایک سیدھا سادہ بندہ تھا لیکن  
 حالات کی ستم ظریفی اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ  
 اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنے پر بھی راضی ہو گیا تھا۔ ابا کی  
 بیماری کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز سر حامد کی سازش میں شریک  
 نہ ہوتا جو سارہ کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی بے عزتی کا بدلہ  
 لینے کے لیے اسے بھی بے عزت کرنے پر تل گئے تھے۔

"کیا بات ہے محبوب بھائی! آج زیادہ ہی جھٹکے  
 ہوئے لگ رہے ہو۔ گلتا ہے آخری دن کچھ زیادہ ہی خدمت  
 لے لی میڈم لوگوں نے۔" کالج کے گیٹ پر ڈیوٹی دیتے  
 چوکیدار نے نام لے کر اسے مخاطب کیا تو اپنی دھن میں باہر  
 کی طرف جاتا محبوب علی ٹھٹک کر رک گیا اور یوں ہی ایک  
 بے معنی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجالی۔

"تمہاری ہمت ہے محبوب بھائی جو سارہ دن دوڑیں  
 لگاتے رہتے ہو۔ تمہیں ان استادوں اور استانیوں کے  
 ہاتھوں جتنی کا ناچ ناچتے دیکھتا ہوں تو اپنی نوکری اچھی لگتی  
 ہے۔ سارہ دن مزے سے کرسی پر بیٹھ کر ڈیوٹی دیتا رہتا  
 ہوں۔ مرضی ہوئی تو کھڑا بھی ہو جاتا ہوں۔ کسی کی خدمت  
 کرنی بھی ہوئی تو بس اتنی کہ گاڑی میں آنے والے  
 استادوں کے لیے دوڑ کر گیٹ کھول دیا۔ باقی سب چمن ہی  
 چمن ہے۔" چوکیدار نے اس سے اظہارِ ہمدردی کیا۔

"کیا کہوں یار! میری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ میں بیون  
 ہوں بیون اور بیون کا کام ہی حکم پر دوڑیں لگانا ہے۔ ابھی  
 کچھ دن پہلے ٹی وی پر ایک پروگرام دکھ رہا تھا۔ پروگرام



کے میزبان نے بتایا کہ مکان کا لفظ اصل میں پینڈا تھا۔ پینڈا کہتے ہیں بیروں کو اور جیون اسل میں وہ بندہ ہوتا ہے جو اپنے بیروں پر دوڑ دوڑ کر خدمت بجالا دیتا ہے تو بس میں بھی دوڑیں لگا تا رہتا ہوں۔“ محبوب علی نے یاسیت سے چوکیدار کی بات کا جواب دیا تو اسے محسوس ہوا کہ آج محبوب علی کا مزاج کچھ ٹھیک نہیں ہے ورنہ تو وہ اس لب و لہجہ میں بات کرنے والا بندہ نہیں تھا اور ہر دم ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔

”کیا بات ہے محبوب بھائی! سب خیریت تو ہے؟ تم کچھ اداس لگ رہے ہو۔“ چوکیدار کی آتے جاتے محبوب علی سے اچھی علیک سلیک تھی چنانچہ اس کی کیفیت محسوس کر کے وہ فوراً سنجیدگی سے دریافت کرنے لگا۔

”خیریت نہیں ہے یار۔ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دل کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے بائی پاس آپریشن کروانا ہو گا بس اسی لیے پریشان ہوں۔“ محبوب علی نے اسے بتایا۔

”اوہو۔ یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے، پر تم ٹینشن مت لو۔ اللہ بہتری کرے گا۔ ہم غریبوں کا تو وہی سہارا ہے۔ تم بتاؤ کب ہے آپریشن؟ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بولنا۔“ چوکیدار کے لہجے میں ہمدردی اور خلوص تھا۔

”ابھی ڈاکٹر نے تاریخ نہیں دی ہے۔ ہو سکتا ہے آج دے دے۔ میں یہاں سے سیدھا اسپتال ہی جا رہا ہوں۔ تم دعاؤں میں یاد رکھنا۔“ چوکیدار کو جواب دیتے ہوئے محبوب علی کو گویا خود بھی یاد آ گیا کہ اسے اسپتال پہنچنا ہے چنانچہ غلٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چھٹیوں کے آغاز سے پہلے وہ کالج کا آخری دن تھا اس لیے اسے نکلنے میں خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ بھوک بھی شدید لگ رہی تھی لیکن گھر جا کر کھانا کھانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے رقم لے کر اسپتال پہنچ جائے پھر وہیں کینٹین سے کچھ لے کر کھالے گا۔ اصل میں کل ابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور انہیں امیر جنسی میں اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ جہاں انہیں داخل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ سنجیدہ کردی گئی تھی کہ ان کا جلد از جلد آپریشن ناگزیر ہے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابا کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے سر حامد کو فون کر کے ان سے رقم کے سلسلے میں بات کر لی تھی اور وہ حسب وعدہ آج رقم اس کے حوالے کر چکے تھے۔ اب اسے یہ رقم اسپتال میں جمع کروا کر ابا کے آپریشن کے لیے تاریخ مقرر تھی۔ دو بیس بدل کر اسپتال پہنچنے میں اسے تقریباً سو گھنٹا لگ گیا تھا۔ اسپتال پہنچنے ہی اس کا سب سے پہلے سکینہ سے

سامنا ہوا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ سسے ہی پریشانی پڑھی جا رہی تھی۔ وہ صبح محبوب علی کی کالج روائی کے وقت اسپتال پہنچی تھی۔ آج کالج کا آخری دن نہ ہوتا اور اسے سر حامد سے رقم نہ ملنی ہوتی تو وہ کالج سے چھٹی کر لیتا لیکن مجبوری کی وجہ سے سکینہ کو ابا کے پاس ٹھہرا کر خود چلا گیا تھا۔

”خیریت نہیں ہے۔ گھنٹا بھر پہلے ابا کی حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ انہیں دورہ پڑا ہے۔ وہ لوگ ابا کو اندر لے گئے ہیں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں بتا رہا۔ میں نے کالج کے نمبر پر تمہیں فون کیا تھا پر تم سے بات نہیں ہو سکی۔ فون اٹھانے والے نے بتایا کہ تم نکل گئے ہو۔ میں یہی دعا کر رہی تھی کہ تم جلدی سے پہنچ جاؤ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ نرس نے دواؤں کی پرچی لا کر دی تھی۔ بہت جھنگا جھکشن تھا۔ اسے لا کر دینے کے بعد میرے پاس رو پے بھی ختم ہو گئے۔ میں پریشان ہو رہی تھی کہ اگر کوئی اور دوا لانے کو کہا تو کیسے لاؤں گی۔“ سکینہ نے اس کے پوچھتے ہی بتانا شروع کر دیا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ محبوب علی نے صرف اتنا کہا اور آگے بڑھ گیا لیکن اس کے دیکھنے اور کرنے کو کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ ڈاکٹروں کی ساری تدبیروں کے باوجود ابا زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ محبوب علی نے کیسے ان کی میت گھر لانے اور پھر انہیں ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے مراحل طے کیے، یہ بس وہی جانتا تھا۔ ابا کا اتنی اچانک اور وہ بھی ایسے موقع پر جب وہ اپنے تئیں ان کی زندگی بچانے کا بندوبست کر چکا تھا، چھوڑ کر چلے جانا اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ وہ منوں مٹی تلے چھپ گئے تب بھی اس کی بے یقینی برقرار رہی۔

”چلو محبوب! گھر چلتے ہیں۔“ مرنے والے کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد جب وہ یوں ہی قبر کے سرہانے بیٹھ کر مٹی پر ہاتھ پھیر رہا تھا تو خاندان کے ایک بزرگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس سے کہا۔

”آپ لوگ جاییے چچا جان۔ میں کچھ دیر یہیں رکوں گا۔“ اس نے انہیں جواب دیا۔

”صبر سے کام لو بیٹا۔ ہم سب کو ہی ایک دن جانا ہے۔ تم جتنا کر سکتے تھے تم نے اپنے باپ کے لیے کیا۔ میری کچھ دن پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمہاری خدمت گزاری کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب اللہ کی رضا میں راضی ہو جاؤ۔“ وہ بزرگ اسے سمجھانے لگے اور ایک بار پھر گھر واپس چلے پر



بھی محبوب علی کو ان باتوں کا احساس ہوا تو صدری میں موجود رقم سانپ بچھو کی طرح محسوس ہونے لگی۔ ویسے بھی اس رقم کا بڑا حصہ تو سر حامد نے اسے قرض ہی دیا تھا اور وہ انہیں دھیرے دھیرے رقم لوٹانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ جب رقم لوٹانی ہی تھی تو دیر کر نامناسب نہیں تھا۔ اس نے قبرستان سے سید خاسر حامد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ قبرستان میں خاموشی اور تاریکی تھی، بس کہیں کہیں لائیں جل رہی تھیں۔ ان ہی کی مدھم روشنی میں وہ راستہ دیکھتا ہوا باہر نکلا اور باہر سڑک پر سے ایک رکشا

میں نے کہا نا کہ میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔ آپ لوگ جائیں۔“ محبوب علی کے لہجے میں قطعیت تھی۔ وہ بزرگ چپ ہو گئے پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ ”جیسی تمہاری مرضی۔ ہم سب چلے جاتے ہیں۔ یہاں تو فقی رک جائے گا تم اس کے ساتھ چلے آنا۔“ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام لیا۔

”توفیق کو بھی لے جائیں۔ میں کچھ وقت ابا کے ساتھ تنہا رہتا چاہتا ہوں۔“ محبوب علی کا لہجہ خاصا روکھا تھا۔ ان بزرگ سمیت کسی نے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں کی اور سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان میں سے زیادہ تر یوں بھی رسم دنیا نبھاتے کے لیے آئے ہوئے تھے اور سب کو جلد از جلد فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹنے کی فکر تھی۔ غشا کے وقت ہونے والی تدفین میں شرکت کرنا دن بھر کے معمولات سے تھکے ہوئے افراد کے لیے ویسے ہی ایک بو جھل عمل تھا۔ سب کے جانے کے بعد محبوب علی ابا کی قبر سے چٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ابا کی قبر سے لپٹا وہ بالکل ایسا ہی محسوس کر رہا تھا جیسے ابا کے سینے سے لگا ہو۔ خاصی دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اسے احساس ہوا کہ سینے پر کوئی چیز چھ سی رہی ہے پھر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ اس کی صدری میں ابھی تک وہ رقم جوں کی توں رکھی ہوئی ہے جو وہ سر حامد سے ابا کے آپریشن کے لیے لایا تھا لیکن اسے اتنی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی کہ رقم کو نکال بھی پاتا۔ رقم کا خیال آتے ہی اسے پتا نہیں کیسے کالج کے چوکیدار سے ہونے والی اپنی گفتگو یاد آ گئی۔ چوکیدار نے اسے دلا سادینے کے لیے جو الفاظ ادا کیے تھے ان میں سے ایک جملہ یہ بھی تھا۔ ”تم ٹینشن مت لو اللہ بہتری کرے گا۔“ اور ابا کا یوں چلے جانا شاید اس کے لیے بہتری ہی کی ایک صورت تھی۔ ابا نے ساری عمر اسے رزقِ حلال کھلایا تھا اور رزقِ حلال ہی کمانے کی نصیحت کی تھی۔ وہ جوان کی لاعلمی میں حرام کی رقم سے ان کا علاج کروانے چلا تھا، یقیناً اس لیے کامیاب نہ ہو سکا تھا کہ اللہ کے جس بندے نے کبھی اپنے جسم پر حرام کا ایک روپیہ نہیں لگایا تھا، اب بھی اللہ اسے حرام سے بچانا چاہتا تھا۔ ابا کو عین وقت پر اپنے پاس بلا کر اللہ نے نہ صرف انہیں حرام سے محفوظ رکھا تھا بلکہ اسے بھی سنبھلنے کا ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ دنیا سے جانا تو ہر ذی نفس کو ہی ہے۔ موت کا وقت آ جائے تو بے علاج بھی مر جاتا ہے اور بہترین اسپتال میں رہ کر بہترین طبی امداد کے باوجود

## قارئین مشوجہ ہوں

### پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز  
سپینس ڈائجسٹ پبلیکیشنز  
63-C

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



بھی ہوتا تھا ہو چکا اور یقین کرو جتنی تم ٹینشن لے رہے ہو اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ بس میں اس مغرور عورت کو تھوڑا سا سبق دینا چاہتا ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔" محبوب علی کی خاموشی سے سر حامد نے اندازہ لگالیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے چنانچہ اب اسے نرمی سے سمجھانے لگے۔ محبوب علی اس بار بھی کوئی جواب نہیں دے سکا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہونے لگا۔

"میں نے تمہیں جو ایک لاکھ معاف کر دیئے کا وعدہ کیا تھا، اس پر اب بھی قائم ہوں۔ تم چاہو تو ابھی یہ رقم لے جاؤ ورنہ بعد میں لے لینا۔ بیٹیوں کا جینز بنانے میں کام آئے گی۔" سر حامد نے اسے پیشکش کی لیکن وہ اپنی لوٹا کی ہوئی رقم پر ایک ٹکاؤ غلط بھی ڈالے بغیر وہاں سے نکلا چلا گیا۔

☆☆☆

"اور سناؤ، تمہارے رشتے کی بات کہاں تک پہنچی؟ کہیں اچانک دھماکا نہ کر دینا۔" سلیم ٹیلی فون پر غزالہ سے مخاطب تھا۔ آج اس کے انداز میں پچھلے دنوں کی سی جھنجھلاہٹ اور ناامیدی نہیں تھی اور وہ کچھ خوشگوار موڈ میں نظر آتا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ اس کے سلسلے میں معلومات لیتی پھروں۔" غزالہ نے خراب موڈ کے ساتھ جواب دیا۔

"معلومات تو رکھنی چاہیے یا۔ بے خبری انسان کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔" سلیم نے اسے سمجھایا۔

"میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ چچی جان کو امی اور ابو نے مایوس لوٹا دیا ہے اور اپنے فیصلے پر قائم ہیں میرے لیے اس سے بڑی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ میرے دن رات جس کرب میں گزر رہے ہیں، یہ میں ہی جانتی ہوں۔" غزالہ کالجیہ روٹھارو ٹھہرا تھا۔ وہ خود گمزور لڑکی تھی اور چاہتی تھی کہ سلیم کسی طرح اسے منجھدار سے نکال لے۔

"میری حالت بھی تم سے مختلف نہیں غزالہ۔ میں بھی کانٹوں پر لوٹ رہا ہوں لیکن اب ایک امید بندھی ہے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔" سلیم نے سنجیدگی اختیار کی۔

"کیسی امید۔ مجھے بھی بتاؤ۔" غزالہ نے پُر شوق لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے جا رہا ہوں۔ بہت بڑا کاروبار نہیں ہوگا لیکن انشاء اللہ میں ترقی کر لوں گا

روک کر سر حامد کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سر حامد اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کی ابتر حالت نے بھی پریشان کر دیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر انہوں نے جلدی سے اسے اندر بلایا اور اس سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ محبوب علی نے کوئی جواب دینے کے بجائے رقم نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

"یہ کیا.....؟" سر حامد کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں رہی سر۔ میرے والد کا آج سہ پہر انتقال ہو گیا۔" محبوب علی نے ساٹ لہجے میں انہیں اطلاع دی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "زندگی بڑی بے بھروسہ شے ہے سر۔ اس بے بھروسہ شے کو بچنے کے لیے انتقام، لالچ اور حسد جیسے جذبات کو پروان چڑھانا بیکار ہوتا ہے۔" کوشش کریں جو غلطی ہو گئی ہے اس کا مداوا کر سکتیں۔ میں بھی اپنے حصے کا جرم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تم صدے کے باعث اپنے حواس میں نہیں ہو محبوب علی۔ میں تمہیں وارن کر رہا ہوں کہ تم اپنا منہ بند رکھو گے۔ اگر تم نے کہیں زبان کھولی تو یاد رکھنا کہ میں صاف انکار کر دوں گا اور تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تم مجھے انوالو کر سکو۔ تم یہ رقم لو یا نہ لو، سب کچھ دیے ہی ہوگا جیسے میں نے بیان کیا تھا۔ اب ہمارے پاس قدم واپس پلٹانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" سر حامد دھیمی آواز میں غرائے۔

"میں چپ رہا تو میرا ضمیر مجھے جینے نہیں دے گا سر۔ میں کبھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا اور مجھے ہمیشہ یہ احساس جرم رہے گا کہ میری وجہ سے کسی کی زندگی خراب ہو گئی۔" محبوب علی بلبلا یا۔

"تم نے زبان کھولی تو تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے بچوں کی زندگی بھی خراب ہو جائے گی۔ تمہارے زبان کھولنے سے تمہارے اوپر انگلیاں اٹھیں گی اور تم اتنے بدنام ہو جاؤ گے کہ کوئی تمہاری بیٹیوں کا ہاتھ مانگنے تمہارے در پر نہیں آئے گا۔ اب تم سوچ لو کہ جذبات میں آکر سب کچھ تباہ کرنا ہے یا....." سر حامد نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن محبوب علی نے اس ادھورے جملے کی سفاکی کو پوری طرح محسوس کیا تھا۔ وہ اسی معاشرے کا فرد تھا اور جانتا تھا کہ ہمارے ہاں باپ کے گناہوں اور غلطیوں کی سزا اولاد، بالخصوص بیٹیوں کو سنبھالنی پڑتی ہے۔

"جاؤ۔ شاباش، گھر جا کر سو جاؤ۔ سونے کے لیے نیند کی گولی کھا لینا۔ بھر پور نیند لے کر اٹھو گے تو تمہیں خود احساس ہوگا کہ تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے تھے۔ غلط یا صحیح جو



## مشہورہ

ایک آدمی نے فیس بک اسٹیٹس پر لکھا۔

وائف چاہیے۔

200 آدمیوں نے کمٹ لکھا۔ میری لے جا۔

آدمی نے جواب دیا۔

کمیونامیک نہیں رہا تھا، پوچھ رہا تھا۔

چاہیے؟ دوں؟

مرسلہ۔ عرفان احمد، جمیل انور، آڑھ چو آسیدن شاہ

مطلوبہ کام بتا دیا۔ سلیم کام کی نوعیت جان کر کچھ ہل کے لیے خاموش ہو گیا۔ عام حالات میں وہ سر حامد کا ایسا کوئی مطالبہ قبول نہیں کر سکتا تھا لیکن اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

”او کے سر! جیسا آپ چاہیں۔“ چارونا چاراسے ہامی بھرنی پڑی۔ یہ اور بات تھی کہ دل پر ایک بوجھ سا آ گیا تھا۔

☆☆☆

”ایک کروڑ کی رقم کا بندوبست کر لو۔ رقم کب اور کہاں پہنچانی ہے، وقت آنے پر بتا دیا جائے گا۔“ زبیر کے موبائل پر یہ دوسرا پیغام رات گئے موصول ہوا تھا جسے پڑھ کر سب کی پیشانیوں پر ہی شکنتوں کا جال بن گیا تھا۔ ایک کروڑ کی رقم معمولی نہیں تھی، اوپر سے مطالبہ کرنے والا دودھو بات بھی نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کے مذاکرات کر پاتے۔ دونوں وفد آنے والے پیغامات مختلف نمبروں سے آئے تھے اور ان نمبروں پر رابطہ کرنے کی کوشش ناکام رہی تھی کہ نمبر زنگوا کاروں کی روایت کے مطابق بند جا رہے تھے۔

”اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے ہوگا؟ میں بہت کوشش بھی کروں تو تیس چالیس لاکھ سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ تمہارے پاس کتنی رقم ہوگی زبیر؟“ سب سے پہلے سبحان صاحب نے اپنی زبان کھولی اور پریشانی کے عالم میں بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

”کھینچ تان کر دس لاکھ ہی ہوں گے ابو۔“ زبیر نے مایوس سے لہجے میں بتایا۔

”یعنی صرف پچاس لاکھ روپے۔ اغوا کاروں کی ڈیمانڈ سے صرف آدمی رقم۔“ سبحان صاحب بڑبڑائے اور پھر مزید بولے۔ ”وہ کم بخت ہم سے بات بھی تو نہیں کر رہے تھا کہ ہم تادان کی رقم کم کروانے پر بات کر سکیں۔“

”اس بات کا ایک ہی مطلب ہے ابو کہ وہ رقم کم نہیں

اور مستقبل میں تمہیں وہ سب دینے کے قابل ہو جاؤں گا جس کی تاپا اور تائی تمہارے لیے خواہش رکھتے ہیں۔ آج شام امی اس سلسلے میں بات کرنے تمہارے ہاں آرہی ہیں۔ میں نے یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ میں جس حد تک کر سکتا تھا کر گزرا ہوں، اب آگے تمہیں اسٹینڈ لینا ہوگا۔“ سلیم نے اسے اطلاع دیتے ہوئے مطالبہ کیا۔

”اس طرف سے بے فکر رہو۔ میرا دودھ تمہارے لیے ہی ہے لیکن کچھ تو بتاؤ کہ کیا کاروبار کرنے جا رہے ہو۔ کاروبار کے لیے سرمایہ کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ غزالہ بہ یک وقت خوشی اور تجسس میں جھٹلا ہوئی۔

”بس کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی گیا ہے۔ تفصیلات میں ملاقات ہونے پر سناؤں گا۔“ سلیم نے اسے ٹالا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر دوسری کال آنے لگی۔ اس نے دیکھا سر حامد کا نام بلیک کر رہا تھا۔ سر حامد نے موجودہ حالات میں جس طرح اس کی مدد اور حوصلہ افزائی کی تھی، وہ اس کے لیے بے حد اہمیت اختیار کر گئے تھے اور وہ ان کی کال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا چنانچہ بلیک بھرے لہجے میں غزالہ سے بولا۔ ”اچھا غزالہ، ابھی اجازت دو۔ میں جلد تم سے ملنے آؤں گا۔“ اس نے غزالہ سے سلسلہ منقطع کر کے سر حامد کی کال ریسیو کی۔ رکی علیک سلیک کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گئے۔

”ہاں بھی سلیم ریڈی ہو؟“

”جی سر! بالکل ریڈی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس میں تمہیں لینے پہنچ رہا ہوں۔ اپنے اسٹاپ تک پہنچ جاؤ۔“ انہوں نے اس سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ سلیم جو تیار ہی تھا، فوراً گھر سے نکل گیا۔ اسٹاپ پر پہنچ کر اسے چند منٹ ہی سر حامد کا انتظار کرنا پڑا۔ گاڑی روک کر انہوں نے اسے اپنے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بٹھالیا۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس سے اس کے کاروبار کے آغاز کے بارے میں پوچھا اور یقین دلایا کہ جس رقم کا اس سے وعدہ کیا تھا، وہ آج ہی بطور قرض حسہ دے دیں گے۔ سلیم نے تھوڑے سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

”شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے یار! میں نے خود نارسائی کا دکھ اٹھایا ہوا ہے اس لیے تمہیں اس دکھ سے بچانا چاہتا ہوں پھر بھی اگر تم اسے کوئی احسان سمجھتے ہو تو جواباً میرا ایک کام کر کے یہ احسان اتار سکتے ہو۔“

”حکم کیجیے سر۔“ سر حامد کی بات سن کر وہ فوراً تابعداری سے بولا۔ سر حامد نے ذرا سا گلا کھنکھارایا اور اپنا



کریں گے۔ ہمیں کسی بھی طرح پورے ایک کروڑ خرچ کرنے ہوں گے۔“ زبیر نے پریشانی سے دونوں ہاتھ ملے۔  
 ”مگر کیسے؟ اتنی بڑی رقم کے لیے ہم کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ سود پر قرض دینے والا کوئی بندہ اتنی بڑی رقم دے تو دے، اس کے علاوہ تو کوئی نہیں دے سکتا لیکن ایسے قرضے دینے والے لوگ بھی رقم کی مالیت کے حساب سے کچھ گروی رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اتنی قیمتی چیزیں دو ہی ہیں۔ ایک یہ گھر دوسری فیکٹری لیکن ان دونوں چیزوں میں تمہارے باقی بہن بھائی بھی حصے دار ہیں اور تم جانتے ہو کہ میں ملکیت کے سلسلے میں قانونی کارروائی کر چکا ہوں۔ اگر ہم ان دونوں میں سے کوئی بھی شے گروی رکھنا چاہیں تو تمہارے بہن بھائیوں کو بھی معاملے سے آگاہ کرنا ہوگا۔“  
 ”نہیں۔ میں ہرگز اس بات کو پسند نہیں کروں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ دونوں بھابھیاں سارہ سے کتنی چپقلش رہتی ہیں۔ انہیں اس واقعے کا علم ہو گیا تو وہ بعد میں اگلے سیدھے طعنے دے کر سارہ کا جینا دو بھر کر دیں گی۔ پھر وہ دونوں بھی پیٹ کی ہلکی۔ ان کی وجہ سے بات خاندان اور ملنے جلنے والوں میں پھیل جائے گی۔“ زبیر نے سختی سے باپ کی تجویز کو رد کر دیا۔ اس دوران رضا کمال بالکل خاموش بیٹھے رہے۔  
 ”تھے۔ اصل میں وہ زیادہ بول ہی نہیں پارہے تھے۔ پریشانی نے انہیں بالکل کم صدمہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے ماں اور باپ دونوں کا درجہ رکھتے تھے اور اسی حساب سے ڈھری پریشانی میں بھی مبتلا تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح سارہ واپس آجائے۔ وہ اپنے داماد کی طرح بدنامی اور دیگر مسائل کے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے لیکن بہر حال وہ زبیر سے اختلاف بھی نہیں کر سکتے تھے۔“  
 ”آپ بھی تو کچھ بولیں رضا بھائی۔“ سحان صاحب نے انہیں مخاطب کیا تو وہ چونک سے گئے۔

”میں کیا بولوں سحان بھائی۔ میں تو ہر قیمت پر اپنی بچی کی واپسی چاہتا ہوں۔“

”چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں لیکن اس قیمت کو ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ زبیر کے لہجے میں سختی سی تھی۔

”میں نے آپ لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی ہے اور میں یہی غور کر رہا تھا کہ میں باقی رقم پوری کرنے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں لگ بھگ پندرہ لاکھ موجود ہیں اور اس کے علاوہ ایک رہائشی مکان ہے جس کی مالیت پینتیس چالیس لاکھ تک تو ہوگی ہی۔ سارہ کے ساتھ زارا بھی ان دونوں چیزوں میں حصے دار ہے لیکن مجھے

معلوم ہے کہ اپنی بہن کی خاطر وہ اپنے حصے سے محروم ہونے پر افسردہ نہیں ہوں گی۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ میں گھر سے گھرے مکان بیچنے کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہوں۔ کوئی اسٹیٹ ایجنٹ راضی بھی ہو گیا تو بکلت کی وجہ سے اصل مالیت سے بہت کم رقم ادا کرے گا۔“ ان کی بیٹی کی زندگی داؤ پر لگی تھی چنانچہ انہوں نے اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔

”گھر بک گیا تو آپ رہیں گے کہاں انکل! خود سارہ کو بہت دکھ ہوگا۔ وہ خود اس گھر کے معاملے میں بہت جذباتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس گھر کے دروازے سے اسے اپنی امی کی خوشبو آتی ہے۔“ زبیر کو ان کی بیٹی کی بات سن کر

”رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بیٹا۔ میں اکیلا آدمی کوئی چھوٹا سا فلیٹ بھی کرائے پر ملے گا آرام سے رہ سکتا ہوں۔ رہی اس گھر سے جذباتی وابستگی کی بات تو یہ تکلف تو ہم سب کو اٹھانی ہی پڑے گی۔ یادیں قیمتی ہوتی ہیں لیکن انہیں زندہ انسان پر کسی طور ترجیح نہیں دی جاسکتی، یہ بات سارہ بھی سمجھ لے گی۔“ انہوں نے زبیر کے اعتراض کا جواب دیا۔

”رضا بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ اگرچہ ان کا گھر بکنا مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا لیکن حالات ہی ایسے ہیں کہ ہمیں مل جل کر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں اگر مکمل رقم دینے کی پوزیشن میں ہوتا تو کبھی رضا بھائی کا یہ نقصان نہیں ہونے دیتا۔ اب بھی میری یہ کوشش ہوگی کہ مستقبل میں رضا بھائی کو ان کی رقم واپس کر دوں۔ کم از کم زارا کے حصے کی رقم تو ہمیں ادا کرنی ہی ہوگی۔ وہ رقم تو ہم پر قرض ہی رہے گی۔ باقی رہا رضا بھائی کی رہائش کا مسئلہ تو مجھے تمہارے سوال پر افسوس ہے۔ کیا میری طرح رضا بھائی بھی تمہارے لیے باپ کا درجہ نہیں رکھتے ہیں جو تم انہیں اپنے ساتھ نہ رکھ سکو۔ یہاں اس کوٹھی میں ان کے لیے بہت جگہ ہے۔“ سحان صاحب بیٹے کو سرزنش کیے بغیر نہ رہ سکے۔

”سوری ابو۔ سوری انکل۔ بس پریشانی میں، میں ٹھیک طرح سے کچھ سوچ نہیں پارہا ہوں۔“ زبیر نے فوری معذرت کی۔

”ابھی ان باتوں کو جانے دیجیے سحان بھائی۔ فی الحال تو ہمیں سارہ کی رہائی کے لیے تاوان کی رقم جمع کرنے پر زیادہ توجہ دینی ہے۔ میرا مکان فروخت کرنے یا گروی رکھوانے کے سلسلے میں آپ کچھ کر سکتے ہیں تو بتائیں۔ باقی رقم تو میں صبح ہوتے ہی بینک سے نکالواؤں گا۔“ رضا کمال نے باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے اصل مسئلے کی



بات بننے کی امید بندھی ہے اور انہیں ابھی اس شخص سے ملاقات کے لیے جانا ہے جو رضا کمال کا مکان خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ چائے پیتے ہی وہ لوگ اس شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ زبیر کو انہوں نے گھر پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ اس کے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور وہ گھر پر رہ کر اپنی والدہ کی تسلی بخشی کروا سکتا تھا۔

☆☆☆

سرحامد اور سلیم کالج پہنچے تو چونکہ ار اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اس نے ان کے لیے کالج کا گیٹ کھولا اور سرحامد گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی سے اتر کر انہوں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا لیکن چابیاں سلیم کے پاس موجود تھیں۔ یوں تو چابیاں محبوب علی کے پاس رہتی تھیں لیکن کل اس نے سلیم کے حوالے کر دی تھیں کیونکہ اسے اپنے والد کے اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے باعث وہیں رہنا تھا اور وہ چھٹیوں میں کالج نہیں آنا چاہتا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کے دروازوں میں آٹوٹینک لاک لگے ہوئے تھے جنہیں بند کرنے کے لیے چابی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اسی لیے محبوب علی چابیاں سلیم کے حوالے کرنے کے باوجود سب سے آخر میں گھر روانہ ہوتے ہوئے آرام سے دروازے لاک کر گیا تھا۔ چھٹیوں کا آغاز ہونے کے باوجود آج سرحامد اور سلیم کو کالج آنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ لیب کے لیے کچھ ضروری کیمیکلز اور دیگر سامان آنا تھا۔ لیب اینڈنٹ کی حیثیت سے سلیم کی وہاں موجودگی لازمی تھی اور یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ عملے کے ساتھ مل کر ہر چیز کو مناسب طریقے سے اسٹور کر لے۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے ایچ او ڈی بہت محتاط طبیعت کے مالک تھے اور ایسے مواقع پر ٹینجنگ اسٹاف میں سے کسی کو نگرانی پر ضرور لگاتے تھے۔ اس بار یہ ڈیوٹی سرحامد کے جیسے میں آئی تھی بلکہ انہوں نے رضا کارانہ از خود سنبھال لی تھی کہ نہ تو انہیں خواتین کی طرح چھٹیوں میں پنڈنگ میں پڑے گھر کے ڈھیروں کام نمٹانے تھے اور نہ ہی شادی شدہ حضرات کی طرح بیوی بچوں کو چھٹیاں انجوائے کروانے کہیں لے کر جانا تھا۔ وہ اور سلیم طے شدہ وقت پر کالج پہنچ گئے تھے لیکن ابھی سامان لے کر آنے والا عملہ نہیں پہنچا تھا۔ انہوں نے اندر بیٹھ کر انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور اسٹاف روم میں آ گئے۔

”آپ بیٹھیں سر۔ میں اتنی دیر میں لیب دیکھ لیتا ہوں اور ساتھ ہی چائے بھی تیار کر لیتا ہوں۔“ سلیم نے ہنسنے اور لالٹوں کے ٹپن کھولنے اور سرحامد کو وہیں چھوڑ کر

”میرے جاننے والوں میں ایک دوا ایسے لوگ موجود ہیں۔ میں ان سے رابطہ کر کے بات کرتا ہوں۔“ سبحان صاحب نے انہیں تسلی دی۔ اس کے بعد وہ فون پر مصروف ہو گئے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور زبیر کے اجازت دینے پر ایک ملازمہ ٹرائی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ٹرائی میں چائے اور کچھ اسٹیکس سجے ہوئے تھے۔ رضا کمال کی آمد کے بعد سے وہ لوگ مستقل ڈرائنگ روم میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ملازمین سمیت گھر کے کسی فرد کو بلا اجازت یہاں نہ آنے کی تاکید کر دی گئی تھی۔ پھر بھی بیگم سبحان رات کے کھانے کے لیے پوچھنے آئی تھیں اور اب پھر انہوں نے یہ ٹرائی بھجوا دی تھی۔ وہ تجسس تھیں کہ ان کے سہمی نے یہاں ڈیرا کیوں ڈال رکھا ہے اور سارہ کہاں ہے لیکن سبحان صاحب نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ زبیر اور سارہ کے درمیان کچھ اختلافات ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے سارہ روٹھ کر میکے چلی گئی ہے اور رضا صاحب اسی سلسلے میں گفت و شنید کرنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔ اس سے آگے دیگر تفصیلات انہوں نے بعد میں بتانے کا کہہ کر بیگم کو ٹال دیا تھا۔ وہ حاکم مزاج آدمی تھے اس لیے بیگم کو ان کی بات تسلیم کرنی پڑی تھی اور تجسس کے باوجود وہ ڈرائنگ روم سے دور تھیں۔ سبحان صاحب نے فون پر گفتگو کرتے ہوئے زبیر کو اشارہ کیا کہ وہ رضا صاحب کو کچھ کھانے کے لیے دے۔ زبیر نے ایک پلیٹ میں سادہ کیک پیس اور کچھ بسکٹ رکھ کر انہیں پیش کیے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ موجودہ حالات میں ان کے لیے کچھ ملنے سے نیچے اتارنا مشکل تھا۔

”کچھ تو لیجیے رضا بھائی۔ آپ جب سے آئے ہیں کچھ کھایا یا نہیں ہے۔ اس طرح کب تک بھوکے پیاسے رہ سکتے ہیں۔“ سبحان صاحب نے فون بند کرتے ہوئے ان سے اصرار کیا۔

”میں کیسے کچھ کھانی سکتا ہوں۔ میری تو جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔“ رضا کمال بے بسی سے بولی۔

”میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں لیکن ان حالات سے نمٹنے کے لیے ہمیں اپنے حواس اور توانائی دونوں برقرار رکھنے ہیں اس لیے پلیز تھوڑا سا تو کچھ کھا لیجیے۔“ سبحان صاحب نے اصرار کیا تو رضا کمال نے چائے کی پیالی اٹھالی لیکن وہ بس مشکل سے آدمی پیالی چائے ہی پی سکے۔ چائے پینے کے دوران سبحان صاحب نے انہیں بتایا کہ ایک جگہ



زبردستی بشارت کا مظاہرہ کیا۔ وہ چائے پی ہی رہے تھے کہ چوکیدار اور دو مزید آدمی وہاں آ گئے۔ چوکیدار کے ساتھ آنے والے وہ دونوں افراد شناسا تھے۔ کالج میں لیب سے متعلق ضروری سامان کی ڈیلیوری کے لیے عموماً وہی دونوں آیا کرتے تھے۔

”یہ لوگ آگئے ہیں سر۔ آپ بتائیں کہ میں مدد کے لیے یہاں رکوں یا گیٹ پر ڈیوٹی دوں؟“ چوکیدار نے سر حامد سے دریافت کیا۔

”کل کالج ٹائم کے بعد محبوب یہاں آیا تھا کیا ثار؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سر حامد نے ایک قطعی غیر متعلقہ سوال پوچھا۔

”نہیں سر! اس بے چارے کو تو پہلے ہی اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس کے ابا کا آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ تو ان کے پاس اسپتال میں ہوگا، اسے کسی کام سے کالج آنا تھا کیا؟“ ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ثار نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بس میں کسی اور وجہ سے پوچھ رہا تھا۔“ سر حامد نے اسے ٹالا اور حکم دیا کہ وہ گیٹ اندر سے لاک کر کے یہاں کام کرنے والوں کی مدد کرے۔ ثار شانے اچکا کر ان کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ کام کے دوران سب نے محسوس کیا کہ سر حامد سخت عجلت میں ہیں اور ان کا بس نہیں چل رہا کہ کیسے جاؤ کی چمڑی گھما کر سیکنڈوں میں سارا کام نمٹا دیں۔ ایک آدھ پار تو انہوں نے سلیم اور چوکیدار سمیت کام کرنے والے باقی دو افراد کو بھی ڈانٹ پلا دی۔ ان کے اس رویے کا یہ فائدہ ہوا کہ کام جلدی منٹ گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ سلیم سمیت روانہ ہوئے لیکن اسے یہ کہہ کر راستے میں ہی ایک قریبی چورنگی پر اتار دیا کہ انہیں ایمر جنسی میں کہیں جانا ہے اس لیے وہ اسے گھرنے نہیں چھوڑ سکتے۔ سلیم نے بغیر ہڑامانے ان کا عذر قبول کر لیا لیکن وہ ابھن میں ضرور تھا کہ اچانک ایسا کیا ہوا کہ سر حامد کے انداز ہی بدل گئے۔ ادھر سر حامد کو اس سے زیادہ اپنی ابھن دور کرنے کی فکر تھی اور وہ گاڑی شہر کے اس مضائقہ علاقے کی طرف اڑا لے جا رہے تھے جہاں محبوب علی کی رہائش گاہ تھی۔ وہ پہلے بھی اس علاقے میں آئے تو نہیں تھے لیکن محبوب علی کا ایڈریس ان کے پاس محفوظ تھا۔ اس ایڈریس کی مدد سے ڈھونڈتے ڈھانڈتے آخر کار وہ اس کے گھر پہنچ ہی گئے۔ گھر کے باہر اب بھی شامیانہ لگا ہوا تھا اور دریاں اور چاند نیاں بھی ہوئی تھیں۔ ان چاندنیوں پر دو

باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی سر حامد نے ملاحظہ باتھ روم کا رخ کیا اور اس کا بند دروازہ کھول کر اندر بھاگا۔ ان کی توقع کے خلاف باتھ روم خالی پڑا تھا۔ ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال نمودار ہو گیا اور وہ بے چین سے نظر آنے لگے۔ باتھ روم پر ایک نظر مزید ڈالنے کے بعد انہوں نے اسٹاف روم پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ یہاں تک کہ بڑی سی میز کے نیچے بھی جھانک لیا لیکن انہیں ان کا گوہر مقصود نہ مل سکا۔ بے قراری کے عالم میں وہ اسٹاف روم سے نکل کر لیب میں پہنچ گئے۔ وہاں سلیم چائے کا پانی رکھ رہا تھا۔

”ارے سر! آپ یہاں کیوں آگئے؟ میں چائے لے کر وہیں آ جاتا۔“ سر حامد کو دیکھ کر وہ بول پڑا۔

”بس اکیلے وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔“ انہوں نے بہانہ بنایا اور متلاشی نظروں سے لیب کا جائزہ لینے لگے۔

”ہر چیز کی جگہ فکس ہے سر۔ ابھی سامان آ جائے تو آپ دیکھیے گا میں کتنی ترتیب سے ہر چیز رکھواتا ہوں۔“ سلیم نے ان کی نظروں کا کچھ اور مبہوم سمجھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ ”مجھے معلوم ہے تم بہت ذمے دار لڑکے ہو۔ میں بس یونہی جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری یہاں موجودگی تو صرف فارمیٹی ہے اور تم میری مدد کے بغیر بھی سب کچھ اچھی طرح مینج کر لو گے۔“ سر حامد نے اسے جواب دیا اور اچانک لیب سے باہر نکل گئے۔ اب وہ قطار سے بنے کلاس رومز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کلاس رومز کے دروازے بھی بند تھے لیکن سرکاری کالجوں کے عمومی حال کی طرح اکثر کھڑکیوں کے پٹ سلامت نہیں تھے۔ وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر اندر کا جائزہ لینے لگے۔ اس عمل میں وہ اتنے مصروف تھے کہ انہیں سلیم کی آمد کا علم بھی نہیں ہوسکا۔

”سر! کچھ تلاش کر رہے ہیں کیا؟“ اس کی آواز پر وہ چونک کر پلٹے تو وہ آنکھوں میں حیرت لیے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنی حرکت اس کی نظر میں آ جانے پر وہ کچھ کھسیا سے گئے اور بات بنانے کے لیے بولے۔

”تلاش کیا کروں گا، بس یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں غلطی سے کسی کلاس روم کے کچے اور لائنیں وغیرہ آن نہ رہ گئی ہوں۔“ ”فکر مت کریں سر۔ محبوب بھائی بڑے ذمے دار آدمی ہیں اور اپنا کام بہت اچھی طرح کرتے ہیں۔“ سلیم نے ہنس کر انہیں تسلی دی اور مزید بولا۔ ”چائے تیار ہو گئی ہے اسی لیے میں آپ کو بلانے آیا ہوں۔“

”اچھا چلو پھر چائے پی لیتے ہیں۔“ سر حامد نے



یقین دلانا ہوں سر۔ میں چاہتا ضرور تھا کہ میڈم سارہ کو وہاں سے نکال دوں لیکن ہمت نہیں کر سکا۔" محبوب علی کے لہجے نے سر حامد کو یقین کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے لیکن سوال یہ تھا کہ پھر سارہ کہاں ہے؟ انہوں نے یہ سوال محبوب علی سے بھی کر ڈالا۔

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں سر۔ شاید چوکیدار کو کچھ معلوم ہو بلکہ اسے ہی معلوم ہونا چاہیے۔" محبوب علی نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور جوش سے بولا۔ "آپ جا کر چوکیدار سے معلوم کریں، وہ ضرور جانتا ہوگا۔" سر حامد بھی اس کے خیال سے متفق ہو گئے لیکن جب وہ محبوب علی کے گھر سے روانہ ہوئے تو ان میں اتنی ہمت پیدا نہ ہو سکی کہ کالج جا کر چوکیدار سے سارہ کے متعلق کچھ پوچھ سکیں۔ انہوں نے خاموشی سے گاڑی اپنے گھر کی جانب موڑ لی۔

☆☆☆

رضا کمال ایک بار پھر اپنے سہمی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ سجان صاحب انہیں جس بندے کے پاس رات میں لے گئے تھے، اس نے رات کو ہی ان کے ساتھ جا کر ان کا مکان دیکھ لیا تھا اور تیس لاکھ قیمت دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ چالیس لاکھ کے مکان کی یہ قیمت کم تھی لیکن مجبوری میں انہیں قبول کرنی پڑی۔ پندرہ لاکھ صبح انہوں نے اپنے اکاؤنٹ سے نکلوا لیے اور باقی تین لاکھ کا فرق پورا کرنے کے لیے اپنی مرحومہ بیوی کے محفوظ رکھے زیورات فروخت کر ڈالے۔ یہ پرانے ڈیزائن کے اور خاصے بھاری زیورات تھے جنہیں اپنی شادی کے موقع پر سارہ اور زارا دونوں ہی نے لیا پسند نہیں کیا تھا اور نئے ڈیزائن کے زیورات بنوائے تھے۔ رضا کمال نے سوچ رکھا تھا کہ جب وراثت کی تقسیم کا موقع آئے گا تو وہ یہ زیورات برابری سے دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دیں گے۔ آگے ان کی مرضی ہوتی کہ وہ بیچ کر رقم حاصل کر لیں یا ان کے بدلے دوسرا زیور بنوالیں۔ ان کے لیے تو یہ سب چیزیں بس مرحومہ بیوی کی نشانیاں تھیں جنہیں وہ بیوی کی سب سے قیمتی نشانی بنی کو بچانے کے لیے خود سے جدا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

انہوں نے کل رات کا بقیہ حصہ اپنے گھر پر ہی گزارا تھا کیونکہ صبح زارا نے پہنچنا تھا۔ اسے اور اس کے بچوں کو ریسو کرنے کے بعد وہ ضروری کام کا کہہ کر گھر سے نکل گئے تھے اور پوری رقم کا انتظام کرنے کے بعد اپنے داماد اور سہمی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں وہ بار بار

میں سکر افراد اور چار چھ بچے بیٹھے ہوئے مجبوری ٹھلیوں کے ڈھیر سے مٹھیاں بھر بھر کر ان پر کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ سر حامد نے ایک معمر فرد کے برابر بیٹھے ہوئے نڈھال سے محبوب علی کو دیکھ لیا اور سیدھے اس کی طرف بڑھے۔ محبوب علی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور چونک کر کھڑا ہو گیا۔ سر حامد کی آنکھوں میں اس کے لیے خوشخواری تھی لیکن دیگر افراد کی موجودگی کے باعث انہوں نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا اور یوں اس کے بازو پر ہاتھ رکھا جیسے اس سے اظہار ہمدردی کر رہے ہوں۔

"مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔" وہ صرف اتنی آواز میں بولے کہ محبوب علی ہی سن پاتا۔

"یہ میرے کالج سے آئے ہیں چاچا جی۔ میں انہیں اندر بیٹھک میں لے جاتا ہوں۔" محبوب علی نے معمر حضرات میں سے کسی کو مخاطب کر کے بتایا اور سر حامد کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے قدم بڑھائے۔ وہ انہیں گھر کے اندر اس سادہ سی بیٹھک میں لے گیا جو محبوب علی کی محروم کمائی کے بجائے سکینہ کے سلیقے اور ہنرمندی کے ثمر پر سجائی گئی تھی کہ اس کا خیال تھا، اچھی بیٹھک سے بیٹیوں کے رشتوں کے لیے آنے والوں پر اچھا تاثر پڑے گا اور اسے بیٹیاں بیاہنے میں آسانی رہے گی۔

"سارہ کہاں ہے؟" سر حامد کو بیٹھک کی سجاوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تنہائی ملنے ہی غرانے والے انداز میں محبوب علی سے پوچھنے لگے۔

"وہ تو وہیں تھیں۔ اسٹاف روم والے ہاتھ روم میں۔ آپ نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا۔" محبوب علی نے حیرت اور گھبراہٹ سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

"وہ وہاں نہیں ہے بلکہ پورے ڈیپارٹمنٹ میں کہیں نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح ہر جگہ دیکھ لی ہے۔" سر حامد نے دانت کچکچائے۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" محبوب علی کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

"یہ تو تم مجھے بتاؤ گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔" سر حامد کا لہجہ خوشخوار ہوا۔

"میرا یقین کریں سر، مجھے نہیں معلوم۔ میں انہیں وہیں چھوڑ کر کالج سے نکلا تھا۔" محبوب علی روپا نہا ہو گیا۔

"تو پھر کیا وہ کسی بن کر وہاں سے نکل گئی جو مجھے نہیں ملی۔" سر حامد یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

"میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر آپ کو



فون کر کے معلوم کرتے رہے تھے کہ اغوا کاروں نے دوبارہ کوئی رابطہ کیا ہے یا نہیں اور ہر بار انہیں لٹی میں جواب ملا تھا۔ اب بھی وہ تینوں ایک دوسرے کے مقابل خاموش بیٹھے آس اور امید کے ساتھ رابطے کا انتظار کر رہے تھے۔ زبیر اپنے موبائل کی ہرنیل پر بے قراری سے اس کی اسکرین کو دیکھتا تھا۔ وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کی طرف سے آنے والی ہر کال رنجشکٹ کر دیتا تھا کہ اول تو اس کا کسی سے بات کرنے کا موڈ ہی نہیں تھا، دوسرے وہ اپنے موبائل کو بالکل فری رکھنا چاہتا تھا تاکہ کسی بھی کال یا میسج کی آمد کی صورت میں فوری طور پر اسے دیکھ سکے۔ ابھی تک اس کے موبائل پر کسی ان ٹون (نامعلوم) نمبر سے کال یا میسج کی آمد نہیں ہوئی تھی اور یہ ایک تشویش ناک صورت حال بھی یہ رضا کمال، سبحان صاحب اور زبیر تینوں کی لائی ہوئی رقم کو مشترکہ طور پر ایک بریف کیس میں رکھ دیا گیا تھا اور وہ یہ ایک کروڑ روپے سامنے رکھے سراپا انتظار بنے ہوئے تھے۔ بیگم سبحان نے کھانے کی جوڑی اندر بھجوائی تھی، وہ بھی تقریباً ویسی کی ویسی ہی واپس چلی گئی تھی اور کوئی بھی ڈھنگ سے کچھ نہیں کھا سکا تھا۔ انتظار کے یہ جاں مسل لمحے سہ پہر کے وقت جا کر ختم ہوئے اور زبیر کے موبائل پر ایک نامعلوم نمبر سے کال آنے لگی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اغوا کاروں کی طرف سے کال آرہی تھی ورنہ اب تک صرف میسج ہی آئے تھے۔ زبیر نے پھرتی سے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔

”انتظام کر لیا ہے تو نے؟“ موبائل کا اسپیکر کھلا ہوا تھا اس لیے تینوں افراد نے گھر دروازے میں کیا گیا یہ سوال سنا۔ ”بالکل۔ تم بتاؤ کہ رقم کب اور کہاں پہنچانی ہے۔ میں ابھی لے آتا ہوں۔“ زبیر نے بے تابی سے کہا۔

”اتنی جلدی مت کرو اور میری بات غور سے سنو۔ رات کو گیارہ بجے گھر سے رقم لے کر اپنی گاڑی میں لٹکنا۔ رقم کہاں پہنچانی ہے، وہ تمہیں کہیں بھی راستے میں بتا دیا جائے گا۔ اپنا موبائل ساتھ رکھنا مت بھولنا۔“ اس نے احکامات جاری کیے۔

”اوکے۔ تم جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا لیکن میری بیوی.....؟“ ”رقم ملنے پر وہ بھی تمہیں مل جائے گی۔“ اس کا لہجہ سہاٹ تھا۔

”اس سے میری بات تو کروادو۔“ زبیر نے التجا کی لیکن دوسری طرف سے لائن کاٹی جا چکی تھی۔ زبیر نے بے قراری سے کال والے نمبر پر کال بیک کی لیکن نمبر بند ہو چکا

تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر اور باپ کی چٹائی پر لیٹ کر رہ گیا۔ وہ دونوں بھی اپنی جگہ بے بس اور مجبور تھے۔ انہیں بھی اس کے ساتھ انتظار کا یہ طویل محسوس ہوتا وقت گزارنا تھا۔ سہ پہر سے رات ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ انہیں آج پہلی بار ہی پتا چل رہا تھا۔

☆☆☆

رضا کمال نے اپنی پیاری بیٹی کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جھڑی کی طرح بہہ گرا اس کے ماتھے اور بند پٹوں کو بھگو گئے اور اس پویشم میں نہائے گلاب کا گمان ہونے لگا۔ وہ گلاب ہی تو تھی جسے کسی ظالم نے عین عالم شباب میں شاخ سے توڑ کر خزاں کے حوالے کر ڈالا تھا۔ اپنے اس خوب صورت گلاب کی موت پر اس کو سینچنے والا مالی آنسو نہ بہاتا تو کیا کرتا۔ اسے وہ پچاس لاکھ کی رقم جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا جو اس نے اپنی بیٹی کی واپسی کے لیے بطور تادان ادا کی تھی لیکن وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ اسے اس کی بیٹی اس حال میں واپس ملے گی کہ اس کے جسم و روح کے مابین رشتہ ٹوٹ چکا ہوگا۔ ان کا ذہن اس ساری صورت حال پر بری طرح سٹپٹا ہوا تھا اور یقین نہ آتا تھا کہ ان کی پیاری بیٹی اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ وہ تو زبیر کے مطلوبہ تادان کی رقم لے کر نکلنے کے بعد اس انتظار میں تھے کہ بس کچھ دیر بعد وہ سارہ کو لے کر آتا ہی ہوگا۔ وہ سارہ کو واپس لایا بھی تھا لیکن ایک لاش کی صورت مٹے ہوئے لٹھے جیسے سفید چہرے کے ساتھ۔ منتظر رضا کمال اور سبحان صاحب کو کچھ بتانے میں اس کی زبان لڑکھڑائے جا رہی تھی۔ پھر وہ انہیں اپنے ساتھ اپنی کار تک لے گیا تھا۔ کار کی پیچلی سیٹ پر سارہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ زبیر نے حواس ذرا بحال ہونے پر انہیں بتایا کہ اغوا کاروں نے گھر سے روانہ ہونے کے دس منٹ بعد اسے فون کیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ سارہ کے کالج پہنچ جائے۔ وہ کالج تک پہنچا تو اسے ایک بار پھر فون کر کے کالج والی سڑک پر ہی دھبی رفتار سے چلتے رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس سڑک پر اطراف میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے درخت لگے ہوئے تھے اور ان درختوں کے نیچے لکڑی کی پیچیں بھی رکھی گئی تھیں۔

زبیر اس سڑک پر آہستہ روی سے گاڑی چلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تو اسے ٹارچ کے اشارے سے رکنے کا حکم دیا گیا اور پھر فوراً ہی موٹر سائیکل پر سوار ایک نقاب پوش اس کی گاڑی کی کھڑکی کے قریب ریوالور تانے آدھمکا۔ اس نے زبیر سے رقم کا مطالبہ کیا جسے ادا کرنے سے پہلے



ذہلے اس نے سارہ کے سرسریوں سے رخصت مانگی اور اپنے بیوی بچوں اور سرسریت وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ لوگ ٹوٹے پھوٹے نڈھال سے اپنی گاڑی میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ کوٹھی کے سامنے پولیس کی گاڑیاں آکر رکیں۔ آگے والی جیب میں ایس ایس پی احمد خان خود سوار تھا۔ رضا کمال اینڈ ٹیلی کورخست کرنے کے لیے موجود اہل خانہ حیرت سے پولیس کی گاڑیوں کو دیکھنے لگے۔ دیکھنے والوں میں سے چند چہروں پر حیرت کے بجائے خوف کا تاثر بھی تھا۔

☆☆☆

محبوب علی نے اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور پوجھل قدموں سے قبرستان کے باہر کی طرف رخ کیا۔ ابھی وہ قبرستان کے مرکزی دروازے سے کچھ فاصلے پر تھا تو اس نے سلیم کو دوسری طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہیں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ سلیم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا چنانچہ قدموں کی رفتار تیز کر لی اور قریب پہنچ کر سلام دعا کرنے لگا۔

”یہاں کس کی قبر پر آئے تھے؟“ رمی علیک سلیم کے بعد محبوب علی نے اس سے دریافت کیا۔

”میرے والد کی قبر ہے یہاں۔ اکثر آتا رہتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جب خود کو بہت تنہا محسوس کروں۔“ سلیم نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

”کیا ہوا، تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوا؟“ محبوب علی کو سلیم کے سارے حالات کا علم تھا چنانچہ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”کیسے حل ہوتا؟ دولت کے آگے سارے رشتے اور جذبے بچ ہو جائیں تو مسئلہ حل نہیں ہوتے۔“ سلیم کی اداس صورت دیکھ کر محبوب علی کا دل بھی مزید دکھی ہو گیا۔

”کیوں ابھی کل تک تو تم بہت پُر امید تھے اور کہہ رہے تھے کہ تباہی کو اپنے کاروبار کے آغاز کا بتاؤ گے تو وہ مان جائیں گے۔“

”وہ میری غلط فہمی تھی۔ تباہی میری طرح جذباتی آدمی نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا کاروبار چل جائے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے شدید نقصان اٹھا بیٹھو تو میں ایسا تجربہ کرنے کی حماقت کیوں کروں اور ایک امکان کے پیچھے سامنے نظر آتے اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کو ٹھکرا دوں..... تو بس یوں ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ حالانکہ امید کے سہارے ہی امی، بہنوں کے جہیز کے لیے رکھا گیا اپنا زور فر دخت کرنے کے لیے راضی

زیر نے سارہ کے بارے میں پوچھا۔ نقاب پوش نے سڑک کے کنارے لگی بیچ کی طرف اشارہ کیا۔ نیم تاریکی میں زیر نے وہاں بیٹھے نیوانی وجود کو دیکھا اور رقم نقاب پوش کے حوالے کر دی۔ رقم لیتے ہی نقاب پوش اڑن چھو ہو گیا اور زیر گاڑی سے اتر کر بیچ کی طرف بھاگا۔ اسے حیرت تھی کہ سارہ اسے دیکھ لینے کے باوجود ابھی تک بیٹھی ہوئی کیوں ہے۔ نزدیک جانے پر اسے سارہ کی آنکھیں بند دکھائی دیں تو اسے گمان ہوا کہ وہ بے ہوش ہے لیکن جب اس نے اسے چھوا تو جان لیا کہ وہ اصل میں مرچلی ہے۔ اس انکشاف پر اسے کچھ بھائی نہیں دیا اور وہ سارہ کی لاش کو گاڑی میں ڈال کر گھر لے آیا۔ رضا کمال جواب تک بیٹی کی زندگی کے لیے کپڑا مار کر رہے تھے، پھر سے گئے اور انہوں نے اپنے اس شاگرد کو فوری طور پر فون کر ڈالا جس کا وہ پہلے بھی ذکر کر چکے تھے۔ ایس ایس پی کے عہدے پر فائز اس شاگرد نے رات دو بجے کے بعد ملنے والی اپنے استاد کی کال پر بے حد تا بعداری کا مظاہرہ کیا اور آدھے گھنٹے کے اندر علاقہ ایس ایچ او کے ساتھ سارہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس دوران سب گھر والوں کو سارہ کی موت کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ رضا کمال نے بھی زارا کو فون کر کے بلوایا تھا۔ زارا جو اپنی آمد کے کچھ دیر بعد سے باپ کے غائب ہو جانے پر پریشان تھی، سارہ کو لاش کی صورت دیکھ کر صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اسے بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ مسلسل گریہ کرتی رہی۔ سارہ کی سرسری خواتین بھی رونے دھونے میں اس کے ساتھ شامل تھیں چنانچہ جب ایس ایس پی احمد خان وہاں پہنچا تو وہاں کھرام سا مچا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ضروری معلومات حاصل کیں اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کروا دیا۔ احمد خان کے تعاون کا نتیجہ تھا کہ انہیں لاش کی واپسی کے لیے بہت زیادہ طویل انتظار نہیں کرنا پڑا اور یوں اب سارہ اپنی آخری آرام گاہ جانے کے لیے تیار تھی۔ اسے سسکیوں اور آہوں میں رخصت کیا گیا اور دنیا داری کی ساری رسمیں بھی نبھائی گئیں۔ یہ رسمیں اس کے سرسری گھر میں سرسریوں نے ہی نبھائی تھیں ورنہ رضا کمال اور زارا کو تو صدمے سے اپنا ہی ہوش نہیں تھا۔ زارا کا شوہر البتہ اس موقع پر میکے کی بھرپور نمائندگی کرتا رہا تھا۔ اس نے صدمے سے کم صدمہ نظر آتے زیر کی بھی کافی دلجوئی کی تھی اور قانونی کارروائیاں نمٹانے میں زیر اور اس کے گھر والوں کے شانہ بشانہ رہا تھا۔ تدفین کے بعد شام



دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر پر

جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بھارت، بنگلہ دیش کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد رکھیں کہ آپ اپنا نام کسی بھی صورت میں

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

(ایڈیٹر جاسوس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III بحیثیت ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35892551

ہو گئی تھیں اور میں نے بھی سر حامد سے قرض حسمہ لینا قبول کر لیا  
تھا کہ کاروبار چل پڑا تو انشاء اللہ بہنوں کے لیے دوسرا زیور  
بھی بنوا دوں گا اور سر حامد کا قرض بھی واپس کر دوں گا۔“ سلیم  
نے روانی میں بتایا تو محبوب علی چونک گیا۔

”آپ یہاں کس کی قبر پر آئے تھے، آپ نے یہ تو  
بتایا ہی نہیں؟“ سلیم، محبوب علی کے چونکنے کو محسوس کیے بغیر  
اس سے پوچھنے لگا۔

”سر حامد رقم کے بدلے تم سے کوئی کام بھی لے رہے  
ہوں گے؟“ اس کے سوال کو اُن سنا کر کے محبوب علی نے  
پوچھا تو اس بار سلیم چونک گیا اور حیرت سے پوچھا۔

”آپ کو کیسے معلوم کہ انہوں نے مجھ سے کوئی کام کہا ہے؟“  
”عمر میں تم سے زیادہ ہوں تو آدمی کی پہچان بھی تم  
سے کچھ زیادہ ہی رکھتا ہوں۔“ محبوب علی نے کہا اور کھوجنے  
والے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا کام کہا تھا تم سے سر حامد نے؟“  
”آپ کسی سے ذکر تو نہیں کریں گے۔“ سلیم کو

جواب دینے میں تھوڑا اتار مل تھا۔

”تم بتاؤ تو سہی۔“ محبوب علی نے زور دیا۔ جواب  
میں سلیم نے سمجھتے ہوئے جوابات بتائی، اسے سن کر محبوب علی  
حیران رہ گیا اور پھر متبنا کر بولا۔

”کون یقین کرے گا کہ ایک کالج کا استاد بھی ایسی  
مکھٹیا حرکتیں کر سکتا ہے لیکن انا پرستی میں انسان بہت سی الٹی  
سیدھی حرکتیں کر جاتا ہے۔“ سلیم نے اس کی رائے کی تائید  
کی لیکن محبوب علی کا دماغ سر حامد سے ہونے والی ملاقات  
میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا تھا کہ سارہ غائب  
ہے اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس سلسلے میں سر حامد نے  
سلیم کا تعاون تو حاصل نہیں کیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ سلیم  
سے براہ راست اس سلسلے میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”کل تم کالج گئے تھے تو وہاں میڈم سارہ بھی تھیں  
کیا؟“ آخر اس کو ایک سوال سوچ ہی گیا۔

”نہیں۔ وہ کیوں ہوں گی؟ میرے ساتھ تو سر حامد  
تھے۔“ سلیم نے حیرت سے جواب دیا۔

”اچھا ہاں ہاں۔ سر حامد کالج کے بعد میرے گھر بھی  
آئے تھے مجھے ابا کا پڑسہ دینے۔“ محبوب علی کو اندازہ ہو گیا  
کہ سلیم مکمل بے خبر ہے۔

”ابا کا پڑسہ دینے..... کیا مطلب؟“ سلیم چونکا۔

”پرسوں میرے ابا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کالج کی  
چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں اس لیے میں کسی کو اطلاع نہیں بھجوا  
سکا۔ بس سر حامد کا نمبر پاس تھا تو انہیں ہی اطلاع دی۔“



دیکھنے کی کوشش کی۔  
 ”یہ سب میری غلطی ہے۔ میں اس شیطان کے جال میں نہیں پھنستا تو آج یہ حادثہ نہ ہوتا۔“ محبوب علی بڑبڑانے لگا۔  
 ”آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“  
 سلیم پریشان ہوا۔

”سچ بتاؤ سلیم! کل تم لوگ کالج پہنچے تو میڈم سارہ وہاں تھیں نہ اور سر حامد نے تمہیں رقم اس لیے دی تھی کہ تم کسی کو وہاں میڈم سارہ کی موجودگی کے بارے میں نہ بتاؤ۔“  
 محبوب علی کچھ ہذیانی سی کیفیت میں اس سے پوچھنے لگا۔  
 ”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں محبوب بھائی؟“  
 سلیم مزید پریشان ہو گیا۔ ریڈیو میں محبوب علی نے شروع سے سارا قصہ سنا ڈالا۔

”اوہ نو۔ یہ تو بہت خطرناک بات بتائی ہے آپ نے۔ میرے خیال میں تو آپ کو یہ سب پولیس اسٹیشن جا کر بتا دینا چاہیے۔ آپ اگر آج خوف زدہ ہو کر بیٹھ گئے تو وہ درندہ کل کو کسی اور کو بھی اپنا نشانہ بنا سکتا ہے۔“ سلیم نے اسے سمجھایا تو محبوب علی بھی سر حامد کے ویسے سارے ڈرامے اور دھمکیاں بھول کر پولیس اسٹیشن جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اس جیسے شخص کی برداشت سے بہت آگے کی بات تھی۔

☆☆☆

”احمد بیٹا آپ؟ اس وقت اور یوں؟“ ایس ایس پی احمد خان رضا کمال کے سامنے آکر کھڑا ہوا تو انہوں نے کمزور سے لہجے میں اس سے پوچھا۔  
 ”جی سر۔ میں آپ کو آپ کی بیٹی کے قاتل سے ملوانا چاہتا تھا۔“ احمد خان نے ان سے کہا اور پھر پیچھے مڑ کر اپنے اہلکاروں کو ہدایت دینے لگا۔ ”پوری کوشش کو گھیرے میں لے لو۔ یہاں سے کوئی فرد باہر نہیں جانا چاہیے۔“

”ڈونٹ وری سرا! یہاں سے چڑیا کا بچہ بھی نہیں نکل سکتا۔“ ساتھ آئے ایس ایچ او نے اسے یقین دلایا جبکہ رضا کمال، احمد خان کے ساتھ آنے والے ان تین افراد کو دیکھ رہے تھے جن کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ان تینوں میں سے کون ان کی بیٹی کا قاتل ہو سکتا ہے، وہ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے۔

”سلیم تو..... تو اس گھناؤنے کام میں شامل ہے، مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تیری اس حرکت پر تو میرے مرحوم بھائی کی روح بلبلانے لگی ہوگی۔“ جنازے کے شرکاء میں سے ابھی تک کچھ لوگ وہیں موجود تھے۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک

محبوب علی نے ادا سی سے بتایا۔  
 ”سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے لیکن حیرت ہے کہ سر حامد نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ آپ کی طرف پُرسے کے لیے جا رہے تھے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔“ سلیم کو یاد آ گیا کہ کل سر حامد نے کسی کام سے جانے کا کہہ کر اسے راستے میں ہی اتار دیا تھا۔ وہ محبوب علی کو گلے لگا کر اس سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ محبوب علی سبب جانتے ہوئے بھی کئی کاٹ گیا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”چلو باہر چلتے ہیں۔ یہاں قبرستان میں کھڑے ہی باتیں کیے جا رہے ہیں۔“

”چلیں چلتے ہیں۔“ سلیم نے بھی کہا اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر سلیم نے قریبی چائے کے ہوٹل تک چلنے کی تجویز دی جسے محبوب علی نے قبول کر لیا۔ ہوٹل پر چائے کا آرڈر دینے کے بعد سلیم، محبوب علی سے اس کے والد کے انتقال کے بارے میں تفصیلات پوچھنے لگا۔ اس دوران میں چائے بھی آگئی۔ وہ چائے پی رہے تھے کہ شام کے اخبارات پہنچنے والا ایک ہا کر قریب سے گزرنے لگا۔ وہ حسب روایت چھوٹی چھوٹی سرخیوں کو بڑی خبر کے طور پر بلند آواز میں سناتا خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”جوان کالج ٹیچر کا اغوا کے بعد قتل.....“ اس کی زبان سے نکلے اس جملے نے محبوب علی کو چونکا دیا اور اس نے آواز لگا کر اخبار خرید لیا۔ مختلف سرخیوں کو دیکھتا ہوا آخر وہ اپنی مطلوبہ خبر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ خبر کی تفصیلات نے اس کے اندیشوں کی تصدیق کر دی اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”کیا بات ہے محبوب بھائی! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“ سلیم نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔

”یہ خبر دیکھو۔“ محبوب علی نے اخبار اس کی طرف بڑھایا اور خود سر تمام کر بیٹھ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سر حامد اس حد تک بھی جاسکتے ہیں۔ سلیم نے خبر پڑھی تو اسے بھی جھجکا لگا۔ جوان العمر، شوخ سی میڈم سارہ کی موت ایک نہایت افسوس ناک واقعہ تھا لیکن محبوب علی کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہا تھا۔

”حوصلہ کریں محبوب بھائی۔“ سلیم نے اسے دلاسا



صاحب تیزی سے سلیم کے قریب آئے اور اس کا گریبان پکڑ کر اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔  
 ”ذرا آرام سے مسٹر! یہ شخص پولیس کی کھڑی میں ہے اور آپ اس پر یوں ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔“ احمد خان نے اسے ٹوکا جبکہ تھپڑ کھانے والا سلیم حیران تھا کہ اس کے تایا یہاں میڈم سارہ کے سرال میں کیوں موجود ہیں۔  
 ”میرے خیال میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ سر کے لیے یوں کھڑے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔“ سلیم کے تایا کو ڈنپنے کے بعد احمد خان نے تجویز پیش کی جس سے اختلاف کی کوئی بھی جرات نہ کر سکا اور طوعاً و کرہاً سب ہی نے اندر کا رخ کیا۔

”سب سے پہلے میں ان صاحب سے آپ کا تعارف کرواتا ہوں۔ یہ سر حامد ہیں، میڈم سارہ کے کولیگ۔ اس حادثے سے قبل ان کی میڈم سارہ کے ساتھ کچھ بد مزگی ہو گئی تھی اور انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ سارہ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لیں گے۔ انتقام میں اندھے ہو کر انہوں نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بیون محبوب علی کو راضی کر لیا کہ جس روز سارہ کالج سے روانہ ہونے میں دیگر اسٹاف کے مقابلے میں لیٹ ہو جائیں، اس روز یہ چائے میں انہیں نشہ آور دوا پلاوے۔ محبوب علی کو اپنے بیمار باپ کے آپریشن کے لیے رقم کی ضرورت تھی اس لیے مجبوراً یہ راضی ہو گیا۔ اتفاق سے اسے یہ موقع کالج کے آخری دن ملا اور اس نے سارہ کو چائے میں سر حامد کی دی ہوئی نشہ آور دوا ملا کر دے دی۔“ احمد خان نے دوسرا اشارہ محبوب علی کی طرف کیا۔  
 ”استاد ہو کر ایسی گھٹیا حرکت۔ ایسے شخص کو تو پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔“ سبحان صاحب سر حامد کی طرف اشارہ کر کے چلائے۔

”حرکت تو واقعی گھٹیا ہے لیکن میری درخواست ہے کہ میری بات مکمل ہونے تک آپ میں سے کوئی دخل اندازی نہ کرے۔“ احمد خان کا لہجہ مہذب ہونے کے باوجود سخت تھا۔ سبحان صاحب کھپا کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔  
 ”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ محبوب علی نے سر حامد کی فرمائش پوری کر دی۔ سر حامد نے اسے اس حرکت کا مقصد یہ بتایا تھا کہ جب سارہ رات بھر کالج میں رہے گی اور اپنے گھر نہیں پہنچ سکے گی تو اس کی بہت بے عزتی ہوگی جبکہ وہ دوسرے دن کالج پہنچ کر اسے آزاد بھی کر دیتے۔ بعد میں اگر سارہ شور بھی مچاتا چاہیں تو سر حامد اور محبوب علی

دونوں صاف انکار کر دیتے کہ ان کا اس سارہ سے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امید بھی یہی تھی کہ میڈم سارہ خود بھی بدنامی کے خوف سے بات کو زیادہ آگے نہیں بڑھائیں گی۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے سر حامد کے اس منصوبے میں شریک ہونے والے محبوب علی کو پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب اس کے والد علاج کی نوبت آنے سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔ ان کے مرنے کے بعد محبوب علی کے لیے سر حامد سے حاصل کردہ رقم بے مصرف ہو گئی اور اس نے کوشش کی کہ سر حامد صبح کا انتظار کرنے کے بجائے فوری طور پر سارہ کو وہاں سے نکال لیں لیکن سر حامد نے انکار کر دیا اور محبوب علی کو بھی منہ بند رکھنے کی تنبیہ کی۔  
 محبوب علی دل پر بوجھ لیے خاموش ہو گیا لیکن اس وقت اپنی خاموشی کو برقرار نہ رکھ سکا جب اسے میڈم سارہ کے قتل کی خبر ہوئی۔ اس نے اپنے ساتھ موجود لیپ ٹاپ سے سلیم کو ساری بات بتائی اور دونوں تھانے پہنچ گئے۔ تھانے میں محبوب علی کے ساتھ سلیم نے بھی اپنا بیان ریکارڈ کر دیا۔ اس نے بتایا کہ سر حامد نے اسے کاروبار کے لیے بطور قرض حسنہ رقم فراہم کی تھی اور بعد میں اس سے مطالبہ کیا تھا کہ جب کالج میں پریکٹیکل ایگزام ہوں تو وہ میڈم سارہ کی استثنائی کامیابیوں میں ایسی گڑبڑ کر دے کہ میڈم سارہ کو پریشانی کے ساتھ ساتھ ایچ او ڈی اور پرنسپل کے سامنے شرمندگی بھی اٹھانی پڑے۔ سلیم کو بھی مجبوری نے ہامی بھرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ یہ اپنی منگیتر سے اپنا رشتہ ٹوٹنے سے بچانا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اپنے تایا کو اس کا رشتہ نہیں اور کرنے سے روکنے کے لیے خود زیادہ کما کر دکھائے۔ اس کے تایا دولت مند داماد کے کالج میں بچپن سے ملے شدہ رشتہ ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔  
 سلیم کے اس بیان سے جہاں سر حامد کی میڈم سارہ سے عداوت کا اندازہ ہوا، وہیں یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ اگر سر حامد کو سارہ کو قتل ہی کرنا ہوتا تو پھر وہ آگے کے لیے ایسا منصوبہ کیوں بناتے؟ بہر حال اس کیس میں میری دلچسپی کی وجہ سے مجھے فوری طور پر اس صورت حال سے آگاہ کیا گیا اور میری ہدایت پر فوری طور پر سر حامد سمیت کالج کے چوکیدار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ سر حامد نے پولیس کھڑی میں تسلیم کیا کہ انہوں نے میڈم سارہ کے خلاف یہ دونوں منصوبے بنائے تھے لیکن وہ خود حیران تھے کہ سارہ کسے غائب ہو گئی۔ میں نے کالج کے چوکیدار کی گرفتاری کا حکم اسی لیے دیا تھا کہ سارہ کو قتل کرنے کے بعد اسے چوکیدار



## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف      ایڈفرس لنکس  
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ      ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر  
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ      ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

**All Done**

Like Liked Message

✓ Get Notifications  
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First  
See new posts at the top of News Feed

Default  
See posts as usual

Unfollow



کے تعاون کے بغیر باہر نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ جب چوکیدار سے سختی کے ساتھ تفتیش کی گئی تو اصل معاملہ نکل کر سامنے آ گیا۔ ”احمد خان یہاں تک کہہ چکے کے بعد رکا اور حاضرین کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ان میں تجسس، متحیر اور خوف زدہ ہر طرح کے چہرے شامل تھے۔ احمد خان کو اندازہ تھا کہ اگر پولیس کے دو سپاہی اسلحہ ہاتھ میں لیے بالکل چوکس وہاں کھڑے نہیں ہوتے تو ان میں سے کچھ لوگ ضرور فرار کی کوشش کرتے۔ وہ گلا کھٹکھارتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع ہوا۔

”چوکیدار نے بتایا کہ اسے جس شخص نے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا، اس نے اسے بھاری رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس رقم کے بدلے اسے صرف اتنا کرنا تھا کہ کالج میں دیر تک رکی سارہ کو بے ہوش کر کے کالج ہی کے کسی حصے میں قید کر دے۔ چوکیدار کمانے کے لیے بیرون ملک جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور آنے والے ہفتے میں اس کی فرار کی پوری تیاری بھی چنانچہ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اگر سارہ نے اسے پہچان بھی لیا تو کیا ہوگا۔ وہ سارہ کی حواگی کے بعد فوری طور پر کالج کی نوکری چھوڑ دیتا اور درمیان کے کچھ دن ملک میں ہی چھپ کر گزارنے کے بعد ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاتا لیکن بالکل آخری لمحات میں گڑبڑ ہوگئی۔ پروگرام کے مطابق سارہ کو زہر کے حوالے کرتے ہوئے بھی بے ہوش ہی رکھا جاتا لیکن چوکیدار سے اسے بے ہوشی کے انجکشن کی ڈوز دینے میں اندازے کی غلطی ہوگئی اور سارہ نے چوکیدار اور اس منصوبے کے ماسٹر مائنڈ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔ اس موقع پر اس نے حماقت اور جذباتیت سے کام لیا اور اپنے ہوش میں ہونے کو ظاہر کر بیٹھی۔ اس کا سب کچھ جان لینا اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا اور مجرم نے اپنے سیاہ کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس بے گناہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ مجرم کا خیال تھا کہ سارہ کی موت کی صورت میں اس کے جرم پر پردہ پڑا ہے گا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ چوکیدار نے ایک حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ چوکیدار نے سارہ کو خود بے ہوش نہیں کیا تھا بلکہ وہ اسے کالج کے ہاتھ روم میں پہلے سے بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی اور اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ سارہ کسی وجہ سے چکر آنے کے باعث ہاتھ روم میں گر کر بے ہوش ہوگئی تھی اور کسی اور کو اس بات کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے بے ہوش سارہ کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا، اسی وجہ سے دوسرے دن سر حامد کو حسب توقع

سارہ وہاں نہیں ملیں اور سلیم نے انہیں ڈیپارٹمنٹ میں کسی نادیدہ شخص کی تلاش میں سرگرداں پایا۔ سر حامد سارہ کے غیاب پر پریشان تو تھے لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اصل معاملے کا کھوج لگاسکیں۔ اس لیے چپ بیٹھے رہے اور یوں بے چاری سارہ زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ”احمد خان نے یہاں تک کہہ کر چپ سادھ لی۔

”آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں ایس ایس پی صاحب کہ اصل مجرم کون ہے؟“ زار کے شوہر نے سوال کیا۔

”اصل مجرم وہی شخص ہے جس نے سارہ کے دیر گئے تک کالج میں رکنے کا جواز پیدا کیا۔“ احمد خان نے مبہم لہجے میں جواب دیا لیکن بہت سوں نے مفہوم سمجھ لیا اور خود بخود کئی گردنیں زہر کی طرف مڑ گئیں جو کسی سے بھی نظر ملانے کے لائق نہیں رہا تھا۔

”آپ سب نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ یہ مسٹر زہیر ہی تھے جنہوں نے اپنے سر سے رقم اینٹھ کر اپنے باپ کے کاروبار میں لگانے کا منصوبہ بنایا تھا اور یقیناً ان کے والد بھی اس منصوبے میں شامل تھے۔ باقی اگر کوئی اور بھی شریک جرم تھا تو اس کا نام تفتیش کے بعد سامنے آ جائے گا۔“ احمد خان نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے اشارہ کیا تو ایک سپاہی ہتھکڑیاں لیے زہیر کی طرف بڑھا۔ زہیر کے پاس اپنے جرم سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ اس نے خاموشی سے گرفتاری دے دی۔

”میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس منصوبے میں اپنے بیٹے کے ساتھ شامل تھا لیکن ہم دونوں کے علاوہ ہمارے خاندان کا کوئی دوسرا فرد اس میں شریک نہیں ہے۔ اس لیے پلیز کسی کو کچھ نہ کہا جائے۔“ سبحان صاحب نے خود ہی اعتراف کر لیا۔

”اوہ میرے خدا.....! میں کیسے مجرمانہ ذہن رکھنے والے لوگوں میں اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے چلا تھا۔ زہیر ایسا ظالم شخص ہے تو میں اس کے چھوٹے بھائی پر کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں۔ ایسے دولت مندوں سے تو میری بیٹی کے لیے میرا بھتیجا ہی اچھا ہے۔“ زہیر اور سبحان کی گرفتاری کا منظر دیکھتے سلیم کے تائیا، جو اپنے تئیں اپنی بیٹی کے متوقع سرال میں ہونے والے ایک سانچے پر تعزیت کے لیے آئے تھے، بے ساختہ ہی بول پڑے اور اس دردناک کہانی کا یہی ایک اچھا پہلو تھا کہ سلیم کو اس کی محبت ملنے کی نوید مل گئی تھی۔